رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۱   جنوری سنہ ۱۹۴۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت:- چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

دارالمصنفین کی نئی کتاب

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ،

ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا قافلہ سندھ میں اترا تھا، اور ان کی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی، اور وہ ایکہزار سال سے اوپر یہان کے حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے اُن کے آثار نمایاں ہیں، لیکن اس کے باوجود اردو میں اسلامی سندھ کی کوئی مفصل و محققانہ تاریخ موجود نہین تھی، دارالمصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ مین جن حکومتون کے ماتحت رہا، ان کی پوری تاریخ اور ان تمام دورون کے نظام حکومت علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اسکو یاد کرنیکی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت مین شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہاں ایک نئی حکومت کی بنیادین استوار ہو رہی ہین،

ضخامت :- ۴۰۰ صفحے،

قیمت :- چھ روپیے،

منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

جلد ۶۱ ماہ صفر المظفر ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۸ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

قومی اور جمہوری حکومت نے اردو زبان کے ساتھ چند مہینوں میں جو سلوک کیا وہ غیر ملکی اور مستبد حکومت چند صدیوں میں بھی نہ کر سکی تھی، اور اس کے جواز کے لئے جو دلیل پیش کیجاتی ہے، اس کو نہ منطق سے واسطہ ہے، نہ سچائی سے، اسے کون منصف مزاج یقین کر سکتا ہے، کہ صوبہ متحدہ کی اکثریت کی زبان ہندی، اور اردو صرف ۱۴ فیصدی کی زبان ہے، یہاں تک تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ علمی و ادبی اردو، عام بول چال کی زبان اور شہری اور دیہاتی زبان میں فرق ہے، لیکن صرف عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش، تلفظ کی صحت و شائستگی اور لب و لہجہ کا کوئی ایسا بنیادی فرق نہیں ہے جس کی بنا پر ان زبانوں کو بھی مختلف زبانیں کہا جائے، چہ جائیکہ ان کو ہندو مسلم زبانیں قرار دیا جائے زبان کی یہ تقسیم بالکل نئی ہے شہر کے باشندوں کی زبان خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اسی طریقہ سے دیہات کے تمام باشندوں کی زبان بالکل ایک ہی، عام بول چال کی زبان ہندو مسلمان یکساں بولتے اور سمجھتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں جو زبان گڑھی جا رہی ہے، اسے نہ صرف مسلمان بلکہ وہ ہندو بھی نہیں سمجھتے جو سنسکرت سے ناواقف ہیں اگر ہندی ہوتی تو بھی غنیمت تھا

اردو نہ صرف اس لئے کہ ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے بلکہ علمی لسانی، سیاسی اور تمدنی کسی حیثیت سے بھی کوئی ہندوستانی زبان اس کے مقابلہ میں حکومت کی زبان بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، وہ خالص ہندوستان کی پیدا شدہ ہے اس میں ہندو مسلم دونوں کلچروں کے عناصر یکساں ہیں اس کی زمین تمام تر ہندی اور پراکرت کی ہے، صرف گل بوٹے فارسی اور عربی کے ہیں، اس کے قاعدے، مادے، مصادر، اور اکثر تمام محاورے اور اصطلاحیں ہندی اور پراکرت وغیرہ کی ہیں، صرف وہ اسماء اور اصطلاحیں جو ہندوستانی زبانوں میں نہ تھیں، یا ان کے مقابلہ میں عربی یا فارسی کی ان سے زیادہ خوبصورت اور زبان کے لئے قابل قبول تھیں، ان دونوں زبانوں کی لی گئی ہیں، اور ان میں بھی بیشتر الفاظ کا بار

منتقل ہو چکے ہیں جنھیں ایک دیہاتی بھی آسانی سے سمجھ لیتا ہے، کاشتکاری، مقدمہ عدالت اور حکومت کے مختلف شعبوں کے متعلق عربی اور فارسی کی جن قدر اصطلاحیں ہیں، انھیں کون دیہاتی نہیں سمجھتا، اردو میں ہندوستان کی پرانی زبانوں کے الفاظ کے مقابلہ میں عربی اور فارسی الفاظ کا تناسب چوتھائی سے بھی کم ہے، اس میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے مقامی اثرات بھی پوری طرح موجود ہیں، اس کی تفصیل میں پڑنے کا یہ موقع نہیں ہے، راقم نے کئی سال ہوئے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے اجلاس میں اس موضوع پر ایک مفصل مقالہ پڑھا تھا، جو اکیڈمی کے رسالہ کے کئی نمبروں میں چھپ چکا ہے،

اردو گو ہندو مسلم عوام کے اختلاط سے پیدا ہوئی لیکن اُس نے حکومت کی گود میں پرورش پائی، اور ایک عرصہ تک ہندو مسلمان ادیبوں اور اصحاب علم وقلم کی تصنیفی زبان رہ چکی ہے، اور اب بھی ہے، اس نے ہندوستان کی اکثر پرانی زبانوں اور عربی فارسی اور ترکی وغیرہ بیرونی زبانوں کے بہترین عناصر کو جذب کیا ہے، اس لیے اس میں جو وسعت ہے، اور علوم و فنون اور حکومت و تمدن کے ہر شعبہ اور ہر شاخ کے متعلق جس قدر الفاظ اور اصطلاحیں اردو میں موجود ہیں، وہ ہندوستان کی کسی زبان میں بھی نہیں مل سکتیں، انگریزی حکومت اور مغربی تمدن نے جو نئی چیزیں پیدا کیں، اُن کے مترادفات بھی اردو میں بن گئے، یا اصل زبان کے جو الفاظ اس میں کھپ سکتے تھے وہ اس میں جذب ہو کر اردو کا جزبن گئے، اور آج کوئی نیا لفظ ایسا نہیں ہے جس کا مرادف اردو میں موجود نہ ہو، ان میں اکثر زبانوں پر چڑھ کر عام ہو چکے ہیں، سیاسی حیثیت سے بھی اردو کی کچھ کم اہمیت نہیں، ایشیا کے اکثر ملکوں خصوصاً ہندوستان کے پڑوسی اسلامی ممالک میں ہر جگہ کم و بیش اردو کے سمجھنے والے موجود ہیں، ایشیا کے جن ملکوں میں بھی مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی ہے، ان میں اردو نامانوس نہیں اس لئے تمام ہندوستانی زبانوں میں ان ملکوں سے ربط و تعلق کا ذریعہ بھی اردو ہی ہو سکتی ہے، سنسکرت اور ہندی صرف ہندوستان تک محدود ہے،

اردو زبان کا مسئلہ اب تنقید و بحث پر نہ صرف ہر مسلک و خیال کے مسلمان بلکہ سنجیدہ اور صحیح الخیال

ہندو بھی متحد ہیں، گاندھی جی کی رائے سب کو معلوم ہے، حال ہی میں لکھنؤ میں آل انڈیا اردو پریس، اور آل انڈیا انجمن ترقی پسند مصنفین کی جو کانفرنسیں ہوئی ہیں، ان میں ہندو اخبار نویسوں اور ادیبوں نے بھی بالاتفاق اردو کی حمایت، اور حکومت کے رویہ پر ناپسندیدگی ظاہر کی ہے، انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے اردو کی حمایت میں جو اعلان شائع ہوا ہے، اس میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں اور سکھوں کے نام ہیں، انفرادی طور پر بھی بہت سے ممتاز ہندوؤں نے اردو کی تائید میں بیانات دئے ہیں، اور اس جماعت کے علاوہ جو پرانے بھارت کو زندہ کرنا چاہتی ہے، حق پسند ہندو بھی اردو کے ساتھ حکومت کی روش کو پسند نہیں کرتے،

کانگریس ایک طرف تو بلا اختلاف مذہب و ملت ہندوستان کے تمام فرقوں کی نمایندگی، ان کے کلچر کے تحفظ اور متحدہ قومیت کی مدعی ہے، دوسری طرف اردو کے ساتھ جو ہندو مسلمانوں کے میل جول کی پیداوار اُن کے اتحاد کی نشانی، دونوں کے مشترک کلچر کا سب سے بڑا نمونہ اور اس کی امین و محافظ ہے، کانگریسی حکومت کا یہ طرزِ عمل نہایت حیرت انگیز ہے، اگر اردو تنہا مسلمانوں کی زبان بھی ہوتی، تو بھی ایک جمہوری ادارہ کی حیثیت سے اردو کا تحفظ کانگریس کا فرض تھا، زبان زبردستی پیدا نہیں کیجاتی، بلکہ طبعی اور فطری پیدا ہوتی، اور بڑھتی ہے، اس لئے اردو کے مقابلہ میں نئی زبان کا فروغ پانا آسان نہیں ہے، اور ایک دن حکومت کو اردو کا واجبی حق ماننا پڑے گا،

مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہٗ دریابادی کی مشہور و مقبول کتاب تصوف اسلام کا تیسرا اڈیشن چھپ کر تیار ہوگیا ہے، گو اس کے ابواب میں کوئی نیا اضافہ نہیں ہے، لیکن بعض ابواب کے مباحث میں مفید اضافے اور پوری کتاب میں جزوی ترمیمیں کی گئی ہیں، اور یہ نیا اڈیشن پہلے اڈیشنوں سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے، یہ کتاب اردو میں قدیم اکابر صوفیائے کرام کی تصانیف کا جو تصوف کی اہمات کتب اور روح شریعت ہیں، خلاصہ اور عطر ہے اور مصنف کے قلم سے اُن کی ضروری تشریح و توضیح ہے، اصحاب ذوق دار المصنفین سے طلب فرمائیں،

مقالات

اسلامی طب کی مختصر تاریخ

از

مولانا عبد السلام ندوی

اسکندر اعظم نے جب مشرق مین فاتحانہ اقتدار حاصل کیا، تو سیاسی مصالح کی بنا پر معاشرتی تمدنی اور علمی حیثیت سے یونان اور مشرق کے مفتوحہ ممالک مین ربط و علاقہ پیدا کرنا چاہا، اور اس غرض سے مشرقی ممالک میں یونانیون کو آباد کیا، اور یونان کے علماء و فضلاء کو یونانی علم و ادب کی اشاعت کی ترغیب دلائی، جو یونانی حکام اسکندر کی طرف سے ان ممالک میں مقرر تھے، انھون نے بھی اس کی تقلید کی، اور اس طرح مشرقی ممالک مین یونانی تمدن اور یونانی علوم عام طور پر پھیل گئے، اور اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد مشرق کے بہت سے شہر یونانی علوم و فنون کے مرکز بن گئے، جن مین اسکندریہ، جندیسا پور، اور حران کو خاص طور پر اہمیت حاصل تھی، ان مین اسکندریہ کے اسکول نے طب کیمیا اور علوم طبعیہ مین زیادہ شہرت حاصل کی اور اسلامی فتح کے زمانہ تک اس کی یہ شہرت قائم تھی، اور مسلمان سب سے پہلے اسی اسکول سے آشنا ہوئے، کیونکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ مین جب اسکندریہ فتح ہوا، تو اس وقت اسکندریہ کا سب سے بڑا فلسفی یحیٰی نحوی زندہ تھا، اور جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے مصر اور اسکندریہ کو فتح کیا، تو وہ ان کی خدمت مین حاضر ہوا اور وہ اس کے علم و فضل کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ اس کو اپنا ہم دم و ہم نشین بنا لیا، اس کے بعد وہ

رندی کی روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک زندہ

رہا، خالد بن یزید المتوفی ۸۵ھ نے اس سے طب کی تعلیم حاصل کی،

اسکندریہ کا سب سے زیادہ مشہور طبیب اصطفن تھا جس نے خالد بن یزید کے لئے کیمیا وغیرہ کی بعض

ں کتابوں کا ترجمہ کیا،

اسکندریہ کا ایک اور طبیب عبد الملک بن ابجر کنانی تھا جس نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے ہاتھ پر

ن کی گورنری کے زمانہ میں اسلام قبول کیا، اور وہ طب میں ان کا مخصوص بن گیا، لیکن اسکندریہ

سکول کا اثر صرف بنو امیہ کے زمانہ تک قائم رہا اور خلفاے عباسیہ کے دور حکومت تک تجاوز

کر سکا، عباسی دور میں اسکندریہ کے صرف ایک عیسائی طبیب بلیطیان کے نام کا پتہ چلتا ہے جو منصور

ں خلافت کے چوتھے سال اسکندریہ کا پادری مقرر ہوا، اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید نے اپنے دور

افت میں عبید اللہ بن مہدی کو مصر کا گورنر مقرر کیا، تو اس نے اس کی خدمت میں ایک نہایت حسین

یل کنیز ہدیۃً بھیجی، جس پر وہ فریفتہ ہو گیا، اتفاق سے وہ ایک بار سخت بیمار پڑی، اور اطبار کے

لاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا، تو لوگوں نے ہارون رشید کو مشورہ دیا کہ مصر سے کسی طبیب کو بلوایئے

وہ اطباے عراق سے بہتر اس کا علاج کر سکے گا، ہارون رشید نے اس کے لئے عبید اللہ بن مہدی کو لکھا اور

ں کے لئے بلیطیان کا انتخاب کیا، بلیطیان مصر سے روانہ ہوا تو مصر سے چند دوائیں بھی ساتھ لیتا آیا اور

بغداد میں پہنچ کر کنیز کو یہ دوائیں کھلائیں، تو وہ بالکل صحیح و تندرست ہو گئی،

بلیطیان کے سوا عباسی دور میں اسکندریہ کے اور کسی طبیب کا نام نہیں ملتا، بلکہ عباسی دور پر سب سے

---

۵ شہرزوری نے یحیٰی نحوی کا تذکرہ دو جگہ لکھا ہے، ایک جگہ وہ اس کو اسکندرانی اور دوسری جگہ دیلمی کہتا ہے

لیکن درحقیقت یہ دونوں ایک ہی ہیں ۵۲ فہرست ابن ندیم مطبوعہ مصر ص ۴۹۴ ۵۳ طبقات الاطباء

ءاول ص ۱۱۶ ۵۴ ایضاً جلد دوم ص ۸۲، ۸۳، ۵۴

اور وقت جب علماء کے اسکول کا یہ حال تھا نہایت قدیم زمانہ سے ایک طبی مدرسہ موجود تھا جس کو نسطوریوں نے قائم کیا تھا اور اس میں یونانی علوم و فنون شامی زبان میں پڑھائے جاتے تھے، یونانی علوم و فنون کے ساتھ ہندی زبان میں ہندی علوم و فنون کی تعلیم بھی ہوتی تھی، اور بعض ہندو اس خدمت کو انجام دیتے تھے،

علامہ جمال الدین قفطی نے اخبار الحکماء میں اس شہر کے آباد ہونے کی جو تاریخ لکھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہر کیونکر یونانی علوم و فنون بالخصوص فنِ طب کا مرکز بن گیا، وہ لکھتا ہے کہ جندیساپور کے اطباء نے اکاسرہ کے زمانہ سے فنِ طب میں مہارت حاصل کی اور اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ سابور بن اردشیر نے جب انطاکیہ اور شام کو فتح کیا، تو اس نے فیلپ قیصر روم سے اس شرط پر مصالحت کی کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی اس کے ساتھ کر دے، قیصر روم نے اس شرط کو منظور کر لیا، لیکن لڑکی کے آنے سے پہلے سابور نے اس کے لئے قسطنطنیہ کی شکل کا ایک شہر تعمیر کیا جس کا نام جندیساپور رکھا، شہر کے آباد ہونے کے بعد جب قیصر روم کی لڑکی اس میں آئی، تو روم سے ہر قسم کے ضروری اشخاص بھی اس کے ساتھ آئے جن میں بہت سے حذاق اطباء بھی تھے، ان اطباء نے اس شہر میں قیام کیا تو وہاں کے نوجوانوں کو فنِ طب کی تعلیم دینی شروع کی، اور انہوں نے رفتہ رفتہ اس فن میں اس قدر ترقی کر لی کہ تمام لوگوں سے ممتاز ہو گئے، اور ایک جماعت کے نزدیک ان کا طریقۂ علاج یونان اور ہندوستان کے طریقۂ علاج سے بھی بڑھ گیا، کیونکہ انہوں نے ہر گروہ کی نمایاں خصوصیات کو لیکر اپنے استنباطات سے ان میں بہت کچھ اضافہ کیا تھا، بہت سے اصول و قوانین مرتب کئے تھے، اور کتابیں تصنیف کی تھیں جن میں ہر قسم کی عمدہ باتیں جمع کی تھیں[1]،

اہلِ عرب پر اموی اور عباسی دورِ حکومت سے پہلے ہی اس اسکول کا اثر پڑنے لگا تھا،

---

[1] اخبار الحکماء قفطی، ص ۹۲،

چنانچہ عرب کے مشہور طبیب حارث بن کلدہ نے جو خود صحابیت سے مشرف نہ تھا، زمانۂ اسلام سے قبل جندیسا پور کا سفر کیا تھا اور اہلِ جندیسا پور وغیرہ سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی، حضرت سعد بن ابی وقاص حجۃ الوداع میں بیمار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حارث ہی کے علاج کا مشورہ دیا، اور چونکہ وہ مسلمان نہ تھا، اس لئے اس واقعہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ طبی امور میں اہلِ کفر کے مشورہ سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔[۵۱]

اس کے بعد عباسی دورِ حکومت میں اہلِ جندیسا پور کا اثر و رسوخ خلیفہ منصور کے زمانہ میں خاص طور پر بڑھا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۴۸ھ میں منصور کو معدہ کی شکایتیں پیدا ہوئیں، اور اطبار کے علاج کے باوجود، روز بروز بڑھتی گئیں، بالآخر اوس نے تمام اطبار کو جمع کرکے کہا کہ "میں تمام شہروں کے اطبار میں سے ایک ماہر طبیب کو بلانا چاہتا ہوں"، سب نے بالاتفاق جورجیس کا نام لیا، جو اس وقت جندیسا پور کا افسر الاطبا اور وہاں کے شفاخانے کا مہتمم تھا، منصور نے اوس کو طلب کیا، اور وہ اپنے دو شاگردوں یعنی ابراہیم اور عیسیٰ ابن شہلا کے ساتھ بغداد میں آیا اور ۱۵۲ھ تک منصور کا طبیب خاص رہا، اس کے بعد بیمار ہو کر اپنے وطن جندیسا پور کو واپس گیا، اور اپنے عوض منصور کے علاج کے لئے اپنے شاگرد عیسیٰ بن شہلا کو چھوڑ گیا،[۵۲] اس کے بعد خلیفہ مہدی کے زمانہ میں اس کا بیٹا ہادی بیمار ہوا، تو اس نے علاج کے لئے جندیسا پور سے جورجیس کے بیٹے بختیشوع کو طلب کیا، لیکن بعض اطبار کی دراندازی سے مہدی نے اوس کو اعزاز کے ساتھ جندیسا پور میں واپس کر دیا، اور ۱۷۱ھ تک وہاں کے شفاخانے کا اہتمام کرتا رہا، پھر ہارون رشید دردِ سر میں مبتلا ہوا، تو اوس نے اوس کو دوبارہ طلب کرکے افسر الاطبار مقرر کیا،[۵۳] اس کے بعد بختیشوع کے بیٹے جبرئیل نے جعفر بن یحییٰ بن خالد برمکی، اور ہارون رشید کی ایک کنیز کے علاج میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، تو ہارون رشید نے اس کو پانچ لاکھ درہم

---

[۵۱] اخبار الحکمار قفطی ص ۱۱۱، ۱۱۲۔ [۵۲] اخبار الحکمار قفطی ص ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱۔

[۵۳] " " صفحہ "

نے ...... اس کو افسر الاطبا مقرر کر دیا،

جندیساپور اسکول کا ایک مشہور طبیب سابور بن سہل تھا، جو جندیساپور کے شفاخانے میں مریضوں کا علاج کرتا تھا، متوکل اور اس کے بعد کے خلفاء کے درباروں میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی،[۱] اس نے ۲۵۵ھ میں خلیفہ مہتدی باللہ کے زمانہ میں وفات پائی،[۲]

حرانی اسکول کا اثر ثابت بن قرہ حرانی کے ذریعہ سے قائم ہوا، جو ۲۲۱ھ میں حران میں پیدا ہوا، پھر بغداد میں آکر مستقل طور پر اقامت اختیار کر لی، حرانی اسکول میں ریاضیات و فلکیات نے سب سے زیادہ[۳] ترقی کی تھی، اور غالباً اس کی وجہ حرانیوں کی ستارہ پرستی تھی، اس نے محمد بن موسیٰ شاکر جو ریاضی و ہندسہ کا بڑا قدردان تھا، روم سے واپس ہوا تو ثابت کو ساتھ لیتا آیا، اور معتضد کے دربار میں اس کو منجمین کے زمرہ میں داخل کر دیا، اور اس کے زمانہ سے عراق میں صابیوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ بڑھ گیا،[۴]

ثابت بن قرہ کے بعد اس کے بیٹے سنان بن ثابت نے طب و ہندسہ میں اپنے باپ کی طرح بہت زیادہ ناموری حاصل کی، اور پہلے مقتدر باللہ کا، پھر قاہر باللہ کا طبیب خاص مقرر ہوا، اور مقتدر باللہ نے اس کو افسر الاطبا مقرر کیا،[۵]

سنان بن ثابت کے بیٹے ابراہیم بن سنان بن ثابت نے بھی علوم طبیہ بالخصوص علم ہندسہ میں بہت زیادہ شہرت حاصل کی، اور اس علم میں متعدد کتابیں لکھیں، وہ ۲۹۶ھ میں پیدا ہوا، اور ۳۳۵ھ میں وفات پائی،[۶]

حران کا ایک مشہور طبیب ابو اسحٰق ابراہیم بن زہرون حرانی تھا جس نے بغداد میں ۳۰۹ھ میں وفات پائی،[۷]

ابراہیم بن زہرون حرانی کے بیٹے ابو الحسن ثابت بن حرانی نے بھی طب میں بہت زیادہ شہرت

۱؎ اخبار الحکماء قفطی ص ۹۳، ۹۴، ۲؎ طبقات الاطباء جلد ۱ ص ۱۶۱، ۳؎ اخبار الحکماء قفطی ص ۴۲، طبقات الاطباء جلد اول ص ۲۱۵ ۴؎ اخبار الحکماء قفطی ص ۱۳۰ ۵؎ اخبار الحکماء قفطی ص ۱۲۴، طبقات الاطباء جلد اول ص ۲۲۶، ۶؎ ایضاً ص ۲۲۷،

حاصل کی، وہ ۲۰۳ھ میں پیدا ہوا، اور ۳۲۵ھ میں بمقام بغداد انتقال کیا، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے اُس کی طبی مہارت کے متعلق بہت سے دلچسپ واقعات نقل کئے ہیں[1]،

ابراہیم بن ہلال صابی کے چچا ثابت بن ابراہیم نے بھی عضدالدولہ کے زمانہ میں طبی حیثیت سے اس قدر شہرت حاصل کی کہ ایک موقع پر اس کی نباضی کے کمال کو دیکھ کر ایک شخص نے صاف کہدیا کہ "نبوت ہے طب نہیں ہے"، وہ ۲۸۳ھ میں پیدا ہوا، اور ۳۶۹ھ میں وفات پائی[2]،

اِن کے علاوہ بعض ہندو طبیب بھی بغداد میں آئے، اور اپنے آثار علمیہ چھوڑ گئے، چنانچہ منکہ ہندوستان سے خاص طور پر ہارون رشید کے علاج کے لئے آیا، اور ایک ہندوستانی طبیب شاناق نے زہروں کے متعلق جو کتاب لکھی تھی، اس کا ترجمہ ہندی زبان سے فارسی زبان میں کیا[3]،

خلفائے اسلام کے درباروں میں ان غیر مسلم اطبا نے طبی ضرورتوں سے جو رسوخ و اقتدار حاصل کیا، اُس سے قدرتی طور پر دو عمدہ نتیجے نکلے،

۱۔ ایک تو یہ کہ انہی غیر مسلم اطبا کے ذریعہ سے یونانی علوم و فنون کا ترجمہ ہوا، اور اوّل اوّل طبی کتابوں کے ترجمے ہوئے، چنانچہ سب سے پہلے خالد بن یزید نے کیمیا و طب کی کتابوں کے ترجمے کرائے، اس کے بعد مروانی دور حکومت میں ماسرجویہ یہودی نے اہرن قس کی قرابادین کا ترجمہ کیا، پھر منصور کے عہد میں جورجیس نے طبی کتابوں کے ترجمے کئے، اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید کے عہد میں، انگورہ، عموریہ، اور روم کے تمام شہروں پر جب اقتدار حاصل ہوا، اور وہاں طب کی بہت سی قدیم کتابیں ملیں تو ہارون رشید نے اُن کے ترجمہ کی خدمت یوحنا ماسویہ سے متعلق کی[4]،

۲۔ دوسرا یہ کہ شفاخانوں کا نظام جس کی بنیاد سب سے پہلے خلیفہ ولید بن عبدالملک نے ڈالی

---

[1] طبقات الاطبا، جلد اول ص ۲۲، [2] اخبار الحکما، قفطی، ص ۸۵، [3] طبقات الاطبا، جلد دوم ص ۳۲، [4] اخبار الحکما، قفطی ص ۲۷۹،

بہت زیادہ وسیع و مکمل ہوگیا، اور متعدد شفاخانے قائم ہوگئے، عباسی دور میں خلیفہ ہارون رشید
م نے جبرئیل بن بختیشوع نے ایک شفاخانہ قائم کیا، اور یوحنا بن ماسویہ کو جو اس کا سب سے بڑا شاگرد
اس کا مہتمم مقرر کیا،[1] اسی زمانہ میں ایک اور شفاخانہ خاندانِ برامکہ نے قائم کیا تھا جس کا افسر ایک ہندو
ب بن دہن نامی تھا،[2] مقتدر باللہ نے ۳۰۶ھ میں سنان بن ثابت حرانی کے مشورہ سے ایک خاص
خانہ قائم کیا جس کا نام شفاخانہ مقتدری تھا،[3]

قیدیوں اور دیہاتیوں کے علاج کی طرف بھی اسی زمانہ میں توجہ ہوئی، اور ان کے لئے اطبا
ء مقرر کئے گئے، چنانچہ ایک سال جب بکثرت وبائی امراض پھیلے، تو علی بن عیسیٰ نے جو مقتدر کا وزیر
سنان بن ثابت کو لکھا، کہ قیدیوں کی حالت خاص طور پر قابلِ توجہ ہے، اور اُن کے لئے مخصوص اطبا
مقرر کرنے کی ضرورت ہے جو روزانہ تمام جیلخانوں میں دوائیں ساتھ لے کر جائیں، اور ان کا علاج
یں، سنان بن ثابت نے اس حکم کی تعمیل کی، تو اس نے دوسرا فرمان لکھا کہ دیہاتیوں کے علاج
کا انتظام نہیں ہے، اُن کے لئے بھی مخصوص اطباء کے مقرر کرنے کی ضرورت ہے، جو اپنے ساتھ
یں لے کر جائیں، اور دیہاتوں میں گھوم گھوم کر دیہاتیوں کا علاج کریں، چنانچہ سنان بن ثابت
س حکم کی بھی تعمیل کی،[4]

اس سلسلے میں مقتدر کے زمانہ میں سب سے بڑی ترقی یہ ہوئی، کہ طبیبوں کے امتحان کا طریقہ قائم ہوا چنانچہ ایک بار ۳۱۹ھ
جب مقتدر کو معلوم ہوا کہ ایک طبیب کی غلطی سے ایک آدمی مرگیا ہے تو اس نے اپنے محتسب کو حکم دیا کہ ہر طبیب کو علاج کرنے کی
اجازت نہ دیجائے صرف وہی طبیب علاج کر سکتے ہیں جو سنان بن ثابت کے امتحان میں پورے اتریں چنانچہ امتحان کے لئے جو اطبا
کئے گئے ان کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ تھی ان کے علاوہ جو مشہور یا شاہی اطباء تھے وہ امتحان سے مستثنیٰ تھے،[5]

طبیبوں کے ساتھ عطاروں کی اصلاح و انتخاب کی بھی ضرورت تھی، اور عباسی دور میں اس طرف

اخبار الحکماء قفطی ص ۲۵۰، ۲۵۱ [2] فہرست ابن ندیم ص ۳۴۲ [3] اخبار الحکماء قفطی ص ۱۳۳ [4] ص ۱۳۲ [5] ص ۱۳۰

سب سے پہلے مامون رشید کے زمانہ میں توجہ مبذول ہوئی، اور یوسف لقوہ نے مامون رشید سے شکایت کی کہ عطاروں سے جو دوائیں مانگی جاتی ہیں، خواہ اُن کے پاس ہوں یا نہ ہوں، مگر وہ یہی کہتے ہیں کہ یہ دوا ہمارے یہاں ہے اور اپنے یہاں سے کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر دیدیتے ہیں، امیر المومنین اگر چاہیں، تو خود اس کا تجربہ کر سکتے ہیں بغداد کے قریب ایک گاؤں تھا جس کا نام سقطیثا تھا، مامون نے کچھ لوگوں کو عطاروں کے پاس بھیجا کہ سقطیثا کے متعلق ان سے دریافت کریں کہ اُن کے پاس ہے یا نہیں، تمام عطاروں نے کہا کہ ہے اور قیمت لے کر سب نے مختلف دوائیں دیدیں، اور یہ تمام لوگ مختلف دوائیں لے کر چلے، تو مامون نے یوسف لقوہ کے اس مشورہ کو پسند کیا، اسی نظیر کو پیش نظر رکھ کر زکریا طیفوری نے معتصم کے زمانہ میں افشین کو اس طرف توجہ دلائی، اور اس نے اس قسم کے بیس نام بتا کر چند آدمیوں کو عطاروں کے پاس بھیجا، بعض عطاروں نے تو اپنی لاعلمی ظاہر کی لیکن بعض نے قیمت لے کر اپنی دوکان سے کوئی نہ کوئی دوا اٹھا کر دیدی اب افشین نے تمام عطاروں کو طلب کیا، اور جن عطاروں نے لاعلمی ظاہر کی تھی، اُن کو قائم رکھا، اور بقیہ عطاروں کو اپنے لشکر گاہ سے الگ کر کے اس کا عام اعلان کر دیا اور معتصم کو لکھا کہ اس کے پاس وہی عطار اور طبیب بھیجے جائیں، جو متدین ہوں، چنانچہ معتصم نے اس کو پسند کیا، اور اس کے پاس متدین اطبا بھیجے،[۱]

یہ تمام اطبا ایک خاص نظام کے ماتحت طبی خدمات انجام دیتے تھے،

۱۔ ان میں چند مخصوص اطبا خلفا و امرا کے ملازم تھے، اور تنخواہیں پاتے تھے،

۲۔ چند اطبا، فوج میں ملازم تھے، اور فوج کے ساتھ سفر کرتے تھے،

۳۔ ان کے علاوہ جو اطبا تھے، وہ پرائیوٹ پریکٹس کرتے تھے، پہلے تو ان پر کوئی قید و بند نہ تھی، بلکہ ہر مرض کا علاج کرتے تھے لیکن جب سنان بن ثابت نے ان کا امتحان لیا تو ہر طبیب کو صرف اسی مرض

---

[۱] اخبار الحکما قفطی ص ۱۲۹

کے علاج کرنے کی اجازت دی، جس کی وہ قابلیت رکھتا تھا،[۱]

منصور کے زمانہ سے لے کر مقتدر کے زمانہ تک یہ اسلامی طب کی مختصر تاریخ ہے، اور مقتدر کے زمانہ تک اگرچہ صرف بغداد میں اطبار کی اس قدر کثرت ہوگئی تھی، کہ مشہور اور شاہی اطبار کے مستثنیٰ کرنے کے بعد جو اطبار سنان بن ثابت کے سامنے امتحان کے لئے پیش ہوئے، اُن کی تعداد آٹھ سو سے زائد تھی، تاہم چونکہ ہم کو ان اطبار کے نام اور حالات معلوم نہیں ہیں، اس لئے ہم نہیں بتا سکتے کہ اس زمانہ میں کس قدر مسلمان اطبار موجود تھے، اس زمانہ کے مشہور اطبار کے جو حالات تذکروں میں مذکور ہیں، وہ سب کے سب عیسائی، صابی اور یہودی ہیں، ان میں کسی مشہور مسلمان طبیب کا نام ہم کو نہیں ملتا، تاہم اس میں شبہہ نہیں کہ اس زمانہ میں طب کی تعلیم نصاب درس کا لازمی جزو ہوگئی تھی، اس لئے مسلمانوں میں جو لوگ مشہور فلسفی گذرے ہیں، سب نے علم طب کی تعلیم حاصل کی تھی، مسلمانوں میں پہلا شخص جو فلسفی کے لقب سے مشہور ہوا، وہ یعقوب کندی تھا، اور اس کے تذکرہ میں علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبار میں لکھا ہے، کہ وہ علم طب کا عالم تھا، اور فارابی کی نسبت تصریح کی ہے، کہ وہ علوم طبیہ میں بڑی مہارت رکھتا تھا، البتہ اس نے عملاً کبھی طبابت نہیں کی، لیکن عملی طور پر مسلمانوں میں اب تک کوئی مشہور طبیب نہیں پیدا ہوا تھا، طبی حیثیت سے اس زمانہ میں سب سے پہلے زکریا رازی نے شہرت حاصل کی، جو باختلاف روایت ۲۳۶ھ، ۲۴۰ھ، ۲۵۰ھ، ۲۵۱ھ میں پیدا ہوا، اور باختلاف روایت ۳۲۰ھ، ۳۲۱ھ ۳۲۲ھ یا ۳۶۴ھ میں وفات پائی، وہ ابتدار میں عود بجاتا تھا، پھر اس کو چھوڑ کر فلسفہ کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد طب کی طرف متوجہ ہوا، اور ابن خلکان کا بیان ہے، کہ اس نے جس وقت طب کی تعلیم شروع کی، اوس کا سن ۴۰ سال سے متجاوز ہو چکا تھا،

طبی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے طبابت کا مستقل پیشہ اختیار کر لیا اور پہلے رے کے شفاخانہ کا

---

[۱] طبقات الاطبار جلد اول ص ۲۲۲،

پھر خلیفہ مکتفی کے زمانہ مین بغداد کے شفا خانے کا افسر مقرر ہوا[1] اور عمر بھر اسی فن کی تکمیل مین معروف رہا، یہان تک کہ اس فن کا امام ہو گیا، چنانچہ علامہ ابن خلکان لکھتے ہین کہ وہ علم طب مین اپنے وقت کا امام تھا، اور اس زمانہ مین اس کی طرف انگلیون سے اشارہ کیا جاتا تھا، وہ فن طب مین کامل اور اس کے اصول و فوائد کا ماہر تھا، اور علم طب حاصل کرنے کے لئے لوگ اس کے پاس سفر کرکے آتے تھے، وہ خود بیان کرتا ہے کہ میرے پاس چین کا ایک شخص آیا، اور ایک سال تک مقیم رہا، اس مدت مین اس نے عربی زبان اور عربی خط سیکھا، یہانتک کہ پانچ مہینہ مین نہایت فصیح اور زود نویس ہو گیا، جب اوس نے اپنے وطن کو واپس جانا چاہا، تو ایک مہینہ پیشتر مجھ سے کہا کہ مین چاہتا ہون کہ آپ جالینوس کی سولہ کتابون کا املا کرا دیجئے تاکہ مین اُن کو لکھ لون، مین نے کہا کہ وقت بہت کم ہے اور تم اپنے زمانہ قیام مین اس کا تھوڑا سا حصہ بھی نہین لکھ سکتے، اوس نے کہا آپ جس قدر جلد ممکن ہو املا کرائیے مین اس سے بھی زیادہ تیزی سے لکھتا جاؤن گا، مین نے اپنے بعض شاگردون کو بھی اپنے ساتھ لیا، اور جس قدر جلد ممکن ہوا، سب مل کر املا کرانے لگے، اور وہ اس سے بھی زیادہ تیزی سے لکھنے لگا جب ہم نے مقابلہ کیا، تو ہم نے اس کی تصدیق کی، مین نے اس کے متعلق اس سے سوال کیا تو اوس نے کہا کہ ہمارے یہاں ایک خط ہے جس کو مجموع کہتے ہین، اور یہ وہی خط ہے جس کو آپ دیکھ رہے ہین، جب ہم کسی طویل تحریر کو تھوڑی سی مدت مین لکھنا چاہتے ہین تو پہلے اوس خط مین لکھتے ہین، پھر اگر ضرورت ہوتی ہے تو اوس کو معمولی خط مین نقل کر لیتے ہین[2]

علامہ ابن خلدون لکھتے ہین کہ اس فن مین اسلام مین بھی ایسے ائمہ پیدا ہوئے جو درجۂ کمال سے بھی آگے نکل گئے، مثلاً رازی، مجوسی اور ابن سینا،[3]

علامہ ابن ابی اصیبعہ طبقات الاطبا مین لکھتے ہین کہ وہ فن طب کے مشکل مسائل پر ہمیشہ غور و فکر کرتا رہتا تھا، اور اس کے حقایق و اسرار کھولا کرتا تھا، اور اس مین اس قدر مشغول رہتا تھا کہ ہمہ وقت

---

[1] ابن خلکان جلد ۲ ص ۸، [2] فہرست ابن ندیم ص ۲۵ [3] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۱۱،

اجتہاد کیا کرتا تھا، اور علما نے اپنی کتابون مین جو کچھ لکھا ہے، اس سے واقفیت حاصل کرتا رہتا تھا، اوس نے خود اپنی بعض کتابوں مین لکھا ہے کہ میرا ایک شریف دوست تھا، جو راتون کو مجھ سے بقراط اور جالینوس کی کتابون کے متعلق گفتگو کیا کرتا تھا، رازی کو فن طب مین جو مہارت حاصل ہوئی، مریضون کے علاج مین اوس نے جو انفرادی شان پیدا کی، اُن کے حالات پر اوس نے طبی پیشینگوئیون سے جو استدلال کیا، دواؤن کے اوصاف وخواص کا جہان تک اور اطبا، کا علم نہ پہنچ سکا تھا، اوس نے جو تجربہ کیا، اُن سب کے متعلق بہت سے تاریخی واقعات ہین، جو اس کی بہت سی کتابون مین درج ہین، اور ان سب کو اس نے اپنی کتاب حاوی کے ایک علحدہ باب مین اور اپنی کتاب سر الطب مین بیان کر دیا ہے،

اس کے بعد رازی کی طبی مہارت کے متعلق اونھون نے دو حکایتین نقل کی ہین، اور ان حکایتون کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ رازی کے متعلق اس قسم کی اور بھی بہت سی حکایتین ہین، اور ان کا بہت بڑا حصہ مین نے کتاب حکایات الاطبار مین بیان کر دیا ہے، رازی کی طبی مہارت کا خلاصہ صرف ایک فقرے مین بیان کیا جاسکتا ہے، جو بطور ضرب المثل کے مشہور ہو گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ فن طب مردہ ہو گیا تھا، جالینوس نے اس کو زندہ کیا، وہ پراگندہ تھا، رازی نے اس کو ایک شیرازہ مین منسلک کیا، وہ ناقص تھا، ابن سینا نے اس کی تکمیل کی، طب کے ان پراگندہ مسائل کا سب سے بڑا مجموعہ اس کی کتاب حاوی ہے، جس مین اوس نے امراض اور ان کے طریقۂ علاج کے متعلق قدما کی اور ان کے بعد اپنے زمانہ تک کے اطبار کی کتابون مین جو کچھ تھا، سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اور ہر قول کو اوس کے قائل کی طرف منسوب کیا ہے،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمانون مین طب کا سلسلہ اطبائے اسکندریہ کے ذریعہ سے پھیلا، جن کو اسکندرانی کہتے ہین، یہ سات طبیب تھے، جنھون نے اسکندریہ مین ایک طبی درسگاہ قائم کی تھی

اور صرف جالینوس کی سولہ کتابین ان کے نصاب تعلیم مین داخل تھین، جن کو آسانی سے یاد کرنے اور سمجھنے کے لئے انھون نے اُن کے خلاصے کرلئے تھے، اس کے بعد انھون نے ان کتابون کی شرح کی تھی، یحیٰی نحوی انھی اطبا مین شامل تھا، جو اسلام کے ابتدائی زمانہ تک زندہ رہا، لیکن ان اطبا کے علاوہ اور بھی بہت سے طبیب تھے، جو اطبا ے اسکندریہ کے معاصر یا ان کے زمانہ سے قریب تھے، اور ان کی کتابین اسلام کے زمانہ تک موجود تھین، رازی کا سب سے بڑا طبی کارنامہ جو یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ اوس نے طب کے پراگندہ مسائل کو ایک جگہ جمع کر دیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اوس نے صرف جالینوس کی ۱۶ کتابون اور اطبا ے اسکندریہ کی شرحون پر قناعت نہیں کی، بلکہ اُن کے علاوہ اُن کے معاصر اطبار کی کتابون کا بھی مطالعہ کیا، اور اُن کے مطالب اپنی کتاب حاوی مین نقل کئے،[1]

موجودہ دور مین اہل مغرب نے بھی فن طب میں اس کی بلند پایگی کو تسلیم کیا، یہانتک کہ ۱۹۱۳ء مین بمقام لندن بین الاقوامی کانگریس مین رازی کے سوانح اور کارنامون کے متعلق ایک خاص کانفرنس قائم ہوئی، اور اس کا ذکر شاندار مدحیہ الفاظ مین کیا گیا،

۱۹۳۲ء مین پیرس مین رازی کی ہزار سالہ برسی منائی گئی، جس مین ایک مضمون پڑھا گیا جس کا عنوان تھا "عربی طب وتاریخ مین اور فرانس کی طب پر اس کا اثر" اور اس مضمون مین رازی کو بہت بڑا طبیب تسلیم کیا گیا، اس کے علاوہ اس کی بہت سی طبی کتابون کا ترجمہ یورپین زبانون مین کیا گیا، اور وہان کے نصاب تعلیم مین داخل رہین، اسی زمانہ کا ایک اور مسلمان طبیب احمد بن ابی الاشعث ہے جو ابتدا مین طبی حیثیت سے مشہور نہ تھا، بلکہ ایک سرکاری عہدہ دار تھا، لیکن کسی جرم مین ماخوذ ہوا، اور اپنے وطن سے بھاگ کر موصل مین آیا، یہان ناصر الدولہ کا ایک لڑکا بیمار تھا، جس کو اطبار کے علاج سے شفا نہیں ہوتی تھی بلکہ مرض اور ترقی کرتا جاتا تھا، احمد نے ناصر الدولہ تک رسائی حاصل کی، اور لڑکے کی ماں سے کہا کہ

---

[1] طبقات الاطبار جلد اوّل ص ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۹،

مین اس کا علاج کرون گا، اسی کے ساتھ ان غلطیوں کو بھی ظاہر کیا، جو اطبا نے طریق علاج مین کی تھین، چنانچہ لڑکے کی ماں کا اس کی طرف میلان ہوا، اور اس کے علاج سے اس کو شفا ہو گئی، اب وہ نوازش شاہانہ سے سرفراز ہوا، اور آخر عمر تک موصل مین مقیم رہا، کر ۳۰۰ھ مین وفات پائی، وہ اگرچہ طبی حیثیت سے بہت زیادہ مشہور نہین ہے، تاہم اس کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جالینوس کی تمام کتابون کی شرح لکھی، اور جالینوس کی سولہ کتابون کو ابواب و فصول مین تقسیم کیا، اس سے پہلے کسی نے اس قسم کی تقسیم نہین کی تھی، اس لئے جو لوگ جالینوس کی کتابون کا مطالعہ کرتے تھے، ان کو اس سے بڑا نفع حاصل ہوا، اور ان کو معلوم ہو گیا کہ اس کی کتابون کے مختلف حصے کن اغراض و مقاصد پر مشتمل ہین [1]،

محمد بن زکریا رازی کے بعد شیخ بو علی سینا ۳۷۰ھ مین پیدا ہوا، اور ۴۲۸ھ مین وفات پائی، اس نے طب و فلسفہ دونون مین یکسان شہرت حاصل کی، اگرچہ شیخ کے بیان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوس نے علم طب کو بذات خود حاصل کیا تھا، لیکن علامہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اس نے ایک عیسائی طبیب ابوسہل عیسیٰ بن یحییٰ مسیحی جرجانی سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی [2]، ابوسہل کے علاوہ، وہ اس زمانے کے ایک اور مشہور طبیب ابو منصور الحسن بن نوح القمری کے حلقۂ درس مین بھی شامل ہوا، اور اس سے طبی تعلیم حاصل کی [3]،

تاہم اس مین شبہہ نہیں کہ شیخ کی طبی مہارت اور طبی شہرت زیادہ تر کثرتِ مطالعہ کا نتیجہ ہے، چنانچہ ایک بار نوح بن منصور سامانی جو بخارا کا بادشاہ تھا، ایک ایسے مرض مین مبتلا ہوا، کہ تمام اطبار اوس کے علاج مین ناکامیاب رہے، لیکن کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے اطبا مین شیخ کو بھی شہرت حاصل ہو چکی تھی، اس لئے انھون نے نوح کے سامنے شیخ کا تذکرہ کیا، اور اس کے بلانے کی درخواست کی تو شیخ آکر ان اطبار کے ساتھ اس کے معالجہ مین شریک ہوا، اور اس کو شفا حاصل ہو گئی، اور اس تقریب سے

---

[1] طبقات الاطبار، جلد اول ص ۲۴۶ [2] ، ص ۳۲۲ [3] ، ص ۳۲۶،

اس کے متوسلین مین داخل ہوگیا، اور اسی سلسلے میں اس نے نوح کے کتب خانے مین داخل ہونے اور طبی کتابون کے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی اجازت چاہی، اتفاق سے کتب خانے مین آگ لگ گئی، اور تمام کتابین جل گئین، اب اس کتب خانہ کے علوم کا عالم صرف شیخ رہ گیا، اس بنا پر شیخ کے مخالفین کا خیال ہو کہ خود شیخ ہی نے اس کتب خانہ مین آگ لگا دی تاکہ ان علوم کو اپنی طرف منسوب کرلے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ ان علوم کا سب سے بڑا عالم ہے، بہرحال واقعہ جو کچھ بھی ہو، لیکن زکریا رازی کے بعد شیخ نے طب مین اس سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی، لیکن تاریخی حیثیت سے یہ واقعہ نہایت حیرت انگیز ہے، زکریا رازی کی طرح شیخ بھی کثیر التصنیفات ہے، لیکن اس کی کتابون کی جو فہرست تذکرون مین منقول ہے، اس مین زیادہ تر فلسفہ وحکمت کی کتابین ہین، طبی کتابین بہت کم ہین، اس کے بہ خلاف رازی کی کتابون کا حصہ زیادہ تر طبی تصنیفات پر مشتمل ہے، اور طب کے ہر موضوع پر اس نے رسالے اور کتابین لکھی ہین، اس کے ساتھ شیخ کو فلسفہ، طب اور دوسرے علوم کی تدوین اور ترتیب مین جو شہرت اور اہمیت حاصل ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس نے ان علوم مین بہت سے ایجادات واختراعات کئے ہین، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ان علوم کی تمام شاخون کو باقاعدہ منظم اور مرتب کر دیا، اور مبتدی، منتہی، اور متوسط ہر طبقہ کے لئے کتابین لکھدین، اس لئے اس کی کتابین نصاب تعلیم کا بہترین جزو ہوگئین، اور درس وتدریس کی وجہ سے اُن کی عام اشاعت ہوگئی، اور شیخ کی قانون مدتون یورپ کے بڑی بڑی طبی مدرسوں مین زیر درس رہی۔

شیخ کے ذاتی بیانات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی سرمایۂ افتخار فلسفہ تھا، فنِ طب نہ تھا وہ ایک معجب، خود پسند اور مغرور شخص تھا، اور بڑے بڑے اطبار وحکما، پر ذاتی حملے کیا کرتا تھا، لیکن اس کا یہ حملہ صرف ان کی فلسفہ دانی پر ہوتا تھا، ان کی طبی مہارت کا وہ بھی قائل تھا، زکریا رازی کی نسبت وہ کہا کرتا تھا، کہ وہ ایک مصنوعی اور طفیلی شخص ہے اس کا کام صرف بول وبراز کا

دیکھنا ہے، اس فقرے مین اوس نے اس کی طبی مہارت کا تو دبی زبان سے اعتراف کیا ہے، البتہ اس کی فلسفیانہ مہارت کا منکر ہے، اس لئے شہرزوری نے تاریخ الحکما مین اس قول کو نقل کرکے لکھا ہو کہ ابن سینا نے بالکل سچ کہا کیونکہ معالجاتِ طبیہ مین تو وہ ذروۂ کمال تک پہنچ گیا تھا، لیکن طب کے علاوہ اور علوم مین اوس نے صرف لغو باتین کہین،

شیخ کا ایک ممتاز معاصر ابوالفرج بن الطیب ایک عیسائی طبیب تھا، جو شفاخانہ عضدیہ میں طب کی تعلیم دیتا تھا، فنِ طب کے ساتھ فلسفہ مین بھی مہارت رکھتا تھا، اور ارسطو کی بہت سی فلسفیانہ کتابون کی شرح لکھی تھی، شیخ اس کی طبی تصنیفات کا تو مداح تھا، لیکن فلسفیانہ حیثیت سے اس کا قائل نہ تھا، ایک رسالہ خاص اس کی تردید مین لکھا تھا، اور اس مین اس کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ شیخ ابوالفرج بن الطیب کی طبی تصنیفات ہم کو ملین، اور ہم نے ان کو صحیح و پسندیدہ پایا، لیکن منطق وطبیعیات وغیرہ مین اس کی تصنیفات کی حالت بالکل برعکس نکلی،[۱] لیکن بہرحال شیخ کے زمانہ سے مسلمانون مین فن طب کی عام اشاعت ہوئی اور چھٹی اور ساتوین صدی ہجری تک بکثرت مسلمان اطبا پیدا ہوگئے جن کے حالات علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا مین تفصیل کے ساتھ لکھے ہین، لیکن ان مین دو شخص خاص طور پر اس لئے قابل ذکر ہین کہ انھون نے مفردو دواؤن کی تحقیقات مین موجودہ زمانہ کے طریقہ پر اپنی عمرین صرف کردین،

یونان مین جو اطبا پیدا ہوئے، ان مین ایک خاص طبیب دیسقوریدس تھا جس نے بہت سے شہرون کا سفر کرکے جنگلون، جزیرون اور سمندرون کی تمام جڑی بوٹیون، اور مفرد دواؤن کا سُراغ لگایا تھا، ان کی تصویرین لی تھین، اور اُن کے افعال و خواص پر ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام کتاب الحشائش تھا،[۲] جعفر متوکل کے عہدِ خلافت مین اصطفن بن بسیل نے یونانی زبان سے اس کا ایک

---

[۱] طبقات الاطبا جلد اول ص ۲۳۹ [۲] فہرست ابن ندیم ص ۲۹۳،

ناقص ترجمہ عربی زبان مین کیا، اور ایک مدت تک اطبار مفرد دواؤن کی تحقیقات مین اسی کتاب سے فائدہ اٹھاتے رہے، اس کے علاوہ یحییٰ بن خالد برمکی نے اپنے دورِ وزارت مین ایک شخص کو ہندوستان مین اس غرض سے روانہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کی جڑی بوٹیون کو خود ہندوستان سے لائے[۱] تاہم شیخ کے زمانے تک کسی مسلمان طبیب نے ادویہ مفردہ کی تحقیقات کی طرف خاص توجہ نہین کی تھی لیکن شیخ کے بعد رشید الدین صوری نے فن طب کی اس خاص شاخ مین نہایت امتیاز حاصل کیا، اور عمر بھر ادویۂ مفردہ کی تحقیقات کرتا رہا، وہ ۵۷۳ھ مین پیدا ہوا، اور ۶۳۹ھ مین وفات پائی، اس کی تحقیقات کا طریقہ یہ تھا کہ جن مقامات پر جڑی بوٹیان زیادہ پیدا ہوتی تھین، وہان خود جا کر اُن کو اپنی آنکھون سے دیکھتا تھا، ساتھ مین ایک مصور ہوتا تھا جس کے پاس مختلف قسم کے رنگ ہوتے تھے، وہ ان جڑی بوٹیون کو دیکھ کر مصور کو دکھاتا تھا، اور وہ اُن کے رنگ، پتی کی مقدار، شاخ، اور جڑ کو اچھی طرح دیکھ کر ان ہی کے مطابق ان کی تصویر کھینچتا تھا، صرف اسی پر قناعت نہین کرتا تھا، بلکہ مصور کو ان جڑی بوٹیون کو پہلے اُن کی ابتدائی نشو و نما کے زمانہ مین دکھاتا تھا، اور وہ ان کی تصویر کھینچ لیتا تھا، پھر جب اُن کی نشو و نما مکمل ہو جاتی تھی، اور ان مین تخم پیدا ہو جاتے تھے، تو مصور اس حالت کی الگ تصویر کھینچتا تھا، پھر جب وہ خشک ہو جاتی تھیں تو اس حالت کی تصویر الگ لی جاتی تھی، اس طرح ایک ہی جڑی بوٹی کی تحقیقات جن مختلف صورتون مین ممکن تھی، ہو جاتی تھی،

اُس نے ان تحقیقات کے نتائج کو ایک مستقل کتاب مین درج کیا تھا جس کو ملک المعظم عیسیٰ بن ابوبکر کے زمانہ مین اس کے نام پر لکھا تھا، اور اس مین نہایت استقصار کے ساتھ تمام مفرد دواؤن کے نام اور خواص لکھے تھے، اور بہت سی ایسی دواؤن کے نام کا بھی اضافہ کیا تھا جن کا ذکر قدما کی کتابون مین موجود نہ تھا، ایک اور کتاب بھی لکھی تھی جس مین ادویہ مفردہ کے متعلق تاج بلغاری کی کتاب کا رد کیا تھا[۲] (باقی)

---

[۱] فہرست ابن ندیم ص ۳۴۵ [۲] طبقات الاطبار جلد دوم از ص ۲۱۶ تا ۲۱۹،

اشرف علی فغان

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے

"سودا کے معاصر شعراء میں اشرف علی فغان مشہور اور بلند پایہ شاعر تھے، ان کے حالات اور کلام کا انتخاب تو نئے پرانے تمام تذکروں میں ملتا ہے، لیکن ان کا دیوان اب تک شائع نہیں ہوا تھا، اس کے قلمی نسخے بھی کمیاب تھے، ہمارے رفیق سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے نے بڑی تلاش و جستجو سے اس کے تین نسخے فراہم کر کے ان کی مدد سے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا تھا، اور فغان کے حالات اور ان کے کلام پر ایک مبسوط تبصرہ لکھا تھا، یہ دیوان انجمن ترقی اردو نے طبع کرایا تھا لیکن شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ دلی کے گذشتہ فساد میں انجمن ترقی اردو کے بیش قیمت کتب خانہ اور اس کے ذخیرۂ کتب کے ساتھ یہ دیوان بھی تلف ہو گیا، اور اب دوبارہ شاید ہی اس کی تصحیح کی نوبت آسکے۔ لائق مرتب نے مقدمہ میں حالات اور کلام پر تبصرہ کے ساتھ قلمی نسخوں کے متعلق بھی ضروری اور مفید معلومات لکھے تھے، یہ حصہ تو اصل کے ساتھ ضائع ہو گیا، لیکن فغان کے سوانح اور کلام پر تبصرہ کی ایک نقل اتفاق سے ان کے پاس رہ گئی تھی، اس کو بطور یادگار ناظرین معارف کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ "م"

ونسب مرزا اشرف علی خان نام اور فغان تخلص تھا، شاہ جہان آباد میں پیدا ہوئے، سنہ ولادت معلوم نہیں، مگر احمد شاہ کے رضاعی بھائی تھے، اس لئے اس کے سنہ ولادت سے ان کی پیدائش کی تاریخ بھی

متعین کی جا سکتی ہے، احمد شاہ کا سنہ پیدائش ۱۱۴۱ھ ہے، رضاعی بھائی ہونے کی حیثیت سے اشرف علی خان ایک یا زیادہ سے زیادہ دو سال بڑے ہوں گے، اس لئے ۱۱۳۹ھ سے ۱۱۴۱ھ تک کسی سال میں ان کی پیدائش ہوئی ہوگی،

والد کا نام مرزا علی خان نکتہ تھا[۱]، نکتہ شاید تخلص ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اشرف علی خان کے پدر بزرگوار بھی شاعر تھے، اُن کا خاندان دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے ممتاز تھا، اور تیموری دربار سے گہرا تعلق رکھتا تھا، ماں نے احمد شاہ کو دودھ پلایا، اس لئے خود کوکہ، کوکہ خان[۲]، کوکلتاش[۳] یا کوکلتاش خان بہادر[۴] کہلائے، چچا ایرج خان مرشد آباد میں شاہی ملازم شاید وہاں کے حاکم تھے[۵]،

تلمذ فغان کے تعلیمی حالات کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں، محمد حسین آزاد نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ابتدائے عمر میں شعر گوئی کا شوق ہوا، طبیعت ایسی مناسب واقع ہوئی تھی، کہ جبھی سے اس کام میں نام پیدا کیا[۶]، شاعری میں یہ شاید کئی استادوں سے مستفید ہوئے، ان کے دوست اور معاصر میر تقی میر نے لکھا ہے کہ وہ قزلباش خان امید کے شاگرد تھے[۷]، مصحفی[۸]، اور لطف[۹] نے ان کو ندیم کا شاگرد بتایا ہے، نساخ نے بھی اُن کو علی قلی خان ندیم ہی کا شاگرد بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ "بعضے صاحب تذکرہ نے جو اُن کو قزلباش خان امید کا شاگرد لکھا ہے، غلطی کی ہے"[۱۰]،

۱؎ گلشن ہند میرزا علی لطف مرتبہ مولانا شبلی و مولوی عبدالحق ص ۱۳۰ ۲؎ مخزن نکات مصنفہ شیخ محمد قیام الدین قائم ص ۴۴، انجمن ترقی اردو ۳؎ مجموعۂ نغز مصنفہ میر قدرت اللہ قاسم مرتبہ پروفیسر محمود شیرانی جلد دوم ص ۳، ۴؎ گلشن بے خار از مصطفٰے خان شیفتہ ص ۲۲۰ ۵؎ گلشن ہند ص ۱۳۰ ۶؎ آب حیات ۷؎ آب حیات از محمد حسین آزاد ص ۱۱۳ ۸؎ نکات الشعراء مؤلفہ میر تقی میر، مرتبہ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی ص ۸۰، ۹؎ تذکرۂ ہندی مؤلفہ غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب صفحہ ۱۶۰ ۱۰؎ گلشن ہند ص ۱۳۰ ۱۱؎ سخن شعراء مؤلفہ عبدالغفور خان نساخ نولکشور پریس ص ۳۶۹،

فغاں نے ندیم سے اپنے رشتۂ شاگردی کا اظہار جا بجا کیا ہے،

کیا فغاں سے پوچھتے ہو کون تھا حضرت ندیم ‏ پیر تھا، مرشد تھا، ہادی تھا، میرا استاد تھا

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں ‏ دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہو گیا

دشتِ جنوں میں کیوں نہ پھروں میں برہنہ پا ‏ اب تو فغاں ندیم مرا رہنما ہوا

کتنا کڑھی فغاں کی طرف سے ندیم کو ‏ اب دل تو جا چکا بھلا استاد کیا کروں[1]

مگر ایک قطعہ میں فغاں نے امید کا بھی نام لیا ہے،

شاہد حال ہے یہ مصرعِ امید فغاں ‏ کا ہیکو دیتے ہیں، مردم آگاہ غلط

اولِ عشق میں ناحق مجھے آخر کیا ‏ بعد آیا تو عبث فائدہ ما بعد غلط

اب مجھے و بوے اذیت تو سزا ہے میری ‏ کردہ این مرتبہ ہم بندۂ درگاہ غلط

اس قطعہ سے امید اور فغاں کے ذہنی تعلقات کی غمازی ہوتی ہے، مولانا عبدالحی نے گلِ رعنا[2] میں لکھا ہے کہ "ممکن ہے کہ پہلے امید سے اصلاح لیتے ہوں، پھر ندیم کے شاگرد ہوئے ہوں، یا فارسی میں اُن کے شاگرد ہوں" ممکن نہیں بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فغاں نے فارسی میں امید سے اصلاح لی، یہی نرائن شفیق کے تذکرۂ چمنستان شعرا میں ہے۔

---

[1] ندیم، نام مراد علی قلی خان تھا، وطن شاہجہان آباد تھا، دلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد آئے، اور نواب میر جعفر خان کی ملازمت میں داخل ہوئے، اسی کے عہد میں ان کا انتقال ہوا، پہلے مرثیہ و سلام کہا کرتے تھے لیکن پھر ریختہ کہنے لگے میر حسن نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

مردے بود بکمال قابلیت شعر فارسی و مرثیہ و ریختہ بخوبی می گفت۔

ان کے مختصر حالات تذکرۂ ہندی مجموعۂ نغز، گلزار ابراہیم اور تذکرۂ میر حسن میں ملیں گے،

[2] گلِ رعنا، ص

"در شعر فارسی اصلاح سخن از قزلباش خان امید می گرفته[۱]"

مختان نے اپنے تعلقات میں بیتاب ادہمت سے بھی نام مشہور کیا

سن کے اس مطلع بیتاب کو کہتا ہو مختان کھینچے تیغ میری جان کہ تیار ہوں میں

---

[۱] چمنستان شعرا صفحہ، قزلباش خان امید، اصلی نام مرزا محمد رضا تھا، ہمدان کے رہنے والے تھے، جوانی میں ترک وطن کرکے اصفہان آئے، اور میرزا طاہر وحید کے شاگرد ہوئے، اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندستان آئے، اور شاہی ملازمت میں داخل ہوکر بہادر شاہ کے وقت میں قزلباش خان خطاب اور ہزاری منصب پایا، چنانچہ خود کہتے ہیں،

مثل بلبل ہمیشہ نالانم این بود منصب ہزاری ما

معز الدین کے وقت میں کسی خدمت کی تقریب سے برہان پور گئے، اور جب امیر الامرا سید حسین دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا، تو یہ اس کے دامن دولت سے وابستہ ہوکر کرناٹک کے داروغہ ہوئے، یہاں بھی زمانہ نے ساتھ نہ دیا، تو حیدرآباد کے ناظم مبارز خان کی سرکار میں آکر ملازمت کی، جب نظام الملک آصفجاہ نے مبارز خان پر فتح پائی، تو یہ بھی قید ہوئے، مگر انھوں نے آصف جاہ کی خدمت میں ایک غزل پیش کی، جو آصف جاہ کو ایسی پسند آئی، کہ امید کو نہ صرف قید سے آزاد کیا، بلکہ کرناٹک کے علاقہ میں مرکب کی قلعہ داری مرحمت کی، کچھ دنوں کے بعد امید حج کرنے کو گئے، وہاں سے واپس ہوئے تو آصف جاہ کے مقرب خاص بن کر ۱۱۵۰ھ میں دہلی آئے، آصف جاہ جب مرہٹوں کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بھوپال گئے، تو امید بھی ہمرکاب تھے، نادر شاہ کے حملہ کے زمانہ میں آصف جاہ کو دہلی بلایا گیا، تو وہ بھی ساتھ آئے، پھر دلی کی محبت سے ایسے مغلوب ہوئے کہ بقیہ عمر یہیں گذاری اور ۱۱۵۹ھ میں انتقال کیا، آٹھ ہزار فارسی اشعار کا ایک دیوان چھوڑا، کبھی کبھی ریختہ بھی کہتے تھے، فن موسیقی کے بھی ماہر تھے، (مآثر الکرام دفتر ثانی مصنفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی ص ۲۱۰، گلزار ابراہیم انجمن ترقی اردو ص ۱۸، ۱۹، ۲۰)

قتل کریجے مجکو تو سزاوار ہون مین ہان میاں تشنۂ آب دم تلوار ہون مین[۵۱]
فل اٹھا مصرعہ حشمت کا فغاں زندان مین پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ[۵۲]

معلوم نہین فغاں نے ان دونوں کے نام محض تحسین کے جذبہ مین یا کسی فیض کے امتنان و تشکر مین لئے ہین،

---

۵۱ بیتاب : نام محمد اسمٰعیل، مصطفیٰ خان یکرنگ کے شاگرد تھے، گردیزی نے لکھا ہے، کہ "نکتہ سنج معنی یاب محمد اسمٰعیل بیتاب پایۂ سخنش بلند حرفش دلپسند است" بھی نرائن شفیق لکھتے ہین، کہ "سحاب گوہر پاش سخن دریاے مواج این فن است، خود را از تلامذہ مصطفیٰ خان یکرنگ می پندارد، و تلاش ہاے فراوان بالفاظ تازہ و مضامین نو می دارد"، ص ۵۰ گھوڑے سے گر کر ایسے زخمی ہوئے کہ پھر جانبر نہ ہو سکے،

۵۲ حشمت کا پورا شعر یہ ہے

نکہت گل نے جگایا کسے زندان کے بیچ پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

حشمت تخلص اور نام محتشم علی خان تھا، باپ کا نام میر باقی اور بڑے بھائی کا میر ولایت اللہ خان تھا، ان کا خاندان بدخشان سے ہندوستان آیا، نسباً سید تھے، لیکن پیشہ سپہگری کا تھا، دہلی مین مغل پورہ مین رہتے تھے، اپنے زمانہ کے ممتاز شاعر تھے، محمد شاہ کے عہد مین انتقال ہوا، گردیزی مین ہے، "سخنش دلپسند است و فکرش بلند، بکمال خوش خلقی، و فراخ حوصلگی زیست می کرد، ...... دیوانش فقیر سیر کردہ و چشمے آب دادہ حقا کہ در ان تلاش معنی تازہ کردہ، و الفاظ رنگین بروے کار آوردہ، احیاناً ریختہ می گفت" میر تقی میر ان کے بارے مین لکھتے ہین، کہ "شاعر خوب فارسی و ریختہ فہمیدہ سنجیدہ با ہمہ عجز و انکسار پیش می آید، چنے بود کہ در دل ہمہ کس جاے او خالیست...... بر فقیر شفقت و عنایت بسیار می کند...... گلشن ہند مین ہے، "از مشاہیر شعراے دہلی است، شعر فارسی را نیکو می گفت، و ترکیب بندے ریختہ از دے بسیار شہرت دارد، باعتبار اظہار دلسوختگی دل نشین مردم افتادہ است..... ارتحالش در زمان محمد شاہ فردوس آرام گاہ است"،

فغان کے حالاتِ زندگی | فغان بچپن سے جوانی کے عالم تک احمد شاہ کے ساتھ رہے، احمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد اس کے ندیم خاص ہوئے، احمد شاہ اُن کی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا بے حد مداح تھا، اس لئے ظریف الملک کوکہ خان بہادر کا خطاب عطا کیا[51] اشرف علی خان کی حیثیت محض لطیفہ گو کی نہ تھی، بلکہ وہ ایک معزز درباری امیر تھے، شیخ محمد قیام الدین قائم مخزن نکات (نوشتہ ۱۱۶۸ھ) میں لکھتے ہیں :-

"در زمان سلطنت مرزا احمد بمنصب پنجہزاری مفتخر و مباہی گشت"[52]

تذکرہ ریختہ گویان مؤلفہ سید فتح علی حسینی گردیزی (نوشتہ ۱۱۶۶ھ) میں ہے،

"اشرف علی فغان تخلص از عمدۂ منصب داران عہد سعادت میداشت"[53]

اس کی تصدیق میر تقی میر کے بیان سے بھی ہوتی ہے،

"فغان تخلص کوکۂ بادشاہ احمد شاہ، داخل ذیل نیمچۂ امرایان است"[54]

لچھمی نرائن شفیق نے چمنستان شعراء (نوشتہ ۱۱۷۵ھ) میں لکھا ہے :-

"از امرایان درگاہ احمد شاہ بادشاہ بود"[55]

میر قدرت اللہ قاسم نے بھی انھیں "بسیار عمدہ معاش"[56] اور شیفتہ نے "از اہل ثروت بودہ" لکھا ہے[57] مگر اشرف علی فغان کو امارت و ثروت کی بہار زیادہ دنوں تک دیکھنا نصیب نہ ہوا، ان کی زندگی کا زمانہ وہ تھا، جب شاہجہان آباد پر مصیبت و الم کی گھٹائیں برس رہی تھیں، محمد شاہ کے

---

۵۱ گلشن ہند ص ۱۳۰، ۵۲ مخزن نکات ص ۴۲، ۵۳ تذکرہ ریختہ گویان مؤلفہ سید فتح علی حسینی گردیزی مرتبہ مولوی عبد الحق صاحب انجمن ترقی اردو، ص ۱۲۱ ۵۴ نکات الشعراء مؤلفہ میر تقی میر، مرتبہ حبیب الرحمن خان شیروانی ص ۸، ۵۵ چمنستان شعراء، انجمن ترقی اردو، ص ۴۸۲ ۵۶ مجموعہ نغز ۵۷ گلشن بے خار ص ۲۲۰، مطبوعہ اردو اخبار پریس، دہلی،

ہد کی طوائف الملوکی اور خانہ جنگی مرہٹون کی سرکشی اور شورہ پشتی اور نادر شاہ کی غارت گری اور ز ریزی سے تیموری حکومت کی بنیادین کھوکھلی پڑ گئی تھیں، اکبر اور عالمگیر کی پرجلال اور پرشوکت لطنت کا زوال اپنے عروج پر تھا، محمد شاہ کے بعد احمد شاہ تخت پر ضرور بیٹھا لیکن وہ محض اپنے جداد کی سلطنت کی پامالی اور بیخ کنی کے مناظر دیکھنے کو بیٹھا تھا، سلطنت مین ایک لوٹ مچی ہوئی تھی، نادر شاہ کے بعد احمد شاہ دُرانی کی نظرین ہندوستان جنت نشان پر لگی ہوئی تھیں، وہ تیموری سلطنت کے چراغ سحری کو اپنی طوفانی فوجون کے تند جھونکون سے بجھا دینا چاہتا تھا، مگر قدرت نے یہ انجام اس کے ہاتھوں سے نہ لکھا تھا، وہ آیا اور چلا گیا، تیموریوں میں درانیوں کے حملوں کو روکنے کی تاب نہ تھی، اس لئے ملتان اور لاہور کے دو صوبے دے کر احمد شاہ نے تھوڑے دنوں کے لئے اپنے کو بچا لیا، لیکن تنہا درانیون کے حملے ہی کی مصیبت نہ تھی، دُرانی جانے بھی نہ پائے تھی کہ رُہیلون اور مرہٹون کی معاندانہ کارروائیوں سے سلطنت کا شیرازہ اور بکھر گیا، خود دربار مین امرائے و اعیان سلطنت مین اتفاق نہ تھا، ان کی ریشہ دوانیون سے رہی سہی قوت بالکل جاتی رہی، بادشاہ بے جان اور عمائد حکومت کے ہاتھون مجبور تھا، آخر کار ۱۱۶۷ھ مین احمد شاہ تخت سے اتار کر قید خانہ مین بٹھا دیا گیا اور دوسرا بے بس اور لاچار بادشاہ عالمگیر ثانی کے لقب سے زینت تخت و تاج بنایا گیا،

ان ہنگامون مین احمد شاہ کے درباری، امیر، ندیم خاص اور رضاعی بھائی اشرف علی خان فغان کو بھلا کہان چین نصیب ہو سکتا تھا، دربار قتل و خون کا مرکز اور شاہجہان آباد کی گلیاں ماتم کدہ بنی ہوئی تھین، دولت اور عزت دونوں کی غارتگری ہو رہی تھی، فغان دلی کی بربادی نہ دیکھ سکے اور وہان سے چل کھڑے ہوئے،

یہ کہنا مشکل ہے کہ احمد شاہ کی معزولی کے فوراً ہی بعد یا کچھ دنون رہکر فغان نے دلی چھوڑی، لیکن قیاس کہتا ہے کہ احمد شاہ کی معزولی اور قید کے بعد دہلی چھوڑ دی، فغان کے معاصر مصحفی اپنے

...ین لکھتے ہین کہ

"مدایکہ بسبب تفرقہ شاہ از شاہجہان آباد بہ آمنہ طرف پورب گذرانگند"[51]

تفرقہ شاہ سے احمد شاہ کی قید ہی مراد ہو گی، لیکن مجموعہ نغز (نوشتہ ۱۲۲۱ھ) مین ہے:-

"بنا بر افراط و تفریطے کہ در ہنگامہ آرائی افاغنہ ابدالی بحضرت دہلی رو داد بہ یار شرقیہ

شتافتہ، رحل اقامت انداخت"[52]

شاید اسی استناد پر محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ جب احمد شاہ دُرانی کے حملون نے ہندستان

... و بالا کر دیا اور دلی مین دربار میں طور بے طور دیکھا، تو فغان دہلی چھوڑ کر باہر چلے گئے، یہی بات

...رعنا میں بھی کہی گئی ہے، لیکن جب ہم احمد شاہ دُرانی کے حملون کی تاریخون کو پیش نظر رکھتے ہین

...ن بیانات مین کچھ الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے، احمد شاہ درانی کا پہلا حملہ محمد شاہ کے زمانہ مین ۱۱۶۰ھ

...بق ۱۷۴۷ء مین ہوا، دوسرا احمد شاہ کے زمانہ مین ۱۱۶۱ھ (مطابق ۱۷۴۸ء) مین ہوا، اس حملہ مین

...ور کے قریب مغل اور دُرّانی متصادم ہوئے، لیکن احمد شاہ نے ملتان اور لاہور کے دو صوبے دیکر

... دہ کی احمد شاہ کے زمانے مین دُرانیون کا پھر کوئی حملہ نہ ہوا، وہ ۱۱۷۲ھ (مطابق ۱۷۵۹ء)

... ہندوستان پھر آئے، اور مرہٹون کی قوت پر ایسی کاری ضرب لگائی، کہ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت

...نہ سنبھل سکی، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ فغان نے درانیوں کے حملہ کی طوائف الملوکی مین دہلی چھوڑی

...ھون نے یا تو ۱۱۶۱ھ یا ۱۱۷۲ھ کے بعد دہلی چھوڑی ہو گی، اگر ۱۱۶۱ھ کے بعد وطن ترک کیا تو گویا

...ز دلی کے پانچ برس بعد تک وہین قیام پذیر ہے، جس کو یقین کرنا ذرا مشکل ہے، چنانچہ مصحفی کا یہ

...ن کہ فغان نے احمد شاہ کی قید کے بعد دہلی چھوڑی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اتفاق سے فغان نے

...نے دیوان مین ایک جگہ خود اس کے متعلق اشارہ کیا ہے، دہلی چھوڑنے کے بعد وہ اپنا دردناک حال لکھتے ہین

---

[51] تذکرہ ہندی مؤلفہ غلام ہمدانی مصحفی انجمن ترقی اردو ص۱۰۲، [52] مجموعہ نغز حصہ دوم ص ۲،،

لکھے شرح غم گر دلِ دردناک
تو اپنی زبان کلک کرتی ہے چاک

میرے شعلۂ آہ پر کر نگاہ
بہاتی ہے چشموں سے اشکِ سیاہ

نپٹ سخت ہے ماجرا درد کا
دلِ سرد کا اور رُخِ زرد کا

بیاں سے بجا ہے کہ خاموش ہوں
کسی سے نہ یہ راز اپنا کہوں

ولیکن چھپانا اسے بے حجاب
کہ یہ راز روشن ہے جوں آفتاب

سنو اے عزیزاں حکایت کے تئیں
گرفتارِ غم کی روایت کے تئیں

اور یہ حکایت فغاں کے محبوب آقا اور رضاعی بھائی احمد شاہ کی ہے جس سے اُن کی محبت عشق کے درجہ تک پہنچ گئی تھی،

جہاں میں مرا ایک دلدار تھا
اوسی سے مجھے تو سروکار تھا

نہ کچھ کام تھا مجکو گلزار سے
نہ واقف تھا ہرگز گل وخار سے

نہ سمجھوں تھا بلبل کے فریاد کو
نہ جانوں تھا میں جورِ صیاد کو

نہ معلوم تھا مجکو فرہاد بھی
سنا تھا نہ میں قیس ناشاد بھی

اگر ان کا کچھ درد پاتا تھا میں
تو کا ہے کو خاطر میں لاتا تھا میں

مجھے دردمندوں سے کیا کام تھا
سدا وصل کے بیچ آرام تھا

جب اس بار پر دھیان کرتا تھا میں
تو یوسف کو قربان کرتا تھا میں

اسی کو میں کہتا تھا ہے ماہتاب
وہی تھا میرا انجم آفتاب

میں پوجوں تھا مانند اس صنم کے تئیں
نہ سجدہ کروں تھا حرم کے تئیں

وہی ماہ تھا، اور وہی شاہ تھا
غرض کچھ ہی تھا میرا اللہ تھا

شاہ مذکور سے فغاں کے اختلاط و محبت کی شدت ملاحظہ ہو،

سدا سیر تھے مجکو گلزار کے — کہیں طبع خوش ہو میرے یار کے

اگر اتفاقاً وہ نازک مزاج — چلے تھے وہاں سے تو میں لاعلاج

یہ کہتا تھا اور دستم گار کے — نہ چھوڑا اس فرے میں تو گلزار کو

ارے دیکھ خوش چشم نرگس کا حال — کہ حیرت سے رہ گئی ہے آنکھیں نکال

ارے اے مری جان اس وقت میں — ارے تیرے قربان اس وقت میں

ترا ہنس کے کہنا میں گھر جاؤنگا — مرا رو کے کہنا میں مر جاؤنگا

یہی مجھ میں اس میں تھا راز و نیاز — کوئی اس میں محمود کوئی ایاز

مگر یہ ساری نشاط انگیزیاں اس وقت کافور ہوگئیں جب کہ

فلک نے یکایک ستم یہ کیا — دلِ شاد کو داغِ حرماں دیا

شاید اس سے احمد شاہ کی معزولی ہی مراد ہے، اس کے بعد فغاں کا کیا حال ہوا، وہ خود ہی لکھتے ہیں :-

نہ پہنچا کوئی وہاں میری داد کو — چلا تب تو میں مرشدآباد کو

آخری شعر سے صاف ظاہر ہے کہ دہلی سے نکلنے کے بعد فغاں مرشدآباد گئے، مگر مصحفی رقمطراز ہیں :

"درایامیکہ بسبب تفرقہ شاہ از شاہجہان آباد برآمد، بہ طرف پورب گذرانید و معرفت میر محمد نعیم خان کہ ہم مکتب ایشان بود بہ ملازمت نواب شجاع الدولہ بہادر رسیدہ یکے از مقربان گردانید"[1]

فغاں کے مذکورۂ بالا شعر کے بعد یہ کیونکر یقین کیا جاسکتا ہے، کہ وہ دہلی سے نکلے، تو سیدھے نواب شجاع الدولہ کے یہاں پہنچے، نواب موصوف اپنے باپ صفدر جنگ کے جانشین ۱۱۶۷ھ ہجری یعنی احمد شاہ کی معزولی کے سال میں ہوئے ظاہر ہے کہ فغاں کی حمیت نے یہ گوارا نہ کیا ہوگا، کہ اپنے شفیق اور جان نثار

۱؎ تذکرہ ہندی ص ۱۶۰

رضاعی بھائی کے قید خانہ جاتے ہی وہ ایک دوسرے فرمانروا کی آستان بوسی کے لئے پہنچ جاتے، اس بے بسی کے عالم میں دہلی کو چھوڑا ہوگا، تو بزرگوں کے پاس مرشد آباد چلے گئے ہوں گے، اس زمانہ میں دہلی اور اودھ کے بعد شاعری کی بزم عظیم آباد اور مرشد آباد میں جمتی تھی، مگر مرشد آباد میں زمانہ نے فغان کا ساتھ نہ دیا، وہ وہاں سے واپس ہوئے، تذکرۂ گلشن ہند میں ہے کہ وہ پھر شاہجہان آباد آئے،" اس کی اصل عبارت ملاحظہ ہو،

"دلی سے مرشد آباد میں اپنے چچا کے پاس کہ محمد ایرج خان کرکے مشہور تھے، وارد ہوئے لیکن نہ رہے، اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر شاہجہان آباد چلے گئے، بعد کئی برس کے عظیم آباد میں آئے اور بود و باش کے وہاں ٹھہرائے"[۱]

اس واپسی کے بعد معلوم نہیں ان کا قیام دہلی میں کتنے دنوں رہا، صاحب گلشن ہند کے "کئی برس" کی مدت میں درانیوں کے آخری حملہ (۱۱۷۵ھ) کا سال شامل کر لیا جائے، تو میر قدرت اللہ قاسم اور ان کے ہم نوا مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا عبدالحی کا یہ بیان کہ درانیوں نے جب دلی کو تہ و بالا کر دیا تو فغان نے پریشان ہو کر دلی کو خیر آباد کہا صحیح ہو سکتا ہے مگر نواب علی حسن خان نے اپنی صبح گلشن میں معلوم نہیں، کس سند پر لکھا ہے کہ فغان ۱۱۷۱ھ میں عظیم آباد پہنچ گئے تھے، ان کی اصلی عبارت ملاحظہ ہو،

"ہمینکہ از وطن برید و در او دھ رسید، رفاقت نواب وزیر شجاع الدولہ بہادر گزید مگر آخر سا زمخالفت کوک نگر دید پس از آنجا در سنہ سبعین و مائتہ و الف صوب عظیم آباد رسید"[۲]

اگر ہم اس تاریخ کو صحیح مان لیں تو یہ قیاس غلط ہوگا، کہ فغان جب دوسری بار شاہجہان آباد واپس آئے، تو پھر درانیوں کے آخری حملہ ۱۱۷۱ء کے بعد نکلے، اور اگر غلط سمجھیں، تو پھر بہت ممکن ہے کہ انھوں نے دوسری بار درانیوں کے حملہ کے بعد ہی دہلی چھوڑی،

---

[۱] گلشن ہند ص ۱۳۱ [۲] ایضاً صفحہ ۱۳۰،

بہرحال دوسری بار دہلی سے نکلنے کے بعد فغاں نواب شجاع الدولہ کے دربار میں پہنچے، صاحب گلشن ہند نے ان کے نواب موصوف کے یہاں پہنچنے کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے، شاید اختصار سے کام لیا ہے، مصطفیٰ علی خان کے یہاں تو یہ اختصار اور بھی بڑھ جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"ازین (یعنی شاہجہان آباد سے) نقل وحرکت کردہ بہ عظیم آباد سکونت اختیار کردہ" [۵۱]

مخزنِ نکات میں شیخ قائم کا بیان اور بھی ژولیدہ ہے،

"درایں ایام چہ دارالامان ہندوستان گردسیہ آفات وشاہراہ بتاب است بپاس آبروئے خویش بنگالہ گزید وہمانجا رخت اقامت انداخت" [۵۲]

مگر فغان کا اودھ پہنچنا اور نواب شجاع الدولہ کی ملازمت سے منسلک ہونا یقینی ہے، نواب موصوف نے ان کو نہایت اعزاز وکرام سے اپنے یہاں رکھا، اور اُن سے بہت زیادہ بے تکلف ہو گئے، ایک روز اسی بے تکلفی میں انھون نے گرم پیسے سے ان کا ہاتھ جلا دیا، فغان کو نواب کا یہ مذاق پسند نہ آیا، اور اُن کی صحبت سے کنارہ کش ہو گئے،

مصحفی لکھتے ہیں :-

"درہمان نزدے روزے نواب وزیر دستش را در عالم اختلاط بہ فلس سوختند، آب در دیدہ گردانید، وہیچ نگفت، وآخر بہمیں حرکت آزردہ شدہ بہ طرف عظیم آباد رفت، [۵۳]

مگر محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ ایک دن اختلاط میں ان کا کپڑا نواب صاحب کے ہاتھ سے جل گیا، اور رنجیدہ ہو کر عظیم آباد چلے گئے، وہاں جا کر انھوں نے زیادہ عزت پائی، [۵۴] کپڑا سے جلنے کی روایت کسی تذکرہ میں میری نظر سے نہیں گذری، مولانا عبد الحی بھی گل رعنا میں آزاد کے اس بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ معلوم نہیں، کپڑا سے جلنے کی روایت کہاں سے لی ہے، مصحفی نے ہاتھ جلنے کا ذکر

---

۵۱ گلشن بہار ص ۲۲۰ ۵۲ مخزنِ نکات ص ۴۲ ۵۳ تذکرہ ہندی ۵۴ آب حیات ص ۱۱۴

کیا ہے، اور یہی صحیح ہے[۵۱]

فغاں فیض آباد سے چلے تو عظیم آباد پہنچے، یہاں راجہ شتاب رائے کا دربار علمی قدردانی اور فیاضی کے لئے مشہور تھا، شتاب رائے نے فغاں کو اپنے یہاں بلا کر اپنے دربار کی زینت بڑھائی، صبح گلشن میں ہے :-

"راجہ شتاب رائے ناظم صوبہ بہار با وصاف شے بر وہ بنا دمت خودش کشید"[۵۲]

شتاب رائے مغلیہ حکمرانوں کا نمک خوار تھا، اس نے جذبہ وفاداری میں اپنے ایک آقا کے رضاعی بھائی کی وہ پوری تعظیم و تکریم کی، جس کے فغاں مستحق تھے، اس کے علاوہ خود بہت ہی علم پرور اور ہنر دوست تھا، فغاں کے کمال ذاتی، شیریں کلامی، اور علم مجلسی کے سبب نہایت عزیز رکھنے لگا،

نواب علی حسن خان صاحب اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ یہیں فغاں کو راجہ شتاب رائے کی وساطت سے شاہ عالم کی طرف سے ظریف الملک کا خطاب ملا :-

"راجہ شتاب رائے .... از حضور شاہ عالم بادشاہ خطاب ظریف الملکی وچند دیہ بطریق التمغا بوی دہانید، از ان زمان اشرف علی خان عظیم آباد را توطن برگزید"[۵۳]

نواب صاحب کو لکھتے وقت شاید غلط فہمی ہوئی، کیونکہ اوپر ہم مستند اور معاصر تذکرہ نویسوں کے بیانات پڑھ چکے ہیں کہ یہ خطاب احمد شاہ نے دیا،

بعض تذکروں میں ہے کہ راجہ شتاب رائے کی قدردانی میں فغاں نے باقی عمر خوشحالی سے بسر کی، لیکن محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد فغاں کے تعلقات راجہ صاحب سے قائم نہ رہے، اس کی بنیاد یہ ہوئی کہ احمد شاہ دُرّانی نے سلطنت پر حملے کئے، ایک دن اس کی دست درازی اور بے اعتدالیوں کا ذکر ہو رہا تھا، خدا جانے طنز سے یا سادہ مزاجی سے راجہ صاحب نے کہا کہ نواب صاحب

---

۵۱ گل رعنا ص ۸۰، ۵۲ صبح گلشن ص ۳۱۰، ۵۳ ایضاً ص ۳۱۰،

ملکۂ زمانی کو احمد شاہ درّانی کیوں کر لے گیا، انھیں یہ بات ناگوار ہوئی، افسردہ ہو کر بولے کہ جس طرح سیتا جی کو راون لے گیا تھا، اسی طرح وہ لے گیا، اس دن سے دربار میں جانا چھوڑ دیا، [51] آزاد کو معلوم نہیں یہ روایت کہاں سے ملی ہے، اس کے بعد آزاد کا بیان ہے کہ فغان نے حکام فرنگ سے یہاں رسائی پیدا کی، اور ان کے فیض سے باقی عمر فارغ البالی اور خوش حالی میں گذاری، اس کی تائید مجموعۂ نغز کی مندرجۂ ذیل عبارت سے ہوتی ہے،

"و بحسن سلیقہ کہ داشت بسران فرنگ درساخت و درہمان نواح رشتۂ زندگانی وے در گسست و بجوار رحمت حق در پیوست" [52]

گلشن ہند اور سخن شعراء میں فغان کا سنہ وفات ۱۱۸۶ھ لکھا ہے، مگر گلشن بیخار میں ۱۱۹۶ھ درج ہے لیکن یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، آب حیات، اور گل رعنا میں ۱۱۸۶ھ ہی ہے، عظیم آباد میں مدفون ہیں، مدفن کی جگہ معلوم نہ ہو سکی،

فغان کا مذہب | فغاں مذہباً شیعہ تھے، دیوان کا آغاز حضرت علیؑ کی مدح سے کیا ہے، اس کے بعد حضرت امام موسیٰ رضا کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے، اس میں بھی حضرت علیؓ سے اپنی محبت کا اظہار جا بجا کیا ہے، مثلاً

پہنچا یو تو خاک فغاں کی وہاں صبا مشہد ہے جس طرف کو میرے بوتراب کا
مہر علی ہے دل میں نہ کر خوف روز حشر توشے چلا ہے ساتھ فغاں زادراہ کا

مگر فغاں ہر ملت کے لوگوں سے یکساں تعلقات رکھتے تھے، میر اپنی خودداری کے باوجود جو نخوت و غرور کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، اُن کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے، وہ لکھتے ہیں :-

"بندہ بخدمت او بسیار مربوطم" [53]

---

۵۱ آب حیات ص ۱۱۵ ۵۲ مجموعۂ نغز ص ۲، حصہ دوم ۵۳ نکات الشعراء ص ۸،

میر کا فغاں سے گہرا ارتباط رکھنا ان کے اخلاق و ملنساری کی واضح دلیل ہے، علی ابراہیم نے بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے، کہ

" با راقم اتم ربطے داشت"[51]

میر حسن بھی لکھتے ہیں کہ

"خوش اختلاط بود با ہر کس خوش طبعی داشت"[52]

ظرافت طبیعت | ان کے ملنے والے ان کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی سے بہت لطف اٹھاتے تھے، اور ان کے مشہور تذکرہ گلشنِ ہند کے مصنف کا بیان ہے، کہ

"آٹھ پہر ان کو خوش طبعی اور خوش اختلاطی سے کام تھا، کوکے تھے احمد شاہ بادشاہ کے، مربی گری ظرافت کی ندیم تھے جہاں پناہ کے، چنانچہ ظریف الملک کوکے خاں بہادر حضور سے بادشاہ کا خطاب پایا تھا، اور مرتبہ کو شوخی کے ساتھ لطیفہ سنجی کے بہت دور پہنچایا تھا"[53]

میر صاحب بھی رقم طراز ہیں کہ

"طبع او مائل لطیفہ بسیار است چنانچہ ناگر مل را کہ دیوان تن و دخیل بادشاہ یگھی کی منڈی کا ساند گفتہ ہر کہ دیدہ دیدہ باشد فہمیدہ باشد و حکیم معصوم را در دربار مطلے گا و گجراتی نام کردہ، ہر کہ حکیم صاحب را بیند داند"[54]

تمام تذکرہ نویسوں نے ان کی ظرافت اور خوش طبعی کا ذکر کیا ہے، سید فتح علی حسینی گردیزی لکھتے ہیں کہ

"وضع ظریفانہ دارد"[55]

چمنستانِ شعراء میں ہے :-

---

[51] تذکرہ گلزار ابراہیم ص ۱۰۴ [52] تذکرہ میر حسن ص ۱۴۲ [53] گلشنِ ہند ص ۴۰ [54] نکات الشعراء ص ۸۱ [55] تذکرہ

"و اکثر گاہ چمنستان قلوب را از نسیم لطیفہ گوئی و ظرافت مطراۃ می نمود"[۵۱]

میر حسن کا بیان ہے کہ

"از ہنگامہ آرایان زمان و ظرفائے دوران خوش طبع و شیرین بیان اشرف علی خان المتخلص بہ فغان کوکۂ احمد شاہ بادشاہ غفران پناہ خان ظریف طبع و خوش اختلاط بود، با ہر کس خوش طبعی داشت، شاعر مربوط بطور خود لطائف و ظرائف او مشہور است"[۵۲]

مجموعۂ نغز میں ہے،

"نہایت یار باش و خیلے ظریف الطبع لطیف مزاج سراسر سرور، سر بسر ابتہاج بود"[۵۳]

نساخ نے بھی سخن شعرا میں لکھا ہے کہ "بڑے ظریف تھے"[۵۴] محمد حسین آزاد نے گل افشانی کی ہے کہ "ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تیزی اور طراری کو اُن کے مزاج سے وہ لگاؤ تھا، جو بارود اور حرارت کو . . . . لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی زبان میں ایسی تھی جیسی تلوار میں جوہر" اس کے بعد ایک لطیفہ نقل کیا ہے، جو اگرچہ بہت مشہور ہے، لیکن محض ناظرین کے تفنن طبع کے لئے آزاد ہی کی زبان میں ہم اس کو سناتے ہیں، فغان نے ایک دن راجہ نتاب رائے کے دربار میں ایک غزل پڑھی جس کا قافیہ تھا لالیان، جالیان، سب سخن فہموں نے بہت تعریف کی، راجہ صاحب کی صحبت میں جگنو میاں ایک مسخرے تھے، اُن کی زبان سے نکلا کہ نواب صاحب! سب قافیئے باندھے، مگر تالیان رہ گئین انھون نے ٹال دیا، اور کچھ جواب نہ دیا، راجہ صاحب نے خود فرمایا کہ نواب صاحب سنتے ہو؟ جگنو میان کیا کہتے ہین؟ انھون نے کہا کہ مہاراج اس قافیہ کو مبتذل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، اور حضور فرمائین تو اب بھی ہو سکتا ہے، مہاراج نے کہا ہان کچھ کہنا تو چاہئے، انھون نے اسی وقت پڑھا،

جگنو میان کی دم جو چمکتی ہے رات کو ۔۔۔ سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہین تالیان

---

۵۱ چمنستان شعرا، از لچھمی نرائن شفیق ص ۱۸۴ ۵۲ تذکرہ میر حسن ص ۱۲۲ ۵۳ مجموعۂ نغز ۲/۶۹ ۵۴ سخن شعرا ص ۳۶۹

تمام دربار چمک اٹھا اور میاں جگنو مدھم ہو کر رہ گئے[1]

نواب علی حسن خان نے بھی اپنے تذکرہ صبحِ گلشن ین فغان کی بذلہ سنجی کی تعریف ان الفاظ ین کی ہے :-

" بسکہ فراجش مزاح وظرافت رامی پسندید، از کلام طیبت انگیز احدی از اعالی واسافل نمی رنجید گویندہر گاہ، مکانش برفعت ووسعت معمور مرتب گردید، وبزم نشاط چید"[2]

اس بزم نشاط کا ایک لطیفہ نواب صاحب موصوف نے بھی نقل کیا ہے، جو ذرا غیر سنجیدہ ہے اس لئے ہم اس کو نظر انداز کر دیتے ہین،

(باقی)

---

[1] آب حیات صفحہ ۱۵۱، [2] صبحِ گلشن، صفحہ ۳۱۹،

اعلان

اب تک ہم نے باوجود مشکلات کے مطبوعات دار المصنفین اور معارف کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہین کیا تھا، اور دار المصنفین کی قدیم وضعداری کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن کنٹرول پیپر کی کمیابی اور بیرونی کاغذ کی غیر معمولی گرانی کے باعث اب معارف کی قیمت مین اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے، اس لئے جنوری ۱۹۴۸ء سے معارف کی سالانہ قیمت بجاے ۵ر کے ۶ر کر دی گئی ہے، غیر مستطیع طلبہ اور قومی انجمنون کے لئے رعایتی قیمت ۵ر سے کم نہ ہوگی، امید ہے کہ دار المصنفین کے ہمدردون اور معارف کے قدردانون پر یہ خفیف اضافہ گران نہ ہو گا، اور وہ آیندہ کا وی پی وصول کرتے وقت اس اضافہ کو یاد رکھین گے،

منیجر معارف

فتاویٰ عالمگیری

اور

اس کے چند اور مؤلفین

از جناب مولوی مجیب اللہ صاحب رفیق دارالمصنفین

(۳)

اخلاق و عادات | شاہ صاحب اخلاق و عادات میں اسلاف کی یادگار تھے، مزاج میں سادگی اور طبیعت میں صفائی اور بے تکلفی تھی، نشست و برخاست، گفتگو و ملاقات، تعزیت و تہنیت، لین دین، خرید و فروخت، تواضع و خاکساری، امداد و اعانت غرض اپنی زندگی کے ہر کام میں وہ نمونۂ عمل تھے اور ان کا کوئی کام حکمت، اداے سنت یا خدمت خلق کے جذبہ سے خالی نہیں ہوتا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ

کار عاقلاں و حکیماں آنست کہ استیفاے لذت فقط مقصود نباشد بلکہ باید کر آن در ضمن دفع حاجتے یا اقامت فضیلتے، یا اداے سنت واقع شود۔ (انفاس ص۵۳)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر | کسی شخص کو سنت یا تعامل کے خلاف کوئی کام کرتے دیکھتے تھے تو بڑی نرمی اور شفقت سے منع کرتے تھے، انفاس میں ہے:

اگر نصیحت میخواستند بنہایت رفق ولین اوا مینمودند (ص۵۳)

جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کی نصیحت لوگوں پر بہت جلد اثر انداز ہو جاتی تھی۔

آپ کے ایک ملنے والے کو جو علم و فضل سے بھی بہرہ ور تھے، فضول گوئی کی عادت تھی، شاہ صاحب نے ایک دن ان سے بڑی شفقت سے فرمایا، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت و تعلق چاہتے

ہو تو اس عادت کو ترک کردو، ورنہ اس دربار سے فیض نہیں پہنچ سکتا، آپ کی یہ بات ان کے دل میں گھر کر گئی، اور انھوں نے وہ عادت چھوڑ دی،

اگر کسی کو نیک بات کی تلقین کرتے تو اس میں ملائمت کے ساتھ ساتھ مخاطب کی صلاحیت کو بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

امر معروف و نہی منکر و مسائل خصوصہ بشرط ظن قبول بر نفق ولین میکردند، ص۵۹

عام فائدہ کے لیے جمعہ کے دن وعظ بھی فرمایا کرتے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس میں اجنہ بھی شرکت کرتے تھے[1]، زیادہ تر مشکوٰۃ، تنبیہ الغافلین، غنیۃ الطالبین اور آخر میں تفسیر وعظ کا معمول تھا[2]،

آپکے احباب ملنے آتے تو رخصت کرتے وقت ان کے سامنے یہ شعر بطور وصیت پڑھا کرتے تھے

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف است — با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

خانہ داری کی ضروری خرید و فروخت خود کرتے، باوجود تنگی کے زندگی بھر کبھی قرض نہیں لیا اور تعیش و تنعم کے لیے جو لوگ قرض لیتے تھے ان کو بیحد ناپسند کرتے تھے، اور اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے[3]

کھانے پینے میں مشتبہات سے بھی گریز کرتے تھے، ایک مرتبہ رمضان میں ان کے استاذ مرزا زاہد نے ان کی دعوت کی، اتفاق سے اسی وقت ایک کبابی آیا، اسے مرزا صاحب سے کچھ کام تھا جس کے لیے اس نے کباب کا ایک خوان بطور نذر کے پیش کیا، مرزا صاحب قبول نہیں کرتے تھے لیکن جب اس نے بہت اصرار کیا تو ایک شاگرد سے کہا کہ قیمت لگا کر اسے رکھ لو، شاگرد نے کئی روپے کے کبابوں کی قیمت کم لگائی اور کبابی راضی ہو گیا، شاہ صاحب نے مرزا صاحب سے آہستہ سے کہا کہ آپ رشوت سے بچنا چاہتے ہیں مگر کئی روپے کے کباب کم میں دے دینا علت سے خالی نہیں ہے، اگر غرض نہ ہوتی تو وہ کبھی راضی نہ ہوتا،

---

[1] انفاس ص۵۰، [2] انفاس رحیمیہ ص۳۹ [3] انفاس ص۸۶،

شاہ صاحب کے اس کہنے پر مرزا صاحب نے شاگرد کو بلوا کر ڈانٹا، اور کتابوں کی پوری قیمت دلوائی[۵۱]
اس کے بعد ان کتابوں سے افطار کیا، شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کے اخلاق وعادات کے متعلق
جستہ جستہ بہت کچھ لکھا ہے، ایک جگہ جامع طور پر لکھتے ہیں:۔

حضرت ایشان باخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت وفراست وکفایت وغیرت بحدّ
اتم متصف بودند عقل معاش مثل عقل معاد کامل ووافر داشتند ودر ہر امر توسط دوست
می داشتند، (انفاس ص۵۰)،

شاہی دربار اور امراء سے احتراز | شاہ صاحب امراء اور سلاطین سے ہمیشہ محترز رہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے
کہ "والد صاحب نے امراء کے پاس جانے اور ان سے ملاقات کرنے کی رسم بالکل اٹھا دی تھی، لیکن اگر ان میں سے
خود کوئی آجاتا تھا تو اس سے وہ کج خلقی بھی نہیں برتتے تھے، بلکہ اعزاز واکرام سے پیش آتے تھے اور اگر وہ
نصیحت کی خواہش کرتے تھے تو نہایت ہی رفق وتلطف سے دو چار کلمہ خیر کہہ دیا کرتے تھے۔" (انفاس ص۵۰)

اوپر ذکر آچکا ہے کہ فتاویٰ کی تالیف کے سلسلہ میں شاہی ملازمت کو کس کشمکش کے بعد قبول کیا
تھا، اور جب اس سے تعلق منقطع ہوا تو کس قدر مسرور ہوئے اور شکرانہ ادا کیا، اس کے بعد جب شاہ عالمگیر
نے زمین دینی چاہی تو اسے بھی قبول نہیں کیا،

عالمگیر ہی کا ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے ماننے والوں میں ایک صاحب عالمگیر کے
درباری تھے، انھوں نے کسی موقع سے اس کے سامنے شاہ صاحب کے فضائل ومناقب کا ذکر کیا، عالمگیر
نے ان سے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا، انھوں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ

بخانۂ ملوک واغنیاء رفتن طریقہ ایشان نیست، (انفاس ص۶۹)

عالمگیر نے شاہ صاحب کے ایک دوسرے مخلص کے ذریعہ ملاقات کا پیغام بھیجا، لیکن شاہ صاحب

---

[۵۱] انفاس ص۳۳

نے اسے بھی قبول نہیں کیا، ہر چند انھوں نے بہت اصرار کیا، مگر شاہ صاحب کسی طرح راضی نہ ہوئے، جب وہ بالکل مایوس ہو گئے تو شاہ صاحب سے عرض کیا کم از کم آپ ایک رقعہ ہی لکھ دیجئے، تاکہ کوتاہی نہ سمجھی جائے، شاہ صاحب نے ایک کاغذ جس میں آپ کا جوتہ لپٹا ہوا رکھا تھا، لیا اور اس پر یہ عبارت لکھکر بادشاہ کے پاس بھیج دی:

"اجماع اہل اللہ است برآنکہ بئس الفقیر علیٰ باب الامیر وحق سبحانہ میفرماید

وما متاع الحیوۃ الدنیا الا قلیل جز قلیل شمار سید و اگر بالفرض بن خواہید داد جزء

لا یتجزیٰ خواہد بود برائے ایں جزء لا یتجزیٰ نام خود را از دیوان خدائے تعالیٰ چرا برآرم زیرا

در بعض ملفوظات بزرگان چشتیہ مذکور است کہ ہر کہ نام او در دیوان بادشاہ نوشتہ شد

نام او از دیوان حق سبحانہ برمی آید"[۱]

یہ خط اس بادشاہ کو لکھا گیا ہے جو شاہان تیموریہ میں سب سے زیادہ دیندار اور مذہب کا دلدادہ تھا، اور جس کے ذریعہ "فتاویٰ عالمگیری" جیسا دینی اور اہم کام انجام پایا تھا، اسی طرح ایک مرتبہ عالمگیر کے پوتے عظیم الشان نے ملاقات کی خواہش کی اور شاہ صاحب کے پاس لکھا کہ "اگر آپ خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے تو اس بہانہ سے مجھے بھی شرف نیاز حاصل ہو جاتا" شاہ صاحب نے جواب میں لکھ بھیجا کہ

ان اللہ لا ینظر الیٰ صورکم واعمالکم	"اللہ تعالیٰ صورت اور اعمال کی طرف نہیں دیکھتا،
وانما ینظر الیٰ قلوبکم ونیاتکم	اسکی نگاہ قلوب اور نیتوں پر پڑتی ہے" میں
بامثال ایں امور فریفتہ نمی شوم	اس قسم کی چیزوں پر فریفتہ نہیں ہوتا،

شاہ صاحب کے زمانہ ۱۰۵۵ھ تا ۱۱۳۱ھ میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات ہوئے اور کئی

---

[۱] انفاس العارفین صفحہ ۷۹، شاہ صاحب کے مکتوبات میں بھی یہ خط کچھ تغیر الفاظ کے ساتھ موجود ہے،

سلاطین بدلے جنھوں نے دعا و برکت کے بہانے شاہ صاحب کی حمایت و ہمدردی حاصل کرنے کی کو
کی مگر آپ نے ہمیشہ گریز کیا اور ان معاملات سے بہت کم دلچسپی لی،

جب معز الدین جہاندار شاہ پر فرخ سیر نے چڑھائی کی تو معز الدین نے دعاے فتح کیلئے شا
کی خدمت میں آنا چاہا لیکن آپ نے اپنے درباری احباب کے ذریعہ یہ کہلا کر اسے روک دیا کہ

"اس کا آنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ اگر سچ بولوں گا تو وہ ناخوش ہوگا اور
اگر جھوٹ بولوں تو فقیروں کا یہ شیوہ نہیں ہے"[1]

اسی طرح فرخ سیر اور سادات بارہہ میں جب ان بن ہوئی تو شاہ صاحب کے سامنے بھی یہ حکم
پیش ہوا، آپ نے صرف اتنا فرمایا کہ "برائے من ایں را ہم چنیں بگذارید" یعنی میری خاطر اس بادشاہ (فرخ
کو اسکے حال میں چھوڑ دو! چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب کا بیان ہے کہ " والد صاحب جب تک زندہ ر
فرخ سیر کی پر کوئی آنچ نہیں آئی لیکن ان کی وفات کے پچاس ہی دن کے بعد فرخ سیر کی بساط
الٹ دی گئی اور وہ قید کر لیا گیا،[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو شاہ صاحب فرخ سیر کو کسی حد تک پسند کرتے تھے یا اس کے
فتنہ و فساد ملک میں شروع ہونے والا تھا اسے اپنی زندگی میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے،

عبادت اور ذکر و اشغال | ذکر و فکر طاعت و عبادت صلاح و تقویٰ کے اعتبار سے شاہ صاحب کی
نمونہ تھی، انھوں نے فرائض کے علاوہ نوافل و مستحبات میں بھی اپنا جو معمول بنا لیا تھا، ان پر ہمیشہ مد
رہے، اور عذر شرعی کے علاوہ انھیں کبھی ترک نہیں کیا، ان کی زندگی کا اصول تھا کہ الاستقا
خیر من الکرامۃ" (احکام الٰہی پر) استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے،" انھوں نے شی
جیو کو ایک خط میں لکھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے پانچ چیزیں[3] عطا کی ہیں، تم بھی ان پر قائم رہو، ا

---

[1] انفاس ص۲۶. [2] ایضاً [3] وہ پانچ چیزیں یہ ہیں الذکر والتقوی علی کل حال، والیصال النف
(باقی حاشیہ صفحہ ۴۳ پر)

ت یہ ہے کہ الذکر والتقویٰ علی کل حال یعنی ہر حال میں ذکر و تقویٰ پر استقامت، اسلیے آپکی ندگی کا کوئی لمحہ ذکر و تقویٰ پر استقامت سے خالی نہیں تھا، ذیل کے واقعات سے اس کا اندازہ ہو سکیگا۔

ہمیشہ نماز با جماعت پڑھتے تھے، عذر شرعی کے علاوہ کبھی اسے ترک نہیں کیا، نماز کی پابندی کا ال یہ تھا کہ جس شب آپ کا انتقال ہوا تو نفس بازپسیں سے کچھ دیر پہلے دریافت کیا صبح صادق ہوئی نہیں؟ حاضرین نے نفی میں جواب دیا، آپنے فرمایا کہ میرا رخ قبلہ کی طرف کردو، لوگوں نے اس کی تعمیل ی اور آپ نے اشارہ سے نماز ادا کی، اسی طرح وفات سے چند مہینہ پہلے رمضان کا مہینہ آگیا، آپ تقاضاے عمر اور ملالت کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے، اور آپکے لیے شرعی رخصت بھی موجود تھی لیکن آپنے س سے فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا اور پورے روزے رکھے، آپ کی اہل خانہ نے افطار کے لیے اصرار کیا تو رمایا کہ "بس یہی تو ہوتا ہے کہ کمزوری کی وجہ سے بیہوش ہو جاتا ہوں تو یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے، بیہوش رہنے کا تو عادی ہو چکا ہوں[۵]، شاہ صاحب کے خاص خاص معمولات یہ تھے:

تہجد، اشراق اور چاشت کا خاص اہتمام تھا، لیکن تہجد میں رکعتوں کی تعیین نہیں تھی، بلکہ حضور ہن اور نشاط کے ساتھ جتنی رکعتیں ہو جاتی تھیں پڑھ لیا کرتے تھے، نماز مغرب کے بعد دو رکعت نفل والدین ور اپنے بڑے بھائی کے ایصال ثواب کے لیے پڑھتے تھے،

تلاوت قرآن روزانہ کا معمول تھا اور اسے بڑی خوش الحانی، سوز و گداز اور تجوید کے ساتھ پڑھتے تھے، دن میں ایک ہزار بار درود شریف اور ایک ہزار بار نفی و اثبات، بارہ ہزار مرتبہ اسم ذات ا ورد کرتے تھے، اور گیارہ بار سورہ مزمل اور گیارہ سو بار یا مغنی غنا ظاہری کے لیے پڑھتے تھے، درود

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳) من غیر تفرقۃ وعدم تفضیل نفسہ علی احد من الخلق والتواضع لامر اللہ و لخلق اللہ، الت میں ذکر و تقویٰ (مومن و کافر حیوان و انسان) کی تفریق کے بغیر مخلوق کی نفع رسانی اور اپنے نفس کو افضل نہ سمجھنا، اور خدا کے حکم کے جھکنا اور اسکی مخلوق سے تواضع کے ساتھ پیش آنا[۵] انفاس العارفین اور انفاس رحیمیہ،

سے خاص عشق تھا، فرمایا کرتے تھے کہ

ہرچہ یافتیم بدولت درود و توجہ مجرد یافتیم ؛ (انفاس ص۸۰)

حکیمانہ مقولے | شاہ صاحب کے ملفوظات اور مکتوبات میں سیکڑوں حکیمانہ جواہر پارے بکھرے ہوئے ہیں، ہم ان میں سے چند فقرے، جن کا تعلق معاملات سے ہے نقل کرتے ہیں، آداب مجلس کے متعلق فرماتے تھے کہ

در مجلس ہرگز نکوہش قومی مکن مگو کہ	عام مجلس میں کسی خاص قوم کو ملامت نہ کرو،
اہل پورب چنین اند و اہل پنجاب چنیں	یہ نہ کہو کہ اہل پورب ایسے ہیں اور اہل پنجاب
و افغانان چنیں، شاید دراں میاں مردے	ویسے ہیں اور افغان اس طرح کے ہیں، ممکن ہے
باشد از آن قوم یا از اہل حمیت آں قوم بہ	کہ اس قوم کا کوئی عام آدمی یا کوئی اہل غیرت شخص
بر دو صحبت منغص شود	موجود ہو اور وہ برا مانے اور مجلس میں بے لطفی پیدا ہو،

ایک مرتبہ فرمایا کہ

ہرگز سخنے مخالف جمہور در مجلس عام بزبان	جو بات جمہور کے خلاف ہو اسے ہرگز مجلس عام
میار اگرچہ فی نفسہ صحیح باشد کہ ایشان برآں انکار	میں نہ کہو اگرچہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو کیونکہ لوگ
کنند و صحبت منغص شود	رد و قدح کرینگے اور مجلس میں تکدر پیدا ہوگا،

فرمایا کہ

در مجلس عام برکسے رد صریح مکن	مجلس عام میں کسی شخص کی کھلم کھلا تردید نہ کرو

فرمایا کہ

اگر آنانکہ منزلت ایشان از منزلت تو فرود	جو لوگ تم سے کم مرتبہ کے ہیں وہ اگر پہلے سلام
تراست ابتدا بسلام کنند آنرا نعمتی از نعم	کریں تو اس کو خدا کی نعمت سمجھو اور اس پہ

الٰہی شناس و شکر آن بجا آرود روے	اس کا شکر ادا کرو، اور ان سے خندہ پیشانی
ایشان منبسط شو و تفقد حال ایشان کن	کے ساتھ پیش آؤ اور ان کی مزاج پرسی کرو،
بسا می باشد ادنیٰ التفاتے کہ نزدیک	اسلیے کہ بسا اوقات ایک ادنیٰ التفات جسکی
تو ہیچ قدر ندارد در چشم ایشان عظیم نماید	تمھارے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہے، ان کے
..... واگر آن را نیابند محزوں شوند	نزدیک اسکی بڑی عظمت ہوتی ہے، ..... اور اگر

[illegible]

فرمایا کہ

اگر ترا با کسے حاجتے باشد بر وتمہید	اگر تم کو کسی سے کوئی ضرورت پیش آجائے تو
شایستہ کن و تدریج نما در طلب آں حاجت،	عمدہ پیرایہ اور تدریجی طور سے انکا اظہار کرو
و نباید کہ سخن مثل سنگ اندازی	یہ نہ ہو کہ بات پتھر کی طرح مار دو،

والدین کی خدمت کے بارے میں فرمایا لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل کام ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت آسان ہے، اس لیے کہ

ایشان با دنیٰ خاطر جوئی رضامند میشوند	والدین تھوڑی سی دلجوئی سے بھی راضی ہو جاتے
واندکے را بسبب غایت شفقت بسیاری	ہیں اور غلبہ شفقت کی وجہ سے تھوڑی سی
شمرند	خدمت کو بھی بہت سمجھتے ہیں۔
در مخاطبہ بزرگان سخن مغلق و موجز	بڑوں سے گفتگو کرنے میں مغلق، مختصر اور آہستہ
و آہستہ گفتن روا نیست	بات نہیں کرنا چاہیے،
در سخن گفتن و راہ رفتن و نشستن و برخاستن	بات چیت کرنے، راستہ چلنے اور نشست و برخاست
برسم اقویا و عادت ایشان کار کن اگرچہ ضعیف	میں قوی لوگوں کی عادت اختیار کرو، خواہ
باشی،	ضعیف ہی کیوں نہ ہو،

وضع اور لباس کے متعلق فرماتے ہیں:

باید کہ لباس وزی مرد مشعر باشد	آدمی کا لباس اور اسکی وضع ایسی ہونی چاہیے
بصفت کمال وی مثلاً کسے کہ دانشمند	کہ اس سے اس کے صفت کمال کا پتہ چل جائے،
است باید لباس دانشمنداں پوشد	مثلاً اگر کوئی فقیہ یا فلسفی ہے تو اسکو انھیں جیسا
بہ آئین ایشان زندگانی کند و آنکہ	لباس پہنا چاہیے اور انھیں جیسی زندگی گذارنی
فقیر است باید لباس فقیراں پوشد	چاہیے، اگر کوئی درویش ہو تو اسے اہل فقر ہی جیسا
وبہ آئین ایشان زندگانی کند	لباس اور انھیں جیسا رہن سہن اختیار کرنا چاہیے؛

اولاد | شاہ صاحب کی دو شادیاں ہوئی تھیں، پہلی زوجہ کے متعلق یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کسکی صاحبزادی اور کس خاندان سے تھیں، ان کے بطن سے ایک صاحبزادے صلاح الدین پیدا ہوئے، جب شاہ صاحب کا سن ساٹھ برس کا ہوا تو بعض غیبی بشارتوں[1] کی بنا پر انھوں نے دوسری شادی شیخ محمد[2] پھلتی کی صاحبزادی سے کی، ان نیک بخت خاتون[3] کے بطن سے دو صاحبزادے شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ[4] پیدا ہوئے، اور

---

[1] اس غیبی بشارت کا تذکرہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ انفاس العارفین میں دو جگہ کیا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں: "بر ایشان منکشف ساختند تقدیر بران جاری شدہ کہ ایشان را فرزند دیگر موجود آید ۔ ...... و آن مولود بفلان و فلان مقام خواہد رسید داعیہ تزوج بخاطر ایشان پیدا شد" ص ۳۶؛ دوسری جگہ خود شاہ عبدالرحیم صاحب کی زبانی فرماتے ہیں: "میفرمودند دیگر بار بزیارت مرقد منور ایشان (بختیار کاکی) رفتم روح ایشان ظاہر شد فرمودند ترا پسرے پیدا خواہد شد او را قطب الدین احمد نام کن ...... بعد از زمانے داعیہ تزوج دیگر پیدا شد" ص ۴۴)

[2] شیخ محمد کے اجداد سدھور (بہار) کے رہنے والے تھے، ان کے اجداد میں شیخ احمد نے سکندر لودی کے دربار میں رسوخ حاصل کیا، جس سے ان کو پھلت کے قریب کچھ زمین مل گئی اور وہ سدھور سے پھلت آگئے، یہ خاندان دنیاوی وجاہت کے ساتھ ساتھ علم و فضل میں بھی ممتاز تھا، خود شیخ محمد بڑے برگزیدہ اور مرتاض بزرگوں میں تھے،

[3] شاہ ولی اللہ صاحب کی والدہ ایک رابعہ صفت اور مریم فطرت خاتون تھیں، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انکی نسبت توجہ کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے بیس عورتوں کو بیک وقت توجہ دی، (ص ۷۲)، ان کی عبادت و ریاضت کے اور بھی واقعات انفاس العارفین میں ہیں،

[4] شاہ اہل اللہ بھی علم و فضل اور تصوف میں خاندانی روایات کے حامل تھے، انھوں نے شاہ عبدالرحیم صاحب کے مکتوبات کو انفاس رحیمیہ کے نام سے جمع کیا ہے، کتاب کے شروع میں چند سطریں انھوں نے بھی اخلاقیات پر لکھی ہیں، جن سے انکی عظمت اور ولایت کا پتہ چلتا ہے،

ہندوستان میں اسلامی علوم و عرفان کے سرچشمہ بنے ۔

ملا ابوالواعظ ہرگامی | ملا ابوالواعظ مولانا فضل حق خیرآبادی کے پردادا بھائی تھے ، ان کا سلسلۂ نسب بارہویں پشت پر شاہ عبدالرحیم صاحب سے مل جاتا ہے ، اور یہ حسن اتفاق ہے کہ اس خانوادے کے یہ دونوں گوہر شب چراغ فتاویٰ کی تالیف میں شریک تھے ،

نام و نسب | ابوالواعظ نام یا کنیت تھی ، ان کے والد کا نام قاضی صدرالدین تھا ، ناںہالی سلسلۂ نسب کا تو علم نہیں ہو سکا ، دادیہالی شجرہ حضرت فاروق اعظمؓ تک منتہی ہوتا ہے ، پورا شجرہ یہ ہے :۔

ابوالواعظ بن قاضی صدرالدین بن قاضی اسمٰعیل ہرگامی بن قاضی عمادالدین بدایونی بن شیخ ارزانی بن شیخ منور بن خطیرالملک بن شیخ سالار شام بن شیخ وجیہ الملک بن شیخ بہاءالدین بن شیرالملک شیرالملک کے اوپر ایک دو نام میں اختلاف[1] کے علاوہ پورا شجرہ وہی ہے جو شاہ عبدالرحیم صاحب کے حالات میں درج ہو چکا ہے ، شیرالملک کے دو صاحبزادے شمس الدین اور بہاءالدین تھے ، اور دونوں صاحب علم و فضل اور صاحب وجاہت تھے ، اور دونوں ساتھ ہی ہندوستان آئے[2] ۔

شیخ شمس الدین رہتک کے قاضی ہوئے اور وہیں مقیم ہو گئے ، اور شیخ بہاءالدین بدایوں کے قاضی ہوئے اور وہیں متوطن ہو گئے ، ان کی اولاد میں شیخ عمادالدین کی شادی قاضی ہرگام (سیتاپور) کی صاحبزادی سے ہوئی ، قاضی صاحب کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی ، اس لیے ان کے بعد قاضی عمادالدین ہی ہرگام کے قاضی مقرر ہوئے ، اور اس سلسلہ سے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ، ان کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی اسمٰعیل نے عہدۂ قضا سنبھالا ، ان کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی صدرالدین یعنی ملا ابوالواعظ کے والد نے ان کی جانشینی کی ، قاضی صدرالدین کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں

---

[1] باغی ہندوستان میں ملا ابوالواعظ کا جو شجرہ درج ہے اس میں شیرالملک کے اوپر دو ایک نام شاہ ولی اللہ صاحب کے انفاس العارفین میں دیے ہوئے شجرہ سے مختلف ہیں [2] باغی ہندوستان ص ۱۳ ۔

تھیں، صاحبزادیوں کی شادی گوپامئو اور لاہرپور وغیرہ میں ہوئی تھی، صاحبزادوں میں ایک ملا عبد اللہ ہیں جن کی اولاد میں کئی متبحر اور ممتاز عالم گذرے ہیں، مولانا فضل حق خیرآبادی بھی انہی کی اولاد میں تھے، دوسرے صاحبزادے ملا ابو الواعظ ہیں، جنھوں نے غالباً عہدۂ قضا کے بجائے درس و تدریس کو اپنا مشغلہ بنایا،

ملا ابو الواعظ اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں تھے اور عالمگیر کے اتالیق بھی رہ چکے تھے، مگر عام تذکروں میں ان کے حالات نہیں ملتے، مولانا فضل حق خیرآبادی کے والد مولانا فضل امام صاحب (متوفی سنہ ۱۲۴۴ھ) نے اپنی کتاب آمد نامہ[1] میں قصبہ ہرگام کے علماء کے کچھ حالات لکھے ہیں، جس کے کچھ اقتباس ایک کرم فرما کے ذریعہ مل گئے ہیں[2] اسی سے ان کے حالات لکھے جاتے ہیں۔

درس و تدریس | ملا ابو الواعظ کا محبوب مشغلہ درس و تدریس تھا، ان کے درس میں دور دور سے طلبہ و علماء آکر شریک ہوتے تھے، مولانا فضل امام صاحب نے لکھا ہے کہ

> ملا محب اللہ بہاری صاحب سلم ملا ابو الواعظ سے درس لینے کے لیے گئے تھے مگر ان کا کوئی وقت خالی نہیں تھا، اس لیے مایوس ہو کر ملا قطب الدین سہالوی کے پاس گئے اور اس چشمۂ علم سے اپنی علمی تشنگی بجھائی،

یہاں ایک دوسرا واقعہ ملا قطب الدین سہالوی کا درج ہے کہ

> ملا قطب الدین سہالوی ملا ابو الواعظ کے پاس علمی بحث و مباحثہ کی غرض سے ہرگام پہنچے لیکن ملا ابو الواعظ نے اس سے گریز کیا اور ان سے فرمایا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں،

---

[1] یہ کتاب کچھ فارسی قواعد اور چند علماء کے حالات پر مشتمل ہے، قصبہ ہرگام میں یہ کتاب قلمی موجود ہے، اس کے کچھ اقتباس سید نجم الحسن صاحب نے بھیجے ہیں، یہ حالات انھیں سے ماخوذ ہیں [2] گو یہ اقتباس ہرگام سے سید نجم الحسن صاحب نے بھیجا ہے مگر اس کا اصل ذریعہ جناب عبد الشاہد خان صاحب شیروانی مترجم الثورۃ الہندیہ ہیں جنھوں نے اصرار کر کے اسے بھجوایا۔

تم نوجوان ہو، اگر مباحثہ میں مجھ پر کوئی کوئی اعتراض وارد ہوا جس کا میں جواب نہ دے سکا

تو میرے مرنے کے دن قریب آئے، درس و تدریس تک کا ہوش نہیں، اس لیے مجھے کوئی

ندامت نہیں ہوگی اور نہ دوسروں کا کوئی نقصان ہوگا، لیکن اگر آپکے ساتھ یہ بات پیش

آجائے گی تو پھر طلبہ کے دل سے آپ کا وقار جاتا رہے گا، اور جو آپ کی ذات سے دوسروں

کو فیض پہنچ رہا ہے وہ ختم ہو جائے گا،

ملا قطب الدین نے عرض کیا کہ

مرا داعیہ تلمذ است نہ داعیہ برابری، اگر استفادہ خواہم کرد کتاب درمیان خواہم نہاد

اس کے بعد کئی روز تک دونوں بزرگوں کی پرخلوص صحبت رہی،

ملا ابوالواعظ عالمگیر کے استاذ بھی رہ چکے تھے، آدرنامہ میں ہے

از استاذان عالمگیر بادشاہ اند،

وفات آپنے ہرگام ہی میں پوری زندگی بسر کی اور وہیں وفات پائی، تاریخ وفات اور اولاد

و اخلاف کی تصریح نہیں مل سکی،

علم و فضل مولانا فضل امام صاحب ان کے علم و فضل کے متعلق لکھتے ہیں،

ملا ابوالواعظ ہرگامی از اساطین علماء و اراکین فضلاء بودہ در جمیع علوم دستگاہ

بلند و قدرتے تمام داشت،

ملا ابوالواعظ کو باطنی ذوق سے بھی حصہ ملا تھا، آدرنامہ میں ہے،

خوارق عادات و کمالات باطنی ملا بسیار نقل کنند،

علمی یادگاریں انھوں نے بہت سی علمی یادگاریں چھوڑی ہیں، ان میں ہدایہ مطول اور ملا جلال کے

حواشی خاص اہمیت رکھتے ہیں، ملا جلال کے حواشی کے متعلق مولانا فضل امام صاحب لکھتے ہیں کہ

دیدہ ام بغایت متین نوشتہ بودند واز اں حاشیہ مبلغ علم ما معلوم می شد،

ایک رسالہ جملۂ خبریہ کے متعلق بھی لکھا تھا، اس کے متعلق مولانا فضل امام صاحب فرماتے ہیں

الحق نہایت خوب است مرتبہ متین است،

لیکن زمانہ کی دستبرد سے ان کی اکثر کتابیں ضائع ہوگئیں، مولانا فضل امام صاحب ان کتابوں کے ناپید ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

دریں ولا از کتب ملا نشانے یافتہ نمی شود اطارت بہا العقام غاب بہا العقل

فتاوی میں شرکت | ان سب کے علاوہ ملا ابوالواعظ کا سب سے بڑا کارنامہ اور ان کی قیمتی یادگار فتاوی عالمگیری کی تالیف میں شرکت ہے، آمدنامہ میں ہے،

در تالیف فتاوی عالمگیری شرکت داشتند،

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس حصہ کی تالیف ان کے سپرد تھی اور نہ یہ پتہ چل سکا کہ وہ کسی معاون کی حیثیت سے کام کر رہے تھے یا وہ خود کسی حصہ کے ذمہ دار تھے،

ہندوستان مین علم حدیث

(بطریق تالیف علوم حدیث)

از

مولوی ابویحیٰی امام خان صاحب نوشہروی

(۳)

مشارق الانوار کی ترتیب | جامع مشارق نے اپنی تحقیق کے مطابق اس مین صرف صحیحین کی حدیثین جمع کین، اور ترتیب فقہی کے بجائے حروفِ ہجا کی ترتیب پر مدون کیا، مثلاً مترجم مولانا خرم علی فرماتے ہین

"جن حدیثون کے سرے پر حرف مَنْ ہے، اول باب مین لایا اور ان کی حدیثون کو دوسرے باب مین اور جن پر حرفِ لا ہے، ان کو تیسرے باب مین، اور باوجود اس کے پھر حرفِ تہجی کی رعایت ہے خلاصہ یہ کہ اس مین ترتیب معنوی نہین، ترتیب لفظی ہے"[۱]

الجھن یہ رہ جاتی ہے کہ باعتبار حرف ہجا پہلے حرفِ الف کی احادیث ہونا تھین، نہ وہ کہ جن کا پہلا حرف میم ہے، فرماتے ہیں،

"لیکن جامع رحمہ اللہ نے باب اول مین لفظ مَنْ کو مقصود نہین رکھا، بلکہ مَنْ کے بعد جو لفظ آئے گا جس کے شروع مین الف ہو، چنانچہ پہلی حدیث ہے :-

خ ابوھریرۃ مَنْ آمَنَ باللّٰہ ورسُولہٖ" الخ[۲]

---

[۱] مقدمہ مشارق الانوار ا ر مولانا خرم علی بلھوری ص ۲ از سطر ۳ [۲] تحفۃ الاخیار ص ۲، باب اول،

"اور دوسری حدیث؛

"زید بن خالد الجھنی من آوی ضالۃ فھو ضال مالم یعرفھا"

پہلی حدیث میں مَنْ کے بعد لفظ آمن کا اور دوسری حدیث میں لفظ آوی کا اعتبار کیا گیا ہے،

اور مولانا خرم نے جو یہ فرمایا کہ "باوجود اس کے ... تہجی کی رعایت ہے، جیسے لغت کی کتابوں میں ہوتی ہے"، تو واقعی اس کا التزام تمام کتاب میں اسی طرح ہے، جیسا کہ حدیث نمبر ۱۰۲ کے بعد سے کہ الف ممدودہ کے بعد الف مقصورہ آتا ہے،

اور یہ جو مولانا خرم علی نے فرمایا کہ "اس میں ترتیب معنوی نہیں، ترتیب لفظی ہے الخ" یعنی

"تیسرے یہ کہ مصنف بعض حدیث کو ٹکڑے کرکے اپنی ترتیب کے موافق چند مقام پر لایا ہے، اور یہ کام عالم عارف کو درست ہے، بشرطیکہ معنی میں خلل نہ پڑے، چنانچہ مصنف نے ایسا ہی کیا"

اور یہ کیفیت مشارق کے مطالعہ سے نظر آئے گی،

مؤلف کی تبویب کے مطابق مشارق ۱۲ ابواب پر منقسم ہے، گیارہواں باب صرف احادیث قدسیہ میں ہے، جس کی ترتیب از سر نو باعتبار بجا رکھی گئی ہے،

ان احادیث قدسیہ کی تعداد ۲۶ ہے، بخاری کی (۸) مسلم کی (۱۴) اور متفق فی الصحیحین (۴) ہیں گویا صحیحین میں صرف ۴ احادیث قدسیہ ہیں،

چودہواں اور آخری باب "فی جوامع الادعیہ" ہے، اس میں نواسی دعائیں ہیں،

یہ بھی ندرت ہے کہ آنحضرت صلوات اللہ علیہ نے جن احادیث میں لفظ والذی نفسی بیدہ یا والذی نفس محمد بیدہ سے قسم فرمائی، امام صغانی نے صحیحین سے ایسی تمام حدیثیں یکجا کر دی ہیں،

۵- الفوائد علی مشارق الانوار، مولانا خرم علی بلہوری م ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء مترجم مشارق الانوار

اوله:- الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد سید المرسلین وعلیٰ

آلہ واصحابہ اجمعین" (ص ۱) جو تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار سے اس طرح ملحق ہے کہ ص ۱ سے ۲ تک مقدمہ ہے، ہر ایک حدیث کے بعد متن ہی میں اس کا ترجمہ اور ترجمہ سے ملا ہوا فائدہ بہ علامت ف ہے۔ مقدمہ میں مولانا خرم علی صاحب ہندوستان میں علوم حدیث کی بے بسی پر فرماتے ہیں،

"ہندوستان میں اس علم حدیث کا چرچا نہیں، عوام تو کیا ذکر ہے، اکثر علماء کو خبر نہیں، اس واسطے نہایت مناسب معلوم ہوا کہ کسی حدیث کی کتاب کا ترجمہ عام فہم اردو زبان میں کیجئے، سو سب کتابوں سے مشارق الانوار حسن صغانی کی نہایت پسند آئی، اس واسطے کہ مختصر کتاب ہے، اور اس کی احادیث کی صحت پر اتفاق ہے کوئی اس کی ایسی حدیث نہیں، جو غیر معتبر ہو بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر جنس کی روایت ہے صحیح بھی ہے اور ضعیف بھی،

الحمد للہ کہ بارہ سو انچاس ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں حسب دلخواہ ترجمہ ہوا، اور تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار اس کا نام مقرر کیا، حق تعالیٰ اپنے کرم سے اس کتاب کو مقبول کرے اور اہل اسلام کو فائدہ بخشے اور بھول چوک کو معاف فرمائے، آمین" (ص ۲)

مقدمہ کے بعد "فصل اصطلاحات حدیث میں" ہے، مرتب مشارق (امام حسن) نے صرف صحیحین کی روایات ضبط فرمائی ہیں، مولانا خرم علی نے بھی محدثین میں صرف شیخین (امام مسلم و امام بخاری) کے ضروری سوانح پر اکتفا کیا ہے اور صفحہ (۵) سے صاحب مشارق الانوار (امام حسن) کا سراپا ہے، جو اس انداز سے بیان ہوا ہے کہ سرخیل مصنفین نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) نے بھی اتحاف النبلاء المتقنین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین جیسی نقید المثال کتاب میں صغانی کا ترجمہ اسی مقام سے مستنبط فرمایا[1]، اور آخر مقدمہ میں تحریض علی العمل بالحدیث کے چند اشعار ہیں۔

---

[1] اتحاف النبلاء ص ۲۴۲ فی ترجمہ امام حسن الصغانی اللاہوری،

کیا تجھ سے کہوں حدیث کیا ہے! دروازۂ درج مصطفیٰ ہے!

نمونۂ فوائد اس حدیث کے ضمن مین بلاحظہ فرمایئے،

ابو هريرة من آمن بالله ورسوله وأقام الصلوٰة وصام رمضان كان حقا على الله ان يدخله الجنة هاجر في سبيل الله او جلس في ارضه التي ولد فيها[1]

صحیح بخاری مین ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ جس نے سچے دل سے خدا کو اور اس کے پیغمبر کو مانا، اور نماز کو ٹھیک ادا کیا، اور رمضان کا روزہ رکھا، کرم اور فضل کی راہ سے ضرور ہو گیا خدا پر اس کا بہشت مین لیجانا، خواہ اپنا وطن اس نے خدا کی راہ مین جہاد کے واسطے چھوڑا ہو، یا اسی زمین مین بیٹھا رہا جس مین پیدا ہوا تھا

اس حدیث پر حسب ذیل "فائدہ" مکتوب ہے،

" اس حدیث کی پوری روایت بخاری مین ہے کہ اصحاب نے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو ہم لوگون کو خوشخبری سنا دیوین کہ بہشت جہاد اور ہجرت پر موقوف نہین، حضرت نے فرمایا بہشت مین ایک سو بلند درجے ہین، کہ خدا نے نمازیون کے واسطے مقرر کئے ہین، ہر ایک درجے میں اتنا فرق ہے کہ جتنا آسمان اور زمین مین، سو جب تم خدا سے مانگو تو فردوس مانگا کرو کہ فردوس سب بہشتوں کے درمیان ہے، اور سب سے اونچی اور اس کے اوپر خدا کا عرش ہے، اوسی سے بہشت کی سب نہرین نکلی ہین، یعنی ہر چند جہاد پر بہشت موقوف نہین، اصل نجات کے واسطے ایمان اور نماز روزہ کفایت کرتا ہے لیکن تم ہمت کو بیشتر کرو،

[1] تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار مولانا خرم علی صاحب ص (۷)

کہ صرف نجات پر قناعت کرو، بلکہ ہمت بلند رکھو، جہاد کرو تاکہ فردوس پاؤ جس کے آگے سب بہشتیں پست ہیں؛

اس حدیث میں فرشتوں اور خدا کی کتابوں کا اور تقدیر و قیامت کا ایمان لانا بیان نہیں فرمایا، اس واسطے کہ جب آدمی رسول کا ایمان لایا تو ان کا بھی ضرور ایمان لاوے گا، کہ تمام قرآن و حدیث میں ان کا بیان موجود ہے، اور نماز روزہ کے ساتھ زکوٰۃ و حج کا ذکر نہیں فرمایا، اس واسطے کہ زکوٰۃ و حج صرف مالدار پر فرض ہے، محتاج پر نہیں، اور نماز، روزہ سب پر فرض ہے، مالدار ہو یا محتاج، خلاصہ یہ ہے کہ یہاں حکم عام بیان فرمانا منظور رہا، جو سب مسلمانوں کو شامل ہے، مصنف نے ایمان کی حدیث مقدم کی، اس واسطے کہ ایمان سب نیکیوں اور عبادت کی جڑ ہے، بدون ایمان کے کوئی عبادت اور نیکی درست نہیں" (۔۔۔)

حدیث مشارق الانوار اس کا ترجمہ اور یہ فائدہ ان تینوں پر ایک مرتبہ اور نظر ڈالئے محشی نے حدیث مافی الباب کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو کس خوبصورتی کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اس پر فائدہ سونے پر سہاگہ ہے،

افسوس ہے کہ ہندوستانی شارحین و مفسرین کی محنتوں کا اندازہ خود ہم بھی نہیں کر سکتے، تو جن لوگوں تک اس زبان یا اس ملک کی مذہبی و قومی کتابیں نہیں پہنچ سکتیں ان کا کیا کہنا، مشارق پر یہ فوائد علم حدیث کی بے نظیر شرح ہے، شارح ناقل نہیں، صاحب بصیرت ہے، جس طرح ترجمہ تحفۃ الاخیار میں شرح کو سمو دیا ہے، اسی طرح شرح میں احادیث متذکرہ فی الباب کے ساتھ ان ٹکڑوں کو جوڑ دیا ہے جو ایک دوسرے سے علحدہ ہونے کی وجہ سے بکھرے پڑے تھے،

لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی طالب علم حدیث (محققین) اب تک مولانا خرم علی کے ان فوائد کو کوئی مقام نہ دے سکے، پس ان فوائد ترجمہ تحفۃ الاخیار پر راقم الحروف نے "الفوائد علی مشارق الانوا

کا عنوان مقرر کیا!

سرم خوش است و بیانگ بلندی می گویم
کہ من نسیم حیات از پیالہ می جویم

اگر سطر الفوائد (علی مشارق الانوار) کا شمار کیا جائے، تو یہ متن و ترجمہ دونوں سے اَضْعَافًا مُضَاعَفًا ہیں،

(۳۰) تبصرۃ الابصار فی تخریج الآثار ملقب بنام تاریخی شوارق المشارق از مولوی الٰہی بخش خان مرحوم بڑاکری بہاری (م ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۵ء)

یہ مشارق الانوار کی ترتیب فقہی ہے، طابع (مشارق۔) مولوی محمد عبد الرحمان بن حاجی محمد روشن خان فرماتے ہیں:۔

"مصنف مغفور نے ترتیب احادیث اس مشارق الانوار کی الفاظ صدر پر رکھی تا ناظرین کو حدیثوں کے یاد کرنے میں آسانی ہو، مگر بہ ترتیب فقہی جس حکم کی حدیث مطلوب ہو نکالنا اس کا دشوار تھا، لہذا اس امید وار رحمتِ منان محمد عبد الرحمان بن حاجی محمد روشن خان غفر لہما کے ذہن میں آیا، کہ اب کی بار کوئی ایسی نئی ترکیب ایجاد کیجئے، کہ یہ دشواری آسان ہو جائے اور حسب ترتیب فقہ ہر حدیث مطلوب نکل آئے، کہ یہ بڑے فائدے کی بات ہے"

"پس جناب مخدومی مولوی الٰہی بخش صاحب عم فیضہم سے اس امر میں استصواب چاہا تو انھوں نے کہ خصوص ایسے امور مشکلہ کے حل میں ذہن عالی و فکر بلند سے ایجاد جدید نہایت مفید فرماتے ہیں، میرے اصرار پر اس جدول کو ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ء میں لکھنا شروع کیا"

اس نسخہ میں یہ جدول شائع ہوئی ہے جس کی وجہ سے بڑی مشکلیں آسان ہو گئی ہیں،

مولانا ابو طاہر بہاری م ۱۳۴۵ھ ۱۹۲۶ء مرتب تبصرۃ الابصار ہندوستان کے علماء فحول میں سے تھے،

مولانا الٰہی بخش خان کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب میں تفصیل سے کیا ہے فرماتے ہیں :-

"آپ علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع تھے، جس فن و علم کو بیان فرماتے، معلوم ہوتا کہ خاص اسی فن کے ماہر و مجہد ہیں، کتابیں اس قدر یاد تھیں، کہ طلبہ کو مقاماتِ مشکلہ بلامطالعہ ایسا حل کرکے بتلاتے کہ آسان تر معلوم ہوتا، نہایت حلیم، خلیق و کم سخن اور متواضع تھے، اپنے دشمنوں سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے اور اچھا سلوک کرتے،

"آپ نے ابتدائی درسیات مولانا علیم الدین صاحب نگرنہسوی متوفی ۲۰ محرم ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء سے پڑھیں اور بقیہ درسیات مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی محدث رحمۃ اللہ علیہ م ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء سے پڑھکر سند و اجازت حاصل فرمائی، بعد فراغ ایک شخص کی طلبی پر حضرت نے آپ کو سنبھل پور ہاے پور (دکن) بھیج دیا، اور فرمایا، کہ لائق و فائق مدرس کو آپ کے پاس روانہ کرتا ہوں، ایک عرصہ تک رہے، جب مکان تشریف لائے تو بہتیرے حضرات اس دور کی مسافت سے مانع آئے، اور مدرسہ اہلِ حدیث دانا پور ضلع پٹنہ میں مدرس ہوئے، چار سال بعد پھر سنبھل پور سے باصرار طلبی ہونے پر مجبوراً تشریف لے گئے، بعد واپسی سید شاہ مظہر حسین صاحب رئیس بہار کے لڑکے کی تعلیم کے واسطے رہے،"

"علم اصول و حدیث میں خاص مہارت تھی، ماتحت احادیث تفریعات فقہیہ و تطبیق و توفیق کے ساتھ پڑھانا معمول تھا، نہایت محققانہ کلام ہوتا، مقلدانہ تقریر سے سخت نفرت تھی، حق گو ایسے تھے کہ مسائلِ دینیہ میں کسی کا لحاظ نہ فرماتے، اور جو بات آپ کے نزدیک حق و ثابت ہوتی، بیان فرما دیتے، کبھی لومۃ ولائم کا خیال دل میں نہ لاتے،"

اہل بہار کو آپ کی ذات سے بہت فیض پہنچا، اشاعت سنت و تردید بدعت ہمیشہ شغل رہا، کامل صحاح ستہ بیس مرتبہ سے زیادہ مرتبہ پڑھائی، ادب میں یہ کمال حاصل تھا کہ برجستہ

عربی مین نظم ونثر فرماتے تھے، اور مسودہ مین محو واثبات نہ ہوتا تھا، جیسا کہ التعقیب سے ظاہر ہے"

آپ کے تلامذہ سے مولوی مولا بخش خان صاحب بڑاکری (آپ کے برادر حقیقی م ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء) مولوی عبدالمجید خان صاحب رئیس گلنی (بہاری) مولوی شیخ محمد ابراہیم بن حاجی شیخ مرحوم داناپوری، مولوی محمد سعید خان صاحب داناپوری، مولوی ابوالحسنات عبدالغفور صاحب داناپوری، خاکسار ابوطاہر بہاری، مولوی عبدالواحد خان صاحب الحیرام پوری ہین"

آپ کی تالیفات نافعہ سے شرح قصیدہ فرزدق تمیمی، شرح حدیث[۵۱] ام زرع، شرق القرین[۵۲] لہدایۃ الزوجین، سعادۃ الدارین فی اطاعۃ الوالدین، زجر العاصی عن قرب المعاصی، شریعت کا درہ، نجات[۵۳] المومنین فی حفظ الاربعین، سوط الرحمٰن وغیرہ (۲۰) سے زائد رسائل ہین جن مین سے اکثر مختلف مطابع مین بوجہ کمال مفید ہونے کے مکرر طبع ہو چکے ہین تبصرۃ الابصار فی تخریج الآثار مشتمل بر تبویب مشارق الانوار: ابویحیٰ، ۱۳۳۴ھ مین ۔۔ نماز صبح کے وقت بہ حالت سجدہ بہار ضلع پٹنہ مین انتقال فرمایا، تاریخ وفات مولوی الٰہی بخش مرحوم ہے ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء

ممدوح نے مولانا ولایت علی مرحوم م ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ء صادق پوری کے بعض فارسی رسالون کا اردو ترجمہ کیا، میان صاحب سے استفادہ کے زمانہ مین صاحب عون المعبود، علامہ ابوالطیب شمس الحق ڈیانوی (م ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء) مولانا رحیم آبادی (عبدالعزیز م ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۸ء) ان کے ہم سبق تھے، صاحب ترجمہ کے حقیقی بھائی مولوی مولا بخش خان (م ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء) بھی صاحب علم و سند اور میان صاحب سے مستفیض تھے، اولاد مین دو

---

۵۱ و ۵۲ لیکن یہ دونون نام ایک ہی کتاب کے ہین، جو مطبع احمدی لاہور ۱۳۲۴ھ مین چھپی ہے، ضخامت ص ۳۹، (دیدۂ مولف)۔ ۵۳ اربعین حدیث پر ہے، پورا نام ہدایۃ المسلمین بشرح نجاۃ المومنین فی حفظ الاربعین ہے، مطبوعہ نولکشور پرنٹنگ ورکس پریس لاہور، ۱۳۲۰ھ ہجری صفحات ۲۸، مترجمہ بہ اردو، تمام احادیث اتباع سنّت و مذمت بدعت پر ہین۔ ۵۴ اخبار اہلحدیث ج ۱۶ نمبر ۴۶،

صاحبزادوں کا علم ہے (۱) یعقوب حسن خان صاحب جن کے لئے زجر الغاصی لکھی (۲) اور یوسف حسن خان فارسی شاعری میں دخل تھا، کتاب الدرر المنثور فی تراجم اہل صادقپور میں ان کی ایک نظم چھپی ہے،

(۳۱) مشکوٰۃ الانوار لتسہیل مشارق الانوار: مولوی عبد الغفور غزنوی امرتسری (م ۱۳۵۴ھ؍ ۱۹۳۵ء) (اردو) مطبوعہ مطبع الفاروقی دہلی،

اس میں مشارق الانوار کی تبویب و ترتیب علیٰ نہج المشکوٰۃ ہے، مولانا غزنوی موصوف نے تمام مشارق کو کتابیہ بھی فہرست مدونہ کے مطابق بدل دیا ہے، البتہ نمبروں میں تبدیلی نہیں کی، مثلاً سب پہلی حدیث (تسہیل) میں الاعمال بالنیات لائے ہیں، مگر یہ نمبر اصل نسخہ کا نمبر ۱۲۵ ہے، الغرض مولوی عبد الغفور کا مقصد صرف ترتیب علیٰ نہج المشکوٰۃ المصابیح ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں:-

" لہذا اس امیدوار رحمت رحمان ابو ادریس عبد الغفور بن محمد بن عبد اللہ الغزنوی غفر اللہ لہم کو نہایت مناسب بلکہ واجب معلوم ہوا، کہ اس کتاب کو ترتیب معنوی پر بنایا جاوے، تاکہ سب مسلمان بھائی اس سے بآسانی تمام فائدہ اٹھا سکیں، اور جس حکم کی احادیث مطلوب ہوں، بآسانی نکال سکیں، چنانچہ مشکوٰۃ وغیرہ میں تو میں نے اپنے چچا مولوی عبد اللہ (م ۱۳۰۰ھ؍ ۱۸۸۲ء) بن عبد اللہ الغزنوی (م ۱۲۹۸ھ؍ ۱۸۸۰ء) رحمہما اللہ تعالیٰ سے اس بارہ میں مشورہ کیا، تو انھوں نے اس بات کو بہت پسند کیا، اور ان کو اللہ تعالیٰ نے ذہن عالی اور فکر بلند دیا تھا جس کی صفت میں بیان نہیں کر سکتا ہوں، اور آپ نے مجھ کو یہ ترکیب سکھلائی، کہ اس کے ابواب موافق مشکوٰۃ کے ہونے چاہئیں، اور ہر باب میں تین فصلیں ہوں فصل اول میں بخاری اور مسلم دونوں کی حدیثیں ہوں، اور دوسری فصل میں حدیث بخاری کی، اور تیسری فصل میں فقط مسلم کی حدیثیں ہوں، اور جس باب میں تینوں میں سے کوئی فصل نہ ہو، اس میں اس طرح رکھنا چاہئے، کہ اس باب میں فلاں

فصل نہیں، چنانچہ مشکوۃ والے کا بھی یہی قاعدہ ہے، تو جیسا آپ نے ارشاد کیا، اوسی کے مطابق مین نے یہ کتاب بنائی، تو گویا یہ کتاب ایک چھوٹی مشکوۃ بن گئی ہے، بلکہ مشکوۃ پر بھی فوقیت دیگئی، اس واسطے کہ یہ کتاب مختصر ہے اور اس کی تمام حدیثون کی صحت پر اتفاق ہے، اس مین کوئی حدیث ایسی نہین، جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوۃ کے کہ اس مین ہر قسم کی حدیثین مذکور ہین، صحیح بھی اور ضعیف بھی..... شب ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء مین حسب دلخواہ یہ کتاب تمام ہوئی، اور مشکوۃ الانوار تسہیل مشارق الانوار اس کا نام مقرر کیا" (ص ۲۳، ۲۴، ۲۴)

اس مین بعض حواشی بھی ہین، مگر شاذ، ترجمہ، وفوائد مولانا خرم علی بلہوری (م ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء) کے ہین، جس کا ذکر شرح نمبر ۲۹ پر کیا گیا ہے،

صاحب مرتب ہندوستان کے مشہور عارف باللہ عبداللہ صاحب غزنوی امرتسری (م ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۰ء) کے پوتے اور صلحاے اُمت سے ہین، امرتسر مین ترویج کتاب و سُنت کے لئے مطبع انوار الاسلام قائم فرمایا، مشکوۃ المصابیح مترجم و محشی اور قرآن مجید مترجم و محشی چھپوائے، الروض الریاحین ترجمہ ریاض الصالحین مولوی احمد الدین ساکن کوم ضلع لودھیانہ (م ؟) اسی مطبع مین چھپا ہے، امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم کے چند رسائل اسباب النزول وجلاء الافہام وغیرہ طبع کرائے، اور شیخین کی تصانیف سے اسی خاندان نے علماے ہند کو متعارف کیا، یہ نکتہ سب سے پہلے صاحب لسان الصدق مولانا ابو الکلام نے بیان فرمایا، کوئی کتاب اس مطبع مین نہ چھپی، جس کی غرض محض تجارت ہو، بلکہ صرف وہ کتابین چھپوائین، جن کا مقصد اشاعت کتاب و سُنت تھا، مولوی عبدالغفور غزنوی نے ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء مین بعمر ۶۵ سال انتقال فرمایا،[1]

امام حسن صغانی کی دوسری تالیفات | امام حسن کی تصانیف مین موضوعات کا ذکر اوپر گذرا ہے،

---

[1] ایک فروگذاشت کا ذکر ضروری ہے مشارق الانوار کی ایک اور اردو شرح کا تذکرہ نظر سے گذرا، یہ غالباً مولوی محمود حسن نانوتوی کی ہے، مگر شرف مطالعہ کا اتفاق نہ ہو سکا،

ان کے دو رسالے ہین، یہ دونون رسالے کتب خانۂ خدیویہ مصر مین (قلمی) موجود ہین[51] اور طبع بھی ہوچکے ہین[52] مولانا عبدالحیٔ لکھنوی نے اُن کا تذکرہ الفوائد البہیہ مین کیا ہے، جس میں ان دونون رسالون کا ذکر آیا ہے[53]،

۳- الدر الملتقط فی تبیین الغلط ونفی اللغط، یہ رسالہ موضوعات (نمبر ا و ۲) سے علحدہ معلوم ہوتا ہے، کہ "در دوے موضوعات کتاب الشبہات والنجم جمع نمودہ[54]" نیز فہرست کتب خانۂ خدیویہ[55] مصر مین بھی الدر الملتقط کا اندراج باب کتب موضوعات سے علحدہ کیا گیا ہے،

۴- کشف الحجاب عن احادیث الشہاب اور یہ الدر الملتقط (نمبر ۳) سے علحدہ ہے،

۵- شرح صحیح بخاری (سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ۲۸)

۶- الشمس المنیرہ من الصحاح الماثورۃ (" " ")

۷- زبدۃ المناسک، (اتحاف النبلا، ۲۴۳)

۸- در السحابہ فی وفیات الصحابہ (فن رجال) (سبحۃ المرجان ص ۲۸)

۹- شرح در السحابۃ (" ") (" ")

۱۰- مجمع البحرین، یہ بارہ جلدون مین ہے،

۱۱- التکملۃ (علی الصحاح) صحاح مین جو کمی رہ گئی تھی، اس کو اس میں پورا کیا گیا ہے[56]،

اسی طرح فن لغت مین ذیل کے چند اور رسالے ہین،

---

[51] فہرس دار الکتب العربیہ الموجودۃ فی الدار لغایت ۱۹۲۱ مخطوط : ۲، ۷، مجامیع ص ۹۰ ومخطوط، ۹ [52] فہرس تجارتی ابنائے محمد بن غلام رسول بمبیٔ [53] الفوائد البہیہ ص ۳۰ [54] اتحاف النبلا ص ۸، [55] فہرس الکتب العربیہ الموجودۃ فی الدار لغایت ۱۹۲۱،

[56] البلغہ فی اصول اللغۃ للنواب (نقلاً عنہ وترجمۃً منہ) ص ۹۹ و ۸۸،

(۱۲) اسماء الاسد (۱۳) اسماء الذئب (۱۴) الاضداد[1] (۱۵) الشوارد (۱۶) کتاب الافتعال،

متفرق کتابیں :-

(۱۷) الفرائض[2] (۱۸) العروض[3] (۱۹) درجات العلم والعلماء[4] (۲۰) کتاب المفعول[5] (۲۱) شرح ابیات المفصل[5] (۲۲) بغیۃ الصدیان (۲۳) العباب الزاخر واللباب الفاخر[6]

" وصنف کتاب العباب فی اللغۃ فاخترمتہ المنیۃ قبل ان یکمل بثلاث احرف ببغداد فی شہور تسعین ستمائۃ" (سبحۃ المرجان ص ۲۸)

علامہ بلگرامی فرماتے ہیں کہ العباب سپرد قلم فرمارہے تھے، ہنوز تیسرا حرف بھی مکمل نہ ہوا تھا کہ

کوس رحلت بکوفت دستِ اجل

بغداد میں مقیم تھے، اور وہیں پیکِ اجل آپہنچا، رحمہ اللہ تعالیٰ،

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۸۳ [2] ایضاً [3] اتحاف النبلاء ص ۲۲۳ [4] کشف الظنون ج ۲

[5] مقدمۃ تحفۃ الاحوذی ص ۳۷، [6] سبحۃ المرجان ص ۲۸،

استفسار و جواب

اسلام میں مجلس شوریٰ کا نظام

مولوی ابو القاسم صاحب
قصبہ بحری آباد ضلع غازیپور (یو پی)

"کیا اسلام میں مجلس شوریٰ کا کوئی نظام بنایا گیا ہے اور اگر کسی مسئلہ میں کتاب سنت کی کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو اور ارکان مجلس اور امام یا خلیفۂ وقت میں دیانتداری سے اختلاف رائے ہو جائے تو کیا اسلام کے رو سے امام کو اختیار حاصل ہے کہ وہ جمہور کی رائے کو نظر انداز کر کے اپنی ذاتی بصیرت اور رائے کے مطابق فیصلہ کر دے، اگر اس کو یہ حق حاصل ہو تو دلائل شرعیہ سے اس کو واضح کیا جائے"،

معارف:- گرامی نامہ ملا، یاد فرمائی کا شکریہ، اس سے پہلے بھی آپ کے مکتوب ملتے گئے مگر افسوس ہے کہ جواب دینے سے قاصر رہا، اصل یہ ہے کہ اس استفسار کے جواب میں لب کشائی سے گریز کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا تھا، یہ زمانہ فتنہ کا ہے مسلمانوں کی اکثریت کی بنیاد پر جو حکومتیں قائم ہیں، ان کو صحیح اسلامی حکومت سے موسوم کئے جانے کا جذبہ بڑھ رہا ہے، اس لئے خطرہ گذرتا ہے کہ کہیں خلیفہ کے اختیارات اور مجلس شوریٰ سے اس کے تعلق پر قیاس کر کے آمرانہ نظام حکومت کے لئے ثبوت نہ بہم پہنچائے جائیں، اور یہ مباحث جب لگا ہوں کے سامنے آئیں تو ان کی اصل روح کو چھوڑ کر غلط انداز سے عوام کی ذہنی تربیت کی راہ نہ نکالی جائے، اس لئے موجودہ دور میں ایسے

لہ افسوس ہے کہ جناب مستفسر کا وہ مکتوب گرامی جو استفسار کے سلسلہ میں آیا تھا، اور جس کے جواب میں یہ سطریں لکھی گئیں کاغذوں میں دب کر کہیں رہ گیا، اس لئے استفسار کے مفہوم کا متن بھی ہمیں خود لکھنا پڑا ہے، "س"

مسائل جہاں تک مجھا ہون سے اوجھل رہیں ، زیادہ مفید ہے لیکن آپکے بار بار کے اصرار سے اس سلسلہ مین چند اشارات ذیل مین پیش ہین لیکن یہ خیال شریف مین رہے کہ ان مین سے کوئی بات بھی اپنی دوسری باتون سے علیحدہ ہوکر صحیح نہین رہ سکتی، یہ مسئلہ ذیل کی چند تصریحات سے واضح ہوسکتا ہے :۔

(الف) یہ صحیح ہے کہ اسلام مین مسائل کے فیصلہ کا معیار عمومیت کے ساتھ محض تعداد کی اکثریت محض پر مبنی نہین ،اس لئے کسی مسئلہ کا فیصلہ محض تعداد کی قلت وکثرت کی بناء پر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اسلام مین اس کا اصل معیار اس مسئلہ کا کتاب وسنت اور حق کے مطابق ہونا ہے ،اور یہی ہر مسئلہ کے فیصلہ کی اصل میزان ہے،

(ب) دوسری طرف اسلام میں خلیفہ وامام کے لئے ضروری ہے کہ ایسے تمام مسائل مین جن میں قرآن مجید کی کوئی نص یا حدیث کی کوئی صریح روایت یا اجماع امّت سے کوئی پچھلا متفقہ فیصلہ موجود نہ ہو، تو وہ مجلسِ شوریٰ طلب کرکے اس سے ہدایت حاصل کرے، پھر یہی راہِ عمل ان تمام وقتی وسیاسی مسائل کے لئے ہے، جو مصالح امت کے لحاظ سے ضروری ہون، خواہ وہ عام سیاسی امور ہون، یا کوئی وقتی جنگی صورتِ حال، ان مین سے کسی صورت مین خلیفہ وامام کے لئے مناسب نہین کہ وہ محض اپنی ذاتی رائے پر اعتماد کرکے کوئی قدم اُٹھائے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کی یہ صفت بیان فرمائی ہے،

وامرھم شوریٰ بینھم (آل عمرانؔ)	اور اُن کے کام آپس کے مشورہ سے ہوتے ہین

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا گیا،

وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ، (آل عمرانؔ)	اور کام مین اُن سے مشورہ لین پھر جب تو قصد کرچکا تو اللہ پر بھروسہ کر،

یعنی باہمی مشورہ کے بعد جو رائے بہتر قرار پائے ،اس پر ہمت وعزیمت کے ساتھ عمل کیا جائے،

(ج) لیکن اسلام نے مجلسِ شوریٰ کے لئے کوئی متعین نظام مقرر نہین کیا ہے، بلکہ اس مین اُمّت

کے لئے زمان ومکان کے لحاظ سے آزادی دی گئی ہو کہ اربابِ حل وعقد اس کے لئے خود کوئی وسیلہ اختیار کرین اسی لئے خلافتِ راشدہ کے زمانہ مین مختلف موقعون کے لحاظ سے مختلف صورتین اختیار کی گئین، عمل کی یہ آزادی ہمین آج بھی حاصل ہو سکتی ہے، کہ اپنے مصالح کے لحاظ سے خود کوئی نظام اور قاعدہ بنا لین، جو کتاب وسنت اور سلف کے طریق کی روشنی اور اسی روح کے مطابق ہو جس پر اسلام کے صدر اول مین عمل درآمد جاری رہا،

(۱) مجلسِ شوری کے متعلق مذکورۂ بالا تینون امور بنیاد و اساس کا درجہ رکھتے ہین، ان مین سے پہلی بات یہ کہ اسلام مین مسائل کے فیصلہ کا معیار تعداد کی کثرت وقلت نہین، بہ ظاہر موجودہ زمانہ مین عام جمہوری اصول کے خلاف معلوم ہوتی ہے، مگر یہ محض بادی النظر مین سمجھا جا سکتا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب اصل معیار کسی مسئلہ کا کتاب وسنت اور حق کے مطابق ہونا ہے، تو یہ سمجھا جا سکتا ہے، کہ اسلامی نظام مین جو مجلسِ شوری ہوگی اس کے ارکان کے ذہن دین کے سانچے مین ڈھلے ہون گے، ان کی دینداری سے ایسی توقع ممکن نہین ہے کہ وہ کسی مسئلہ کو دین کی روح کے مخالف جانتے ہوئے اس کے منظور کئے جانے پر اصرار کرین کہ امت کے اکابر کبھی کسی باطل پر متفق ہو ہی نہیں سکتے، دوسری طرف اگر کوئی خلیفہ جان بوجھ کر کتاب وسنت کے خلاف راہ اختیار کرے گا، تو کھلی ہوئی بات ہے، کہ اس مین اس کی پیروی نہ کیجائے گی کہ "انما الطاعۃ فی المعروف" اور "لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق" اسلام کے جانے بوجھے اصول ہین، حقیقت یہ ہو کہ اسلام کی حکومت، اس کے ارکان کے اطوار، اخلاق اور طرزِ سیاست کا اندازہ موجودہ حکومتون کے نظام اور اُن کے معیار سے لگایا ہی نہین جا سکتا،

(۲) اسلام مین مجلسِ شوری کو مسلمانون کی سیاسی واجتماعی زندگی مین نمایاں درجہ حاصل رہا ہے، چنانچہ اسلام کے صدر اول مین مذکورہ بالا دونون آیاتِ کریمہ کی روشنی مین ملکی وغیر ملکی معاملات کے لئے باہمی مشاورت اسلامی حکومت کے لئے ایک بنیادی شعار رہی، اور اس پر عمل درآمد جاری رہا، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مسائل مین جن مین وحی والہام سے کوئی راہ بتائی نہ گئی ہوتی، آپ اربابِ صلاح سے

مشورہ فرماتے تھے، اور بعض مثالیں ایسی بھی ہیں کہ آپ کی رائے گرامی سے کسی اور صحابی کی رائے موافق ہوئی تو آپ نے اس کے موافق عمل فرمایا، چنانچہ بدر کے قیدیوں کا جب معاملہ آیا، تو آپ نے حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے مشورہ فرمایا، حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے آپ کی رائے گرامی سے مطابق ہوئی، اور آپ نے اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیا،

ارباب علم کا خیال ہے کہ آپ نے اس موقع پر صرف دو صحابیوں سے اس لئے مشورہ فرمایا کہ اس وقت وشاورہم فی الامر کا حکم ربانی نازل نہیں ہوا تھا، یہ آیت پاک غزوۂ احد میں نازل ہوئی، جب آپ سے آیت میں "عزم" کا جو ذکر آیا ہے، اس کی تصریح پوچھی گئی، تو آپ نے ارشاد فرمایا "مشاورۃ اہل الرأے ثم اتباعہم" یعنی ارباب رائے سے مشورہ کرنا پھر اس کا اتباع کرنا، یہ ظاہر ہے کہ یہ مشورہ امت کے تمام افراد سے بیک وقت ممکن نہیں، اس لئے اس مشورہ کے اہل، وہ ارباب حل وعقد ہوں گے جن پر امت اسلام کو کامل اعتماد ہوگا، اور وہ اپنی دیانت، تقویٰ اور اصابت رائے سے اس کے اہل سمجھے جائیں گے، گویا دوسرے لفظوں میں انہیں عوام مسلمین کا اعتماد و نمایندگی حاصل ہوگی،

پھر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب مجلس شوریٰ میں ارباب حل وعقد جمع ہوں گے، اور وہ اپنی دینی بصیرت سے کسی مسئلہ میں کوئی فیصلہ کریں گے، تو اُن کی تعدادی اکثریت ناقابل لحاظ بھی نہیں رہ سکتی، اس لئے امام یا خلیفہ کی واحد یا قلیت رکھنے والی جماعت کی رایوں کے برخلاف صاحب صلاحیت افراد کی رایوں کی جس طرف کثرت ہوگی، وہ زیادہ قرین صحت و صواب سمجھی جائے گی، لیکن یہ خیال رہے کہ اس اقلیت و اکثریت میں تعداد محض کے علاوہ مجلس شوریٰ کے ارکان کے اوصاف و محامد کا لحاظ بھی رکھنا پڑے گا، اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد گرامی سے حقیقت زیادہ واضح ہو سکتی ہے،

ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا، کہ یا رسول اللہ! اگر فیصلہ کرنے میں کوئی ایسا مسئلہ آجائے جس کے متعلق کوئی وحی نہ آئی ہو، اور نہ سنت رسول کا علم ہو، تو

صورت مین آپ کیا ارشاد فرماتے ہین، اس کے جواب مین آپنے فرمایا،

تجعلونہ شوریٰ بین اہل الفقہ		اس مسئلہ کو ارباب فقہ، اور عبادتگذار
والعابدین من المومنین و	(طبرانی اوسط)	مسلمانون کے سامنے پیش کرو، اس مین خاص
لاتقض فیہ برایٔ خاصۃ		اپنی راے سے کوئی فیصلہ نہ کرو،

ایک دوسری حدیث مین حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ارشاد ہوا،

واستشر فی امرک الذین یخافون		اور اپنے کام مین اُن سے مشورہ چاہو جو اللہ
اللہ عزوجل،	(مستدرک وبیہقی)	تعالیٰ سے ڈرتے ہیں،

اور اللہ سے ڈرنے والے جیسا کہ قرآن مجید مین ہے وہی ہین جن کو علم و معرفت حاصل ہے، انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (الآیہ) اللہ سے علماء ہی ڈرتے ہین، لفظ علماء یہان اصطلاحی معنون مین نہین ہے مراد اہل علم سے ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلسون مین اجتماعون مین بلکہ نماز کی جماعتون مین بھی اس بات کا خیال فرماتے تھے، کہ اہلِ عقل و فہم آپ کے قریب تر رہین، تاکہ وہ بات کو سمجھ سکین، اولوالاحلام والنُّہیٰ کے الفاظ اس موقع پر احادیث مین آے ہین،

قرآن مجید مین اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے،

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و	اللہ کی اطاعت کرو، اور اللہ کے رسول اور
اُولی الامر منکم	اولوالامر کی اطاعت کرو،

اس اولوالامر کی تشریح دوسری آیت مین یہ ہے،

واذا جاءھم امر من الامن اوِ	اور جب اون کے پاس امن وخوف کی کوئی
الخوف اذاعوا بہ ولو ردوہ	خبر آتی ہے، تو اوس کو پھیلا دیتے ہین، اور اگر

اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ، (نساء - ۱۱) | اوس کو رسول اور اپنے میں سے اولوالامر تک ...... پہنچادیں تو اس کی تحقیق وہ کرتے جو بات کا پتہ لگا سکتے ہین'

اس سے معلوم ہوا کہ اولوالامر جو حقائق و مسائل کا استنباط کرین اون کی بھی اطاعت مصالح اسلامیہ مین کی جائے،

اس لئے جو صورت آپ نے لکھی ہے، اس مین امام کے لئے ضروری ہوگا، کہ پہلے وہ اپنے شرحِ صدر کو اربابِ حل و عقد کے سامنے رکھے، انھیں اپنا ہمنوا بنائے، اگر اس مین اس کو کامیابی نہ ہو اور لوگ اپنی دینی بصیرت و معاملہ فہمی سے اپنی اس رائے پر جمے رہین، جو اگرچہ امام کی رائے سے مختلف ہے مگر وہ باہم متفق یا بیشتر افراد ہمنوا ہین، تو پھر امام کے لئے مناسب ہوگا، کہ وہ اپنی رائے کو ان کی رایون کے تابع کردے اور اس کی مثالین عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ کے دورون مین بھی گذر چکی ہین،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جہان تک امور دینیہ کا تعلق تھا، آپ کو صلاح و مشورہ کی حاجت نہ تھی کہ آپ کا سرچشمۂ علم، وحی ربانی و ملکۂ نبوت تھا، البتہ دنیاوی امور مین جن مین جنگی و سیاسی مصالح و ضروریات بھی داخل تھے، آپ صحابۂ کرام سے صلاح و مشورہ فرماتے، اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، کبھی ایسا بھی پیش آیا، کہ آپ نے اپنی رائے کے مطابق عمل کو ترک کرکے دوسرون کے مشورہ پر عمل فرمایا، جیسا کہ بدر کے موقع پر جب آپ نے ایک مقام پر قیام فرمانا چاہا، اور وہاں اُتر پڑے، تو حضرت حباب بن منذر بن جموح رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا، کہ "یا رسول اللہ! اس مقام کو وحی کے مطابق اختیار فرمایا ہے، تو اس سے ہم آگے پیچھے نہین اُتر سکتے، یا حضرت نے اپنی رائے سے اس کو منتخب فرمایا ہے، اور لڑائی مین جنگی چالین ہوتی ہین" آپ نے فرمایا کہ "نہین محض ذاتی رائے، اور جنگی چال ہی کے طور پر ہے" تو پھر حضرت حبابؓ نے ایک دوسرے مقام کے لئے مشورہ دیا، اور آپ نے اپنی رائے کو ترک کرکے اس کو قبول فرمالیا،

اگرچہ اس موقع پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت حبابؓ سے گفتگو کے بعد بھی آپ کی پہلی رائے اپنی جگہ قائم رہی، اور اس کے باوجود آپ نے اس کو ترک کر کے ان کی رائے قبول کر لی، بلکہ زیادہ امکان یہ ہے کہ اس گفتگو کے بعد خود آپ کی رائے بھی تبدیل ہو گئی ہو، تاہم اس موقع پر ہمارے لئے وہ ارشاد گرامی راہنما ہے جو آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا، کہ "لا تقض فیہ بر ایک خاصۃ" اور اس لئے دورِ حاضر میں امام و خلیفہ کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے، کہ اس کو اپنی رائے ترک کر کے عام ازیں کہ وہ ذاتی طور پر متفق ہو یا نہ ہو، اربابِ حل و عقد کی کثرت رائے کا اتباع کرنا مناسب ہے،

(۳) باقی رہا اسلام میں شوریٰ کے نظام کے متعلق کسی متعین طریق کا مقرر نہ ہونا، تو در حقیقت اس میں امت کی فلاح و بہبود ہی کو پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ اس میں وسعت باقی رہے، اور امت کے مختلف حالات و مقتضیات کے لحاظ سے نظام میں ردوبدل کی آسانی برقرار رہے، کیونکہ ایسے جزئی قوانین کا نفاذ ممکن نہ تھا جن پر ہر زمانہ اور مقام میں یکساں عمل کیا جاتا، اور اگر کوئی خاص نظام متعین کر دیا جاتا تو خطرہ تھا کہ لوگ اس کو دینی حکم سمجھ کر ہر زمانہ میں اسی کو لئے رہتے، اگرچہ اس پر عمل کرنا امت کے مصالح کے خلاف ہوتا، اس لئے یہ محض اصولی بات کہہ دی گئی، کہ "مشاورہ" ایک دینی حکم ہے، اور اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں عمل کرنے کی تربیت امت کو دی، چنانچہ ہجرت کے وقت سے فتح مکہ تک آپ کا طریق عمل یہ رہا، کہ آپ مسجد نبویؐ میں اہم مسائل پیش فرماتے، مسلمانوں کا سوادِ اعظم وہاں موجود ہوتا، جن میں اربابِ حل و عقد بھی ہوتے، اور آپ مسائل پر مشورہ فرما لیتے، پھر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، دور دور کے مختلف مقامات اسلامی سلطنت کے ماتحت آئے، تو مختلف قبائل اور گروہ کے اربابِ حل و عقد پر اعتماد کیا گیا، اور وہ اپنی اصابت رائے سے اہم امور کا فیصلہ کرتے رہے، چنانچہ خلافتِ صدیقی و فاروقی میں متعدد مسائل کا فیصلہ ایسی مجلسوں کے انعقاد سے ہوتا رہا، یہاں تک کہ زراعت اور مالگذاری یا جنگ کے معاملات میں اہلِ ذمہ اور عام اہلِ تجربہ سے مشورہ کیا گیا ہے،

اس موقع پر تشریع اسلام کی اصطلاح فنی میں دو لفظ خاص طور کے لحاظ سے قابل ہیں،

ایک اجماع اور دوسرا جمہور، اجماع کے طول طویل مباحث کا خلاصہ اسی قدر ہے کہ اسلام کے اصول کتاب و سنت کے تحت میں کسی جزئی مسئلہ کے فیصلہ کے لئے جس کا ذکر نص میں نہ ہو، کسی زمانہ کے علمائے امت کسی ایک پہلو پر تمامتر یا بالاکثریت قولاً یا عملاً متفق ہو جائیں،

جمہور کے معنی یہ ہیں کہ جس جانب علی العموم اکثر علماء ہوں، اس کی نسبت یہ خیال کیا جائے گا، کہ یہ رائے زیادہ صحیح ہے، ایسے ہی موقعوں پر ہمارے فقہاء لکھتے ہیں، وعلیہ الجمھور، مختلف مسائل میں صحابۂ کرام اور ائمۂ اعلام کے نام گنا کر کہا جاتا ہے کہ جمہور صحابہ، جمہور ائمہ یا جمہور امت کی یہ رائے ہے، اور اس کے مقابلہ میں ایک فرد یا قلیل التعداد افراد کی رائے کو شاذ کہا جاتا ہے، جس کے اتباع سے منع فرمایا گیا، احادیث میں جماعت کا ساتھ دینے کا حکم ہے جیسے ید اللہ علی الجماعۃ اور اتبعوا السواد الاعظم اور من شذ عن الجماعۃ وغیرہ احادیث اسی طرف اشارہ کرتی ہیں، جامع ترمذی میں اکثر مسائل میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے نام لے کر کہا گیا ہے، وبہ قال غیر واحد من الصحابۃ او العلماء

مگر یہ جمہوریت اور جماعت عوام افراد کی نہیں ہو بلکہ اہل علم و اہل عقل کی ہے،

مباحث بالا کا حاصل یہ ہے کہ

۱۔ ایسے مسائل میں جو منصوص نہیں مشورہ ضروری ہے،

۲۔ اہل شوریٰ اہل علم و عقل ہوں جن کو اصول سے مسائل کے استنباط کا سلیقہ ہو،

۳۔ غیر دینی مسائل میں عام اہل تجربہ سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے،

۴۔ اگر اہل علم و تجربہ کی رائے میں اختلاف ہو تو اکثریت کی رائے کو ترجیح دی جا سکتی ہے،

بہر حال یہ سرسری امور ہیں، جو عرض کئے گئے، ضرورت ہے کہ اہل علم مجلسِ شوریٰ کے نظام پر غور و فکر کریں، اور کتاب وسنت اور آثار و سیر کی روشنی میں اوس کے جزئیات کو مرتب و مدون کریں، والسلام

"س"

کیا ناقص مسلمانوں کی نسبت اسلام کی جانب صحیح نہیں؟

جناب محمود اکبر خاں صاحب
ڈھوک شرفا کیمل پور، ضلع اٹک

مکرمی محترمی :- سلام مسنون

نومبر ۱۹۴۲ء کے معارف میں استفسار و جواب کے تحت صفحہ ۵۹، پر یہ مثال بطور دلیل پیش فرمائی ہے:

"کیا کھٹے آموں کو آپ آم نہیں کہیں گے، اور اگر نہیں کہیں گے، تو کیا آپ اس کو املی بتائیں گے، یا یہ کہیں گے کہ ہیں تو آم ہی مگر کھٹے ہیں"[1]

اسلام کی اصطلاحات کو بیان کرنے سے مدعا اگر صرف اسی قدر ہو کہ طرز بیان دلپذیر ہو اور معترض کو خاموش کرنے کی کوشش کی جائے، تو آپ کسی حد تک اس مدعا میں کامیاب رہے

---

[1] حضرت الاستاذ مدظلہ نے افغانستان کے سفرنامہ میں جو "سیر افغانستان" کے نام سے چھپ چکا ہے، عرف عام کے مطابق افغانستان کے لئے "اسلامی حکومت" اور "اسلامی ملک" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، اس پر ایک صاحب عبدالعزیز کوایدی نے اپنی حمیت دینی سے اعتراض کیا تھا کہ آپ جیسے بزرگوں کی تحریروں میں ایسے ممالک کے لئے جو اسلامی ملک اور اسلامی حکومت کا نمونہ نہیں ہیں، مسلمانوں کے ملک اور مسلمانوں کی حکومت کے بجائے اسلامی ملک اور اسلامی حکومت کے الفاظ کو دیکھ کر ذہن متشوش ہوتا ہے"، (باقی اگلے صفحہ پر)

کسی حد تک کامل طور پر نہین،

لیکن آپ کی پیش کردہ مثال کا اگر تجزیہ کیا جائے تو مثال بھی ویسی ہی بے کار ہے، جیسے کھٹے آم کا باغ لگانا اور پالنا،

اس مین شک نہین کہ کھٹے آمون کو آم ہی کہین گے، لیکن جب آم لگانے کے مقصد کو سامنے رکھ کر غور کرین گے، تو اس شخص کا فعل عبث ہی دکھائی دیگا، جو کھٹے آمون کا باغ لگائے، حاشا وکلا، اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول عبث کام نہین کرتے،

جب اس آم مین جو اس وقت بنارسی آم (غیر مسلم) کے نام سے موسوم ہوتا ہے، اور ملیح آباد کی آم (مسلم) مین اعتقاد و عمل کے لحاظ سے کوئی فرق نہین ہے، پھر اگر ایسے آمون کو اس کی جانب نسبت دیجائے؛ تو اس کی بدنامی اور توہین نہ ہوگی،

فرمایئے اگر آپ کے باغ مین تمام آم کھٹے ہون تو لوگ آپ کی اس صنعت کی اور انتخاب کی نسبت کیا راے قائم کرین گے۔

جن لوگون کے اعتقاد و عمل کافرانہ (مشرکانہ) ہون، اُن کو ایسے عقائد و اعمال پر مطمئن کرنے کی سعی کرنا اور دنیا جہان کے بے محل، و غلط دلائل تلاش کرکے پیش کرنا صحیح اور درست روش ہے اور شرعاً محبوب مشغلہ. اُمید ہے کہ آپ میری اس سیدھی اور صاف بات کو غور سے سمجھنے کی کوشش فرمائینگے

والسلام، جواب کا طالب،

(بقیہ حاشیہ ص) قبلہ موصوف نے معترض کے جذبۂ دینی کی قدر کرتے ہوئے اس کا تشفی بخش جواب مرحمت فرمایا تھا، (دیکھو معارف نومبر ۱۹۲۲ء) اور آخر مین بطور تمثیل کے تحریر کیا تھا، کہ کیا آپ کھٹے آمون (ناقص مسلمان) کو آم نہ کہین گے، اگر آم نہ کہین گے تو کیا ان کو املی بتائین گے، یا یہ کہین گے، کہ ہین تو آم ہی مگر کھٹے ہین، معترض نے اسی تمثیل پر اعتراض کیا ہے،

معارف:۔ حضرت سید صاحب قبلہ بھوپال میں تشریف رکھتے ہیں، اور آپ کا اعتراض کوئی ایسا دقیق اور پیچیدہ نہیں ہے، کہ موصوف کو اس کے جواب کی زحمت دیجائے، آپ کا جذبۂ دینی لائق ستائش لیکن آپ کی برہمی غلط فہمی کا نتیجہ ہے،

آپ نے کھٹے اور میٹھے آمون کی تمثیل سے یہ غلط نتیجہ نکالا ہے، کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ صحیح اور کامل اسلام کے مقابلہ مین ناقص اسلام کی حمایت کیجائے یا کافرانہ اور مشرکانہ اعمال والون کی حوصلہ افزائی کیجائے، اگر ایسا ہوتا تو کھٹے اور میٹھے آمون کا فرق ہی کیون کیا جاتا، تمثیل کا صرف یہ مقصد ہو کہ کامل اسلام اور ناقص اسلام اور کامل مسلمان، اور ناقص مسلمان دونون کی نسبت اسلام کی جانب صحیح ہے، کیا ناخلف اولاد ابنیت کی نسبت سے خارج ہو جاتی ہے، اور آپ کا یہ ارشاد تو سراسر مغالطہ ہے، کہ جب آم لگانے کے مقصد کو سامنے رکھ کر غور کرین گے، تو اس شخص کا فعل عبث دکھائی دے گا، جو کھٹے آمون کا باغ لگائے۔ حاشا وکلا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول عبث کام نہین کرتے"

معارف مین تو باغ لگانے نہ لگانے کا کوئی ذکر ہی نہین ہے، یہ تو تمامتر آپ کی اختراع ہے، اس مین تو صرف کھٹے اور میٹھے آمون کی تمثیل ہے، اس سے کھٹے کا باغ لگانے کی حمایت کہان سے نکلتی ہے، یہ تو آپ کو خود تسلیم ہے کہ شجرِ اسلام کا باغبان خود باری تعالیٰ ہے، اس لئے کسی انسان کے باغ لگانے کا کیا سوال ہو سکتا ہے"

غالباً یہ آپ کو معلوم ہوگا کہ تمثیل صرف مفہوم کی وضاحت کے لئے ہوتی ہے، اور اس کی تمام جزئیات کا مثل لہٗ کے مطابق ہونا ضروری نہین ہے، پھر کیا میٹھے آم کے تخم سے مختلف اسباب کی بنا پر کبھی کھٹے آم نہین پیدا ہوتے، یہ تو ہر شخص کا تجربہ ہے کہ اگر اچھے تخم کے درخت کی پوری داشت اور نگرانی نہ کیجائے تو کچھ دنون کے بعد اس کے پھل کا رنگ اور ذائقہ بدل جاتا ہے،

دنیا کا کوئی نظام بھی خواہ وہ دنیاوی ہو، یا الٰہی مادی ہو یا روحانی واخلاقی مرورِ زمانہ سے اپنی

اصلی حالت میں قائم نہیں رہتا، اور زمانہ کے ہاتھوں اس میں کچھ نہ کچھ تصرفات ہو جاتے ہیں، جن کی نگہداشت اور حفاظت کے لئے محافظین کی ضرورت ہوتی ہے، کہ وہ اوس کو بیرونی اثرات سے پاک وصاف کرتے رہیں۔ یہی حال اسلام کا بھی ہے، بلاشبہہ اسلام کی ہدایت اور اس کی تعلیمات ابدی ہیں، لیکن خود ان کو اصلی شکل میں قائم رکھنے کے لئے اور اس سے اچھے پھل پیدا کرنے کے لئے مجددین اور مصلحین کی ضرورت ہوتی ہے، کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اور جب اوس فریضہ سے غفلت کیجائے گی، تو اسلام کی تعلیمات مسخ ہوتی رہیں گی، اور اس کی پیداوار مسلمان بھی ناقص پیدا ہوں گے، اس لئے کھٹے اور میٹھے آموں کے درخت لگانے کا کوئی سوال ہی نہیں، بلکہ اگر اسلام کی پوری نگہداشت نہ کیجائے، تو مذکورۂ بالا سبب کی بنا پر خود بخود ناقص مسلمان پیدا ہونگے، جیسا کہ آج کل ہے۔

"اس تمثیل سے کافرانہ اور مشرکانہ اعمال کی حمایت اور حوصلہ افزائی بھی مقصد نہیں"، اور نہ یہ کہ ناقص اسلام یا ناقص مسلمانوں پر قناعت کر لی جائے، جیسا کہ خود کھٹے آم کی تمثیل سے ظاہر ہے، لیکن کسی مسلمان کی جانب کفر و شرک کی نسبت کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، فاسق اور گنہگار تک تو کہنے میں مضائقہ نہیں، لیکن جب تک کسی مسلمان سے صریح کفر کا صدور نہ ہو اس وقت تک اس کو کافر کہدینا بڑی جسارت ہے، بعض اکابر نے تو یہاں تک احتیاط کی ہے، کہ اگر کسی مسلمان میں ننانوے جہتیں کفر کی نکلتی ہوں، اور صرف ایک جہت اسلام کی ہو، تو اسے کافر نہ کہنا چاہئے،

اس سلسلے میں ایک اصولی سوال یہ ہے کہ اسلام اور ایمان کا صرف ایک ہی درجہ ہے یا مختلف مدارج ہیں، یعنی وہی مسلمان مسلمان کہلائے گا، جو ابو بکرؓ و عمرؓ وغیرہ اکابر صحابہ کا مثنیٰ اور اسلام کا مکمل نمونہ ہو، یا ناقص و گنہگار مسلمان بھی مسلمان ہی کہلائیں گے، اگر ایک ہی معیار ہے، تو تمام صحابہ کرام بھی ایمان و عمل کے لحاظ سے ایک درجہ کے نہ تھے، تو عام مسلمانوں کا کیا ذکر، ان بعض آیات اور بے شمار احادیث کا کیا جواب دیا جائے گا، جن میں گنہگار مسلمان کو مسلمان ہی کہا گیا ہے، اور ان پر مغفرت الٰہی

نجات کے دروازے بند نہین کئے گئے ہین، اور ان کو معمولی معمولی اعمال پر بڑے بڑے اجر کی امید دلائی گئی ہے، اس مختصر جواب مین ان حدیثون کے نقل کرنے کی گنجایش نہین ہے، اور وہ اصحاب علم کی نگاہ مین ہون گی، یہ بھی احادیث نبوی سے ثابت ہے کہ عہد رسالت کے بعد کے ساتھ مسلمانون کی عملی حالت کمزور پڑتی جائے گی، لیکن کسی مسلمان کا تھوڑا عمل بھی بیکار نہ جائے گا، اس لئے کسی مسلمان کو کافر و مشرک کہنے مین بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اسی کے ساتھ ناقص مسلمانون کو کامل بنانے کی بھی پوری کوشش کرتے رہنا چاہئے، کہ یہی اسلام کا اصل مقصود اور ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے،　　"م"

حیاتِ شبلی

(حصہ اول)

مؤلفہ مولینا سید سلیمان ندوی

یہ نوسو صفون کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانحعمری ہی نہین، بلکہ درحقیقت مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، اور قومی تحریکات و واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اس سلسلہ مین بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہین جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لئے جاننا ضروری تھا، شروع مین ایک دیباچہ ہے جس میں جدید علم کلام کی نوعیت، اس کی حیثیت اور اس سے متعلق مولانا شبلی مرحوم اور اُن کے متقدمین و معاصر علما، کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، اس کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے، جس مین دیار مشرق مین علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے، جو بڑی دیدہ ریزی سے یکجا ہوئی ہے، ضمناً ہر عہد کے مشہور اکابر علما، کے حالات بھی آگئے ہین، اس کے علاوہ کتاب مین مولانا کے باقیات صالحات یعنی دارالمصنفین، ندوۃ العلما، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اور شبلی ڈگری کالج کی عمارتون کے ہاف ٹون بلاک فوٹو بھی شامل ہین، کاغذ و طباعت اعلیٰ ضخامت ۹۲۰ صفحے قیمت غیر مجلد عہ، مجلد لعہ "منیجر"

ادبیات

نعت

ازجناب مائل خیرآبادی

زبان پر محمد کا نام آگیا ہے   ہمیں آج لطفِ تمام آگیا ہے
وہاں کی زمین خاک سے پاک سمجھو   جہاں ذکر خیرالانامؐ آگیا ہے
فرشتے جلو میں ادب سے کھڑے ہیں   یہ محشر میں کس کا غلام آگیا ہے
قدم کیا رسولِ معظمؐ کے آئے   جہاں میں مکمل نظام آگیا ہے
یہی بس ہے مائلؔ ہمیں روزِ محشر   وہ کہدیں ہمارا غلام آگیا ہے

غزل

ازجناب شاہین اشرف حجازی

مجھے نام ہی تمھارا ہے قرار جیتے جی کا   کہ یہی ہے اک سہارا مری ساری زندگی کا
میں فقیر ہوں ٹھکانا نہیں کچھ مری خوشی کا   کہ ہے دو جہان سے بڑھ کر مجھے لطف زندگی کا
تمہیں کس طرح بھلا دوں یہ مجھے نہیں تمنا   کہ ہے تم پہ خود ہی روشن مرا حال بے کسی کا
ہے تجھی سے یاس مجھکو ہے تجھی سے آس مجھکو   کہ مجھے نہیں سہارا ہے ترے سوا کسی کا
جو ہجوم یاس پاتا تو مجھیں پکار اٹھتا
یہی کام رہ گیا ہے بس اب اپنی زندگی کا

مطبوعات جدیدہ

شرح میر درد از جناب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰، صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ع۳ر پتہ:۔ مکتبۂ ادب لال کنوان دہلی۔

خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کی شہرت زیادہ تر شاعر کی حیثیت سے ہے لیکن درحقیقت وہ ایک صاحبِ نسبت بزرگ اور صاحب دل صوفی تھے، ان کی شاعری ان کے باطنی جذبات کے اظہار کا ذریعہ تھی، ان کا کلام نہایت سادہ اور سلیس ہے، لیکن تصوف کے معارف وحقائق سے لبریز ہے، اس لئے جو لوگ اس راہ کی منزل شناس نہیں ان کو جابجا سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے، خواجہ صاحب نے اس کی شرح لکھ کر ایک بڑی ضرورت پوری کی ہے، اب تک یہ نہیں معلوم تھا کہ خواجہ صاحب اس کوچہ سے بھی آشنا ہیں، ہم نے اس شرح کو اکثر مقامات سے دیکھا، اور صحیح پایا، یہ اس سرزمین سے نسبت کا فیض ہے، جو صدیوں تصوف کا گہوارہ رہ چکی ہے، اور جہان آج بھی بہت سے اکابر مشائخ وصوفیائے کرام آسودہ خواب ہیں، مصنف مین زبان کی فصاحت پاکیزگی اتنی رچی ہوئی ہے، کہ ان کے قلم کی کوئی تراوش اس سے خالی نہین ہوتی، چنانچہ اس شرح مین بھی زبان کی لطافت نمایان ہے، یہ شرح اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

ہندوستان کی سیاسی الجھنین، مترجمہ جناب شاہین فاروقی تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۷ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت:۔ ع۱۲ر پتہ نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

کانگریس کے اجلاس کوکناڈا (۱۹۲۱ء) کا مولانا محمد علی مرحوم کا خطبۂ صدارت بڑا معرکۃ الآرا تھا، اس مین اس دور کے ہندوستان کے تمام سیاسی مسائل پر جن مین ہندو مسلمانون کے اختلافات بھی ہین

نہایت مبصرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، اور اُن کا حل پیش کیا گیا ہے، اصل خطبہ انگریزی زبان مین ہے، اور اس مین مولانا مرحوم کے زور بیان اور ادب و انشا کی تمام خوبیان موجود ہین، جناب شاہین فاروقی نے اس کا ترجمہ کیا ہے، گو اتنی طویل مدت مین بڑا انقلاب ہو چکا ہے، سیاست کی دنیا ہی بدل گئی ہے، ہندوستان آزاد ہو چکا ہے، اس لئے اس خطبہ کی بہت سی باتین قصۂ پارینہ بن چکی ہین، لیکن ہندو مسلم مسائل اور ان کے اتحاد کے بارہ مین آج بھی اس خطبہ سے مدد مل سکتی ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے اس کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے، ترجمہ شگفتہ اور سلیس ہے، لیکن اس پر جو مقدمہ اور کتاب پر جابجا جو نوٹ ہین، وہ نہ صرف اس ترجمہ کے مقصد کے منافی بلکہ نہایت نامناسب ہین، آج کل سیاسی تغیرات کی تیز رفتاری کا یہ حال ہے، کہ چند مہینے پہلے تک جو سیاست تھی، وہ اب بالکل بدل گئی ہے، اور برابر بدلتی جائے گی، ان حالات مین جو خیالات مقدمہ مین ظاہر کئے گئے ہین ان کی اب قطعاً کوئی گنجایش نہین، "امن کی راہ کی" تلاش مین "فریب کاری" کی بدنامی کی دعوت کس قدر متضاد ہے،

ان پڑھ ہندوستان مترجمہ جناب سید ملا فخرالدین صاحب بی اے بی ٹی، لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد، تقطیع اوسط ضخامت ۲۵۰ صفحے، کاغذ کتابت بہتر، قیمت درج نہین، پتہ ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن،

ہندوستان مین جہالت اتنی عام ہے، کہ اس کی پوری تعلیم کے لئے ایک مدت درکار ہے، اس کا وقتی علاج صرف تعلیم بالغان ہے، جس کے ذریعہ بقدر خواندگی تعلیم عام ہو سکتی ہے، ہندوستان مین جابجا اس کے کامیاب تجربے کئے گئے ہین، پروفیسر فرینک سی لاخ جنھین تعلیم بالغان کا وسیع تجربہ ہے، اور ہندوستان کے تجربات سے بھی ان کو پوری واقفیت ہے، اس موضوع پر یہ جامع کتاب لکھی تھی، اس مین تعلیم بالغان کی اہمیت و ضرورت، ہندوستان مین اس کے تجربات و نتائج، اس کے نصاب و تعلیم کے طریقون، اور ان تمام تعلیمی اور عملی وسائل و ذرائع کو جو تعلیم بالغان کے لئے مفید اور کارآمد ہو سکتے ہین، نہایت بسط و شرح

کے ساتھ بیان کیا ہے، یہ کتاب اس موضوع سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔

غدر دہلی کے افسانون کا سلسلہ، مرتبہ شمس العلما جناب خواجہ حسن نظامی، ۱۲ حصے، قیمت مجموعی

گیارہ روپے، پتہ دفتر لوح محفوظ، اردو لائبریری دہلی،

خواجہ حسن نظامی صاحب کے مرتب کردہ غدر دہلی کے افسانون کا سلسلہ اتنا مشہور اور مقبول ہے، کہ اس کے لئے کسی نئے تعارف کی ضرورت نہیں، یہ سلسلہ اب سے پچیس تیس سال پہلے شروع ہوا تھا، اور اتنا مقبول ہوا کہ اوس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہین، ادہر اڈیشن مین نئے معلومات کا اضافہ ہوتا رہا، بعض مستقل کتابون کا بھی اضافہ ہوا، ان مین سے اکثر حصے خواجہ صاحب کی مستقل تالیف ہین جو انھون نے دہلی کے پرانے لوگون سے سن کر لکھے، اور بعض غدر کے زمانہ کے ..... روزنامچون خطوط اخبارات، اور سرکاری کاغذات وبیانات سے ماخوذ ہین، یہ کل ۱۲ حصے ہین، بیگمات کے آنسو، انگریزون کے قصے، محاصرہ دہلی کے خطوط، بہادر شاہ کا مقدمہ، غدر کے فرمان، غدر دہلی کے اخبار، غالب کا روزنامچہ، دہلی کی جان کنی، بہادر شاہ کا روزنامچہ غدر کی صبح وشام، دہلی کی آخری شمع، دلی کی سزا، گیارہوان حصہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا، مشہور معروف دلی کا آخری مشاعرہ ہے،

نکتہ چین ہے غم دل، مترجمہ جناب آغا فتح حسین صاحب بی اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۸۷ صفحے

کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت فی جلد ہ۸ رہے، پتہ:- نفیس اکیڈمی، عابد روڈ حیدرآباد دکن،

یہ کتاب برنارڈ شاہ کے مشہور ڈرامے "مین اینڈ سپرمین" کا ترجمہ ہے، جس مین ایک شعبدہ گر اور عشوہ طراز عورت اپنے شاعر مزاج اور بھولے عاشق کو محبت کے فریب مین مبتلا رکھ کر ایک دوسرے خوش مزاج بذلہ سنج اور چرب زبان نوجوان سے جو بظاہر اس سے بھاگتا ہے لیکن دل مین اس کی محبت چھپائے ہے، شادی کر لیتی ہے اس ڈرامے مین برنارڈ شاہ کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہین، اور اس زمانہ کے بہت سے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظریات ومسائل اور جدید دور کی بعض خوشنما اور پرفریب اصطلاحون اور سائنس وآرٹ اور بعض

نہایت مبصرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، اور اُن کا حل پیش کیا گیا ہے، اصل خطبہ انگریزی زبان میں ہے، اور اس میں مولانا مرحوم کے زور بیان اور ادب وانشا کی تمام خوبیاں موجود ہیں، جناب شاہین فاروقی نے اس کا ترجمہ کیا ہے، گو اتنی طویل مدت میں بڑا انقلاب ہو چکا ہے، سیاست کی دنیا ہی بدل گئی ہے، ہندوستان آزاد ہو چکا ہے اس لئے اس خطبہ کی بہت سی باتیں قصۂ پارینہ بن چکی ہیں، لیکن ہندو مسلم مسائل اور ان کے اتحاد کے بارہ میں آج بھی اس خطبہ سے مدد مل سکتی ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے اس کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے، ترجمہ شگفتہ اور سلیس ہے لیکن اس پر جو مقدمہ اور کتاب پر جابجا جو نوٹ ہیں، وہ نہ صرف اس ترجمہ کے مقصد کے منافی بلکہ نہایت نامناسب ہیں، آج کل سیاسی تغیرات کی تیز رفتاری کا یہ حال ہے، کہ چند مہینے پہلے تک جو سیاست تھی، وہ اب بالکل بدل گئی ہے، اور برابر بدلتی جائے گی، ان حالات میں جو خیالات مقدمہ میں ظاہر کئے گئے ہیں ان کی اب قطعاً کوئی گنجائش نہیں، "امن کی راہ کی" "تلاش میں" "فریب کاری" کی بدامنی کی دعوت کس قدر متضاد ہے،

ان پڑھ ہندوستان مترجمہ جناب سید ملا فخرالدین صاحب بی اے بی ٹی، لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد، تقطیع اوسط ضخامت ۳۰۵ صفحے، کاغذ کتابت بہتر، قیمت درج نہیں، پتہ ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن،

ہندوستان میں جہالت اتنی عام ہے، کہ اس کی پوری تعلیم کے لئے ایک مدت درکار ہے، اس کا وقتی علاج صرف تعلیم بالغان ہے، جس کے ذریعہ بقدر خواندگی تعلیم عام ہو سکتی ہے، ہندوستان میں جابجا اس کے کامیاب تجربے کئے گئے ہیں، پروفیسر فرینک سی لاخ جنھیں تعلیم بالغان کا وسیع تجربہ ہے، اور ہندوستان کے تجربات سے بھی ان کو پوری واقفیت ہے، اس موضوع پر یہ جامع کتاب لکھی تھی، اس میں تعلیم بالغان کی اہمیت وضرورت، ہندوستان میں اس کے تجربات ونتائج، اس کے نصاب تعلیم کے طریقوں، اور ان تمام تعلیمی اور عملی وسائل وذرائع کو جو تعلیم بالغان کے لئے مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں، نہایت بسط وشرح

کے ساتھ بیان کیا ہے، یہ کتاب اس موضوع سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے،

غدر دہلی کے افسانوں کا سلسلہ، مرتبہ شمس العلماء جناب خواجہ حسن نظامی، ۱۲ حصے، قیمت مجموعی گیارہ روپئے، پتہ دفتر لوح محفوظ، اردو لائبریری دہلی،

خواجہ حسن نظامی صاحب کے مرتب کردہ غدر دہلی کے افسانوں کا سلسلہ اتنا مشہور اور مقبول ہے، کہ اس کے لئے کسی نئے تعارف کی ضرورت نہیں، یہ سلسلہ اب سے پچیس تیس سال پہلے شروع ہوا تھا، اور اتنا مقبول ہوا کہ اوس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، اور ہر اڈیشن میں نئے معلومات کا اضافہ ہوتا رہا، بعض مستقل کتابوں کا بھی اضافہ ہوا، ان میں سے اکثر حصے خواجہ صاحب کی مستقل تالیف ہیں جو انھوں نے دہلی کے پرانے لوگوں سے سن کر لکھے، اور بعض غدر کے زمانہ کے ..... روزنامچوں خطوط اخبارات، اور سرکاری کاغذات وبیانات سے ماخوذ ہیں، یہ کل ۱۲ حصے ہیں، بیگمات کے آنسو، انگریزوں کے قصے، محاصرہ دہلی کے خطوط، بہادر شاہ کا مقدمہ، غدر کے فرمان، غدر دہلی کے اخبار، غالب کا روزنامچہ، دہلی کی جان کنی، بہادر شاہ کا روزنامچہ غدر کی صبح وشام، دہلی کی آخری شمع، دلی کی سزا، گیارہواں حصہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا مشہور معروف دلی کا آخری مشاعرہ ہے،

نکتہ چین ہے غم دل، مترجمہ جناب آغا افتخار حسین صاحب بی اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۸۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت فی جلد ۲ رہے، پتہ :- نفیس اکیڈمی، عابد روڈ حیدرآباد دکن،

یہ کتاب برنارڈ شاہ کے مشہور ڈرامے "مین اینڈ سپر مین" کا ترجمہ ہے، جس میں ایک شعبدہ گر اور عشوہ طراز عورت اپنے شاعر مزاج اور بھولے عاشق کو محبت کے فریب میں مبتلا رکھ کر ایک دوسرے خوش مزاج بذلہ سنج اور چرب زبان نوجوان سے جو بظاہر اس سے بھاگتا ہے لیکن دل میں اس کی محبت چھپائے ہے، شادی کر لیتی ہے اس ڈرامے میں برنارڈ شاہ کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں، اور اس زمانہ کے بہت سے سیاسی اقتصادی اور معاشرتی نظریات ومسائل اور جدید دور کی بعض خوشنما اور پر فریب اصطلاحوں اور سائنس و آرٹ اور بعض

دوسرے عقائد وخیالات پر نہایت فلسفیانہ انداز مین نقد وتبصرہ کیا گیا ہے، ترجمہ سلیس وشگفتہ ہے،

تلقینِ حق از جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت ۱۰ ۔ پتہ ادارہ تعلیمات اسلامی نمبر ۱۳۰ ، امین آباد پارک لکھنؤ،

فاضل مصنف کی نگاہ قدیم مذاہب اور ان کے صحیفون پر بڑی گہری اور وسیع ہے، اس رسالہ مین انھون نے مختلف عقائد کے بارہ مین ان مذاہب کی تعلیمات اور بعید از عقل افسانون کے مقابلہ مین اسلام کے عقائد و تعلیمات، اس کی توحید، دوسرے صحیفون کے مقابلہ مین کلام مجید کی خصوصیات وحی، کلام مجید کے ممتاز اور نمایان مضامین، احکام، اہل مذاہب سے مناظرہ، گذشتہ امتون کے سبق آموز حالات، عجائبات عالم مین تفکر کی دعوت اور ان سے استدلال، حیات بعد الممات اور جزا و سزا وغیرہ اسلام کے ارکان خمسہ، توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی حکمتوں کو ایسے دلنشین انداز مین بیان کیا ہے جن سے دوسرے مذاہب کی تعلیمات کے مقابلہ مین اسلام کی تعلیمات کی سادگی دلنشینی صداقت اور برتری کا اندازہ ہوتا ہے، گو یہ کتاب طالب علمون کے لیے لکھی گئی ہے، لیکن ہر شخص کے مطالعہ کے لائق ہے،

سفینہ جناب شفیق جونپوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت :-عہ/ پتہ نسیم بک ڈپو، وانوار بک ڈپو، لکھنؤ، وسکریٹری بزم ادب جونپور،

مصنف کے کلام کی شہرت محتاج تعارف نہین اُن کے کلام کے کئی مجموعے چھپ کر مقبول ہو چکے ہین، سفینہ نیا مجموعہ ہے، اس مین غزلیات کے علاوہ مذہبی اخلاقی اور قومی نظمین بھی ہین، اور ان سب مین کلام کی پختگی، خیالات کی پاکیزگی، زبان کی نفاست اور انداز بیان کی دل آویزی نمایان ہے امید ہے کہ یہ مجموعہ اصحاب ذوق مین مقبول ہوگا،

تابعینؒ

مرتبہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور اُن کے تربیت یافتہ تابعین
رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہؓ
ل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت
ن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت
جعفرؒ صادق، حضرت محمد حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ
رت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحول شامیؒ، قاضی شریحؒ، وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ
سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

ضخامت :- ۵۶۰ صفحے،

قیمت :- چار روپئے،

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

دیباچہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کا ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید وتاریخ ہے دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات اعمال وعبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے، جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید وتفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے اور دوسرے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق، فضائل اور آداب کے عنوان اور اس کی ذیلی سرخیوں کے تحت اخلاقی تعلیم کی تفصیل ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول زیر طبع للعمر حصہ دوم تقطیع خورد ۲ روپیہ، حصہ سوم تقطیع کلاں للعمر تقطیع خورد مشر، حصہ چہارم تقطیع کلاں باختلاف کاغذ ۲ روپے و تقطیع خورد عہر، حصہ پنجم تقطیع کلاں صر و للعمر و تقطیع خورد ۲ روپیہ، حصہ ششم تقطیع کلاں صر للعمر و تقطیع خورد عہر و عہر،

(پرنٹر وپبلشر صدیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۱ فروری ۱۹۴۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت :- چھ روپیے سالانہ

دفتر رسالہ دار المصنفین اعظم گڑھ

دار المصنفین کی نئی کتاب

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ،

ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا قافلہ سندھ میں اترا تھا، اور ان کی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی، اور وہ ایکہزار سال سے اوپر یہاں کے حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے اُن کے آثار نمایاں ہیں، لیکن اس کے باوجود اردو مین اسلامی سندھ کی کوئی مفصل و محققانہ تاریخ موجود نہین تھی، دار المصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ مین جن حکومتون کے ماتحت رہا، ان کی پوری تاریخ اور ان تمام دورون کے نظامِ حکومت علمی و تمدنی حالات اور رفاہِ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اسکو یاد کرنیکی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت مین شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہاں ایک نئی حکومت کی بنیادین استوار ہو رہی ہین،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے،

قیمت:- چھ روپیے،

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۶۱ ماہ ربیع الاول ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۸ء عدد ۲

مضامین

شذرات

فدائے انسانیت گاندھی!

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

واحسرتا کہ آج قلم کو امن و سلامتی کے اس داعی اعدل و انصاف کے اس علمبردار، اور اخلاص و عمل کے اس پیکر کا ماتم کرنا پڑا جو ساری عمر ملک و قوم کا غمگسار رہا، اور اس کی راہ میں جانِ عزیز تک قربان کردی اور کس قدر عبرت کا مقام ہے، کہ اسی بدقسمت ملک و قوم کے ایک فرد کے ہاتھوں اس کے محسنِ اعظم کی شمعِ حیات گل ہوئی جس کی عزت و سربلندی کے لئے اس نے اپنی پوری عمر صرف کردی، اور اس کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی تک پہنچا دیا لیکن دنیا کے بہت سے اکابر اور محسنین انسانیت اس درجۂ عظمیٰ پر سرفراز ہوئے، پھر یہ جلیل القدر انسان اس خلعتِ امتیاز سے کیوں محروم رہتا، یہ تو اس کی عظمت و جلالت کی آخری اور سب سے بڑی سند ہے،

مادیت کے اس تاریک دور میں جب کہ مہذب انسان انسانیت کی بربادی کے درپے، ایٹم بم کی تیاری میں مشغول، ساری دنیا آگ و خون کے سمندر میں غرق اور امن و سلامتی کو ترستی ہے، اس محسنِ انسانیت نے دنیا کو الفت و محبت اور اخوت و مساوات کا

پیام دیا، اور اخلاق و روحانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، اور بے تیغ و تفنگ کے اخلاقی قوت سے فتح حاصل کرنا اور دلوں کو مسخر کرنا سکھایا، اور عملاً ثابت کرکے دکھا دیا، کہ دنیا مین اصل طاقت اسلحہ کی نہین بلکہ اخلاق کی ہے، اور اسی کے ذریعہ دنیا مین ہندوستان کا سر اونچا کیا، اوس نے مکر و فریب کی سیاست مین سچائی کی روح پھونکی، وہ مظلومون کا حامی، غریبون کا سہارا، اور بے نواؤن کا آسرا تھا، اس نے غریب بن کر غریبون کی خدمت کی، اور غربت ہی مین اس دنیا سے سدھارا، اُس نے نیکی اور سچائی کے لئے جان دی، عدل و انصاف کے لئے جان دی، اخلاق و شرافت کے لئے جان دی، اس لئے اس کی موت درحقیقت ہندوستان کی عزت و ناموس اور اس کے وقار و عظمت کی موت، اور عالم انسانیت کا حادثہ ہے،

اس کی زندگی مین ہندوستان کی سیاست مین بڑے بڑے انقلاب آئے، نفرت و عداوت کی آندھیان چلین، وحشت و درندگی کے طوفان اٹھے، سفاکی اور خونخواری کے پہاڑ ٹوٹے، لیکن یہ کوہ وقار اپنی جگہ پر قائم رہا، اور کوئی قوت اسے ہلا نہ سکی، اس استقلال مین جان تک دیدی اور مرکر ثابت کر دیا کہ وہ کسی خاص فرقہ و قوم کا نہین بلکہ پورے ہندوستان کا لیڈر تھا،

اس لحاظ سے وہ خوش نصیب تھا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے آزادی کا بیج بویا، اور اس کے نازک پودے کو سیاست کے طوفانی حوادث سے بچا کر پروان چڑھایا، لیکن یہ کتنے حسرت و اندوہ کا مقام ہے، کہ جب اوس کے برگ و بار لانے کا وقت آیا تو باغبان خود اس دنیا سے رخصت ہوگیا، اور اپنے چمن کی بہار نہ دیکھ سکا، ابھی تو آزادی کا صرف دروازہ کھلا تھا، اصل منزل مقصود دور تھی کہ اور آہ! آزادی کا سالار خود [illegible] گیا، آزادی ملتے ہی نفرت و عداوت کی ایسی آگ بھڑکی جس

ہندوستان کے حاصل اور ماحصل خرمن ہی کو جلا کر خاکستر کردیا، یہ ہندوستان کی پیشانی پر ایسا کلنک کا ٹیکہ ہے، جو مٹائے نہ مٹے گا، لیکن جلنے والا اس جہان سے سرخرو اٹھا، اور دنیا میں ہمیشہ کے لئے نیک نام چھوڑ گیا،

ہرگز نہ میرد آن کہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ سنت اللہ ہو کہ سچی قربانی کبھی رائگان نہیں جاتی، قربانی کرنے والے کا مادی وجود تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کا نصب العین ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتا ہے، اور جو روح زندگی نہ پیدا کر سکی تھی، وہ موت پیدا کر دیتی ہے، دنیا کی تاریخ اس کی شاہد ہے، ہندوستان کے فدائی اعظم نے اس کے لئے سب سے بڑی قربانی پیش کی ہے، یہ اپنا اثر دکھا کر رہے گی، اور ہندوستان کا چمن اس کے خون کی آبیاری سے لہلہائے گا،

اگر ہماری عقلوں پر پردے نہیں پڑ گئے ہیں، تو گاندھی کی موت ہندوستان کی زندگی بن سکتی ہے، اس وقت بلاتفریق مذہب و ملت ہر ہندوستانی اوس کی یاد میں دلفگار اور تلافی مافات کے لئے بے قرار ہے، ان جذبات سے اس کے مشن کی تکمیل کا کام لیا جاسکتا ہے، گاندھی کی سب سے بڑی محبت اور سب سے بڑی یادگار یہی ہے کہ اس مشن کو مقصد بنا لیا جائے یہی امن و سلامتی کی راہ اور ہندوستان کی فلاح و ترقی کا صحیح راستہ ہے، اور اسی سے اس کی روح مسرور ہوگی، اگر ہم اتنا بھی نہ کر سکے، تو ہماری محبت کے سارے دعوے باطل ہیں،

مقالات

اسلامی طب کی مختصر تاریخ

از

مولانا عبدالسلام ندوی

(۲)

مشرق یعنی عراق و بغداد میں اسلامی طب کو جو ترقیان ہوئین، یہ اُن کی اجمالی تاریخ ہے لیکن اسلام کی ابتدائی دو صدیون تک مغرب یعنی اندلس میں کوئی مسلمان طبیب نہین پیدا ہوا، البتہ تیسری صدی کے آغاز مین سب سے پہلے جس شخص نے اہلِ مغرب کو طب و فلسفہ سے آشنا کیا، وہ ایک بغدادی طبیب اسحاق بن عمران تھا جس کو زیادۃ اللہ بن اغلب التیمی نے اپنے دورِ حکومت (۲۰۱ھ - ۲۲۳ھ) مین بغداد سے بلوایا تھا، اور اوس نے ایک مدت تک قیروان مین قیام کرکے نہایت کامیابی کے ساتھ مطب کیا تھا،[۱]

اسحاق بن عمران کا ایک شاگرد اسحاق بن سلیمان اسرائیلی تھا، اور اس کو بھی زیادۃ اللہ بن الاغلب تمیمی نے معقول تنخواہ دیکر مصر سے بلوایا، اور اس نے قیروان مین قیام کرکے اسحاق بن عمران کی شاگردی کی، اور طویل عمر پاکر تقریباً ۳۲۰ھ مین وفات پائی،[۲] لیکن اب تک مغرب مین طب و فلسفہ کی عام اشاعت نہین ہوئی تھی، اس لئے جو شخص ان علوم مین مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا، اوس کو مجبوراً مشرق کا سفر کرنا پڑتا تھا چنانچہ اس غرض سے سب سے پہلے دو بھائیون یعنی احمد اور عمر نے ناصر کے دورِ سلطنت مین ۳۳۰ھ مین مشرق کا سفر کیا

اور وہاں دس سال تک مقیم رہے، پھر بغداد میں آئے اور ثابت بن سنان بن ثابت بن قرہ صابی سے جالینوس کی کتابیں پڑھیں اور خلیفہ مستنصر باللہ کے زمانہ میں ۳۵۱ھ میں پلٹ کر اندلس آئے، اور ان کے دربار میں طبی خدمت پر مامور ہوئے، اور نہایت وسیع پیمانے پر طبی خدمات انجام دیتے رہے، احمد کی نسبت ابن جلجل نے لکھا ہے کہ بارہ لڑکے اس کے ملازم تھے، اور اس کے سامنے شربت اور معجون تیار کرتے تھے، اور وہ مستنصر کی اجازت سے ان کو غربا اور مریضوں کو تقسیم کرتا تھا[1]،

اسی زمانہ میں ایک اور طبیب محمد بن عبدون الجبلی نے ۳۴۷ھ میں مشرق کا سفر کیا، اور بصرہ، فسطاط اور مصر میں قیام کرکے فنِ طب میں مہارت حاصل کی اور ۳۶۰ھ میں اندلس میں واپس آیا، اور حکم کے دربار میں طبی خدمت پر مامور ہوا[2]،

ایک اور طبیب ابوالحکم عمرو بن عبدالرحمان بن احمد بن علی الکرمانی المتوفی ۴۵۸ھ نے بھی مشرق کا سفر کیا، اور حران میں قیام کرکے طب اور ہندسہ کی تعلیم حاصل کی، اور وہاں سے پلٹ کر آیا، تو سرقسطہ میں قیام کیا، وہ معالجات کے علاوہ سرجری میں بھی کمال رکھتا تھا[3]،

مغرب میں خاندان زہر ایک مستقل طبی خاندان تھا جس میں ایک مدت تک مسلسل بڑے بڑے اطبا پیدا ہوتے رہے، اس خاندان میں سب سے پہلے ابو مروان عبدالملک نے طبی حیثیت سے شہرت حاصل کی، اس نے مشرق کا سفر کیا، اور وہاں ایک طویل مدت تک مطب کرتا رہا، اور پہلے بغداد کا پھر مصر کا، پھر قیروان کا رئیس الاطبا مقرر ہوا، مشرق سے پلٹ کر اندلس آیا اور شہر دانیہ میں قیام کیا، پھر دانیہ سے منتقل ہو کر اشبیلیہ میں قیام کیا اور ابن ابی اصیبعہ کی روایت کے مطابق وہیں وفات پائی[4]، لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ ایک مدت تک اگرچہ مغرب طبی معاملات میں مشرق کا زیر بار احسان رہا، تاہم وہاں پانچویں صدی تک شیخ بوعلی سینا کی طبی تصنیفات کو حسن قبول حاصل نہیں ہوا، طب میں شیخ کی سب سے مقبول و مشہور کتاب قانون ہے، لیکن اس کا نسخہ سب سے

۱؎ طبقات الاطبا جلد دوم صفحہ ۴۵، ۴۶ ، ۲؎ ۵۳ صفحہ ، ۳؎ صفحہ ، ۴؎ صفحہ ۴۳ ، و ابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۱۰۱ ،

پھر خاندانِ زہر کے ایک مشہور طبیب ابو العلاء زہر المتوفی ۵۲۵ھ کے زمانہ میں مغرب میں پہنچا، جس کو ایک تاجر عراق سے اندلس میں لایا تھا، اور چونکہ اس سے اس کی بڑی تعریف کی گئی تھی، اس لئے اس نے تقرب حاصل کرنے کی غرض سے اوس کو ابو العلاء زہر کی خدمت میں تحفۃً پیش کیا، لیکن ابو العلاء نے اس کو سخت ناپسند کیا، اور اس کو اپنے کتب خانے میں داخل کرنے کے قابل نہیں سمجھا، بلکہ اس کے حاشیے کے سادہ کاغذ کو کاٹ کاٹ کر اس پر نسخے لکھنے شروع کر دیئے،[1]

اس خاندان کی بدولت مغرب میں فنِ طب کو بہت زیادہ ترقی ہوئی، مشرق میں اگرچہ اس فن نے مغرب سے پہلے ترقی کی تھی، تاہم مشرق میں اب تک کوئی عورت طبیب نہیں ہوئی تھی، لیکن خاندانِ زہر کی بعض عورتیں بھی طب کی ماہر تھیں، اور عورتوں کا خاص طور پر علاج کرتی تھیں، چنانچہ اس خاندان کے ایک مشہور طبیب حفید ابو بکر بن زہر کی بہن، اور اس کی بھانجی بھی طبیب تھیں، اور خلیفہ منصور کے گھر کی عورتوں کا علاج کرتی تھیں، اور اوس کے محل میں جب کسی بچے کی ماں کا انتقال ہو جاتا تھا، تو اس کی پرورش کا انتظام بھی انہی دونوں کے متعلق ہوتا تھا،[2]

مغربی اطباء کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ اُن کو مفرد دواؤں کی تحقیقات سے خاص طور پر دلچسپی تھی، اور اطبائے شام و بغداد نے اس فن کو جس قدر ترقی دی تھی، اطبائے مغرب نے اس کو اس سے بہت زیادہ ترقی دی، ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ادویہ مفردہ کے نام و خواص پر یونان کے ایک حکیم دیسقوریدس نے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا ترجمہ جعفر متوکل کے زمانہ میں اصطفن بن بسیل نے یونانی زبان سے عربی میں کیا تھا، لیکن اصطفن نے جن یونانی دواؤں کے نام عربی زبان میں پائے، ان کا ترجمہ تو عربی میں کر دیا، لیکن عربی میں جن یونانی دواؤں کے نام اوس کو معلوم نہ تھے، ان کو بعینہٖ یونانی زبان میں رہنے دیا تھا، اصطفن کا یہی ناقص ترجمہ اندلس میں پہنچا، اور لوگ اس کی مشہور دواؤں سے نامِ عبد الرحمٰن بن محمد کے زمانہ تک جو

[1] طبقات الاطباء جلد دوم ص ۶۵ [2] ،، ص ۷۰،

اندلس کا بادشاہ تھا، فائدہ اٹھاتے رہے، اس کے بعد ارمانیوس شاہ قسطنطنیہ نے ۳۳۷ھ میں ناصر کو ایک خط لکھا، اور خط کے ساتھ بہت سے قیمتی ہدیے بھیجے، جن میں ایک دیسقوریدس کی کتاب بھی تھی، اس میں جڑی بوٹیوں کی تصویرین بھی بنی ہوئی تھین، لیکن چونکہ یہ کتاب یونانی زبان میں تھی، اس لئے ارمانیوس نے ناصر کو لکھا کہ اس کتاب سے بجز ایک ایسے شخص کی مدد کے جو یونانی زبان اور دواؤن سے واقف ہو، فائدہ نہین اٹھایا جاسکتا، اگر آپ کے ملک مین اس قسم کا کوئی شخص ہو تو آپ اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہین، لیکن بدقسمتی سے قرطبہ کے عیسائیون مین کوئی شخص ایسا نہ تھا، جو قدیم یونانی زبان سے واقف ہو، اس لئے ناصر نے ارمانیوس کو لکھا کہ ایک ایسے شخص کو بھیجدو جو یونانی اور لاطینی زبان سے واقف ہو، تاکہ وہ چند آدمیون کو ان کی تعلیم دیسکے، اور وہ ترجمہ کرنے کے قابل ہو جائین، چنانچہ اوس نے نقولا راہب کو بھیجدیا، اور وہ قرطبہ مین ۳۴۰ھ مین پہنچا، اس وقت قرطبہ مین اطبا کی ایک ایسی جماعت موجود تھی، جو دیسقوریدس کی کتاب کی ان جڑی بوٹیون کی تحقیقات کرنی چاہتی تھی جن کے نام معلوم نہ تھے، ان مین اس کام سے زیادہ شائق حسدای بن بشروط اسرائیلی تھا، اور نقولا راہب کو اس کے ساتھ خاص تعلق تھا، اور اس نے اس کتاب کی نامعلوم الاسم جڑی بوٹیون کی تفسیر کی، اس کے علاوہ محمد المعروف بالشجار، بسباسی، ابوعثمان الجزار الملقب بالیابسہ، محمد بن سعید الطبیب، عبدالرحمٰن بن اسحٰق بن ہیثم، اور ابو عبداللہ الصقلی، ایک ہی زمانے مین نقولا راہب کے ساتھ سرگرم تحقیقات تھے، سلیمان بن جلجل اندلسی کو بھی ان مفرد دواؤن کی تحقیقات کا نہایت شوق تھا، اور وہ مستنصر حکم کے زمانے مین ان سب کا شریک صحبت رہ چکا تھا، اور ان سب کی تحقیقات سے جب وہ سب دوائین معلوم ہوگئین جو شہر قرطبہ مین موجود تھین، اور ان کے نام کا تلفظ صحیح ہوگیا، تو سلیمان بن جلجل نے ۳۷۲ھ مین ہشام بن الحکم المؤید باللہ کے زمانہ مین دیسقوریدس کی کتاب کی مفرد دواؤن کے نامون کی تفسیر کی، اس کے ساتھ خود ایک رسالہ لکھا جس مین ان دواؤن کے نامون کا اضافہ کیا، جو طب مین مستعمل ہین، لیکن دیسقوریدس نے اپنی کتاب مین ان کا ذکر نہین کیا تھا، کیونکہ یا تو اوس نے ان کو

ہکتا ہی نہیں تھا، بلکہ اس کے زمانہ میں مستقل دقیقیں سلیمان بن جلجل اور اس کے ہمعصر اطبا کے علاوہ اور بھی بہت سے اندلسی اطبا مثلاً ابن وافد ابن بجون، البکری، غافقی، شریف اور ابو العباس بن رومیہ میں جن کو ادویہ مفردہ کی تحقیقات سے نہایت دلچسپی تھی، اور انھوں نے اس سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں چنانچہ ان کے متعلق علامہ ابن ابی اصیبعہ نے جو کچھ لکھا ہے، ہم بہ ترتیب اس کا خلاصہ اس موقع پر درج کرتے ہیں :-

ابن وافد ۳۸۷ھ میں پیدا ہوا، اور ۴۶۰ھ تک زندہ تھا، اوس نے ادویہ مفردہ کے علم میں مہارت حاصل کی، اور اتنی دواؤں کے نام لکھے کہ اس کے زمانہ میں کسی نے نہیں لکھے تھے، اوس نے اس فن میں ایک بے نظیر کتاب لکھی، اور ادویہ مفردہ کے متعلق دیسقوریدس اور جالینوس نے جو کتابیں لکھی تھیں ان سب کو اس کتاب میں جمع کر دیا، اوس نے ادویہ مفردہ کے ناموں کی تصحیح، ان کے اوصاف، قوی اور درجات کی تحدید میں ۲۰ سال صرف کئے، اور اس جانفشانی کے بعد کتاب اس کی خواہش کے مطابق تیار ہوئی[۱]

ابن بجون ادویہ مفردہ کے قوی وافعال کے علم میں ممتاز تھا، اور ادویہ مفردہ کی تحقیقات میں اس کی کتاب اپنی خوبی کے لحاظ سے مشہور تھی،

اوس نے اس کتاب کے لکھنے میں بڑی جانفشانی کی تھی، اور ادویہ مفردہ کے متعلق قدما کی بہت سی رائیں جمع کر دی تھیں، اس نے یہ کتاب منصور الحاجب محمد بن ابی عامر المتوفی ۳۹۲ھ کے زمانہ میں لکھی تھی[۲]

بکری ادویہ مفردہ، ان کے قوی ومنافع اور ناموں کے علم میں ممتاز تھا، اور اس فن میں اعیان النبات والشجریات الاندلسیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی[۳]

غافقی ادویہ مفردہ کے قوی، منافع، خواص اور ان کے ناموں کا اپنے زمانے میں بہت بڑا عالم تھا،

---

[۱] طبقات الاطباء جلد دوم ص ۵۰، [۲] ص ۵۲، [۳] ص ۵۲، ص ۵۲

بعد ادویہ مفردہ کے متعلق اوس کی کتاب اپنا نظیر نہین رکھتی، دیسقوریدس اور جالینوس نے ادویہ مفردہ کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، اوس نے اس کتاب مین اوس کو مختصر طور پر جمع کر دیا ہے، پھر ان کے بعد ادویہ مفردہ کے متعلق متاخرین نے جو نئی رائین قائم کی تھیں، یا یہ کہ ہر طبیب نے الگ الگ جن دواؤن کا پتہ لگایا تھا، ان کا بیان کیا ہے، اس بنا پر اوس کی کتاب ادویہ مفردہ کے متعلق تمام اطبار کے اقوال کا مجموعہ تھی[۵۱]

شریف ادویہ مفردہ کے قوی منافع اور مناسبت کا عالم تھا، اور اس نے اس فن مین ایک کتاب لکھی تھی۔

مغرب کے ان اطبار مین جنھون نے علم النباتات کی تحقیقات کو اپنا خاص موضوع بنا لیا تھا، دو شخصون نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی، ایک ابو العباس بن رومیہ جو اشبیلیہ کا رہنے والا، اور علم النباتات ان کے تشخص، ان کے قوی، منافع، ان کے مختلف اوصاف اور ان کے مقامات کے اختلافات کا بڑا ماہر تھا، وہ سنہ ۶۱۳ ھ مین دیار مصر مین آیا، اور مصر و شام و عراق مین دو سال تک قیام کر کے ان جڑی بوٹیوں کو جو مغرب مین نہین ہوتی تھین، یہان کے شہرون مین خود ان مقامات مین دیکھا، جہان وہ اگتی تھین، الملک العادل ابوبکر بن ایوب نے اوس کی شہرت سنی تو اس کو اسکندریہ سے قاہرہ مین بلا کر اس کا وظیفہ مقرر کر دیا، اور مستقل قیام کی خواہش کی، اوس نے ایک مدت تک اس کے یہان قیام کیا، لیکن چونکہ اس سفر کا اصلی مقصد فریضۂ حج کا ادا کرنا تھا، اس لئے حج کر کے مغرب کو واپس گیا، اور اشبیلیہ مین قیام کیا[۵۲]

دوسرا ضیاء الدین ابن بیطار جو علم النباتات کا بڑا ماہر تھا، اور جڑی بوٹیون کی تحقیقات کے لئے یونان اور روم کے اکثر شہرون کا سفر کیا تھا، اور جو لوگ اس فن کے ماہر تھے، اُن سے مل کر جڑی بوٹیون کا علم حاصل کیا تھا، اور یہ جڑی بوٹیان جن مقامات مین پیدا ہوتی تھین، اون مقامات مین بذاتِ خود جا کر ان کا معائنہ کیا تھا، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ مین پہلی بار اوس سے سنہ ۶۳۳ ھ مین دمشق مین ملا، اور دمشق کے باہر اس کے ساتھ جا کر بہت سی جڑی بوٹیون کو اُن کے نشو و نما کے مقام مین دیکھا، اور اس نے دیسقوریدس

---

[۵۱] طبقات الاطبار جلد دوم ص ۵۲، [۵۲] طبقات الاطبار جلد دوم ص ۸۱،

کی کتاب کی دواؤن کے نامون کی جو تفسیر کی تھی، اوس کو خود اس سے پڑھا، اور اس طریقہ سے مجھ کو اس کے تجرعلمی کا حال معلوم ہوا، ادویۂ مفردہ کے متعلق دیسقوریدس، جالینوس اور غافقی وغیرہ نے جو کتابین تصنیف کی تھین، وہ ہمارے سامنے رکھی جاتی تھین، تو وہ سب سے پہلے ہر دوا کے وہ یونانی نام اور وہ افعال وخواص بتلاتا تھا جس کو دیسقوریدس نے اپنی کتاب مین لکھا تھا، پھر اوس کے وہ خواص وافعال بتاتا تھا جس کو جالینوس نے بتایا تھا، پھر متاخرین کی تحقیقات اور اختلافات کو بیان کرتا تھا اوس کے بعد مین اوس کے ساتھ ان کتابون کا مطالعہ کرتا تھا، تو معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ان کتابون کی کوئی بات نہین چھوڑی ہے، سب سے عجیب تر بات یہ تھی کہ وہ جس دوا کا ذکر کرتا تھا، اس کے متعلق متعین طور پر یہ بتا دیتا تھا کہ اس کا نام دیسقوریدس اور جالینوس کی کتاب کی فلان فصل مین ہے، اور دواؤن کے سلسلۂ ترتیب مین اس کا فلان نمبر ہے

ایک ماہر علم النباتات کی حیثیت سے اوس نے شہرت حاصل کی، تو ملک الکامل محمد بن ابی بکر بن ایوب نے اوس کو ملک مصر کے تمام دوا فروشون اور عطارون کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا، جس کو رئیس العشابین کہتے تھے[۱]

اس تمام تفصیل سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے، وہ یہ ہے،

(۱) اسلام سے پہلے طب کے چار مرکز تھے، جندیساپور، حران، اسکندریہ اور ہندوستان، بغداد مین مسلمانون نے ان چارون مرکزون کو ایک جگہ جمع کر لیا، اور سب سے یکسان فائدہ اٹھایا، اس لئے اسلامی طب سب سے زیادہ جامع و مکمل ہو گئی،

(۲) غالباً مسلمانون سے پہلے ہر ملک مین صرف وہی دوائین استعمال کی جاتی تھین، جو اس ملک مین پیدا ہوتی تھین، لیکن مسلمانون نے ہر ملک کی دواؤن سے فائدہ اٹھایا، سب سے پہلے برامکہ نے ہندوستان کی جڑی بوٹیان بغداد مین منگوائین، پھر رشید الدین صوری نے دمشق کی جڑی بوٹیون کی تحقیقات کی اس کے بعد اطباے مغرب مین ابن بیطار وغیرہ نے یونان وروم وغیرہ کی جڑی بوٹیون کا پتہ لگایا، اس لئے

---

[۱] طبقات الاطبا، جلد دوم ص ۱۳۳،

اسلامی طب نے ہر ملک کی دواؤن سے فائدہ اٹھایا [illegible] عطاری [illegible]
چنانچہ اسلامی طب مین جو دوائین مستعمل ہین اُن کے نامون پر سرسری نظر ڈالنے سے اس کی تصدیق
ہو سکتی ہے، قسط ہندی، عود ہندی، ساذج ہندی، سناء مکی، مصطگی رومی، [illegible] بخارا، اجوائن خراسانی
ثعلب مصری، نمک لاہوری، ریوند چینی، صبر سقوطری، عشبہ مغربی، زہر مہرہ خطائی، زیرہ کرمانی، گل ارمنی، گل ملتانی
بورہ ارمنی، افتیمون رومی، عقیق یمنی، گلنار فارسی، تربد اکبرآبادی، اسگند رومی، صمغ عربی، انار قندھاری،
گل بنفشہ کشمیری، مربہ آملہ بنارسی وغیرہ کے نامون سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ طب اسلامی نے ہر ملک کی
دواؤن سے فائدہ اٹھایا ہے، اور ہر ملک کی بہترین پیداوار سے دواؤن کا انتخاب کیا ہے،

مفردات کے بعد مرکبات کا درجہ ہے، اور اسلامی اطباء کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ
انھون نے اس مین بھی کمال کا درجہ حاصل کر لیا تھا، احمد بن یونس کے حالات مین لکھا ہے کہ وہ شربت اور
معجون بنانے مین کمال رکھتا تھا، اور اُن کی تیاری کے لئے اس کے یہان ۱۲ ملازم تھے، جو ہمہ وقت اس
کام مین مصروف رہتے تھے، اگرچہ اکثر اس قسم کے مرکبات امراء و سلاطین کے لئے تیار کئے جاتے تھے، لیکن
اُس نے خلیفہ مستنصر سے درخواست کی کہ اگر اجازت ہو تو غرباء و مساکین اور عام مریضون کو بھی تقسیم کئے
جائین، چنانچہ اوس نے اوس کی اجازت دی[1]، بعض اطباء صرف مرکبات سے علاج کرتے تھے، اور ان کا
نسخہ کسی کو نہین بتاتے تھے، ایک امیر کو ضیق النفس کا عارضہ تھا، سلیمان ابو بکر بن تاج نے ایک لعوق سے
اس کا علاج کیا، اور وہ ایک ہی دن مین اچھا ہو گیا، وہ درد پشت کا علاج ایک گولی سے کرتا تھا، اور
فوراً شفا ہو جاتی تھی، لیکن کسی کو ان کا نسخہ نہین بتاتا تھا[2]، خلیفہ منصور نے ادویہ مرکبہ کا گویا ایک مستقل
کارخانہ قائم کر دیا تھا، جس کے اہتمام کے لئے ایک خاص طبیب مقرر تھا[3]، وہ ادویہ مرکبہ کی تیاری مین
خاص طور پر ابو جعفر بن غزال پر اعتماد کرتا تھا، اوس نے اپنے دور سلطنت مین شراب کی خرید و فروخت کی

---

[1] طبقات الاطباء جلد دوم ص ۲۴۴، [2] ایضاً جلد دوم صفحہ ۴۳، [3] ایضاً صفحہ ۴۹،

نت ممانعت کردی تھی، لیکن اسی زمانے مین اوس نے ابوجعفر بن غزال کو تریاق کبیر کے بنانے کا حکم دیا جس کا
ب جزو شراب تھی، ابوجعفر نے اور تمام دوائین تو فراہم کرلین لیکن اس بندش کی وجہ سے شراب نہ مل سکی، اس نے
منصور کو اس کی اطلاع دی، تو اوس نے کہا کہ مین نے اس وقت تریاق کبیر کے بنانے کا حکم صرف اس غرض
ے دیا تھا، تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ کسی کے یہان شراب موجود تو نہین،[۱]

ادویہ مرکبہ کا سب سے بڑا ماہر محمد بن احمد بن سعید تمیمی تھا، جس نے تریاق فاروق مین بہت سی دواؤن کا
اضافہ کرکے اس کو مکمل کیا تھا، اور بہت سے معجون، نسخے اور سفوف تیار کئے تھے،[۲]

اطبائے مغرب نے اس فن مین جو مہارت حاصل کی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، کہ مشرق
کا ایک طبیب قرطبہ مین آیا جس نے ایک ایسی معجون تیار کی تھی، جس کی ایک خوراک پچاس اشرفیون مین
فروخت کرتا تھا، اوس نے اس کے ذریعہ سے بڑی دولت کمائی، تو مغرب کے پانچ اطبا نے مل کر پچاس اشرفیان
جمع کین، اور اس سے اس معجون کی ایک خوراک خریدی، اور سب نے اس مین سے تھوڑی تھوڑی مقدار لے کر
چکھا اور چکھنا شروع کیا، اور اس طرح اس کے جو اجزا معلوم ہو سکے، اوس کو ہر ایک نے الگ الگ
کاغذ پر لکھ لیا، پھر سب نے اپنی اپنی معلومات کو یکجا کرکے لکھا، اس کے بعد اس مشرقی طبیب کے پاس گئے، اور
واقعہ کو بیان کرکے کہا کہ ہم نے اس طریقہ سے اس معجون کے جن اجزار کا پتہ لگایا ہے، اگر وہ صحیح ہین تو
اپنے تجربہ مین کامیاب ہو گئے، ورنہ آپ ہم کو اس کے علم مین اپنا شریک بنائیے" اوس نے اُن کے نسخہ کو
دیکھا تو کہا کہ معجون کے تمام اجزار کا پتہ تو تم نے صحیح لگایا ہے، البتہ اُن کے وزن مین غلطی کی ہے، اب اس نے
ان کو اپنا شریک بنا لیا، اور اس معجون کا تمام اندلس مین رواج ہو گیا،[۳]

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ فن کیمیا سازی کو جس کو ہوس پرستون نے کسب زر کا ذریعہ
بنا لیا، فن دوا سازی سے گہرا تعلق ہے، اور اغالب اوس کی ایجاد اس غرض سے ہوئی تھی کہ تکمیل وتجر

---

[۲] طبقات الاطباء جلد دوم ص ۸۵، [۳] ص ۵۳، ص ۴۶۔

کے ذریعہ سے دواؤن کے افعال وخواص کا پتہ لگایا جائے، اور ان مین تغیرات پیدا کر کے نئے نئے افعال وخواص پیدا کئے جائین،

جندیسا پور، حران، اور اسکندریہ میں طب کے جو تین اسکول قائم ہوگئے تھے، ان مین خاص طور پر مصرین طب، کیمیا اور طبعیات کو ترقی ہوئی تھی، اس لئے خالد بن یزید کو طب اور کیمیا کا شوق پیدا ہوا، تو اوس نے مصری کے اطبا و حکما کے ذریعہ سے طب اور کیمیا کی تعلیم حاصل کی، اور ان کے ذریعہ سے اس فن کی کتابون کا ترجمہ کرایا، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے، کہ مصرین کیمیا اور طبعیات کو اسی لیے بہت زیادہ ترقی ہوئی کہ ان کو علم طب کی ترقی سے خاص تعلق تھا مسلمانون مین فن طب کا بہت بڑا امام زکریا رازی تھا، جو بہت بڑا کیمیا ساز بھی تھا، اگرچہ اوس کے حالات مین سونا چاندی بنانے کے بہت سے قصے منقول ہین لیکن غالبًا اوس نے فن دواسازی ہی کی تکمیل کے لئے اس کی طرف توجہ کی ہوگی۔

جرجی زیدان نے اپنی کتاب آداب اللغۃ العربیہ کی دوسری جلد مین جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے، کہ کیمیا کو فن دواسازی سے گہرا تعلق ہے، وہ لکھتا ہے، کہ فن دواسازی، کیمیا، اور جڑی بوٹیون کی تحقیقات پر جو علم طب کی ایک شاخ ہے مسلمانون کا بہت بڑا احسان ہے، انھون نے خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور مین اس کی طرف توجہ کی، اور یورپین لوگون نے اپنی ترقی کے آخری دور مین فن دواسازی کی تاریخ کا مطالعہ کیا، تو ان کو معلوم ہوا کہ سب سے پہلے اہل عرب ہی نے اس فن کی بنیادین قائم کین، اور سب سے پہلے دواؤن اور جڑی بوٹیون کو ہر جگہ سے جمع کیا، اور خود بہت سی نئی دوائین ایجاد کین سب سے پہلے ان ہی نے موجودہ طرز پر قرابادینین لکھین، اور اس طرز پر عطارون کی دکانین قائم کین، لیکن عطاری کے فن مین ان کی ترقیون کی وجہ یہ ہے کہ انھون نے فن کیمیا و نباتات مین بہت زیادہ ترقی کر لی تھی، اور اس مین کوئی اختلاف نہین ہے کہ سب سے پہلے اہل عرب ہی نے اپنے تجربات سے جدید کیمیا سازی کی بنیاد قائم کی، اور سب سے پہلے خالد بن یزید نے اس فن کو عربی زبان مین اسکندریہ کے اسکول سے منتقل کیا، اور

اوس سے جعفر صادق المتوفی ۱۴۸ھ نے اس فن کو سیکھا، اس کے بعد جابر بن حیان، یعقوب کندی، اور ابوبکر رازی پیدا ہوئے جنھوں نے بہت سے مرکبات کیمیاوی ایجاد کئے جن پر جدید فنِ کیمیا سازی کی بنیاد قائم ہے، اس کے بعد اہلِ عرب کے بہت سے کیمیاوی اکتشافات کا ذکر کیا ہے، اور ایک تصویر درج کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ اہلِ عرب کیونکر جڑی بوٹیون کا عرق کھینچتے تھے، اس کے بعد لکھا ہے کہ اور بھی بہت سے کیمیاوی مرکبات و مکتشفات ہین، جو اگرچہ ہم کو معلوم نہ ہوسکے تاہم مورخین کے بیانات سے اُن کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ ابن اثیر نے بعض دواؤن کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے اہلِ عرب نے ۲۶۹ھ کے واقعہ زنج مین کام لیا تھا، اور ان دواؤن کی خاصیت یہ تھی، کہ جب وہ لکڑی پر لگادیجاتی تھین، تو اُن پر آگ کا اثر نہین ہوتا تھا، لیکن اوس نے ان دواؤن کا نام نہین بتایا، کیمیاسازی کے سلسلے مین بارود بھی داخل ہے، جس کو مسلمانون نے بنایا، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کیمیاوی اعمال مثلاً تقطیر، ترشیح تصعید تبلور، اور تذویب ان کی ایجاد ہین،

مسلمانون کی طبی ترقی کی تاریخ مین یہ مسئلہ نہایت اہم ہے، کہ انھون نے علم تشریح مین کس قدر مہارت حاصل کی ؟

یونانی اطبا مین جالینوس آدمیون اور بندرون کے اجسام کی تشریح کرتا تھا[1]، اور عباسی دور کے اطبا مین یوحنا بن ماسویہ نے بھی اس کی تقلید کرنی چاہی تھی، چنانچہ اس کے حال مین لکھا ہے کہ اوس نے ایک بندر پال رکھی تھی جس کا نام اوس نے حاحم رکھا تھا، اور اوس کو اپنے پاس سے کبھی جدا کرنا پسند نہین کرتا تھا، ایک بار شاہ نوبہ نے خلیفہ معتصم کی خدمت مین بہت سے ہدیے بھیجے، جن مین ایک قوی ہیکل بندر بھی تھا، معتصم نے اس کو ایک غلام کے ذریعہ یوحنا کے پاس بھجوا دیا، کہ اپنی بندریا حاحم کے ساتھ اس کی شادی کردو، یوحنا کو یہ بات ناگوار ہوئی، اور اوس نے غلام سے کہا کہ امیرالمومنین سے کہدو کہ مین نے اس بندریا کو اس مقصد کے لئے نہین پالا ہے جو امیرالمومنین کے خیال مین ہے، بلکہ مین اس کے اعضا کی تشریح کرکے

[1] اخبار الحکما قفطی ص ۲۵۵،

جالینوس کی طرح اس موضوع پر ایک کتاب لکھنا چاہتا تھا، لیکن چونکہ یہ بندر یا نہایت لاغر تھی، اور اس کے عروق اور اوراد اور اعصاب نہایت باریک تھے، اس لئے میرا خیال تھا کہ اس کی تشریح سے ان کا حال واضح طور پر معلوم ہو سکے گا، اسی غرض سے مین نے اوس کو چھوڑ رکھا تھا کہ وہ بڑی ہوکر فربہ ہوجائے لیکن جب یہ قوی ہیکل بندر مجھ کو مل گیا ہے، تو اب مین امیرالمومنین کے لئے اس فن مین ایک ایسی کتاب لکھدونگا کہ اب تک اسلام مین ایسی کتاب نہین لکھی گئی ہے، چنانچہ اوس نے اس بندر کی تشریح کرکے اس موضوع پر ایک ایسی کتاب لکھدی جس کو اوس کے دوستون اور دشمنون دونون نے پسند کیا۔[1]

قفطی نے اخبار الحکماء مین اس واقعہ کا ذکر نہین کیا ہے، لیکن اوس نے پہلے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نہایت خوش خلق اور بدصورت تھا، اوس کے برخلاف اس کی بی بی نہایت بدخلق اور خوبصورت تھی، ان دونون سے ایک لڑکا پیدا ہوا تو وہ ان دونون کی برائیون کا مجموعہ تھا، یعنی بدخلق بھی تھا اور بدصورت بھی تھا، ایک موقع پر یوحنا ابن ماسویہ کے سامنے اس کا ذکر آیا، تو اوس نے کہا کہ یہ شخص ایک نہایت ذہین اور طباع شخص تھا، لیکن میری ایک بی بی حسین تو بہت زیادہ تھی مگر اسی کے ساتھ اس قدر احمق تھی کہ کوئی بات نہین سمجھتی تھی، اس سے جو لڑکا پیدا ہوا وہ بھی نہایت احمق تھا، اور ہمارے محاسن کا اوس پر کوئی اثر نہین پڑا تھا، اگر بادشاہ غیرضروری باتون مین مشغول رہنے کا عادی نہ ہوتا، تو مین اپنے لڑکے کو زندہ چیر پھاڑ ڈالتا، جیسا کہ جالینوس آدمیون اور بندرون کو چیرتا پھاڑتا تھا، اور اس طریقہ سے اوس کی حماقت و بلادت کے اسباب معلوم کرلیتا، اور اپنی کتاب مین اس کے جسم کی ترکیب اور عروق، اوراد اور اعصاب کے متعلق ایسی معلومات جمع کردیتا جو اہل دنیا کے لئے مفید ہوتین۔[2]

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ عباسی دور مین یوحنا ابن ماسویہ نے فن تشریح کی طرف خاص

---

[1] طبقات الاطباء جلد اول ص ۱۷۸، [2] اخبار الحکماء قفطی ص ۲۵۵، ۲۵۶،

ترجمہ کی تھی، اور اس فن مین ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی تھی لیکن خود مسلمانون نے اس فن کو مزید ترقی نہین دی، کیونکہ وہ لاشون کی چیر پھاڑ کو پسند نہین کرتے تھے، البتہ سرجری مین اُن کے کارنامون کو نظر انداز نہین کیا جاسکتا، سب سے پہلے مشرق میں اس کی ابتدا ہوئی، اور محمد بن زکریا رازی نے اُس کی طرف خاص توجہ کی، اور اسی کے زمانہ مین یہ فن ممالک اسلامیہ مین پھیلا، لیکن محمد بن زکریا نے اپنی تصنیفات مین صرف سرجری کے عملی طریقے بتائے تھے، خود اُن پر عمل نہین کرتا تھا، بلکہ یہ کام جراحون سے متعلق تھا، اس کے بعد علی ابن عباس المجوسی پیدا ہوا، جس نے پتھری نکالنے کے عملی طریقے کی تشریح کی، پھر شیخ بو علی سینا نے جراحی اور سرجری کے بہت سے عملی طریقے بتائے، لیکن خود ان پر عمل نہین کیا، اس طریقہ پر اگرچہ مشرق مین اس فن کی ابتدا ہو چکی تھی، تاہم اس کی اصلی ترقی مغرب مین ہوئی، اور بہت سے اطبا پیدا ہو گئے جو علاً فن جراحی مین کمال رکھتے تھے، ان مین خالد بن یزید اور ابن ملوکہ نصرانی تھے، جو عملاً جراحی کا کام کرتے تھے[۱]، لیکن ان کے علاوہ چند مسلمان بھی تھے جن مین ایک یحییٰ بن اسحٰق تھا، جو عملاً جراحی کا کام کرتا تھا، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے اس کے حالات مین اس کی تصریح کی ہے، اور اس کے بعض عملی کام بھی بیان کئے ہین[۲]، دوسرا ابو الحکم عمرو بن عبد الرحمٰن بن احمد علی الکرمانی المتوفی ۴۵۸ھ تھا جس کی نسبت علامہ ابن ابی اصیبعہ نے یہ الفاظ لکھے ہین،

وَلہٗ عنایتہ بالطب وجربات	اس کا رجحان طب کی طرف ہے، اور
فاضلۃ فیہ ونفوذ مشہور	طب مین اس کے عمدہ تجربات ہین،
فی الکی والقطع والشق و	اور عملی طور پر داغنے، کاٹنے، اور
البط وغیر ذلک من اعمال	چیر پھاڑ میں اس کو عام شہرت
الصناعۃ الطبیۃ[۳]	حاصل ہے،

---

[۱] طبقات الاطبا، جلد دوم ص ۴۱، [۲] ۴۳ رر ص ۴۳، [۳] رر ص ۴۰۔

لیکن اس فن مین سب سے زیادہ شہرت خلف بن عباس زہراوی نے حاصل کی جس نے اس فن
ایک مستقل رسالہ لکھا، اور اس مین سرجری کے کئی سوالات کی تصویرین دین اور انکے استعمال کے طریقے
وہ اس رسالہ کی تمہید مین لکھتا ہے کہ "ہاتھ کے عمل کام ہمارے شہر مین اور ہمارے زمانے مین معدوم ہو
ہین، اور عنقریب ان کا علم مٹ جائے گا، صرف اس کے تھوڑے سے نشانات قدماء کی کتابون مین
باقی رہ گئے ہین، جن مین اس قدر تحریفات ہو گئی ہین، کہ اُن کے مطالب کا سمجھنا مشکل ہو گیا ہے
مین نے مناسب سمجھا کہ اس فن کو زندہ کرون اور شرح و بیان اور اختصار کے ساتھ اس رسالہ کو
اور داغنے اور ہاتھ سے کام لینے کی نئی نئی صورتین درج کرون، جس سے بیان کی وضاحت مین ا
اضافہ ہو گا"

اس رسالہ کا نام "التعریف لمن عجز عن التالیف" ہے، اور خوش قسمتی سے ۱۹۰۸ء مین مطبع نامی کا
مین آلات کی تصویر کے ساتھ چھپ گیا ہے، موجودہ زمانہ مین مصر کے ایک ڈاکٹر احمد عیسیٰ بک نے
دالجراحۃ والکحالہ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، جن مین ان تمام آلات کی تشریح کی ہے، جو مسلما
نے ایجاد کئے تھے، اور رسالے کے اخیر مین اُن سب کی تصویرین درج کی ہین، اور اُن آلات
جن کا ذکر زہراوی نے اپنی کتاب مین کیا ہے، چند آلات کا اضافہ کیا ہے، اسلامی طب کی یہ مختصر تا
اُن اطباء کے حالات سے ماخوذ ہے، جن کا ذکر علامہ جمال الدین قفطی، علامہ شہرزوری اور علامہ ابن ابی
نے کیا ہے، انہین سب سے زیادہ جامعیت و استقصار کے ساتھ ان اطباء کے حالات علامہ ابن ابی
نے لکھے ہین، لیکن وہ بھی ساتوین صدی کے اطبا تک محدود ہے، اس کے بعد جہان تک
معلوم ہے کسی مورخ نے اطباء کے حالات نہین لکھے، اس لئے ہم یہ نہین بتا سکتے کہ اس کے
اسلامی طب کی تاریخ مین کیا کیا تغیرات پیدا ہوئے؟ اس سلسلے مین اُن تبدیلیون اور ترقیوں
تفصیل نہایت اہمیت رکھتی ہے، جو ہندوستان مین اسلامی دور حکومت مین اسلامی طب مین

اگرچہ عباسیون ہی کے دورِ حکومت مین اسلامی طب پر ویدک اثر پڑنے لگا تھا، لیکن یہ معلوم نہین ہوتا کہ خود ہندوستان مین ویدک نے اسلامی طب پر کیا اثر ڈالا، ؟ اور خود اسلامی طب کا کیا اثر قبول کیا؟ تاہم اس مین شبہہ نہین کہ اب تک اسلامی طب کا جو سلسلہ چلا آتا تھا، ہندوستان کی آب وہوا کے لحاظ سے اس مین تغیر پیدا کرنے کی ضرورت تھی، اور علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون مین لکھا ہے کہ سب سے پہلے سلطان سکندر لودی کے زمانہ مین اس کا احساس پیدا ہوا،" اور خواص خان ایک درباری امیر نے عرض کی کہ جہان پناہ یونانی طب ہندوستان کی آب وہوا کے موافق نہین ہے، حکم ہوا کہ سنسکرت سے ہندی طب کو فارسی مین منتقل کیا جائے، چنانچہ میان بھوہ بن خواص خان نے اس کام کو انجام دیا، اور کتاب کا نام معدن الشفا سکندر شاہی رکھا، قاسم فرشتہ نے اکبری عہد سے پہلے اختیارات قاسمی کے نام سے ہندی علم طب کو زندہ کیا" اب علمی حیثیت سے طبی کتابون کی زبان بدل گئی، پہلے طب کی تمام کتابین عربی زبان مین لکھی جاتی تھین، لیکن مسلمانون کے دورِ حکومت مین فارسی زبان مین لکھی جانے لگین، اور اس وقت فارسی زبان مین جو علم طب ہے، اور خصوصًا خاندانی اطبار کے سفینون اور مجربات ناموں مین جو سیکڑون نسخے اور دوائین ہین، ہندوستان زا ہین اسی طریقے سے بیدون نے مسلمانون کے سیکڑون نسخے، دوائین اور اصول علاج اپنے ہان لئے، اور اس طرح مل ملا کر ایک ایسا طرزِ علاج رائج کیا، جو ہندوستان کے حالات کے مطابق تھا، ویدک کا یہ وہ اثر تھا جو اسلامی طب نے خود ہندوستان مین قبول کیا، لیکن خود اس نے بھی ویدک پر مختلف اثرات ڈالے، پہلے ویدون مین وہ دوائین رائج تھین جو ہندوستان مین پیدا ہوتی تھین، طب اسلامی نے تمام ملکون مین جو دوائین، جڑی بوٹیان زیرِ تجربہ آچکی تھین، اُن کو ہندوستان مین رواج دیا، اس طرح مفردات کے ذخیرے کو بیحد بڑھا دیا، مفردات کے علاوہ دواؤن کی ترکیب مین عرق معجون، قرص، طلی، اور سفوف وغیرہ کے مختلف طریقون کو پھیلایا،

اشرف علی فغان

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب (علیگ)

(۲)

فغان کی ہجوین: شاعری کے میدان مین فغان کی ظرافت اور بھی تیز بلکہ بہت زیادہ تیز ہو جاتی ہے، پیش نظر دیوان مین ان کی دس ہجوین ہین جو انھون نے وقتاً فوقتاً مختلف اشخاص کی کہی ہین، ان مین بعض تو ایسی ہین جو اعتدال کی حد سے اتنی آگے بڑھ گئی ہین، کہ وہ فحاشی اور گالی گلوچ کہی جا سکتی ہین،

عام طور سے اردو مین ہجو گوئی کا معیار بہت ہی پست ہے، بلکہ یہ ادب اردو کے رُخ گلگون کا بہت ہی بدنما داغ ہے، ہجو گوئی کا مقصد اردو شعرا خصوصاً قدما کے یہان وہ نہین، جو فرانس مین ربیلے، مولیر والٹیر، اور اناطول، فرانس یا انگلستان مین ڈرائیڈن پوپ اور بائرن یا عرب مین ابن قدامۂ ابی عمر ابن العلاء اور ابن رشیق کے یہان ہین، بلکہ وہ ہے جو ایرانی شاعری مین سوزنی، عبید زاکانی، اور قتو حی کے یہان ہین یعنی یہ کہ بغض وعناد یا تمسخر مین ذاتی تضحیک و تذلیل جوش انتقام مین سب وشتم، اور حسد مین طنز و تشنیع کرنا، عربی شعراء مثلاً ابن قدامہ اور ابن رشیق کے نزدیک جسمانی یا آبائی عیوب کا ذکر کرنا تہمت لگانا، اور بدزبانی کرنا، ہجو گوئی نہین، بلکہ موزون گالی گلوچ ہے، اس لحاظ سے اردو کے قدیم ہجو گو شعراء کے یہان صرف گالی گلوچ بلکہ ایسی فحاشیان ہین جن کو پڑھ کر حیا کی گردن جھک جاتی ہے،

بجو گوئی کے مرد میدان مرزا سودا ہیں، وہ طبیعتاً نہایت نازک مزاج واقع ہوئے تھے، پھر ان کی رگوں میں سپاہیانہ خون رواں تھا، اس دو آتشہ نے اُن کی ظرافت اتنی تیز کر دی تھی، کہ اُن کی ہجو دن میں متانت، سنجیدگی اور سلامت کا کہیں پتہ باقی نہ رہا، اُن کے یہاں پھبتیاں کہنا کھلی کھلی گالیاں دینا، حسب نسب کی دھجیاں اڑانا کوئی غیر معمولی بات نہیں، پھر معلوم نہیں سودا کا رنگ اس قدر کیوں جما کہ ان کے معاصرون میں جس کسی نے ہجو کہی، اسی انداز کو اختیار کیا، اور رفتہ رفتہ ہجو کے معنی، تعریض، تنقیص، تضحیک، تذلیل، سب وشتم، گالی، گلوج اور بیہودہ گوئی وغیرہ سب کچھ تصور کیا جانے لگا،

چنانچہ فغان کے یہاں بھی یہ ساری خصوصیات موجود ہیں، مثلاً میر معصوم کی ہجو میں لکھتے ہیں،

ایک ہیں آشنا میرے مجہول — خود نما بوالفضول و نا معقول
بھتیجے ہیں یہ اسد خان کے — متبنٰی ہیں خان دوران کے
یا یہ شایستہ خان کے پوتے ہیں — خانخانان کے ہوتے سوتے ہیں
یا یہ کہ نانی تھی ان کی نورجہان — ان کا نانا تھا شیر افگن خان

آبائی عیوب کا ذکر کرکے جسمانی نقائص پر حملہ کرتے ہیں،

سر کہاں ہے تلا ہے ہانڈی کا — حلق جیسے گلا ہے ہانڈی کا
بھوین آپس میں اس طرح رلیان — جس نمط لڑ رہی ہوں چھپکلیاں
چشم تو ہے بہ رنگ دیدہ بوم — نہ دکھاوے خدا یہ صورت شوم
کان پھیلے ہیں جوں پر شپرک — ہے بنا گوش جوں سیر شبرک
ناک تو اس طرح سے ہے اینٹھی — جیسے جوتے پہ مینڈک بیٹھی

آگے پڑھتے پڑھتے تو آنکھیں بند کر لینی پڑتی ہیں، دوہ اور ہجو دن میں تو ابتذال، رکاکت، اور فحاشی اس درجہ تک پہنچ گئی ہیں، کہ سودا بھی ان کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں،

مگر اس زمانہ میں ہجو گوئی کا جو عام معیار ہے، اس لحاظ سے فغاں کی بعض ہجویں اعلیٰ معیار پر اترتی ہیں، دہلی چھوڑ کر جب مرشدآباد چلے، تو راستہ میں الٰہ آباد ٹھہرے، وہاں کی سرزمین اور اس کے لوگوں سے خوش نہ ہوئے، اس کی ہجو لکھی جو خوب ہے،

کہاں سے کہاں چرخ لایا مجھے — عجب شہر ابھونڈا دکھایا مجھے

یہ وہ شہر جس کو کہیں ہیں پراگ — مرا بس چلے آج دوں اس کو آگ

جہاں تک تری ہے وہاں سیل ہے — نظر آئی خشکی تو کھپریل ہے

لکھوں خاک نقشہ میں اس شہر کا — کہ یہ تو ہے بیت الخلا دہر کا

. . . . — . . . .

. . . . — . . . .

لکھوں وضع گر مردم شہر کی — کم ہو جائے حرمت ابھی دہر کی

عجب دہر ہے جس میں یہ شہر ہے — مصیبت ہے زندان ہے قہر ہے

نکالے خدا اس بلا سے شتاب — نہ ہوگا جہنم میں اتنا عذاب

اگر ہوگا تو یار ہوں گے کئی — وہاں میرے غم خوار ہوں گے کئی

وہ پوچھیں گے آخر مرے درد کو — دکھاؤں گا اپنے رخِ زرد کو

کہوں گا کہ میں عاشقِ زار ہوں — میری داد دنیا گرفتار ہوں

وہاں کے اربابِ علم اور اصحابِ کمال کی جو خبر لی ہے، وہ ملاحظہ ہو،

یوں ہی ہنستے ہنستے یہ آیا خیال — بھلا دیکھیے یہاں کے صاحبِ کمال

انھیں شاعری میں ہے کتنا شعور — کوئی ریختہ پڑھیے ان کے حضور

پڑھا ریختہ [illegible] — [illegible]

وہاں کے پیر مرشد اور شاعر کامل شاہ عبدالرحمن الہ آبادی کی جو دُرگت بنائی ہے وہ بھی سُن لیجئے:-

اگر کوئی جا اُن کو دشنام دے　　کہیں تجھ کو اللہ آرام دے
کہیں آپ کو مرشدِ کائنات　　تبرک ہے یاں پیر صاحب کی ذات

شاہ صاحب شعر و شاعری میں جو درک رکھتے ہیں، پہلے اُن ہی کی زبان سے سُنئے،

سنو جس کی پھولی گلستان ہے　　وہ سعدی میرا اوڑھا در بان ہے
نظیری مجھے دیکھ خاموش ہو　　اور سے خانخانان فراموش ہو
رکھے تھا اگرچہ وہ دستِ سخا　　تو میں بھی تو رکھتا ہوں دستِ دعا

اب اس کے آگے سنئے،

کئی شعر ہیں یاد استاد کے　　تصدق ہوں میں آپ کی یاد کے
سو کہتے ہیں وہ میرے مضمون ہیں　　تب ہی اس نصاحت کے موزون ہیں
اگر کوئی بولا کہ فرمائیے　　نئے شعر کچھ اپنے پڑھ جائیے
تو اس مثنوی کو پڑھیں ہیں بکا　　کہ تا شاہدی دیوین اہلِ جوار
کریما بہ بخشائے برحالِ ما　　کہ ہستم اسیرے کمندِ ہوا
کبھی کاٹ کر ایک تکہ بنا　　پھرے ہیں یہ پڑھتے ہوئے جابجا
الٰہی بہ اعزاز آن پنج تن　　کہ ہستند فخرِ زمین و زمن

مگر فغان کا اصلی شاعرانہ کمال ان کی غزلوں سے ظاہر ہے، عمر میں تو وہ میر سودا، اور درد سے چھوٹے تھے، لیکن موجودہ دور کے بعض اربابِ نظر نے اُن کا شمار شعرائے متقدمین کیا ہے، آزاد نے اُن کو اردو شاعری کے دورِ دُوم میں رکھا ہے، جس میں حاتم اور سراج الدین خان

آرزو ہیں، اور مولانا عبدالحی نے قدما کے دورِ سوم مین شامل کیا ہے جن مین شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، میر محمد شاکر ناجی، محمد حسین کلیم اور مصطفیٰ خان یکرنگ وغیرہ ہین، مگر قیام الدین قائم نے فغان کو اپنے مجوزہ طبقہ سوم مین یعنی مظہر جانجانان، میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، میر سوز اور انعام اللہ خان یقین وغیرہ کے ساتھ رکھا ہے، اور یہی صحیح تقسیم ہے، کیونکہ پیشِ نظر دیوان مین بعض خصوصیات ایسی پائی جاتی ہین، جن کی بنا پر ان کو متقدمین کے بجائے شعرائے متوسطین کے دورِ اول کی صف مین جگہ دینی چاہئے، موخر الذکر دور کے شعرا کے کارنامے یہ ہین، کہ انھون نے ایہام گوئی کو چھوڑ کر زبان کی صفائی اور صحت کی کوشش کی، فارسی کی دلپذیر ترکیبیں اور پسندیدہ محاورے اردو مین رائج کئے، الفاظ کی بندشون کو چست اور لطیف بنایا، اور پرانے عاشقانہ مضامین کو روزمرّہ بول چال مین خوبصورتی سے ادا کیا، اور یہ تمام باتین فغان کے یہان موجود ہین،

فغان کا موجودہ دیوان تو ایہام گوئی کے خلاف سراسر جہاد ہے، ایہام گوئی کے خلاف سب سے پہلے مرزا مظہر جانجانان نے علمِ بغاوت بلند کرکے "اس خس و خاشاک سے اردو شاعری کو پاک کیا" لیکن مرزا مظہر اردو مین اشعار کہنا اپنے لئے طرۂ امتیاز نہ سمجھتے تھے، اس لئے اردو شاعری کو واقعۃً جس نے ایہام گوئی کی برائیون سے صاف کیا، وہ انکے شاگرد رشید انعام اللہ خان یقین تھے، فغان مرزا مظہر سے تو بہت چھوٹے لیکن یقین کے ہم عمر تھے، اب معلوم نہین فغان نے مرزا مظہر کے زیرِ اثر ہوکر یا یقین کی تقلید مین یا اپنی طبیعت کی اپج سے ایہام گوئی کی صنعت چھوڑی، مگر کسی کی تقلید مین شعر کہنا وہ اپنے لئے ننگ سمجھتے تھے، وہ خود کہہ گئے ہین،

کیون کرین غیر کے مضمون کو فغان ہم موزون
تازگی ہوے سخن مین یہ کمال اپنا ہے

بہر حال حقیقت جو کچھ ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جس زمانہ مین یقین ریختہ گوئی کو ایہام گوئی

سے پاک کر رہے تھے، اسی زمانہ مین فغان نے بھی اس صنعت سے بہت زیادہ احتراز کیا ہے، چنانچہ بقول مخدومی مولانا عبدالسلام صاحب ندوی وہ فصلین اردو شاعری کی صفِ اوّل مین جگہ پانے کے قابل ہین۔

جہان تک زبان کی صفائی اور صحت کا تعلق ہے، فغآن نے وہی زبان استعمال کی ہے، جو مرزا مظہر سودا، میر اور درد کے یہان ہے. قدما کے الفاظ ان کے یہان نہین ملتے ہین، اور جو متروکات سودا اور میر کے یہان بکثرت استعمال ہوئے ہین، فغآن کے یہان مشکل سے کہین کہین ملین گے، پورے دیوان مین صرف کسو، نت، جون، سان اور ٹک چند بار استعمال ہوئے ہین، ان مین کسو تو صرف ایک ہی جگہ آیا ہے، کبھو کا تو استعمال ہی نہین کیا ہے[1] اس کی جگہ پر کبھی ہے،

کبھی نہ گل سے محبت نہ بو کری اخلاص ‌ ‌ ‌ ‌ تجھے بھی دہر مین ظالم کسو سے ہو اخلاص

البتہ ولی کی طرح[2] تئین کا استعمال جابجا کیا ہے، بلکہ دو غزلین تو اسی ردیف مین لکھی ہین جن کے بعض اشعار یہ ہین،

شعلہ ہماری آہ کا ہوتا چلا بلند ‌ ‌ ‌ ‌ نزدیک ہے کہ آگ لگے آسمان کے تئین
خلوت مین وہ ہو جام ہو مطرب ہو اور شراب ‌ ‌ ‌ ‌ یہ دن خدا دکھاوے ہمارے فغان کے تئین

---

[1] معارف جلد ۹ نمبر ۴ [2] دیوان کے پیش نظر قلمی نسخہ کی غزلون مین تو کبھو نظر نہین آیا لیکن مجموعہ نغز مین فغان کے حسب ذیل اشعار منقول ہین، جن مین کبھو کا استعمال ہوا ہے،

مجھسا گرفتہ دل بھی کبھو شاد ہوئے گا ‌ ‌ ‌ ‌ یہ خانمان خراب بھی آباد ہوئے گا
اس سال ہم قفس مرے آزاد ہوگئے ‌ ‌ ‌ ‌ مجھ پر بھی مہربان کبھو صیاد ہوئے گا
نہ کھولیئے ترے بند قبا تو کیا کیجئے ‌ ‌ ‌ ‌ دلِ گرفتہ کو ظالم کبھو تو وا کیجئے

[3] ولی کا ایک مقطع ہے :-

پیدا ہوا ہے جگ میں ولی صاحب سخن ‌ ‌ ‌ ‌ میری طرف سون جا کے کہو انوری کے تئیں

شمع رو خلوت مین مت دکھا ؤ پروانے کے تئین | او تیرے قربان ہین کیا کم ہون جل جانے کے تئین
ے نہین مینا نہین، ساغر نہین ساقی نہین | جی مین آتا ہے لگا دون آگ پیمانے کے تئین

اسی طرح ایک قطعہ ہے، جس مین "چالیان" "کالیان" اور "نکالیان" جیسے الفاظ قدماء کی یاد تازہ کرتے ہین[۵۱]:-

دیکھا کہ یہ تو چھوڑنا ممکن نہین مجھے | چلنے لگا وہ شوخ میر اتب یہ چالیان
ایذا ہر ایک طرح سے دیتو غرض مجھے | کچھ بس نہ چل سکا تو یہ طرحین نکالیان
ہم نے شبِ فراق مین سنتا ہے اے فغان | کیا خاک سو کے حسرتیں دل کی نکالیان
یہ تھا خیال خواب مین دیکھیں گے روز وصل | آنکھین جو کھل گئین وہی راتین ہین کالیان

مگر یہ الفاظ متوسطین کے دور اوّل میں متروک نہین ہوئے تھے، بلکہ مذکورہ بالا دونون ردیف اور قافیے اس زمانہ مین بہت پسندیدہ تھے، میر[۵۲]، سودا[۵۳]، یقین[۵۴] اور بیدار[۵۵] نے بھی اس ردیف اور قافیے مین غزلین لکھی ہین،

---

۵۱ حاتم کا ایک مطلع ہے:-

جب سے تیری ادائین عالم کو بھائیان ہین | تب سے جہان میں تونے دھومین مچائیان ہین

۵۲ میر:- مدت ہوئی کہ اپنی خبر کچھ ہمین نہین، | کیا جانئے کہ میر گئے ہم کدھر کے تئین
کیا جانتے تھے ایسے دن آجائیں گے شتاب | روتے گذرنیان ہمین راتین ساریان

۵۳ سودا: جب لبون پر یار کے مستی کی دھڑیان دیکھیان | جون زحل کی ساعتین اس دل پہ کڑیان دیکھیان

۵۴ یقین:- کم نہین ہم پوچھتے کعبہ سے میخانہ کے تئین | سجدہ ہم کرتے ہین جوں محراب پیمانے کے تئین
گالی بھی پی گئے ہین، مارین بھی کھائیان ہین | ہم نے تیری جفائین کیا کیا اٹھائیان ہین

۵۵ بیدار: جانین تشنہ قون کی لب تک آئیان | بل بے ظالم تیری بے پروائیان
یارب جو خارِ غم ہین جلا دے انھون کے تئین | جو غنچۂ طرب ہین کھلا دے انھون کے تئین

فغاں نے فعل امر کے استعمال مین قدما ہی کی روش پسند کی ہے، اور یہ چیز شعرائے متوسطین کے دور سوم تک جاری رہی، اس کے علاوہ فغاں کی غزلوں مین ایسے موزون ہین کہ موجودہ مذاق کے مطابق بھی ان مین قبح کے بجاے حسن پیدا ہو گیا ہے، مثلاً

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہین — لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہین
باد صبا تو عقدہ کشا اس کی ہوجیو — مجھ سا گرفتہ دل نظر آوے اگر کہین
اتنا ہجوم خوش نہین آتا ہے اشک کا — عالم کو مت ڈبوئیو اے چشم تر کہین

مجھ سے گرفتہ دل کو خدا شاد کیجیو — اس خانماں خراب کو آباد کیجیو
اس باغباں کو میری اسیری کا کیا الم — اے عندلیب تو تو مجھے یاد کیجیو

پھر اس قسم کے متروکات فغاں کے یہاں بہت ہی کم ہین، عام طور سے دیوان شروع سے آخر تک سلاست اور فصاحت سے بھرا ہوا ہے اور اس لحاظ سے وہ اپنے ہمعصر شعرا مین بہت ممتاز ہین ان کے معاصر انعام اللہ خان یقین کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ انھون نے ریختہ کو بہت ہی شستہ بنایا؛ مصحفی یقین کے بارے مین لکھتے ہین :-

"در دورہ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ این جوان بود بعد از ان متبعش بہ دیگران رسیدہ"،

اسی طرح یقین کے ذکر مین تذکرہ فتح علی شاہ مین ہے :

تبے اغراق ریختہ گوئی بر طاق بلند گذاشتہ وتخم معنی در زمین سخن کاشتہ!!

صاحب گل رعنا بھی اپنی خوش عقیدگی کے جوش مین رقمطراز ہین، کہ اگر یقین جیتے رہتے تو میر ہون یا مرزا ہون کسی کا چراغ ان کے سامنے نہین جل سکتا تھا،

مگران خوبیون کے باوجود یقین کے یہان بعض الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہین جو اس زمانہ مین متروک ہو چکے تھے، مثلاً جگہ کے بجائے جاگہ[ص۱] رکھنا کے بجائے راکھنا[ص۲]، لگنا کے بجائے لاگنا[ص۳]، سے کے بجاے ستی، اور سیتی[ص۴]، جینا کے بجائے جیونا[ص۵]، جاننا کے بجائے بوجھنا[ص۶]، ادھر کے بجاے یدھر[ص۷] اور کدھر کے بجاے کیدھر[ص۸] استعمال کئے گئے ہین، اس کے برخلاف فغان کے یہان یہ متروکات بالکل نہین پائے جاتے، اگران کے دیوان پر نظر ڈالی جائے، تو متروکات کی جگہ نئے ترشے ہوئے الفاظ[ص۹] ملین گے،

فغان نے قلعہ معلی کی چہار دیواری مین پرورش پائی تھی، اس لئے فطری طور پر ان کی زبان مین اردوے معلی کی گھلاوٹ ہے، اور اس لحاظ سے وہ اپنے تمام معاصرین مین ممتاز ہین، یقین کی ایک مشہور غزل ہے،

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
قاتل ہماری لاش کی تشہیر ہو ضرور آیندہ تا کوئی نہ کسو سے وفا کرے

ص۱ تیری جاگہ اگر پتھر بھی ہوتا آب ہو جاتا پھٹی چھاتی کو میری دیکھ کو طور رو دیتا
ص۲ کسو کا کبھو راکھا کرو دل، تم کو لازم ہے وگر نہ دلربا ؤن کا لقب دلدار کیون ہوتا
ص۳ اشک سے لاگے ہے پروانہ کے جیسے تن کو آگ لگیوا ے فانوس ایسی تیری پیراہن کو آگ
ص۴ منہ پھیر نالہ سے، آنسو سے نہ موڑ آنکھین اتنا بھی یقین مت ہو اپنے ستی بیگانہ
ص۵ ہاتھ سیتی جا چکا جب یار تب آئی بہار پی کے مے تنہا کوئی دھومین مچاؤ کس طرح
ص۶ عشق کے بھی کارخانے کی عدالت دیکھ لی بوالہوس جو ہین، مرین ہم اے محبت داد
ص۷ کم نہین ہم بوجھتے کعبہ سے میخانہ کے تئین سجدہ ہم کرتے ہین جون محراب پیمانے تئین
ص۸ دیوان یقین ص . . . .
ص۹ دلون پہ برق سی گرتی تھی جب ہم نالہ کرتے تھے گئین کیدھر نہین معلوم ان آہون کی تاثیرین

جو کوئی عرض حال کرے تجھ سنی مرا — اوّل بیان دا تعوذ کر بلا کرے

خلوت ہو اور شراب ہو معشوق سامنے — زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ہوتا ہے خاکِ راہِ وفا بیگمان یقین

ہے دل مین یہ کہ شرطِ محبت ادا کرے[ا]

فغاںؔ نے اسی قافیے اور ردیف مین جو طبع آزمائی کی ہے، وہ بھی ملاحظہ ہو:

یار اگر جفا کرے چاہیے دل وفا کرے — یہ نہ کرے تو کیا کرے وہ نہ کرے تو کیا کرے

یار طرف نظر رہی اشک سے چشم بھر رہی — جیب و کنار تر رہی خونِ جگر بہا کرے

کوچۂ یار پاک ہو جان کہیں ہلاک ہو — کاش یہ چشم خاک ہو در پہ تیرے اوڑا کرے

جو کوئی عشق باز ہو چاہیے وہ گداز ہو — شعلۂ دل فراز ہو شمع صفت جلا کرے

تو تو فغاںؔ ہر پیر دیر پاتے ہین تجسے لطفِ سیر — کون جیئے گا تجھ بغیر تو نہ مرے خدا کرے

یقینؔ کا شاعرانہ کمال اپنی جگہ پر لیکن زبان کی جو صفائی اور روانی فغاںؔ کے یہان ہے، وہ یقینؔ کے یہان نہین، دونون کے ملتے جلتے مضامین کے کچھ مفرد اشعار بھی ملاحظہ ہون،

یقین — اس طرح رونے مین آنکھون کا خدا حافظ یقین — دیکھیے یہ خانماں اس درد مین ڈوبے یا ترے

فغان — اتنی ہی آہ و زاری کرنے اگر رہین گے — جیتے کہاں بچیں گے آخر تو مر رہین گے

یقین — بہار آئی ہے کیا کیا چاک جیب پیرہن کرتے — جو ہم بھی چھوٹ جاتے اب تو کیا دیوانہ پن کرتے

فغان — بہار آئی میرے پاؤن مین پھر زنجیر پڑتی ہے — مبارک ہو جنون گھر کو تیرے آباد کرتا ہون

یقین — آنکھ سے نکلے یہ آنسو کا خدا حافظ یقین — گھر سے جو باہر گیا لڑکا سو ابتر ہو گیا

[ا] اس غزل کا پہلا دوسرا، اور چوتھا شعر، سوداؔ کی طرف بھی منسوب ہے،

(دیکھو کلیات سوداؔ ص ۸۰۴ نولکشور پریس لکھنؤ)

فغاں - مجھ سے ہل سکے گا نہ ہرگز یہ طفل اشک   لخت جگر کو گود میں جب تک کہ بھر نہ لے
یقین - آپ سے جب تک نہ تھا واقف کہاں تھا آپ کو   دیکھتے ہی آئینہ میں مست سکندر ہو گیا
فغاں - دل میں فغاں کے ہم نے عکس رخ وہی نہ دیکھا   آئینہ سکندر کیا اوس کے روبرو ہو

اس زمانہ کے عام مذاق کے مطابق یقین کے کلام میں بعض جگہ تعقید[1] عجیب و غریب ترکیب[2] قافیے میں ناہمواری بھی پائی جاتی ہے لیکن فغاں کا دیوان ان معائب سے پاک ہے، البتہ "نے" استعمال میں فغاں نے معلوم نہیں کونسا نحوی طریقہ اختیار کیا ہے، کہ کہیں بالکل نہیں استعمال ہوا ہے جس سے زبان میں کچھ ثقل پیدا ہو گیا ہے، مثلاً

اے شیخ میں کل سے نہیں دیکھا ہوں صنم کو   اس وقت خدا کی تو بھی بیزار بیٹھا ہوں
رفو کرے تھے جسے تو ہزار محنت سے   میں تار تار کر اس کو اڑا دیا ناصح
تب کہا میں دل سے کر کچھ فکر عقبیٰ اے عزیز   کیوں نہیں ہوتا تو مداح شہ دلدل سوار

ایک جگہ انھوں کے استعمال سے بھی ثقل پایا جاتا ہے،

جو میری تحقیق میں آیا سو اب کرتا ہوں عرض   رائے تو ان کی غلط ہے پر انھوں کا ہے شعار

مگر کہیں کہیں تو صفائی اور روانی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ بعض غزلوں پر بقول استاذی مولانا صاحب، دہلوی داغ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے، مثلاً

مفت سودا ہے ارے یار کہاں جاتا ہے   آ مرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے
کج کلہ، تیغ بکف چیں بہ ابرو، بے باک   یا الٰہی یہ ستمگار کہاں جاتا ہے

---

[1] مثلاً کہاں سکتے ہیں چڑھ نہ یہ تیاں ناز و تمکین کے   کہیں ہم صبر کے بے خرچ مفلس ہیں دل و دین کے
[2] مثلاً لیکن مشتاق دل میرا ہوا ہے سخت سودائی   جہاں یہ دیکھتا ہے سنگ وہاں کرتا ہے بینائی
[3] زور، شور کے قافیے کے ساتھ چھوڑ اور کروڑ بھی استعمال کیا ہے، دیکھو دیوان یقین ص ۱۰۶، انجمن ترقی اردو

یا مثلاً :-

ساغر ہو اور مینا ہو اور سبو ہو ہم تم رہیں یہ صحبت دنیا ہو اور تو ہو
منظور عشق یہ ہے عشاق پا شکستہ محتاج در بدر ہو آوارہ کو بکو ہو

یا مثلاً :-

اے عندلیب زمزمہ کرتے پھر رہے آئی خزاں چمن میں چھپے دن بہار کے
ساقی مجھے تو ساغر نرگس میں دے شراب کچھ بس نہیں ہے چشم تو ہے خمار کے

یا مثلاً :-

ظالم تجھے قسم ہے جو اس کو برا کہے یہ دل بھی دل ہو وے جو نکلو دامن دوست
تیرے ہی دل سے پوچھئے رنج کو بالا کے لذت بڑی بلا ہے کسی کو نہ دے

فغاں کے یہاں شعرا متوسطین کی طرح بعض ترکیبیں تو بہت سبک، لطیف اور دلکش ہیں مثلاً "کاروان اشک" "طفل اشک" "دامن صحرا" "داغ جنون" "خاک بسر" "آتشکدہ دل" "تشنۂ عشق" "گرفتہ دل" "صف مژگان" وغیرہ مگر بعض ایسی ہیں، جو موجودہ ذوق کے مطابق گراں ہو گئی ہیں، مثلاً

برنگ طائر بسمل ہوئے ہے کشتۂ عشق کسی نے غم نہ کیا خاک و خون طپیدن کا
دہن کو دیکھ تیرے ہونٹ چبائے رہ گئے بھرا نہ قند سے منہ پستۂ چشیدن کا

ایسی ترکیبیں اس زمانہ کے شعرا کے یہاں عام ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ اس دور میں اردو شاعری کو اس قابل بنایا جا رہا تھا کہ اس کے ذریعہ سے خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار اچھی طرح ہو، فارسی اس کے سامنے تھی، اس لئے اس زبان کی ترکیبیں اور محاورے کثرت سے استعمال کئے جانے لگے، ان میں سے اکثر تو اردو شاعری کے رخ زیبا کی زینت بن گئے لیکن بعض کھپ نہ سکے، انہی میں فغاں کی مذکورہ بالا ترکیبیں ہیں، اسی طرح فارسی محاورات کو اردو میں رائج کرنے کی کوشش میں کہیں کہیں جگہ بیجا اور

استعمال ہوگیا ہے، جو آج غیر فصیح معلوم ہوتا ہے،

یار برباد تو دیتا ہے میرے خون کو لیک نہ اڑے چھینٹ نہیں گوشۂ داماں کی طرف

فغاں نے فارسی کے محاورہ برباد داون سے برباد دینا استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن اردو میں برباد کرنا رائج ہوا،

مگر اس قسم کے غیر فصیح محاورے شاید ایک آدھ ہی ہیں، ورنہ عام طور سے تمام محاورات موجودہ مذاق کے مطابق ہیں،

الفاظ کی بندش فغاں کے یہاں شعرائے متوسطین کی طرح الفاظ کی بندش بھی چست اور لطیف ہے مثلاً

پامالِ عشق کوچہ الفت سے کیا چلے چلنے میں ہم یہاں سے اگر نقشِ پا چلے
لختِ جگر کو دیکھ کے کہتے ہیں طفلِ اشک گر چل سکے تو ساتھ ہمارے چلا چلے

رسوائے خاص و عام ہوں جاؤں جہاں لئے اس داغدار دل کو بھرُں میں کہاں لئے
واہوں برنگِ گل جو سخن داں ملے کہیں غنچہ صفت خموش ہوں مونہہ میں زباں لئے
اس قافلہ کے بیچ صدائے جرس نہیں جاتی ہے سیلِ اشک عجب کارواں لئے

کیونکر کوئی زیارتِ زخمِ جگر کرے پردے اٹھے نہیں ہیں دلِ داغدار کے

طاقِ نسیاں پہ نہ رکھ شیشۂ دل کو ظالم یہ نہ ہو گرکہ مرا آبلۂ دل پھوٹے
کر دیا وقف مرے کلبۂ احزاں کو فغاں خوانِ یغما کے یہ معنی ہیں جو جا ہو لوٹے

بندش پر ردیف کے اثر کی مثال ملاحظہ ہو،

عاشق کا دل تجھے گر مطلوب ہے تو یہ ہے گر زشت ہو تو یہ ہے اور خوب ہے تو یہ ہے
پردہ اگر دوئی کا اٹھ جاوے تو دکھا دوں معشوق ہے تو یہ ہے محبوب ہو تو یہ ہے
اب کیا علاج کیجئے خانہ خراب دل کا ہوشیار ہے تو یہ ہے مجذوب ہو تو یہ ہے

بخت جگر فغان نے اب نامہ بر کیا ہے   پیغام ہے تو یہ ہے مکتوب ہے تو یہ ہے

الفاظ کی بندش کی چستی سے کہین کہین بقول مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کلام مین موسیقیت اور کہین کہین تشابہ پیدا ہو گیا ہے، پہلے موسیقیت کی مثالین ملاحظہ ہون،

نے شعلہ ونے برق و نہ اخگر نہ شرر ہون   مین عاشق دل سوختہ ہون تفتہ جگر ہون

زاہد کو حرم دیر برہمن کو مبارک   مین کشتۂ الفت نہ ادھر ہون نہ ادھر ہون

قاتل کے دم تیغ سے یہ بوالعجبی ہے   بسمل کی زبان پر طپش تشنہ لبی ہے

آنکھین تیرے پاؤن سے لگین مین سعادت   دامن کو تیرے ہاتھ لگے بے ادبی ہے

دشمن ہے محتسب دل خانہ خراب کا   چھوٹے نہ اس کے ہاتھ سے شیشہ شراب کا

جاری ہے میرے گوشۂ دامان سے سیل اشک   تر اس قدر ہے کا ہیکو دامن سحاب کا

اس دل کو الٰہی کیون آسیب نہ پہنچے   مین ٹھیس سے ڈرتا ہون کہ شیشہ یہ پری ہے

صنعت کے یہ معنی ہین کہ ٹوٹے کو بنا دے   دل توڑنا یہ کون فن شیشہ گری ہے

ہون عاشق دل سوختہ جون سرو چراغان   اس نخل کی ٹہنی نہ ہری ہے نہ بھری ہے

کیون پھوکتا رہتا ہے فغان داغ جگر کو   بجھ جائے گا آپ ہی یہ چراغ سحری ہے

اس کے بعد تشابہ کی مثالین ملاحظہ ہون،

کسی کے پاس دیکھوں یار کو مین سہہ نہین سکتا   رہون تو رہ نہین سکتا کہون تو کہہ نہین سکتا

یہ موج اشک میری صورت زنجیر رکھتی ہے   چلون تو چل نہین سکتا بہون تو بہہ نہین سکتا

تجھے ہر صبح ہنسنا تھا، تجھے سر شام تنا تھی   مجھے ہر روز جلنا تھا مجھے ہر رات رونا تھا

تجھ سے رقیب ہنستے یہ بھی خدا کی قدرت   ہم یون رہین ترستے یہ بھی خدا کی قدرت

دل رودن مین روتے روتے یہ بھی نصیب   جی لے تو ہنستے ہنستے یہ بھی خدا کی قدرت

فغاں کے الفاظ کی بندش کی داد موجودہ دور کے اربابِ کمال نے بھی دی ہے، محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ان کے الفاظ کی بندش ان کی مشق سخن پر گواہی دیتی ہے، مولانا عبدالسلام ندوی رقمطراز ہیں "کہ ان کی بندش کی چستی اُن کی زبان کی سلاست اور روانی کو اور دوبالا کر دیتی ہے" پھر لکھتے ہیں کہ بندش کی چستی نے بعض جگہ فغاں کی ترکیبوں میں نہایت تشابہ اور توازن پیدا کر دیا ہے، اس نے کلام میں روانی کے ساتھ موسیقیت بھی پیدا ہو گئی ہے، جو کانوں کو نہایت خوش آیند معلوم ہوتی ہے،

بقولِ مصنف گلِ رعنا متوسطین شعرا کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ جو عاشقانہ مضامین غزلوں میں بہت پہلے سے بندھتے چلے آتے تھے، اُن کو بہ تبدیلِ الفاظ اور تغیرِ اسالیب معمولی بول چال اور روزمرہ میں اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے، کہ بار بار پڑھئے اور مزے لیجئے، یہ خصوصیت فغاں کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، پیشِ نظر دیوان کی تمام غزلیں اس کی بین مثالیں ہیں، فغاں کی شاعری میں مضامین کی بلندی یا خیالات کی ندرت نہیں بلکہ اس میں عشق و عاشقی کے وہی پرانے نقشے ہیں جن میں صرف زبان کی صفائی کا لطف ہے، اس کا اندازہ ناظرین ان کے اشعار سے کر سکتے ہیں، (باقی)

اسلام کا معاشیاتی نظام

از

جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی منٹگمری

موجودہ معاشی نظریات کا پس منظر | انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی مسائل میں اقتصادی مسئلہ کو کافی اہمیت حاصل ہے، اسی لئے موجودہ زمانہ میں ارباب حکومت نے اس مسئلہ کو اولین درجہ دے دیا ہے، اور ہر حکومت اپنی اقتصادی عظمت و برتری کی خاطر گوناگوں وسائل و ذرائع عمل میں لا رہی ہے، اور یہ بات بڑی سختی سے بار بار دہرایا جا رہا ہے کہ ہمارے ملک میں کسی انسان کو تنگدستی اور افلاس کا شکار نہ رہنے دیا جائے گا، ملک کے تمام باشندوں کو امن و خوشحالی کے ساتھ مساویانہ زندگی بسر کرنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

مگر اس حقیقت سے کس کو انکار ہوگا کہ حقیقی امن و خوشحالی صرف اس کا نام نہیں کہ دولت کے ذخیرے انبار جمع کئے جائیں اور حکومت کے خزانے سونے اور چاندی سے بھرپور ہوں، ورنہ اس معیار سے موجودہ زمانہ سرمایہ و دولت کے اعتبار سے تاریخ کے کسی دور سے پیچھے نہیں ہے، بلکہ ازمنۂ سابقہ سے آگے بڑھ گیا ہے، موجودہ سائنس کے حیرت انگیز اکتشافات نے انسان کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی تک پہنچا دیا ہے، راحت نفس کے جملہ وسائل مہیا ہیں، عشق و محبت کی ہوسناکیوں کی تکمیل میں کوئی کمی نہیں، حسن و جمال کی رنگینیوں سے فضائے عالم معمور ہے، عیش و عشرت، زینت و تجمل اور آرام و راحت آسائش کے وسائل کی بہتات ہے، مگر کوئی عقلمند انسان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ جس چیز کا نام امن و سکون ہے، وہ عنقا ہے، دنیا کے ہر حصہ میں شورش و بدامنی کے طوفان اٹھ رہے ہیں، یعنی

اضطراب کی بجلیاں کوندرہی ہیں، اور فتنہ و فساد کے شعلوں نے خرمنِ امن کو خاکستر بنا دیا ہے کہ کسی نفس کو ایک لمحہ کے لئے بھی سکون حاصل نہیں،

ان حالات سے ہم ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں، کہ عالم انسانی بہت بڑے انقلاب کے دروازہ پر کھڑا ہے زمانہ نئی کروٹ بدلنا چاہتا ہے اور حیاتِ انسانی ایک نئی حرکت کا آغاز کرنے والی ہے، مگر انسان کو اس وقت اس کا یقین ہوگا، جب وہ اس ہمہ گیر انقلاب کی عبوری منازل کے بعد ایک نئی کائنات کا مشاہدہ کرے گا،

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي	ہم ان کو نفس و آفاق میں اپنی نشانیاں
أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ	دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان کو حق وصداقت
(حم سجدہ)	کا یقین ہو جائے گا،

یہ قانونِ قدرت ہے اور تاریخ کے ہر دور میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے، کہ جب کسی قوم نے لذات و شہوات میں غرق ہو کر نوامیسِ فطرت کی توہین کی، اور اس کی ظالمانہ قوتوں نے مخلوقِ خدا کو رنج والم میں ڈال دیا تو قدرت کی انتقامی قوتوں نے اس بدکردار قوم کے ناپاک وجود سے اپنی مقدس زمین کو پاک کر دیا، اور اس کے بعد کسی دوسری صالح قوم کو اس زمین پر بسایا، كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ، آج اس دور میں اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، کہ دنیا مادہ پرستی میں حدِ اعتدال سے بہت بڑھ چکی ہے اور مادی ترقی میں دنیا منتہائے کمال کو پہنچ چکی ہے، مگر اس کے باوجود انسان کا جو قدم بھی آگے کی جانب اٹھتا ہے، اس میں عالمِ انسانی کے لئے ہزاروں ہلاکت خیزیاں موجود ہوتی ہیں، کیا ان حالات میں کوئی عقلمند انسان اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے، کہ صرف سیم و زر کے خزائن ہی انسانوں میں امن و مساوات پیدا کر سکتے ہیں، اگر ایسا نہیں تو ہمیں سوچنا ہوگا، کہ ہمارے سماجی نظام میں کونسا نقص پایا جاتا ہے جس کی بنا پر ہماری ترقی کا ہر قدم ہلاکت و بربادی کو دعوت دے رہا ہے،

اگر دولت سے مقصود دل کی آسودگی اور امن و خوشحالی نہیں، بلکہ نفس دولت ہی ہے، یا دولت صرف آتشیں اسلحہ کی نمایش اور قومی و نسلی رفعت و استیلا کا ذریعہ ہے، تو بدقسمت انسان قیامت تک چین کی نیند نہیں سو سکتا، اور قیام امن کی کوئی کوشش بارآور نہ ہوگی، جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج صرف وطنی اور نسلی قومیتوں کی عظمت و برتری کے لئے سرمایۂ دولت کے انبار لگائے جا رہے ہیں، اور ہر ملک نے ان مکروہ مقاصد کی تکمیل کے لئے دوسرے ممالک میں اپنی تجارت کا وسیع جال پھیلا رکھا ہے، کہ ان خزائن کے ذریعہ ہوائی جہاز، ٹینک، ایٹم بم، اور دوسرے ہلاکت آفرین اسلحہ تیار ہوسکیں، اور اپنی فوجی طاقت کو ناقابل تسخیر حد تک مضبوط اور مستحکم بنا دیا جائے، اقوام حاضرہ کا یہ طرز عمل اُن کے حسد اور رشک و رقابت کی چنگاریوں کو بھڑکانے میں تیل کا کام دے رہا ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس آگ کے شعلے کب اور کس وقت امن عالم کو جلا کر خاکستر کر دیں،

اس مسئلہ پر جتنا غور کیا جائے، ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ موجودہ اقوام کے اقتصادی نظریات کی اندرونی بنیاد جغرافی اور نسلی قومیت کے عصباتی جذبات پر ہے، اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب تک ان اقوام کے بنیادی تصورات میں تبدیلی نہ ہوگی، اس وقت تک آنے والے خطرات کا سدباب نہیں ہوسکتا، اور یہ تبدیلی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اقوام حاضرہ جغرافی اور نسلی قومیتوں کے تنگ دائرے سے نکل کر ہمہ گیر اخوتِ انسانی کے وسیع دائرہ میں قدم رکھیں، اس زمانہ میں انسان کی حقیقی نجات کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اخلاقی اقدار اور ہمہ گیر اخوتِ انسانی کی علی الرغم انسانوں کی خود ساختہ عصباتی تقسیم ہے، اور نہ صرف اُن کے اقتصادی نظام میں بلکہ پورے فلسفۂ اجتماع ( ) میں اس جاہلی عصبیت کا زہر سرایت کئے ہوئے تھے، اُن کی تہذیب، آرٹ، معاشری طور و طریق اور سیاسی و معاشی نظریے سب کے سب اس اصل پر مبنی ہیں، کہ ایک ملک کے باشندے یا ایک نسل کے افراد ایک ایسی قومیت کی تعمیر کرتے ہیں، جو دوسرے بنی نوع انسان سے کلیتہً الگ ہے، اور اس کے اجتماعی تقاضے

اور مفاد قومیتون کے مفاد سے کسی وقت ہم آہنگ نہین ہو سکتے،

ظاہر ہے کہ ہر جغرافی قومیت جب تک اپنے آپ کو دوسرے انسان سے بالکل الگ تھلگ وحدت ( ) تصور کرتی رہے گی، اور اس کی ہئیت اجتماعیہ کا سنگ بنیاد وطنی تصور پر ہوگا، اس وقت تک متضاد اور مخالف قومیتون مین بھی اتحاد نہین ہو سکتا، اور اُن کے قومی مفادات مین کبھی ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ اسی صورت مین ممکن ہے، جب اجتماع انسانی کی بنیاد موجودہ طبقاتی (Sectional) تصورات کے بجائے شرف انسانی اور اس کے ہمہ گیر اصول و نظریات پر رکھی جائے، جب تک یہ بنیادی تبدیلی پیدا نہ ہوگی، اس وقت تک قومون کے مفاد مین باہم ٹکر جاری رہے گی،

اقوام حاضرہ کے اقتصادی نظریے اسی خود ساختہ اور غیر فطری تقسیم پر مبنی ہین، یہی وجہ ہے کہ کم و بیش کے خزانے انسانون کی فلاح و بہبود کے بجائے اُن کی ہلاکت و بربادی کے کام مین لائے جا رہے ہین، اور اُن کے غیر فطری رجحانات نے اُن کی مدنیت کی بنیادین متزلزل کر دی ہین،

وکم اھلکنا من قریۃ بطرت	ہم نے بہت سی ایسی بستیان ہلاک کین
معیشتھا فتلک مسٰکنھم لم تسکن	جو اپنی معیشت مین مغرور و متکبر ہو گئی تھین
من بعدھم الا قلیلا وکنا نحن	اب یہ ہین اُن کے مکانات کہ ان کی ہلاکت
الوارثین،	کے بعد بہت کم آباد ہو سکتے ہین، اور درحقیقت
(قصص)	حقیقی مالک و وارث تو ہم ہی ہین،

اسلام کا اقتصادی نظریہ، اسلام کے نظریۂ زندگی اور فلسفۂ اجتماع کا دائرہ پورے روے زمین کی وسعت مین پھیلا ہوا ہے جس مین مرز و بوم، قبیلہ و نسل اور رنگ و زبان کے امتیازی خطوط کی کوئی گنجائش نہین، اسلام کے وسیع اور عالمگیر اصول و نظریے دنیا کے تمام انسانون مین ایک وسیع روحانی اور نظریاتی اخوت پیدا کرنا چاہتے ہین، اور اس مقصد مین وہ احمر و اسود، آقا و غلام اور عرب و عجم کی کوئی تمیز روا نہین رکھتے،

یعنی اسلام کا دستور اخلاق و معاشرت، نظریہ سیاست، اور فلسفہ معاشیات، اس کے تمام تصورات وطنی اور نسلی قیود سے بالاتر اور انسانیت مطلقہ سے متعلق ہیں، اس لئے اسلامی اصول و نظریات ہی عالم انسانی میں ہمہ گیر رشتۂ مودت پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، اور اسلام کا نصب العین یہی ہے کہ تمام عالم انسانی کو ایک ایسی ہمہ گیر وحدت میں جذب کر دیا جائے جس کی بنیاد شرف انسانی اور ایمان و عمل پر ہے،

کونوا عباد اللہ اخوانا،	تم سب اللہ کے فرمانبردار بندے اور باہم
(بخاری)	بھائی بھائی بن جاؤ،
اللّٰھم ربنا و رب کل شئی انا	اے ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار!
شھید ان العباد کلھم اخوۃ	میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ انسان
(ابوداؤد و مسند امام احمد)	آپس میں بھائی بھائی ہیں،

اسلام میں تمام انسانوں کا مایۂ خمیر ایک ہی ہے اس لئے وہ انسانوں کی کسی مصنوعی تقسیم کو پیدا نہیں کرتا،

الا کلکم من آدم و آدم من طین	تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو مٹی
(مشکوٰۃ)	سے پیدا کیا گیا،

اگر آج کی دنیا کا انسان اس کو ماننے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے، تو کرے، مگر اس کی خواہشات کے علی الرغم قانون قدرت (. Law of nature) اپنا کام بہر حال جاری رکھے گا اور ایک نہ ایک دن ایسا وقت آکر رہے گا، کہ اسلام اپنے نصب العین میں پوری طرح کامیاب ہوگا،

واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون	اللہ اپنے دین برحق کو مکمل کر کے رہے گا
(انفال)	اگرچہ کافر اس بات کو ناپسند کرتے ہیں،

اسلام کے اقتصادی نظریے (. Economic theories)

اخلاقی اقدار پر مبنی ہیں، اور ان میں وطنی قبیلوی، نسلی اور لسانی امتیازات کو کسی قسم کا دخل نہیں، اگر ان میں کوئی امتیازی پہلو ہے، تو وہ صرف شرف انسانی اور مابعد الطبیعاتی تصورات کا کسی صحیح اسلامی حکومت کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا، کہ وہ انسانوں کی کسی جماعت پر صرف اس لئے جارحانہ حملہ کرے کہ اس کی قومیت ہماری وطنی قومیت سے الگ ہے، یا اس کی نسل ہماری نسل سے جدا ہے، یا اس کا رنگ ہمارے رنگ سے متفاوت ہے، اسلام ایک لمحہ کے لئے بھی اس قسم کے حملہ و ہجوم ( ) کی اجازت نہیں دیتا، اور اس کو قتال فی سبیل الطاغوت قرار دیتا ہے، البتہ دینی مقاصد کے لئے جہاد و قتال کا حکم دیتا ہے اور وہ بھی اس وقت جب کہ کوئی بیرونی طاقت مسلمانوں کے فرائض مذہبی اور تبلیغ دین کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہے، درحقیقت اسلام ایک آزاد و خود مختار اسلامی حکومت کا قیام صرف اسی لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ اس کے سوا کسی شکل میں قرآنی نظام اور اسلامی قانون ( ) کا نفاذ و اجرا نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ اور کسی مادی مقصد کے لئے اسلام میں حکومت کی کوئی گنجایش نہیں، گویا اسلام میں حکومت ایک بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اصل مقصود نہیں،

الذین ان مکنّٰھم فی الارض	وہ لوگ کہ جن کو اگر ہم زمین میں غلبہ و تمکنت
اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ و	عطا کریں، تو وہ نمازیں ادا کریں زکوٰۃ
امروا بالمعروف ونھوا عن	دیں، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا
المنکر ( ) (حج)	فریضہ بھی ادا کریں،

مذکورہ آیت میں غلبہ و تمکنت فی الارض کو نماز، زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قیود سے مقید کر دیا گیا ہے، اگر قیام حکومت کے بعد اس کے ذریعہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پوری ادائی نہ ہو سکے، اور حکومت کی طاقت نیکی کو ابھارنے اور برائی کو مٹانے میں صرف نہ ہو، تو ایسی حکومت اگرچہ اس کے چلانے والے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، اسلام کی نظر میں صحیح اسلامی حکومت نہ ہوگی، اسلام میں

ہر ایسی جنگ جو اعلائے کلمۃ الحق اور دین کی برتری کے سوا کسی دوسرے مقصد کے لئے لڑی جائے خواہ وہ اقتصادی جنگ ہو، یا نسل و نسل اور جغرافی قومیت کے غلبہ و استیلا کے لئے یا انتقامی جذبات کے تحت ہو، وہ جاہلیت کی جنگ ہوگی اور اسے کسی حال مین اسلامی جہاد کا نام نہیں دیا جا سکتا، قرآن حکیم نے صاف الفاظ مین جہادِ اسلامی کی غرض و غایت متعین کر دی ہے،

قاتلوا حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون	تم جہاد کرو یہاں تک کہ فتنہ مٹ جائے اور
الدین کلہ للہ	طاعت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے،

حضرت عبد اللہ بن عمر نے فتنہ کی تفسیر ان الفاظ مین بیان فرمائی ہے،،

فقال ہل تدری ما الفتنۃ ثکلتک	حضرت عبد اللہ بن عمر نے فرمایا، تم جانتے ہو
امک انما کان محمد صلی اللہ علیہ	کہ فتنہ کیا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین
وسلم یقاتل المشرکین وکان	سے اس لئے جہاد کرتے تھے کہ ان کے دین
الدخول فی دینہم فتنۃ ولیس	میں داخل ہونا فتنہ تھا، اور آنحضرت صلی اللہ
کقتالکم علی الملک،	علیہ وسلم تمھاری طرح ملک کے لئے نہین
(بخاری کتاب الفتن)	لڑتے تھے،
عن ابی ھریرۃ قال قال رسول	جو شخص امیر کی طاعت سے باہر اور جماعت
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خرج	سے الگ ہو جائے، اور پھر اسی حالت مین
من الطاعۃ و فارق الجماعۃ فمات	مر جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت
مات میتۃ جاھلیۃ و من خرج	ہو گی، اور جو شخص میری امت پر حملہ آور ہو
علیٰ امتی یضرب برھا و فاجرھا	اور نیک و بد کو قتل کرنے لگے، مومن تو
ولا یتحاشی من مومنھا ولا یفی	بھی بچا ہے اور جن لوگون سے اس کا عہد ہے

لذی عھدھا فلیس منی ومن قتل — ان کی پرواہ بھی نہین کرتے تو وہ میری امت
تحت رایۃ عمیۃ یدعوا الی عصبیۃ — سے ہرگز نہین، جو شخص کفر کے جھنڈے کے نیچے
او یغضب لعصبیۃ، فقتل فقتلۃ — عصبیت کی طرف دعوت دے، یا عصبیت کی
جاھلیۃ، — خاطر غضبناک ہو، اور پھر وہ اسی حال مین
(نسائی کتاب المحاربہ) — مرجائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی،

ان تصریحات سے ظاہر ہوا کہ اسلام کا سیاسی اور اقتصادی نقطۂ نظر اقوام حاضرہ کے طبقاتی نقطہ ہاے نظر سے بالکل مختلف ہے، اسلام نفس انسانیت کی فلاح و نجات کا طالب ہے، اور وہ کسی طبقہ سے محض رنگ و نسل کی بنا پر جنگ نہین کرنا چاہتا، اور نہ کسی فرقہ پر محض اس حیثیت سے اقتصادی تفوق و برتری چاہتا ہے، بلکہ وہ دنیا کے تمام انسانون کو نفس انسانیت کے اعتبار سے ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے، اور نسل و وطن کا اختلاف اس کی وسعت نظر کے سامنے حائل نہین ہوتا۔

اس لئے یہ کہنا بالکل درست ہے، کہ صرف اسلامی نظریۂ اجتماع و سیاست کی بنیاد ہی پر پائدار اور عالمگیر رشتۂ اخوت پیدا ہو سکتا ہے، اور جب تک قومون مین فرق و طبقات کی سبقت و اولیت کا جنون موجود ہے، اور ان کے سیاسی اور اقتصادی نظریات تنگ نظری کے زہر سے آلودہ ہین، اس وقت تک ان کی اقتصادی اور طبقاتی جنگ بدستور جاری رہے گی،

اسلامی نظریۂ معیشت کی نوعیت اسلام کا معاشیاتی نظریہ ہر حیثیت سے اقوام حاضرہ کے اقتصادی نظریات سے مختلف اور جداگانہ ہے، اور مستقل نوعیت رکھتا ہے، اسے کسی دوسرے اقتصادی نظریہ سے منسوب نہین کیا جا سکتا، اور نہ کسی دوسرے نظریہ کی اس کی جانب نسبت کی جا سکتی ہے، اسے کسی دوسرے نظریۂ اقتصاد سے کوئی تعلق ہی نہین،

چونکہ یہ نظریہ ہر حیثیت سے مکمل اور مستقل ہے، اس لئے یہ کسی دوسرے نظریہ کا پیوند نہین ہو سکتا،

اور اپنا مستقل مقام رکھتا ہے جس مین کسی بیرونی دباؤ کا شائبہ تک موجود نہ ہو،

کہا جاتا ہے کہ نظامِ اشتراکیت اسلام سے قریبی نسبت رکھتا ہے، اس لئے کہ اس کا مقصد بھی انسانون مین معاشی اور مجلسی مساوات قائم کرنا ہے، یہ خیال اسلامی نظریہ معیشت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ان دونون مین کوئی نسبت نہین، اسلامی نظریہ زندگی اور فلسفہ اجتماع احکم الحاکمین نے انبیا علیہم السلام کے توسط سے انسانون کو دیا ہے، جس کی بنیاد اخلاق در وحانیت پر ہے، اور اشتراکی نظریہ انسانون کا خود ساختہ ہے، اور اس کی بنیاد تمام تر مادی ہے۔ پھر احکم الحاکمین کا علم ازلی و ابدی اور محیط کل ہے اس لئے اس کا بنایا ہوا نظام بھی دائمی اور ہر زمانہ، ہر ملک او قوم اور ہر طبقہ کے لئے ہے، اور اس پر زمانہ کے انقلابات و حوادث کا اثر نہیں پڑ نہیں سکتا، اور انسانون کا بنایا ہوا نظام اُن کی محدود نظر کے مطابق ناقص محدود اور وقتی ہے، جو زمانہ کی رفتار و حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، اس لئے اسلام کا اقتصادی نظام زمانہ کے ہر اقتصادی نظام کے مقابلہ مین زیادہ مکمل جامع اور پائدار ہے،

اسلامی نظام اجتماع کے تمام اجزاء باہم مربوط ہین، ضابطہ اخلاق ہو یا دستور تمدن، مذہب و روحانیت ہو یا معیشت و سیاست، سب مین ایک ہی روح کارفرما ہے، جو ان تمام اجزاء مین ہم آہنگی، اور انضباط، پیدا کرتی ہے، نظامِ اسلامی کا ہر شعبہ جب تک اخلاقی قیود و اقدار کا پابند ہے، اور مابعد الطبیعیاتی تصورات و عقائد کے ماتحت ہے، اس وقت تک وہ اسلامی ہے، اور اگر ایسا نہین ہے، تو ظاہری ڈھانچہ خواہ کتنا ہی خوبصورت کیون نہ ہو، اس پر اسلام کا اطلاق نہین ہو سکتا، اب ان اصول کے ماتحت نظامِ اشتراکیت کے بنیادی عناصر کا تجزیہ کیا جائے، کہ اس کی تہ مین کون سے عوامل کارفرما ہین،

نظامِ اشتراکیت کے عوامل عوامل سے مراد وہ تصورات ہین، جو کسی چیز کے وجود کے محرک ہوتے ہین، یہی تصورات اس چیز کے لئے اصل روح کی حیثیت رکھتے ہین، نظامِ اشتراکیت کو جن تصورات نے

پیدا کیا ہے، یا اس نظام کے ذریعہ جس نوعیت کا انقلاب مقصود ہے اس کا اجمالی خاکہ یہ ہے،

۱۔ اشتراکی نظام مکمل طور پر انفرادیت محضہ ( ) کی ضد ہے، اور

وہ انفرادیت کو کلی طور پر ختم کر دینا چاہتا ہے، افراد کی شخصی اور ذاتی ملکیت خواہ سرمایہ کی شکل میں ہو یا

جائداد کی صورت میں ان سے چھین کر سٹیٹ یا جماعت کی تحویل میں دینا چاہتا ہے، انفرادی جد وجہد

اور ذاتی محنت کے حاصلات پر بھی سٹیٹ کو قابض بناتا ہو اس طرح معاشرت اور معاشیات کو کلیۃً جماعت کے تحت لانا چاہتا ہے،

۲۔ نظام عائلی میں تمام اخلاقی پابندیوں کو اٹھا دینا چاہتا ہے، اور عورت کو ہر مرد سے اختلاط

کی پوری آزادی دیتا ہے، اور اس سے جو اولاد پیدا ہو اس کو سٹیٹ کی ملکیت قرار دیتا ہے، گویا نظام عائلی

میں سلسلۂ ازدواج کو کلیۃً ختم کر دینا چاہتا ہے،

۳۔ مذہب کے تصورات کو مٹا کر سوسائٹی کی بنیاد معاشی نظریوں پر قائم کرنا چاہتا ہے،

۴۔ ہر قسم کی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے،

اور اس انتہا پسندی کا نام کمیونزم ہے، اور جب تک یہ کام مکمل نہیں ہوتا، حکومت کے تمام اختیارات

ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر کے حوالہ کرتا ہے، جسے منزہ عن الخطار تصور کیا جاتا ہے،

۵۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے، اور اسے

ماننے والوں سے کسی اخلاقی پابندی کا مطالبہ نہیں کرتا،

اب دیکھنا ہے کہ متذکرہ بالا امور خمسہ کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

اسلام افراد کی ذاتی ملکیت برقرار رکھتا ہے، اگرچہ فرد کو جماعت سے الگ ہونے کی اجازت

نہیں دیتا، اس نے فرد اور جماعت کے حدود و دائرے متعین کر دئے ہیں، کہ فرد کس حد تک اپنی انفرادیت

برقرار رکھ سکتا ہے، اور کس مقام پر اس کی انفرادیت جماعت کے مفاد سے متعلق ہو جاتی ہے، اسلام نے

جماعتی مفاد اور انفرادیت محضہ کے بین بین ایک معتدل اور درمیانی مسلک اختیار کر لیا ہے،

جو فطرت کے عین مطابق ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فرد کی ذاتی صلاحیتیں اسی وقت ابھر سکتی ہیں جبکہ اسے کام کرنے کی پوری آزادی، اور اس کے دل میں اس کام کے لئے کشش موجود ہو، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو جب اسے یقین ہو کہ وہ اپنی محنت کے نتائج سے فائدہ اٹھا سکے گا، اور آدمی کو اپنی مرضی کے ماتحت صرف کر سکے گا، لیکن اگر کام کرنے والے کو پہلے سے یہ یقین ہو جائے، کہ اس کو صرف صبح و شام کا کھانا اور پہننے کے کپڑے ہی میسّر آئیں گے، تو اُسے کیا پڑی ہے کہ وہ اپنی جان کو مصائب و آلام کی نذر کرے، اور شوق و تندہی کے ساتھ محنت و مشقت اٹھائے، لیکن اگر اس کو یقین ہو کہ اس کو اس کی محنت کا پورا صلہ ملے گا، جسے وہ اپنی مرضی سے صرف کر سکے گا، تو اس کا شوق عمل تیز سے تیز تر ہوتا جائے گا اور اس کی قابلیت کے جوہر نمایاں ہوتے چلے جائیں گے،

دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام میں انسانی زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے دو حصے ہیں، حیات قبل الموت اور حیات بعد الموت، گویا حیاتِ انسانی ایک غیر منقطع سلسلہ ہے، اور دونوں زندگیوں میں ایک خاص قسم کا ربط پایا جاتا ہے، اور اس زندگی کی جد و جہد صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ بعد میں آنے والی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے، گویا ہماری اس زندگی کی ہر حرکت کو آنے والی زندگی میں پورا دخل ہے، یہ عمل و سعی کی زندگی ہے، اور وہ ثمرات و نتائج کی؛!

ظاہر ہے کہ اس تصوّر کے مطابق دنیاوی زندگی میں جب تک فرد کے تشخص کو برقرار نہ رکھا جائے اور اس کو عمل کی آزادی نہ دی جائے، محاسبۂ اعمال کی کوئی صورت ہی ممکن نہیں ہے، انسانی اعمال میں عبادات و معاملات دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے، اور جس طرح عبادت کی تکمیل اور عدم تکمیل پر ثواب و عقاب کا ترتب یقینی ہے، اسی طرح معاملات میں بھی انسان کی ہر حرکت کا محاسبہ لازمی ہے مگر اسی صورت میں جب کہ اس کی جد و جہد کو انفرادیت سے نکال کر اجتماعیت میں گم نہ کر دیا جائے، اور فرد کی مستقل حیثیت باقی رہنے دی جائے ورنہ محاسبۂ اعمال کا تصوّر بے معنی ہو کر رہ جائے گا،

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے بھی جماعتی زندگی کو بڑی اہمیت دی ہے، اور وہ فرد کو کسی حال مین جماعت سے الگ ہونے کی اجازت نہین دیتا، اور جب فرد اور جماعت کے مفاد کا سوال آجائے، تو فرد کو جماعت کے مقابلہ مین اپنے مفاد سے دست بردار ہو جانا چاہئے، بلکہ جماعت کے مفاد کے لئے فرد کی جان بھی جماعت کی ملک بن جاتی ہے، مگر اس کے باوجود اسلام نے فرد کے تشخص اور ذاتی اعمال مین اس کی خود ارادیت (Self Determination) کو برقرار رکھا ہے، اور فرد کی اس حیثیت کے حقوق و حدود بالکل الگ ہین،

نظام عائلی اسلامی زندگی کا ایک اہم حصہ اور اسلام کے فلسفہ اجتماع کا ایک مستقل باب ہے، درحقیقت عائلی زندگی کی ترقی پذیر صلاحیتیں ہی سوسائٹی کی فلاح و ترقی کی ضامن ہین، اور اسی سے اجتماعی زندگی کی شاہراہین نکلتی ہین، اسی لئے اسلام نے ازدواج کو زندگی کا ایک جزو لاینفک قرار دیا ہے، اور شوہر اور بیوی کے لئے الگ الگ دوائر عمل متعین کر دئے ہین، اور ان کی مشترکہ ذمہ داری کو بالوضاحت بیان کر دیا ہے، ولهن مثل الذی علیهن وللرجال علیهن درجة (بقرہ)

مسلمانون کی وحدت ملی کی بنیاد ہی مذہب پر ہے، اور مسلمان صرف مذہب ہی سے دوسری اقوام و ملل سے ممتاز ہین، مذہب کے سوا مسلمان کا کوئی وجود نہین،

اسلام مین اس کے نظریہ حیات کو عمل مین لانے کے لئے خلافت اسلامیہ یا اقتدار حکومت کی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر اسلامی احکام و قوانین کا اجراء و نفاذ ممکن نہین ہے یعنی حکومت و اقتدار مقصد کے حصول کا ایک ضروری وسیلہ ہے، خود مقصود بالذات نہین،

اسی طرح اسلام مین کسی منزہ عن الخطاء اور مختار مطلق ڈکٹیٹر کی گنجائش نہین جس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات قانون کا حکم رکھتی ہو، اسلام مین خلیفہ خود احکام الٰہی کا تابع ہوتا ہے، وہ نائب حق کی حیثیت سے ان احکام کو نافذ کرتا ہے، اسے یہ اختیار نہین کہ وہ ان احکام مین

طرف سے کوئی رد وبدل یا ترمیم کر سکے اس کا کام صرف خدائی احکام کو اس کی اصل شکل مین نافذ کرنا ہے، اور وہ ان احکام کا خود بھی اسی طرح پابند ہوتا ہے جس طرح دوسرون کو پابند بنانا چاہتا ہے، اور مسلمانون مین جو شخص خدا اور رسول کی اطاعت مین سب سے زیادہ ممتاز ہوتا ہے، وہی مسندِ خلافت کے لئے سب سے زیادہ اہل قرار پاتا ہے،

اسلامی نصب العین کے حصول کے لئے جو جد وجہد کی جاتی ہے خواہ وہ جسمانی محنت ہو خواہ جانی و مالی قربانی، اسی کا نام جہاد ہے، اور اس کو اخلاقی بندشون مین جکڑ دیا گیا ہے، اور اس کی حدین مقرر کر دی گئی ہین، اور مختلف حالات کے لئے اس جد وجہد کے الگ الگ ضوابط مقرر ہین، جب تک یہ جد وجہد اسلام کی اخلاقی اور الٰہیاتی تصورات کی پابند رہے گی، جہادِ اسلامی کے مقدس نام سے موسوم ہوگی، اور جب اُن سے الگ ہوگی، وہ جہاد نہیں، بلکہ فساد فی الارض یا قتال فی سبیل الطاغوت کے نام سے موسوم ہوگی،

ان تصریحات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ اشتراکیت اور اسلام مین کوئی نسبت نہین، جو لوگ اس غلط فہمی مین مبتلا ہین، کہ سوشلزم اسلام سے مناسبت رکھتا ہے، وہ ایک بڑی سخت غلطی مین مبتلا ہین، درحقیقت موجودہ جاہلی نظامات مین سب سے زیادہ مکروہ اور خطرناک نظام اشتراکیت ہے،

اشتراکیت کی حدِ رسائی | اشتراکیت کا مطمحِ نظر انسانون کی معاشی الجھنون کو حل کرنا اور ایک ایسی پُرسکون اور آزاد فضا تیار کرنا ہے، جس مین کوئی انسان اقتصادی اور معاشی اعتبار سے کمزور اور پس ماندہ نہ رہنے پائے، اور کوئی ایک طبقہ ملک کے وسائل معیشت پر تنہا تسلط نہ رکھ سکے، اور ملک کے ذرائع آمدنی سے ملک کا ہر باشندہ مساوی طور پر فائدہ اٹھا سکے، اس مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کی پیداوار اور تمام کارکن قوتین سٹیٹ کی ملکیت قرار دی گئین،

اشتراکیین جن تصورات پر جدید انسانی سوسائٹی کی تعمیر کرنا چاہتے ہین، وہ محض منفی ہین یعنی عدم ملوکیت عدم ملکیت ذاتی، عدم تشخص ذاتی، عدم تصرف ذاتی، خدا اور مذہب کی نفی، اخلاق و روحانیت کی نفی بلکہ آگے

چل کر ہر قسم کی حکومت کی نفی، غرض اس نظام کی تمام دفعات نفی سے شروع ہو کر نفی ہی پر ختم ہوتی ہیں۔

ع لاسلاطین، لاکلیسا، لااِلٰہ،

حالانکہ حیاتِ انسانی بذاتِ خود مثبت چیز ہے اور اس مثبت کے لئے جو نظام مرتب کیا گیا ہے، وہ تمام تر منفیات کا مجموعہ ہے، انسانی زندگی جب خود مثبت ہے تو اوس کی فلاح و ترقی کسی مثبت نظام ہی سے ہو سکتی ہے،

لا و الّا احتسابِ کائنات   لا و الّا فتحِ بابِ کائنات،

لا و الّا سازو برگِ اُمتان   نفی بے اثبات مرگِ امتان (اقبال)

اس سے قطع نظر انسان صرف جسم کا نام نہین، بلکہ اس کی ترکیب مین ایک دوسرا جوہر بھی شامل ہے، جو جسم پر حکومت کرتا ہے، اور جسم کی حس و حرکت کا سرچشمہ ہے، حیاتِ انسانی کے ان دونون اجزا میں جس طرح کا ناقابلِ انفکاک ربط پایا جاتا ہے، اس کے فلاح کے لئے ایک ایسے نظامِ حیات کی ضرورت ہے، جو اپنی ترکیبی نوعیت کے اعتبار سے حیاتِ انسانی کے اجزای ترکیبی سے مناسبتِ تامہ رکھتا ہو، اور اس کے اجزا مین بھی اس قسم کا گہرا ربط موجود ہو،

اس لحاظ سے اگر اشتراکی نظام کا تجزیہ کیا جائے، تو اس کا کوئی جزو بھی ایسا نہین، جو ابعادِ جسم سے اتر کر روحِ انسانی کے مقتضیات کی بھی تکمیل کرتا ہو، اخلاقی اور مابعد الطبیعیاتی تصورات تو اس کے پاس تک نہیں بھٹکنے پاتے، اور وہ خدا و مذہب سے پیچھا چھڑانے ہی مین انسان کی نجات تصور کرتا ہے، صرف جسم کی راحت و آسائش اس کا مطمحِ نظر ہے، اور اوس نے حیاتِ انسانی کی وسیع ضرورتون کو سمیٹ کر ایک ادنیٰ درجہ کی ضرورتِ انسانی کے تابع بنا دیا ہے، گویا انسانی زندگی کا منتہائے کمال یہی ہے، کہ اس کے پیٹ کی آگ کے لئے ایندھن کی کوئی کمی نہ رہ جائے،

اوپر یہ کہا جا چکا ہے کہ حقیقی امن و راحت کا تعلق مادی خزائن کی کثرت اور وسائلِ معیشت کی بہتات

سے آتا نہیں جتنا کہ انسان کے قلب نظرت سے ہے، اور جسمانی راحت، دل اور روح کی طمانیت و تسکین کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے کسی اور ہی غذا کی ضرورت ہے، اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (آیۃ)

حقیقت یہ ہے کہ جب تک حیات انسانی کے تمام اجزا میں ربط و تسلسل کو قائم نہ رکھا جائے، اور اس کے ہر جزو کو اس کے اصل مقام پر نہ رکھا جائے، اس وقت تک زندگی کے مسائل کسی شکل میں حل نہ ہونگے فسادِ انسانیت کا اصل سبب یہ ہے کہ زندگی کے کسی ایک جزو کو اس قدر اہمیت دیجاتی ہے، کہ دوسرے اجزا کسی ایک جزو میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں یا اُن کو کسی ایک جزو کے تابع بنا دیا جاتا ہے، اور ان کی مستقل حیثیت باقی نہیں رہتی نظامِ اشتراکیت میں اقتصادی مسئلہ کو اس قدر اہمیت دیگئی ہے کہ زندگی کے تمام مسائل یا تو سرے سے ختم ہو کر رہ گئے ہیں، یا اس کے لئے تابع مہمل کی حیثیت رکھتے ہیں،

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام حیاتیاتی ضرورتوں کی علیٰ قدر مراتب رعایت کی گئی ہے، حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اسلام کی نظر التفات سے محروم رہ گیا ہو، اور ہر شعبہ کو اسی مقام پر رکھا گیا ہے جس کا وہ مستحق ہے، (باقی)

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچون کے نصاب میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی، جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کرسکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، اس کی زبان بچون کے لائق دلچسپ اور پسندیدہ ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور آسان تاریخ ہے، جو گذشتہ صدیون میں مسلمانون نے دنیا کے مختلف حصون میں قائم کین،

قیمت عہ، ضخامت:۔ ۲۰۰ صفحے،

"منیجر"

کتب خانۂ ٹونک کے بعض مخطوطات

از

جناب مولوی ابوالطیب عبدالرشید صاحب لاہوری

راقم سطور کو اپنے زمانہ قیام ٹونک مین پہلی بار اس کے کتب خانہ کے دیکھنے اور وہان کی نادر قلمی کتابون کے مطالعہ کا موقع ملا، دوران مطالعہ مین جو قابلِ ذکر قلمی کتابین نظر سے گذرتی تھین اُن کے متعلق اس خیال سے مختصر کیفیت بطور یادداشت لکھ لیا کرتا تھا، کہ آیندہ کسی وقت اس امر کو مرتب کرکے پیش کیا جائے گا، اسی خیال کے ماتحت آج تقریبًا ۰ سال کے بعد اُس یادداشت کو مضمون کی شکل مین پیش کیا جارہا ہے، جو انشاء اللہ تعالیٰ اہلِ علم کی دلچسپی کا باعث ہوگا، اور بعض قلمی کتابون کے متعلق مفید معلومات حاصل ہون گے،

کتابون کے تذکرہ سے پہلے کتب خانہ کی تاریخ کے متعلق حضرت الاستاذ العلام ابوعبداللہ محمد السورتیؒ (م ۱۳۹۹ھ) اور ٹونک کے دیگر اہلِ علم حضرات سے کتب خانہ کے متعلق مجھے جو کچھ معلوم ہوسکا ہے، اوس کو لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس سے کتب خانہ کی تاریخ بھی سامنے آجائے گی،

یہ کتب خانہ اپنی قدامت اور نوادر کتب کے ذخیرہ کے لحاظ سے شمالی ہند مثلاً لکھنؤ، رامپور، پٹنہ کے مشرقی کتب خانون سے کسی طرح کم نہین ہے لیکن ریاست کی بے اعتنائی کے باعث اب تک گوشۂ گمنامی مین پڑا ہوا ہے، اس لئے اکثر اہلِ علم حضرات کتب خانہ ٹونک اور اس کی بیش بہا علمی نوادرات سے قطعًا ناواقف ہین،

اس کتب خانہ کو سب سے پہلے نواب محمد علی خان بہادر نے اپنے زمانہ نظر بندی میں بنارس میں فراہم کرنا شروع کیا تھا، اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے عبدالرحیم خان صاحب جو بڑے ذی علم اور متقی تھے، کتب خانہ کو بنارس سے منتقل کرکے ٹونک لے آئے اور اپنی حویلی میں رکھا، صاحبزادہ مرحوم نے دیوان شمس الدین (قافلہ) کا کتب خانہ خرید کر اُسے بھی اس کتب خانہ میں شامل کیا، جب تک صاحبزادہ صاحب زندہ رہے، کتب خانہ میں کتابوں کا اضافہ فرماتے رہے، اُن کے انتقال کے بعد کتب خانہ ان کے چھوٹے صاحبزادہ عبدالمنعم خان صاحب کے قبضہ میں آیا، وہ بھی اپنے پیش رو بزرگوں کی طرح کتب خانہ کی ترقی میں کوشاں رہے اُن کے انتقال کے بعد خاندان میں کوئی ایسا علم دوست نہیں رہا، جو بزرگوں کی اس علمی وراثت کی حفاظت اور نگرانی کرتا، اس لئے ریاست نے اوس کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور موجودہ فرمانروائے ٹونک ہز ہائنس سعید الدولہ نواب سر سعادت علی خان بہادر بالقابہ کے عہد میں کتب خانہ صاحبزادہ عبدالرحیم خان بہادر کی حویلی سے منتقل ہو کر ایک عالی شان سرکاری عمارت میں آگیا ہے،

کتب خانہ کی موجودہ حالت نہایت خراب ہے، فہرستیں نامکمل اور ناقص ہیں، مخطوطات کی علٰحدہ کوئی فہرست نہیں، مطبوعات اور مخطوطات کے لئے ایک ہی فہرست ہے، مخطوطات پر کوئی تشریحی نوٹ بھی نہیں، چنانچہ راقم سطور کو ٹونک لائبریری کی فہرست سے قطعاً کوئی مدد نہیں ملی، اور خود ہر کتاب کے متعلق تحقیق کرنی پڑی ہے، اس لئے ریاست کو کتب خانہ کی جانب توجہ کرنے کی زیادہ ضرورت ہے اس کی ادنی توجہ سے یہ کتبخانہ بھی شمالی ہند کے مشرقی کتب خانوں کی طرح شہرت و اہمیت حاصل کر سکتا ہے،

علوم قرآنی | (۱) تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر، یہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن ابی الحسن علی بن محمد بن علی القرشی التیمی البکری البغدادی، الفقیہ الحنبلی الواعظ الملقب بہ جمال الدین الحافظ (م ۵۹۷ھ)

کی تصنیف ہے، کتب خانہ مین اس کا قلمی نسخہ بخط نستعلیق خوشنما موجود ہے، جو سورۂ صافات سے آخر قرآن تک ہے، کتاب کا طرز بیان نہایت صاف اور سادہ ہے، جس کو معمولی استعداد کا عربی طالب علم بھی بلا تکلف سمجھ سکتا ہے،

(۲) تیسیر البیان لاحکام القرآن" یہ علامہ جمال الدین محمد بن علی بن عبد اللہ المعروف بابن نور الدین الیمنی کی تصنیف ہے، ابتدا مین یہ عبارت ہے:۔

"الحمد للہ الذی خلق الانسان وعلّمہ القرآن" الخ

مصنف نے اس مین صرف اُن آیات کی تفسیر کی ہے جو احکام سے متعلق ہین ۸۲۰ھ مین اس کی تصنیف سے فراغت ہوئی، کتاب پر سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہین ہے لیکن نسخہ قدیم، خوشخط اور صاف لکھا ہوا ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ مین بھی ہے، جو ۱۱۶۹ھ کا لکھا ہوا ہے، دوسرا نسخہ کتب خانہ رامپور مین ۸۷۱ھ کا نوشتہ محفوظ ہے،

(۳) "کثیر الفوائد فی تصریح وتوضیح امثال القرآن

موضوع کتاب کتاب کے نام سے ظاہر ہے، امثال القرآن کے موضوع پر یہ بہترین کتاب ہے، چھوٹی تقطیع کے ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے، سنہ تصنیف ین نسخہ کے آخر مین یہ عبارت ہے:۔

"وکان الفراغ من تسوید هذه النسخة الشریفة فی یوم الجمعة شهر رمضان المبارک سنہ ۱۲۷۰ھ"

(۴) اسئلة القرآن"

یہ کتاب محمد بن ابی بکر عبد القادر الرازی المتوفی سنہ ۶۶۰ھ کی تصنیف ہے، جن کی عربی لغت مین "مختار الصحاح" مشہور اور متداول کتاب ہے، یہ نسخہ مختلف رنگ کے نفیس گل بیز کاغذ پر بخط نستعلیق لکھا ہوا ہے، تقطیع متوسط، ضخیم، ابتدا اس طرح ہے، قال الفقیر الی رحمة ربه ومغفرته الخ

یہ کتاب اعراب القرآن للعکبری مطبوعہ مصر کے حاشیہ پر طبع ہو چکی ہے،

۵- تفسیر ایجاز البیان لمعانی القرآن یہ نجم الدین ابو القاسم محمود بن ابی الحسن النیشاپوری القزوینی کی تصنیف ہے، کتاب کا سنہ تصنیف معلوم نہ ہو سکا، مصنف نے یہ کتاب شہر خجند میں تصنیف فرمائی ہے، اس کا نسخہ اکثر جگہ سے کرم خوردہ ہے، کتابت قدیم طرز کی اور تقطیع کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، کتاب کا آغاز یوں ہوتا ہے، الحمد للہ بِرَحمتہ وَ انزل الخ

۶- غریبُ القرآنُ المُسمّٰی بنزھۃ الخاطر وسرور الناظر للامام اللغوی فخر الدین محمد بن علی النجفی الطریحی،

یہ نسخہ بھی قدیم الخط ہے، مگر نہایت اچھی حالت میں ہے، سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں ہے، یہ کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، بلکہ امام ابی بکر محمد بن عزیز سجستانی (م ۳۳۰ھ) کی کتاب "غریب القرآن" کو جدید ترتیب پر مرتب کیا گیا ہے، مقدمہ میں مؤلف اس کی اس طرح تصریح کرتا ہے۔

"اِنّی عثرت بکتاب غریب القرآن المسمّی بنزھۃ القلوب و فرحۃ المکروب تالیف ابی بکر محمد بن عازیز السجستانی وتاملتہ و اذا ھو کتاب فائق رائق عجیب غریب الا المطلوب فیہ یعسر تناولہ للقصور فی ترتیبہ والخلل فی تبویبہ فاستخرت اللّٰہ تعالیٰ علی تغییر ذالک الترتیب علی وجہ لا رضی فشرعت فیہ ورتبتہ علی ابواب الحروف الھجائیۃ، الخ،

۷- تفسیر القرآن للشیخ الاجل الشاہ اھل اللّٰہ بن الشیخ عبدُ الرحیم الدِھلوی، یہ عربی میں قدیم مفسرین کے طرز کی تفسیر ہے، عبارت نہایت پاکیزہ، شستہ اور صاف ہے، شاہ صاحب نے اس میں اہل تصوف کے مذاق کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے

جیتی عصر حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی تفسیر مظہری سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے، صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہے، اس مین اختصار ہے، اور قاضی صاحب کی تفسیر مین تفصیل ہے،

راقم سطور نے شاہ اہل اللہ صاحبؒ کے مفصل حالات معلوم کرنے کے لئے مختلف عربی فارسی تذکرون کی ورق گردانی کی، اور خط و کتابت کے ذریعہ اہلِ علم حضرات سے دریافت بھی کیا مگر کہین سے کامیابی نہو سکی، اور نہ آپ کی تصنیفات کے متعلق کچھ معلوم ہو سکا،

صرف الیانع الجنی" کے مطالعہ سے اتنا پتہ چل سکا، کہ آپ شاہ ولی اللہؒ کے بھائی ہین، اور احادیث ہدایہ کی تخریج پر آپ کی ایک تصنیف ہے،

اس سے زیادہ حالات شاید الیانع الجنی "کے مؤلف کو بھی نہین معلوم ہو سکے یانع کے الفاظ یہ ہین:

وکان لولی اللہ اخ یسمی الشیخ اھل اللہ کان من اھل اللہ واھل العلم به لم یبلغنی من خبرہ فوق ان لہ کتاباً باطیفاً فی تخریج احادیث الھدایۃ رائیت لہ الابواب الاربعۃ مختصر فیہ کلمات جامعۃ یکثر نفعھا رحمہ اللہ تعالیٰ الخ"

کتاب کے آخر مین یہ عبارت ہے :-

سبحان ربك رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین اولاً واٰخراً الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ وانا الفقیر المفتقر الی اللہ الکریم اھل اللہ بن عبد الرحیم احسن اللہ الیہ والی والدیہ بفضلہ العمیم والسلام علی من اتبع الھدیٰ"

فقہ اور اصولِ فقہ مین بھی آپ کی عربی مین دو معرکۃ الآراء تصنیف ہین، مختصر الہدایہ اور

رسالۂ اصولِ فقہ" پہلی کتاب فقہ حنفی کی مشہور متداول کتاب ہدایہ کا خلاصہ ہے، یہ خلاصہ اس قابلیت کے ساتھ کیا گیا ہے، کہ کتاب کا اصل مضمون نہیں چھوٹا ہے، لیکن لاحاصل تطویلات اور فقیہانہ مناقشات کو یکسر قلم انداز کر دیا ہے، حتی کہ صاحبین اور طرفین کے اختلافی مسائل تک نظر انداز فرما دیئے ہیں، صرف امام ابوحنیفہؒ کے فقہی مسلک کو پیش کیا ہے اور اس کے ذیل میں ہر مسئلہ کی تائید و توثیق میں صحاح اور دوسری مستند کتب احادیث سے سندیں نقل کی ہیں،

غالباً اسی کتاب کے متعلق مؤلف یانع کو تخریج ہدایہ کا شبہ ہو گیا ہے، راقم کے پاس یہ دونوں کتابیں صحیح رسالہ قلمی موجود ہیں، "مختصر الہدایہ" کا نسخہ حضرت مولانا عبدالقیوم م ۱۲۹۹ھ بن الشیخ عبدالحی البڈھانوی خلیفہ سیدنا سید احمد شہید کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی رئیس بھیکم پور (ادام اللہ فیوضہ العلیہ) کے کتب خانہ میں میری نظر سے گذرا ہے، اس کا ایک ناقص نسخہ مکتوبہ ۹۵۹ھ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں فن فقہ کے تحت نمبر ۱۲۱۴ پر موجود ہے، جو کتاب النکاح سے کتاب المزارعۃ تک ہے، ایک محترم دوست سے معلوم ہوا ہے، کہ مختصر الہدایہ کا ایک قلمی نسخہ علامہ ادیب عبدالعزیز الاثری المینی صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ابقاہ اللہ تعالیٰ راعیاً للعلم والادب کے پاس بھی ہے،

رسالہ اصول فقہ یہ رسالہ باوجود صغیر الحجم ہونے کے اصول فقہ کا نہایت جامع رسالہ ہے، اور اصول شاشی اور حسامی کی طرح عبارت میں اس قدر ایجاز و اختصار سے کام نہیں لیا گیا ہے جس سے کتاب کا مطلب سمجھنا طلبہ پر دشوار ہو جائے، یہ رسالہ عبارت اور طرز بیان کے اعتبار سے متداول اصولی رسالوں سے بدرجہا بہتر معلوم ہوتا ہے، اول :-

الحمد للہ رب العالمین والصلوات والسلام علی سید المرسلین

محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین امّا بعد فیقول الفقیر المفتقر الی

رحمۃ اللہ الکریم محمد اہل اللہ بن الشیخ عبد الرحیم غفر اللہ لہ ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ ھٰذا مما یجب استحضارہ فی علم اصول الفقہ الخ

میرے پاس جو نسخہ ہے وہ والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین محدث بریلی م ۲۰ صفر ۱۳۶۳ھ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، مرحوم نے اس رسالہ کو بنگلور (مدراس) کے زمانۂ قیام میں کسی قلمی نسخہ سے نقل فرمایا تھا، کہیں کہیں معمولی سی بیاض چھوٹی ہوئی ہے، قابل طبع رسالہ ہے،

۸- **المقدمہ فی اصول الترجمہ** یہ رسالہ بزبان فارسی حکیم الامت سیدنا الشیخ ولی اللہ ابن عبد الرحیمؒ کی تصنیف ہے، گو یہ ۱۲-۱۳ صفحے کا مختصر رسالہ ہے، مگر مضمون کی ندرت اور خصوصیات کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، ترجمۂ قرآن کے فن پر اپنے طرز کا یہ پہلا رسالہ ہے، فن ترجمۂ قرآن کی جن خصوصیات کا اس رسالہ میں ذکر کیا گیا ہے، ان کا اپنے ترجمۂ قرآن (فتح الرحمٰن) میں التزام رکھا ہے یہ رسالہ شاہ صاحب کے ترجمۂ قرآن کے مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہے جو رسالہ فتح الرحمٰن کے بعض مطبوعہ نسخوں کی ابتدا میں چھپا ہوا ہے، وہ زیر نظر رسالہ کے علاوہ ہے، یہ نسخہ ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۲۷ھ کا لکھا ہوا ہے، کاتب کا نام محمد علی الحسینی السقطی ہے، اس رسالہ کا ایک قلمی نسخہ مولانا سید نور الحق علوی استاذ اورنٹیل کالج لاہور کے یہاں بھی ہے، ان دونوں نسخوں میں کہیں کہیں الفاظ میں زیادتی وکمی کا معمولی سا فرق ہے،

اکتوبر ۶۲ء کے "برہان" دہلی میں اسی "مقدمہ" کو مختصر نوٹ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، برہان کا یہ شائع کردہ رسالہ راقم سطور کے ٹونک لائبریری کے نسخہ سے نقل کیا ہوا ہے،"

اس نسخہ کے طبع کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیا گیا ہے، ضرورت تھی کہ اس کے دوسرے نسخوں کو تلاش کرکے اُن سے تصحیح ومقابلہ کے بعد شائع کیا جاتا، راقم سطور نے مختلف نسخوں کی مدد سے اس کی تصحیح کرلی ہے، اور انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب اسے شائع کیا جائے گا،

۹۔ طیبی شرح مشکوٰۃ المصابیح : یہ علامہ حسین بن عبداللہ بن محمد الطیبی م ۷۴۳ھ کی نہایت معتبر تصنیف اور مشکوٰۃ کی شروح میں سب سے پہلی شرح ہے، یہ نسخہ جابجا سے ناقص ہے، مگر کتابت نہایت اعلیٰ ہے،

اولہ :۔ الحمد للہ الذی ھو العزیز الحکیم وھو الرحمن الرحیم الخ

اصول حدیث میں بھی آپ نے ایک تصنیف کی ہے، ٹونک میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، طیبی کے ساتھ اگر اس کتاب کو بھی مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مدظلہ طبع کرا دیں تو بہتر ہو،

(۱۰) ضوء المشکوٰۃ حاشیہ مشکوٰۃ یہ ہندوستان کے جلیل القدر ادیب شاعر علامہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی تصنیف ہے، کتاب کا آخری باب، "باب علی الولاۃ فی التیسیر" ہے، خطبہ کے بعد لکھتے ہیں،

"وبعد فیقول الفیض السہارنفوری وقد صین من کل شر وعین انی لما انفضت یدی من تعلیقات الجلالین ثنیت عنانی الی حل المشکوٰۃ غیر مکترث بزین ولا شین ولا مبال بما یصیب کل ھین ولین مما یقال فیمن ضل وزل ولم یفرق بین العین والغین فشرعتہ متقحا للاسماء والانساب ومصرحا المناسبۃ ما فی الباب بالباب وکاشفا فیہ عما یستعملہ العرب وباحثا عما یلیق لفنون الادب وموفقا بین المتنافیین ورافعا للتنافی الظاھر البین علی قدر علمی وفھمی للہ ودری ان اصاب سہمی ولم اقتف الشراح ولم ابحث عن المسائل فان الفقہ کافل لھما ونعم الکافل وسمیتہ بضوء المشکوٰۃ وعسی ان یکون ان تلقی بالقبول واللہ المستعان علی

ما اقول وھو نعم المسئول ھذا اوالدعاء وجود الخطاء معفو،

(۱۱) حاشیہ مشکوٰۃ (عربی) مصنف کا نام عطاء اللہ بن فضل شیرازی نیشاپوری المعروف بجمال حسنی ہے، طبقات شاہجہانی میں لکھا ہو کہ میر جمال الدین عطاء اللہ نے ہرات میں وفات پائی، صاحب کشف الظنون نے اُن کی وفات ۱۰۰۰ھ میں لکھی ہے،

یہ نسخہ بخط عربی خوشخط ہے، اول ص مطلا ہے اور جدول آسمانی ہے، کتاب کے آخر کی ان عبارتوں

تمت الحاشیۃ بحمد اللہ وعونہ وحسن توفیقہ فی سنۃ الف وثمانین

زائداً علیہ التسع من الھجرۃ النبویۃ علیہ الصلوٰۃ وعلی آلہ

واصحابہ وازواجہ اجمعین،

"شرعت ھذہ الحاشیۃ فی بلدۃ لاھور حفظہا اللہ من الآفات

فی عھد ابی المظفر محی الدین اورنگزیب دا[م] سنۃ من جلوس تسع عشر

سو ظاہر دھوکا ہوتا ہے کہ ۱۰۰۰ھ میں مصنف کا انتقال ہوا ہے، تو ایسی حالت میں ۱۰۸۹ھ سنہ تصنیف کس طرح ہو سکتا ہے، لیکن درحقیقت یہ سنہ کتابت ہے سنہ تصنیف نہیں،

کتاب کے سرورق پر ہے "وھی خلاصۃ الطیبی"

(۱۲) لمعات التنقیح علی مشکوٰۃ المصابیح للشیخ عبد الحق حنفی المحدث الدھلوی (م ۱۰۵۲ھ ۱۶۴۲ء) یہ نسخہ قدیم الخط دو ضخیم جلدوں میں ہے، کاغذ گلرنگ سفید ہے، پہلی جلد نہایت خوشخط خفیف سی کرم خوردہ، جلد دوم بادامی مجدول شنجرفی وسیاہی پہلے ورق کے ص پر یہ عبارت ہے:-

"حاجی عبد اللہ خلیفہ شیخ عبد الرزاق بن شیخ امام الدین قادری اور یہ درثبت ہے، شیخ عبد القادر

(۱۳) جواہر الاصول[۱] فی حدیث الرسول یہ ابو الفیض محمد بن محمد علی الفاسی کی

---

[۱] اس کا ایک قلمی نسخہ سہارنپور میں ایک محترم دوست کے یہاں میری نظر سے گذرا ہے، جو حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے نسخہ سے منقول ہے،

تصنیف ہے اوّلہ :-

الحمد لمن اصح حدیث کلام القدیم والصلوٰۃ والسلام علی من احسن کلام حدیثہ القدیم وعلی آلہ وصحابہ سراۃ هداۃ الصراط المستقیم،

آخر کی عبارت ہے :-

استراح منا ان الکاتب من تحریرھا وتسطیرھا فی ضحوۃ الخمیس الذی کان السابع والعشر من ذی القعدۃ وقد مضی من الهجرۃ المصطفویۃ علی صاحبها الصلوٰۃ والسلام

۱۴ - لُباب الاصول فی اصول الحدیث، یہ عربی میں اصول حدیث میں مختصر رسالہ ہے، مصنف کا نام معلوم نہ ہوسکا،

۱۵ - مدارج الاخبار ومعارج الآثار من مشارق الانوار، ہندوستان میں فن حدیث پر دو کتابیں لکھی گئی ہیں، مشارق الانوار اور کنز العمال، ان دونوں میں اوّلیت کا فخر مشارق الانوار کو حاصل ہے، اس کتاب میں اوّل الذکر کتاب کو فقہی تبویب پر مرتب کیا گیا ہے، یہ نسخہ نہایت قدیم الخط ہے، فن حدیث کے تحت نمبر ۱۰۹ پر محفوظ ہے،

۱۶ - شمائل ترمذی بحواشی علامہ ابن حجر عسقلانی و میرک شاہ وغیرہ یہ نسخہ بہ تقطیع متوسط، ۱۰ صفحات پر مشتمل ہے، سنہ کتابت کی عبارت حسب ذیل ہے،

قد فرغ من تحریر هذہ النسخۃ الشریفۃ المبارکۃ المسماۃ لشمائل النبویۃ المصطفویۃ الفقیر الی اللہ الصمد محمد بن سید پیر محمد فی تاسع عشر من ربیع الاوّل سنۃ الف ومائۃ وتسعۃ من الهجرۃ

اس کے علاوہ شمائل کے اردو قلمی نسخے بھی کتب خانہ میں ہیں جو ۱۱۹۱ھ و ۹۰۹ھ کے نوشتہ ہیں،

(۱۷) اشرف الوسائل فی شرح الشمائل (عربی) مصنف کا نام احمد بن علی الہیثمی الانصاری مصری (المولود ۹۰۹ھ المتوفی ۹۷۳ھ) ہے قاضی زکریا کے شاگرد ہیں، مکہ معظمہ میں ۹۷۳ھ کے بعد انتقال فرمایا، حجر ان کے اجداد میں کسی کا نام یا لقب تھا، اسی نسبت سے ابن حجر مکی مشہور ہوئے نسخہ بخط نسخ خوشخط لیکن خفیف کرم خوردہ ہے،

اولہ:- الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین والمرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وبعد فھذہ لا مجالتی علقتھا علی مشکل شمائل الامام الحافظ ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ (بفتح المھملۃ فسکون)

مقدمہ میں ہے:-

"لما قرئ علی فی رمضان سنۃ لتسع واربعین وتسعمائۃ (۹۴۹) بالمسجد الحرام المکی ح وسمیتھا اشرف الوسائل الی فھم الشمائل واسئال اللہ قبولھا (آمین)

(۱۸) شرح شمائل، یہ شرح شیخ عبد الرؤف المناوی (م ۱۰۳۲ھ) کی تصنیف ہے... صفحات پر مشتمل ہے، یہ نسخہ ۱۰۳۲ھ کا مکتوبہ ہے، آخر میں یہ عبارت ہے،

تم الشرح المبارک بعد العصر من یوم السبت السادس عشر من شھر رمضان المعظم سنۃ ۱۰۳۲ھ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلم علی ید الفقیر محمد بن احمد المطری،

کتاب کے سرورق پر ہے:- ھذا الشرح للشیخ عبد الرؤف المناوی المتوفی سنۃ ۱۰۳۲

یہ شرح مولانا عصام الدین الاسفرائنی اور علامہ ابن حجر الہیثمی کی شرحوں کے بعد شمائل کی تیسری شرح ہے جس میں پہلی دو شرحوں کی تہذیب و تنقیح کی گئی ہے، مقدمہ میں لکھتے ہیں،

ان متن تصدی بحل شرحها احد المدققین مولانا عصام الدین الاسفرائینی فاتی بما لم یسبق الیه من کشف النقاب عن اسرارها الکثیرة من الاحتمالات العقلیة فی هذا الفن الذی هو من الفنون النقلیة مع ماهو علیه من الاقتصار حتی عد ذالک من سقطات الاوهام و تلاه العالم النحریر الشهیر بابن حجر الهیثمی نزیل المکة المکرمة فاطال و اطاب الخ،

(۱۹) شرح شمائل مولانا عصام الدین ابراہیم بن محمد الاسفرائینی (م ۹۴۳ھ) کی شرح شمائل کا بھی قلمی نسخہ کتب خانہ میں محفوظ ہے،

(۲۰) الخیر الکثیر اور التفہیمات یہ دونوں رسالے ایک مجموعہ میں نہایت پاکیزہ خط میں لکھے ہوئے ہیں، مجلس علمی ڈابھیل سورت سے یہ دونوں رسالے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، حضرت شاہ صاحب کے پہلے مسودہ سے منقول ہونے کے باعث ان کی قدر و قیمت باوجود چھپ جانے کے بہت زیادہ ہے، یہ دونوں نسخے ٹونک لائبریری کے گوہر نایاب کہلانے کے مستحق ہیں،

مجموعہ کے سرورق پر یہ عبارت ہے،

"تفہیمات حضرت قدوۃ العلماء مولوی شاہ ولی اللہ صاحب منقول از مسودہ اول قلمی خط فارسی کاغذ سفید، در کتب خانہ یمین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علی خان بہادر دام اقبالہ والی ٹونک سنہ ۱۲۹۰ھ داخل گردید"

اس عبارت کے ذیل میں جو مہریں ثبت ہیں، ایک مہر محمد علی خان بہادر کی اس طرح ہے ہے

نگہبان دین محمد علی

دوسری مہر وزیر الدولہ امیر الملک محمد وزیر خان نصرت جنگ کی ہے، اسی مجموعہ میں سات صفحون کا ایک رسالہ مصطلحات الحدیث کا بھی ہے اس پر بھی نواب محمد علی خان کی مہر ہے،

(۲۱) مجموعہ رسائل حجۃ الاسلام سیدنا اسمٰعیل شہیدؒ، اس مجموعہ میں ایک رسالہ ہے جس میں حضرت شہید نے ہم عصر علمائے شاہجہان آباد (آگرہ) کے فتاوائی پر تنقید فرمائی ہے، مقدمہ میں لکھتے ہیں:-

"پس ازین اجوبہ مفصلہ بعض سوالات است کہ علمائے شاہجہان آباد در اجوبہ آنہا اجمالے مخل بکار بردہ اند و بدین سبب بعض عوام در اوہام باطلہ افتادہ اند ابتغاء لرضوان اللہ برائے دفع شبہ عوام تفصیل پرداختم، وھو حسبی ونعم الوکیل ونعم المولی ونعم النصیر،

دوسرا رسالہ "علم عقائد" میں ہے، اس رسالہ کا آغاز یہ ہے:-

"من العبد الذلیل الراجی لرحمۃ اللہ الجلیل محمد اسماعیل تجاوز ربہ عن مساوئہ ......

تیسرا رسالہ "اصول حدیث" پر ہے، جس میں احادیث کے اخذ و استناد کے سلسلہ میں ائمہ اربعہ کا نقطۂ نظر اور محور فکر واضح فرمایا ہے جس کے مطالعہ سے ائمہ اربعہ کی فقہ میں جو اختلاف بادی النظر میں نظر آتا ہے، اس کی حقیقی علت سمجھ میں آجاتی ہے، اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد درس حدیث میں کسی مذہب کے پیرو کو اپنے مسلک کی تائید اور تقویت کے لئے متعارض احادیث میں دور از کار تاویلات کرنے کی قطعاً گنجایش باقی نہیں رہتی، اس رسالہ سے موجودہ جماعتی نقطۂ نظر کے طریقۂ تعلیم حدیث میں اصلاح ہو سکتی ہے۔ قابل طبع رسالہ ہے،

استفسار و جواب

شاہ نعمت اللہ ولی اور ان کا قصیدۂ پیشینگوئی

(۱)

محمد عاصم صاحب انسپکٹر ابکاری، ڈرا برانڈ کوڈ شلری ڈالی گنج لکھنؤ: "شاہ نعمت اللہ ولی کے مختصر حالات، مثلاً ولادت، وفات، سکونت، خاندان، سلسلۂ طریقت وغیرہ کے بارہ میں معلومات درکار ہیں، نیز ان کا مفصل حال کس کتاب میں مل سکتا ہے، شاہ صاحب کا قصیدہ کہاں دیکھنے میں آسکتا ہے، اور اس کا صحیح نسخہ کہاں ہو سکتا ہے؟ کیا اس کی اشاعت اب بھی ممنوع ہے؟"

(۲)

جناب رشید احمد صاحب منعمی، تسنیم محل رانچی: شاہ نعمت اللہ ولی کا قصیدہ پیشین گوئی شکست ہندوستان کے عنوان سے روزنامہ قندیل کراچی میں شائع ہوا ہے، اس کا تراشہ روانہ ہے، کیا یہ انہی کا قصیدہ ہے؟ اس کی تحقیق مطلوب ہے۔

(۱)

معارف:- شاہ نعمت اللہ ولی کے اس قصیدہ کے متعلق اور دوسرے کئی مقاموں سے بھی استفسارات آئے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ان دنوں مسلمانوں میں ایسی پیشین گوئیوں سے سہارا پکڑنے کا میدان بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ فرضی قصیدے بھی ان کی طرف منسوب کر کے چھاپے جا رہے ہیں

بہرحال آپکے سوالوں کا جواب حسب ذیل ہے ۔

(۱) نعمت اللہ ولیؒ کے نام و تخلص سے ایک سے زیادہ اہل دل شعرا شہرت رکھتے ہیں، ان میں سے صاحب قصیدۂ پیشین گوئی نورالدین سید شاہ نعمت اللہ ولیؒ ہیں، ان کا دیوان برٹش میوزیم، بائکی پور، ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانوں میں موجود ہے، اور ۱۲۷۶ھ میں طہران سے چھپ بھی چکا ہے،

شاہ نعمت اللہؒ کے سوانح عام فارسی تذکروں خصوصاً مجمع الفصحا، مراۃ الاسرار، ریاض الشعرا تذکرۃ الشعرا دولت شاہ سمرقندی، اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیا، تذکرۃ الکرام اور عام تاریخوں میں سے فرشتہ و حبیب السیر وغیرہ میں پائے جاتے ہیں، ان میں اختلافات بھی ہیں، جو نسب نامہ سے سنہ وفات تک کے پورے دور میں موجود ہیں، زیادہ مستند معلومات وہ ہیں جن کو اُن کے کسی شاگرد نے دیوان میں دیباچہ کے طور پر لکھا ہے، اور "مناقب حضرت شاہ نعمت اللہ ولیؒ" کے نام سے عبد العزیز بن شیر ملک ابن محمد واعظی نے ایک مختصر رسالہ بھی لکھا ہے، جو علاء الدین احمد شاہ بہمنی، (۸۳۸ھ - ۸۶۲ھ) کے نام سے معنون ہے یعنی یہ رسالہ شاہ صاحب کی وفات کے چند ہی سال کے بعد لکھا گیا ہے، اس کا متن برٹش میوزیم کے ایک مجموعہ نمبر ۱۶۸۲۷ میں موجود ہے اور ان مآخذ سے برٹش میوزیم کی فارسی مخطوطات کے مرتب ریو نے بہت مختصر حالات اجمال و اختصار سے قلمبند کئے ہیں، اور اردو میں جناب ام اے حفیظ نے اُن کے سوانح و کلام پر ایک مختصر رسالہ لکھا ہے جس میں اس قصیدۂ پیشینگوئی کے اشعار بھی شائع کئے ہیں، یہ رسالہ "شاہ نعمت اللہ ولیؒ" کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا ہے، اور راج نرائن سنگھ درگاہ شاہ ارزان، ڈاکخانہ مہندرو پٹنہ کے پتہ سے ۱۴؍ میں مل سکتا ہے،

مناقب شاہ کی تصریح کے مطابق شاہ نعمت اللہ ۷۳۰ھ یا ۷۳۱ھ میں حلب میں پیدا ہوئے، عراق میں نشو و نما پائی، ۲۴ سال کی عمر میں مکہ معظمہ گئے، یہاں سات سال قیام پذیر رہے، اور شیخ عبد اللہ یافعی متوفی ۷۶۸ھ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر راہ سلوک طے کی، اور اُن کے مجاز و خلیفہ بنائے گئے، پھر

سمرقند، ہرات اور یزد میں مقیم رہے، اور ہر جگہ مریدوں کی بڑی تعداد حلقۂ ارادت میں داخل ہوتی گئی، پھر ماہان میں جو کرمان سے ۲۰ فرسخ پر واقع ہے مستقل سکونت اختیار کی، اور اپنی زندگی کے پچیس سال نہیں بسر کئے، اور ۲۲ رجب ۸۳۴ھ کو ایک سو یا چار سال کی عمر میں واصل بحق ہوئے ان کی تصنیفات میں دیوان[۱] کے علاوہ تقریباً پانسو چھوٹے بڑے رسائل و مکاتیب ہیں، جو تقریباً سب کے سب مسائل تصوف پر ہیں (فہرست مخطوطات برٹش میوزیم جلد ۲ ص ۴۴۳ و دیگر کتب تذکرہ

شاہ صاحب علیہ الرحمہ صوفی تھے، اور الصوفی لا مذہب لہ کے صحیح مصداق کہے جا سکتے ہیں، انھیں اثنا عشری یا علوی کہنا حقیقت سے دور ہے، وہ شیخ عبد اللہ یافعی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کی وجہ سے شافعی کہے جا سکتے تھے، اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ طریقت کی ارادت کے ساتھ فقہی مذاہب میں سے شیخ کے اختیار کردہ مذہب کی بھی مرید پیروی کرے، لیکن دراصل وہ اس قسم کے کسی انتساب کو قبول نہیں کرتے تھے، شاہ نواز خاں نے مآثر الامراء میں ان کا ایک قطعہ نقل کیا ہے، وہ ان کے مذہب پر صحیح روشنی ڈال سکتا ہے، کہتے ہیں :-

گویند مرا چہ کیش داری ای بیخبران چہ کیش دارم

از شافعی و ابو حنیفہ آئینہ خویش پیش دارم

اینہا ہمہ تابعان جد اند من مذہب جد خویش دارم

یعنی وہ بجز اسلام کے کسی انتساب کو روا نہ رکھتے تھے،

شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے زہد و تقوی و کشف و کرامت کی شہرت دور دور پھیلی اور وہ مختلف سلاطین کے حلقہ میں بھی احترام و عقیدت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، ان میں سے دکن کا بہمنی حکمران احمد شاہ بھی تھا، اور اسی کے وسیلہ سے شاہ نعمت اللہ اور اُن کے خاندان کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے پیدا ہوا، چنانچہ احمد شاہ بہمنی کی درخواست پر شاہ نعمت اللہ کے پوتے میر نور اللہ دکن میں آئے

احمد شاہ امام کی پیشوائی کے لئے دور تک گیا، اور جس جگہ ان دونوں کی ملاقاتیں ہوئیں، وہاں ایک گاؤں "نعمت آباد" کے نام سے آباد کرایا، اور انھیں دربار میں مخدوم زادے کی حیثیت سے غیر معمولی عزت و تکریم سے جگہ دی، اور اپنی لڑکی کو اُن کے حبالۂ عقد میں دیدیا،

پھر شاہ نعمت اللہ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے شاہ خلیل اللہ اپنے دو صاحبزادوں شاہ حبیب اللہ و شاہ محب اللہ کے ساتھ یہاں وارد ہوئے، اور ان دونوں صاحبزادوں کی شادیاں بھی دکن کے بہمنی شاہی خاندان میں ہوئیں، آگے چل کر میر نور اللہ نے سجادہ نشینی کی خدمت شاہ محب اللہ کو تفویض کر دی، اور خود صاحب طبل و حشم ہو کر امیرانہ کروفر کی زندگی اختیار کر لی، پھر عہد جہانگیری میں اس خاندان کے اکابر کو مناصب حاصل ہوئے، اور یہ سرفرازیاں دورِ عالمگیری میں بھی قائم رہیں، شاہنواز ان کا بیان ہے کہ اس خانوادہ کی اولاد اُن کے زمانہ تک دکن میں موجود ہے، (مآثر الامراء ج ۳ ص ۲۳۵ تا ۲۴۴)

شاہ نعمت اللہ کی اولاد کے چند اور سلسلے بھی ہیں، جن کا تعلق ایران سے وابستہ رہا، اور وہ ہماری گفتگو سے علٰحدہ ہیں،

شاہ صاحب کے قصیدۂ پیشین گوئی قیامت کی شہرت کی خاص وجہ شاید یہ ہو کہ اس میں مہدی آخرالزمان کے ظہور کا ذکر آیا ہے، اس قصیدہ کے لکھے جانے کے چند ہی سال بعد امیر تیمور کے حملے سے ایشیا کا ایک وسیع علاقہ تھرا اٹھا، اس دور میں امام آخرالزمان کی آمد کا خاص طور پر انتظار کیا گیا، پھر ایک سے زیادہ موقع پر تاریخ کے مختلف دوروں میں لوگوں نے اس قصیدہ کو مدار بنا کر مستقبل کے متعلق خوش آیند توقعات قائم کئے، اور آخری طور پر حضرت سید احمد شہید بریلوی کی تحریک کے موقع پر بھی اس سے کام لیا گیا، اور اُن کی ذات گرامی کو اس قصیدہ کی پیشینگوئی کا مصداق ٹھہرایا گیا، اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے،

قدرتِ کردگار می بینم حالتِ روزگار می بینم

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی تحریک انقلاب کے بعد مسلمانوں پر ابتلا کا ایک خاص دور گذرا ہے
پھر جب انگریزی حکومت کو پورا تسلط حاصل ہوا تو مسلم عوام نے اپنے مستقبل کی امیدیں پیشینگوئیوں پر
رکھیں، اور اس سلسلہ میں اس قصیدہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، پھر اسی زمانہ میں ایک دوسرا قصیدہ
شاہ نعمت اللہ کی طرف منسوب ہو کر مسلمانوں میں گشت کرنے لگا جس میں انگریزی حکومت کے استیلا، اور اس کے
زوال کا تذکرہ خاص طور پر تفصیل سے آیا ہے، لیکن اس قصیدہ کا انتساب شاہ صاحب کی طرف صحیح نہیں
یہ نہ اُن کے کسی دیوان میں ہے، اور نہ اس کا کوئی قدیم نسخہ کسی کتب خانہ میں پایا جاتا ہے. اس دوسرے
قصیدہ کے کچھ اشعار ربع صدی پہلے راقم سطور کی نظر سے کسی کی بیاض میں گذرے تھے، پھر وہ اشعار
کہیں دیکھنے میں نہ آئے ممکن ہے اُس زمانہ میں حکومتِ ہند نے اُس کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا ہو
ورنہ اصل قصیدہ جو شاہ نعمت اللہ ولی کا ہے، وہ ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا ہے، اور پٹنہ سے جو کتاب
شائع ہوئی ہے، اس میں بھی موجود ہے، آپ اس کتاب کو منگا کر شاہ صاحب کے مفصل حالات اور اس
قصیدہ کے اشعار کا مطالعہ کر سکتے ہیں،

(۲)

شاہ نعمت اللہ ولی سے منسوب یہ قصیدہ جس کا تراشہ آپنے، روزنامہ قندیل کراچی سے لے کر
بھیجا ہے، غالباً پاکستان کی تاسیس کے بعد اسی ماحول اور تصورات میں ترتیب پایا ہے، اس کے
فرضی ہونے کی بہت سی داخلی شہادتیں خود اس قصیدہ کے اشعار میں موجود ہیں، نہ صرف اس کا شعر
ہندوستانی فارسی" زبان میں ہے، بلکہ اس میں ایسے بہت سے الفاظ موجود ہیں، جو شاہ نعمت اللہ ولی
علیہ الرحمہ کے زمانہ میں ان معنوں میں استعمال نہیں کئے جاتے تھے، یہانتک کہ بعض ملک کے جو نام اس میں
آئے ہیں، وہ بھی شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے زمانہ میں پائے نہ جاتے تھے، مثلاً جاپان کا ذکر اس میں
ایک سے زیادہ موقع پر آیا ہے، حالانکہ جاپان کو "جاپان" سے جو موسوم کیا گیا ہے، وہ مارکو پولو کے سفر چین

احمد شاہ ان کی پیشوائی کے لئے دور تک گیا، اور جس جگہ ان دونون کی ملاقاتین ہوئی وہان ایک گاؤن "نعمت آباد" کے نام سے آباد کرایا، اور انھین دربار مین مخدوم زادے کی حیثیت سے غیر معمولی عزت و تکریم سے جگہ دی، اور اپنی لڑکی کو اُن کے حبالہ عقد مین دیدیا،

پھر شاہ نعمت اللہ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے شاہ خلیل اللہ اپنے دو صاحبزادون شاہ حبیب اللہ و شاہ محب اللہ کے ساتھ یہان وارد ہوئے، اور ان دونون صاحبزادون کی شادیان بھی دکن کے بہمنی شاہی خاندان مین ہوئین، آگے چل کر میر نور اللہ نے سجادہ نشینی کی خدمت شاہ محب اللہ کو تفویض کر دی، اور خود صاحب طبل و حشم ہو کر امیرانہ کروفر کی زندگی اختیار کر لی، پھر عہد جہانگیری مین اس خاندان کے اکابر کو مناصب حاصل ہوئے، اور یہ سرفرازیان دور عالمگیری مین بھی قائم رہین، شاہنواز ان کا بیان ہے کہ اس خانوادہ کی اولاد اُن کے زمانہ تک دکن مین موجود ہے، (مآثر الامراء ج ۳ ص ۲۳۵ تا ۲۴۳)

شاہ نعمت اللہ کی اولاد کے چند اور سلسلے بھی ہین جن کا تعلق ایران سے وابستہ رہا، اور وہ ہماری گفتگو سے علحدہ ہین،

شاہ صاحب کے قصیدۂ پشین گوئی قیامت کی شہرت کی خاص وجہ شاید یہ ہو کہ اس مین مہدی آخرالزمان کے ظہور کا ذکر آیا ہے، اس قصیدہ کے لکھے جانے کے چند ہی سال بعد امیر تیمور کے حملہ سے ایشیا کا ایک وسیع علاقہ تھرا اٹھا، اس دور مین امام آخرالزمان کی آمد کا خاص طور پر انتظار کیا گیا، پھر ایک سے زیادہ موقع پر تاریخ کے مختلف دورون مین لوگون نے اس قصیدہ کو مدار بنا کر مستقبل کے متعلق خوش آیند توقعات قائم کئے، اور آخری طور پر حضرت سید احمد شہید بریلوی کی تحریک کے موقع پر بھی اس سے کام لیا گیا، اور اُن کی ذات گرامی کو اس قصیدہ کی پیشینگوئی کا مصداق ٹھہرایا گیا، اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے،

قدرتِ کردگار می بینم   حالتِ روزگار می بینم

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی تحریک انقلاب کے بعد مسلمانوں پر ابتلا کا ایک خاص دور گذرا ہے پھر جب انگریزی حکومت کو پورا تسلط حاصل ہوا تو مسلم عوام نے اپنے مستقبل کی امیدیں پیشینگوئیوں پر رکھیں، اور اس سلسلہ میں اس قصیدہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، پھر اسی زمانہ میں ایک دوسرا قصیدہ شاہ نعمت اللہ کی طرف منسوب ہو کر مسلمانوں میں گشت کرنے لگا جس میں انگریزی حکومت کے استیلا اور اس کے زوال کا تذکرہ خاص طور پر تفصیل سے آیا ہے، لیکن اس قصیدہ کا انتساب شاہ صاحب کی طرف صحیح نہیں ہے نہ اُن کے کسی دیوان میں ہے، اور نہ اس کا کوئی قدیم نسخہ کسی کتب خانہ میں پایا جاتا ہے، اس دوسرے قصیدہ کے کچھ اشعار ربع صدی پہلے راقم سطور کی نظر سے کسی کی بیاض میں گذرے تھے، پھر وہ اشعار کہیں دیکھنے میں نہ آئے، ممکن ہے اُس زمانہ میں حکومتِ ہند نے اُس کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا ہو، ورنہ اصل قصیدہ جو شاہ نعمت اللہ ولی کا ہے، وہ ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا ہے، اور پٹنہ سے جو کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں بھی موجود ہے، آپ اس کتاب کو منگا کر شاہ صاحب کے مفصل حالات اور اس قصیدہ کے اشعار کا مطالعہ کر سکتے ہیں،

(۲)

شاہ نعمت اللہ ولی سے منسوب یہ قصیدہ جس کا تراشہ آپ نے روزنامہ قندیل کراچی سے لے کر بھیجا ہے، غالباً پاکستان کی تاسیس کے بعد اسی ماحول اور تصورات میں ترتیب پایا ہے، اس کے فرضی ہونے کی بہت سی داخلی شہادتیں خود اس قصیدہ کے اشعار میں موجود ہیں، نہ صرف اس کا ہر شعر ہندوستانی فارسی" زبان میں ہے، بلکہ اس میں ایسے بہت سے الفاظ موجود ہیں، جو شاہ نعمت اللہ ولی علیہ الرحمہ کے زمانہ میں ان معنوں میں استعمال نہیں کئے جاتے تھے، یہاں تک کہ بعض ملک کے جو نام اس میں آئے ہیں، وہ بھی شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے زمانہ میں پائے نہ جاتے تھے، مثلاً جاپان کا ذکر اس میں ایک سے زیادہ موقع پر آیا ہے، حالانکہ جاپان کو جاپان "سے جو موسوم کیا گیا ہے، وہ مارکو پولو کے سفر چین

(۱۲۹۵ء) کے بعد کا واقعہ ہے، چین میں اس جزیرہ کو "چی پن کیو" (Chi-pen-Kue) کہتے تھے
اس سے (Chipangai) جپانگو ہوا، پھر یہی لفظ انگریزی میں (Japan) جاپان
کے تلفظ سے ادا کیا گیا، اور جینیوں نے بھی اس کے اس تلفظ کو قبول کر لیا، (جاپان از ایڈورڈ مرے) ظاہر ہے
کہ ۱۳ ویں صدی کا یہ نومولود لفظ اس قدر جلد شہرت نہیں پا سکتا تھا، کہ شاہ نعمت اللہ ولی متوفی
۸۳۴ھ اور ان کے زمانہ کے لوگ اس سے واقف ہوتے، اور وہ بے تکلف اپنے قصیدے میں "جنگ روس
و جاپان" یا زلزلہ جاپان" کا ذکر کرتے، اور کہہ سکتے کہ

جاپان فتح یابد بر ملک روسیانہ (؟)

یا:- جاپان تباہ گردد یک نصف ثالثانہ (؟)

اس لئے حال کے اس تصنیف کئے ہوئے قصیدہ کے متعلق جو محض سیاسی پروپیگنڈے کے لئے
تیار کیا گیا ہے، یہ تصریح کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں، کہ یہ قدیم زمانہ کے کسی قلمی یا مطبوعہ اصل پر
مبنی نہیں ہے، بلکہ یہ سراسر خود ساختہ اور فرضی اور جعلی ہے، "س"

وفیات

ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم

افسوس ہے کہ گذشتہ ۲۴؍ دسمبر ۴۷ء کو ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم نے بعارضۂ فالج لندن مین انتقال کیا، مرحوم اپنے علمی کمال مین ہندوستان کے مشاہیر مین تھے، وہ تعلیم کے ماہر اور ریاضیات کے ممتاز فاضل تھے، انھون نے اپنی تعلیم کے زمانہ مین ان فنون مین ہندوستان اور یورپ کی درسگاہون مین جو امتیازات حاصل کئے، وہ اس دور مین کم ہندوستانیون کو حاصل ہوئے تھے، چند دنون جامعہ ازہر مین بھی رہے تھے، اس لئے عربی سے بھی کچھ واقف تھے، ان کی پوری زندگی علم و تعلیم کی خدمت مین گذری، اور وہ نصف صدی سے زیادہ کسی نہ کسی حیثیت سے مدرسۃ العلوم اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے، کئی مرتبہ وائس چانسلر ہوئے، ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ اس عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے، برسون مجلس مقننہ کے ممبر رہے، مالیات مین ان کی راے اور مشورون کو خاص اہمیت حاصل تھی، اُن کو اس زمانہ کے بڑے سے بڑے اعزاز حاصل ہوئے، جن سے یونیورسٹی کو بھی فوائد پہنچے، اور اُن کے دور مین اس کو بڑی ترقی ہوئی، اُن کا آخری کارنامہ میڈیکل کالج کا قیام ہے، چند مہینے ہوئے جدید تعلیمی نظام کے مطالعہ کے لئے یورپ اور امریکہ گئے تھے، کہ لندن مین پیام اجل آپہنچا،

مرحوم اس دور کی پیداوار تھے، جب مسلمانون پر مغربی تمدن مسلط تھا، اور اس کا سب سے بڑا مرکز علی گڈھ تھا، لیکن انھون نے اس کا بہت کم اثر قبول کیا، اب تو ضعیفی کی عمر تھی، وہ ہر زمانہ مین نہ صرف عقیدے بلکہ ظاہری وضع قطع مین بھی مسلمان رہے، اُن کی زندگی بڑی سادہ اور

بے تکلف تھی، اُن کی سادگی مین ایک صاحبِ کمال کی شان بے نیازی پائی جاتی تھی، شخصی طور پر بھی سے لوگون کو بڑے فوائد حاصل ہوئے، ان کی ذات سے سینکڑون غریب طالب علمون نے تعلیم حاصل کرلی، اور انھون نے بہتون کو جن کا کوئی سہارا نہ تھا، ملازمتین اور بڑے بڑے عہدے دلوائے کمزوریون سے کوئی انسان مستثنیٰ نہین، وہ سیاست مین علی گڈھ کی پرانی روایات کے حامل اس لئے ایک طبقہ کو ان کے خیالات اور طریقہ کار سے اختلاف رہا، لیکن ان کی علمی فضیلت اور خدمات سے کسی کو انکار نہین، مسلمانون مین جو صاحبِ کمال بھی اُٹھ گیا، اس کا بدل نہ پیدا ہوسکا مرحوم کی جگہ بھی مشکل سے بھر سکیگی، اللھم اغفرلہ مغفرۃ واسعۃ،

ان کو یونیورسٹی کے انتظامی امور اور دوسری قومی و سیاسی مشغولیتون کی وجہ سے تالیف و تصنیف کا کم موقع مل سکا، اور دو تین مختصر تعلیمی کتابون کے علاوہ اپنے علم کے شایانِ شان کوئی علمی یادگار نہین چھوڑی،

"م"

تصوفِ اسلام

(طبع جدید)

مصنفہ مولانا عبد الماجد دریابادی

مُدیر صدیق مولانا دریابادی کی مشہور کتاب تصوفِ اسلام کا نیا اڈیشن تیار ہوگیا ہے، جس مین بتایا گیا ہے، کہ صحیح اسلامی تصوف کیا ہے اور اس میں اور موجودہ رواجی تصوف مین کتنا فرق ہے اس نئے اڈیشن کے لئے پوری کتاب کے مضامین پر نظر کرکے کتاب کو بالکل نئی حیثیت دیدی گئی ہے، قیمت:- ۵ ضخامت ۲۲۴ صفحے

"منیجر"

ادبیات

آہ! داعیِ امن!

از

جناب یحییٰ اعظمی

ابھی کچھ اور دن جیتے وطن میں محترم گاندھی — کہ اس دنیائے پُر آشوب میں تھے مغتنم گاندھی

رلائے کیوں نہ خون چشمِ وطن کو تیرا غم گاندھی — ملیں گے اب کہاں اس کو ترے لطف و کرم گاندھی

وطن کیونکر سہے گا آہ اس داغِ یتیمی کو
بھلا روئے نہ کیوں دنیا تری خوردکرمی کو

ہندوؤں اور ہواؤں کا غم اب کون کھائے گا — مسلمانوں کے غم پر کون اب آنسو بہائے گا

وطن کے غم زدوں کو کون اب تسکیں دلائے گا — نواکھالی سے چل کر کلکتہ اب کون آئے گا

کرے گا کون آباد آہ اب اُجڑی ہوئی دلی
بنے گی کس کے ہاتھوں آہ اب بگڑی ہوئی دلی

جہاں آباد ہے گریاں کہ اب گاندھی نہیں باقی — ہے چشمِ بلدہ خون افشاں کہ اب گاندھی نہیں باقی

وطن ہے کلبۂ احزان کہ اب گاندھی نہیں باقی — ہے محزون آج ہر انساں کہ اب گاندھی نہیں باقی

ہے غمِ مظلوم کا غم کھانے والا ہوگیا رخصت
ہر اک دکھ درد میں کام آنیوالا ہوگیا رخصت

سنہ ۵۲ دِلّی

روان ہون کیون نہ اب ہر چشمِ تر سے خون کے آنسو   کہ تنہا چھوڑ کر ہم کو سدھارے قوم کے باپو
جدھر دیکھو نظر آتی ہے اک آشفتگی ہر سو   ہے کس کا سوگ بھارت کو کہ ہیں بکھرے ہوئے گیسو

اُٹھا مغموم ہندوستان کے سر سے آپ کا سایہ
کہ اک بچہ کے سر سے اُٹھ گیا ہے باپ کا سایہ

جواہر لال جی کو اب ملے گی روشنی کس سے   ملے گی اب شبستانِ وطن کو چاندنی کس سے
مٹے گی اب رُخِ انسانیت کی مردنی کس سے   سُنے گی حرفِ تسکین اب یہ دنیا ی دنی کس سے

اٹھا وہ خود جو دیتا تھا نویدِ امن دنیا کو
بنایا تھا شعارِ زندگی جس نے اہنسا کو

منور جس سے تھی کل تک ابھی کُل بزمِ انسانی   دریغا بجھ گئی اک آن میں وہ شمعِ روحانی
ہزار افسوس ظالم نے نہ تیری قدر پہچانی   مٹے گا آہ کیونکر یہ وطن کا داغِ پیشانی

نوائیں ہیں زمین سے آسمان تک درد و ماتم کی
وطن تاریک ہے، ہر سمت چھائی ہے گھٹا غم کی

مٹایا کس شقی نے اُف اہنسا کے پجاری کو   اخوت کے پیامی امن و رافت کے بھکاری کو
سنے گا کون اب ہم غمزدوں کی آہ و زاری کو   پھرے گا کون در در اب ہماری غمگساری کو

جہانِ آب و گِل ہو کیون نہ وقفِ شیون و ماتم
کہ دنیا سے اٹھا انسانیت کا محسنِ اعظم

وہ ہندو جلوہ گر تھی جس کے دل میں شمعِ عرفانی   وہ جس کے سینہ میں تھا پرتوِ توحیدِ ربانی
رہا جو عمر بھر خدمت گزارِ نوعِ انسانی   ہویدا جس میں تھی خلقِ حسن کی جلوہ افشانی

وہ دردِ غم کا محرم اٹھ گیا افسوس دنیا سے

نقیبِ امنِ عالم اٹھ گیا افسوس دنیا سے

روانہ ہوتے ہین اس شان سے آخر کہان باپو[1] ذرا دیکھے کوئی ہین گلستان در گلستان باپو
پکارے گا کسے کل کہہ کے اب ہندوستان باپو ٹھہر جائین ذرا شعلے کہ ہین اس مین نہان باپو

تمنا ہے میسّر آخری دیدار ہو جائے
الٰہی جلد یہ آتش کدہ گلزار ہو جائے

محسنِ انسانیت

از مولوی اقبال احمد خان صاحب سہیل

زنجیرِ غلامی سے کس نے بھارت کو چھڑایا گاندھی نے صدیون کے اسیرون کو کس نے آزاد بنایا گاندھی نے
سائنس کی طوفانی لہرین پربت کو بھی جب ٹھکراتی تھین ست دھرم کی ٹوٹی نیا کو تب کس نے ترایا گاندھی نے
جب بغض و عداوت کی آندھی قومون کو اڑائے جاتی تھی تب شمعِ محبت کو کس نے سینون مین جلایا گاندھی نے
اس خون کی پیاسی دنیا کو بتلائی اہنسا کی شکتی اس پاپ کی اندھی نگری کو ست مارگ دکھایا گاندھی نے
بھارت کے لئے وہ مسیحا تھا اس دیس کا جیون داتا تھا گو موت سے خود بھی بچ نہ سکا مردون کو جلایا گاندھی نے
سنسار کی اس نے سیوا کی ست دھرم کی اپنے رکشا کی جو بوجھ پہاڑون سے نہ اٹھے وہ بوجھ اٹھایا گاندھی نے
تہذیب و تمدن کے داعی جب ایٹم بم برساتے تھے اس شور مین بھی راگ الفت کا دنیا کو سنایا گاندھی نے
ان موہنی آنکھون کا جادو پتھر کو بھی پگھلا دیتا تھا روٹھون کو منایا گاندھی نے بچھڑون کو ملایا گاندھی نے
توحید پرستون مین اس نے گیتا کا پرچار کیا ہندو سکھ عیسائی کو قرآن سنایا گاندھی نے
ہستی کی اس بستی مین تھی روحِ شرافت خوابیدہ پیغامِ حیاتِ نو دیکر پھر اس کو جگایا گاندھی نے

بھارت کے اجڑتے گلشن کو آج اپنے لہو سے سینچ گیا
جو کام کسی سے بن نہ پڑا وہ کرکے دکھایا گاندھی نے

[1] باپو کی حیثیت اب لقب کی ہو گئی ہے۔

مطبوعات جدیدہ

فلسفہ کلام غالب ۔ از جناب پروفیسر سید شوکت سبزواری ایم اے تقطیع اوسط ضخامت ۲۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ے؍ پتہ:۔ قومی کتب خانہ بریلی،

فاضل مصنف ایک صاحب علم ونظر اہل قلم ہیں، مذکورہ بالا کتاب میں انھوں نے بڑی دقت نظر سے کلام غالب سے ان کے مختلف جذبات و تاثرات اور افکار و تصورات کی فلسفیانہ تحلیل کی ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ غالب مجتہدانہ دل و دماغ رکھتے تھے، اور بلند خیال، بلند نظر اور جدت طراز شاعر تھے، اردو کا کوئی شاعر ان کی پرواز فکر کو نہیں پہنچتا، لیکن وہ کوئی صاحب فکر فلسفی یا کسی خاص تعلیم و پیام کے معلم و مبلغ نہ تھے اس لیے اس معنی میں ان کو فلسفی کہنا صحیح نہیں کہ ان کا کوئی مرکزی تصور یا فلسفیانہ مسلک تھا، لیکن وہ ایک ذہین طباع انسان تھے، اس زمانہ کے مروجہ الٰہیاتی فلسفہ، اشراقی تصوف اور ویدانت کے مسائل سے پوری آگاہی بلکہ ان کا ذوق رکھتے تھے، اور انھیں زندگی میں ایسے حوادث سے سابقہ پڑا جن میں اس قسم کے نیم فلسفیانہ اور نیم متصوفانہ جذبات کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے اس لیے ان کے کلام میں زندگی اور کائنات کے حقائق اور مابعد الطبیعاتی تصورات کے متعلق بکثرت فلسفیانہ خیالات ملتے ہیں، اخلاقیات اور آرٹ و جمال اور نظریہ حسن وغیرہ کے متعلق بھی ان کے خیالات میں ندرت اور بلندی ہے، اسے خواہ جدت و اجتہاد فکر کہا جائے یا فلسفہ سے تعبیر کیا جائے، لیکن درحقیقت یہ خیالات کسی فلسفیانہ مسلک کے ماتحت نہیں بلکہ ان کے دل میں وقتاً فوقتاً جو تاثرات پیدا ہوئے، اس کو انھوں نے فلسفیانہ انداز میں ظاہر کردیا اسی لیے ان کے

کلام میں تضاد پایا جاتا ہے، لیکن اگر ان خیالات کو غالب کے فلسفہ سے تعبیر نہ کیا جائے، اور صرف جذبات و تاثرات کہا جائے تو یہ تضاد خود بخود رفع ہو جاتا ہے، اس لیے کہ جذبات و تاثرات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے بلکہ مختلف حالات کے ماتحت بدلتے رہتے ہیں، بہرحال اس کتاب میں مصنف نے مذکورہ بالا امور اور بعض دوسرے مسائل کے متعلق غالب کے خیالات کی نہایت فلسفیانہ تشریح کی ہے، اور آخر میں ان کے مسلک شعری، اس کی فنی حیثیت اور تغزل پر مختصر گر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے مصنف کی بیشتر تشریحات غالب کے نازک شاعرانہ فلسفہ سے زیادہ دقیق و عمیق اور غالب سے زیادہ خود مصنف فلسفیانہ دقت نظر کا ثبوت ہیں، اس لحاظ سے یہ کتاب خود ان کی فلسفیانہ تالیف کی حیثیت رکھتی ہے، طرز نگارش دلکش اور ادیبانہ ہے، ایک مقام پر سہو قلم سے شیخ مقتول کی عوارف المعارف لکھ گیا ہے ص۱۳۱، حضرت شیخ شہاب الدین...... سہروردی صاحب عوارف اور شہاب الدین مقتول دو جدا شخصیتیں ہیں، اول الذکر بزرگ اکابر صوفیہ میں ہیں، اور آخر الذکر حکیم و فلسفی، بعض مقامات پر اسلامی تصوف اور اشراقی فلسفہ اور ویدانت کے مسائل میں خلط مبحث ہو گیا ہے، لیکن یہ خفیف فروگذاشتیں لائق التفات نہیں، مجموعی حیثیت سے اس موضوع پر اردو میں اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی، مصنف کے علم سے اسی کی توقع تھی،

مجموعہ مقالات علمیہ - شائع کردہ مجلس ادارت حیدرآباد اکیڈمی، تقطیع بڑی ضخامت ۴۴۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت درج نہیں، پتہ:۔ اکیڈمی مذکور سے ملیگی،

حیدرآباد اکیڈمی کے علمی خدمات کا تذکرہ ان صفحات میں آچکا ہے، اور اس کے بعض شائع کردہ مقالات پر تبصرہ بھی ہو چکا ہے، زیر نظر کتاب اسکے مختلف علمی، ادبی اور سائنٹفک مقالات کا نیا و مفید مجموعہ ہے، اس میں حسب ذیل مقالے ہیں، "جوہر توانائی" محمد عبدالرحمن خانصاحب صدر اکیڈمی، "کائناتی شعاعیں"، ڈاکٹر سید مہدی علی "فارسی شاعری میں رمزیہ اشارے"، مظہر علی خانصاحب استاذ جامعہ عثمانیہ

"بعثت نبوی کے وقت کی عالمگیر گتھیاں اور ان کا اسلامی حل"، ڈاکٹر حمید اللہ، اس میں دکھایا گیا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی، اور قومیت، انتقام، انسانی حیات یقین و عمل، دوسرے مذاہب کی تصدیق، دولت و افلاس، اور انفرادیت و اجتماعیت وغیرہ کے متعلق گزشتہ اقوام و مذاہب کے تصورات اور اس کے کیا نقائص تھے۔ اور اسلام نے اس میں کیا اصلاح کی، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کا مضمون "قرآن و فلسفہ"، اس سے پہلے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے، "ہمارے کوکبی نظام کی ساخت"، ڈاکٹر اکبر علی صاحب ناظم رصدگاہ حیدر آباد، "شوکت بخاری" ڈاکٹر سید حکیم اللہ حسینی، یہ سب مقالے مفید پراز معلومات اور مطالعہ کے لائق ہیں،

فلاح و ترقی کے اصول - مؤلفہ جناب مولوی محمد سراج الحق صاحب مچھلی شہری تقطیع اوسط ضخامت ۱۵۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ: ادارۂ صدیقیہ الہ آباد،

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے انکی دینی اور اُخروی فلاح کے ساتھ دنیاوی ترقی کا بھی وعدہ فرمایا ہے، لیکن واقعہ اسکے خلاف نظر آتا ہے، مسلمان پستی اور تنزل میں مبتلا ہیں اور غیر مسلم قومیں بام عروج پر پہنچ گئی ہیں، اس سے بعض دماغوں میں اسلامی اصولوں کے متعلق شکوک پیدا ہوتے ہیں، اس کتاب میں انکا ازالہ کیا گیا ہے، اور دکھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور آج بھی اسلام ہی کے پاکیزہ اصول دنیاوی ترقی کا بھی ذریعہ ہیں لیکن اولاً اسلام میں ترقی کا مفہوم موجودہ ترقی کے خالص مادی تصور سے مختلف ہے، دوسری خود مسلمانوں نے ترقی کے اسلامی اصولوں کو چھوڑ دیا ہے، اور انکا عمل سراسر اسکے خلاف ہے جسکا لازمی نتیجہ انکا تنزل ہے، ان کے مقابلہ میں غیر مسلموں نے دنیاوی ترقی کے بہت سے اسلامی اصولوں کو اختیار کر لیا ہے، اس لیے ع مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور، کے تحت انکی ترقی قدرتی امر ہے، لیکن ان قوموں نے ان اصولوں کے علاوہ بہت سے خالص مادی اصول بھی وضع و اختیار کئے ہیں، اس لئے کہ ان کی ترقی متوازن نہیں ہے، جس کی خرابیاں آج ساری دنیا میں نمایاں ہیں، اور ان کے مادی اصولوں سے اسلامی اصولوں کا موازنہ کر کے اول الذکر کے نقصانات اور آخر الذکر کے فوائد دکھائے ہیں

کتاب کے آخر میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے رسالہ فروع الایمان کی تلخیص ہے جس میں ستتر اسلامی تعلیمات اور ان کی ضروری تشریح ہے، اس کتاب کا اصل موضوع بحث وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا، لیکن ضمناً اور بہت سے مفید مذہبی معلومات بھی آگئے ہیں،

تعلیم قرآن ۔ مولفہ جناب غلام دستگیر صاحب لکچرار نظام کالج و مولوی عبدالرحمٰن صاحب سعید صدیقی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ر

پتہ :- ادارۂ اشاعت اسلامیات، حیدر آباد دکن ۔

عام طور سے مسلمانوں میں قرآن مجید کے معنی اور مفہوم کی جانب سے اتنی بے توجہی ہے کہ اکثر مسلمان ان سورتوں کے معنی بھی نہیں سمجھتے جن کو روزانہ نمازوں میں تلاوت کرتے ہیں، اگر صرف انہی کو سمجھکر پڑھیں تو بھی کلام مجید کے مقصد و منشا سے ان کو ایک گونہ ربط و مناسبت قائم رہے، اور نماز میں بھی خشوع پیدا ہو، اس ضرورت کے پیش نظر لائق مولفین نے تعلیم قرآن لکھی ہے، اس میں سورۂ فاتحہ سے لیکر والضحیٰ تک پارۂ عم کی ۱۲ سورتوں کا ترجمہ اور ان کی ضروری تشریح کی گئی ہے، یہ سورتیں عام طور سے نمازوں میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں، ان میں سے بعض مضامین کے اعتبار سے بھی زیادہ اہم ہیں، جن میں قرآنی تعلیمات کی روح آگئی ہے اس لیے یہ ترجمہ مختلف حیثیتوں سے مفید ہے، ہر سورہ کا لفظی اور بامحاورہ ترجمہ علیحدہ علیحدہ لکھا ہے، اور ان کی ضروری تفسیر بھی کردی ہے، ترجمے شاہ عبدالقادر صاحب اور شیخ الہندؒ کے مستند تراجم سے ماخوذ ہیں، مولفین کے پیش نظر زیادہ تر تعلیم یافتہ نوجوانوں کی دینی اصلاح و تربیت ہے، اس لیے تفسیر میں ان کے ذوق، انداز فکر، اور موجودہ اجتماعی مسائل کی زیادہ رعایت رکھی گئی ہے، لیکن اس سے نفس مطالب میں کوئی تغیر نہیں ہونے پایا ہے، اس کی صحت اور نفاذ کے لیے مولانا مناظر احسن صاحب کی مندرجہ تصدیق کافی ہے، یہ کتاب عربی سے ناواقف نمازی مسلمانوں

کے مطالعہ کے لائق ہے۔

فلسفۂ نماز - از جناب مولوی شمس الدین صاحب، تقطیع بڑی، ضخامت ۸۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۵ر، پتہ: بک ڈپو انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی،

نماز اللہ تعالیٰ کے دربار کی حضوری، اس کی عظمت و کبریائی، اور اپنی عبودیت اور بے چارگی کا اعتراف ہے، اس لیے اس کے ارکان کو درباروں کی حاضری کے آداب سے تشبیہ دیجاتی ہے لیکن ان دونوں میں بڑا فرق ہے، بارگاہ خداوندی میں آداب ظاہری کی پابندی کے ساتھ دل کو بھی خوف و خشیت اور عجز و فروتنی کی کیفیت سے معمور ہونا چاہیے، اس کتاب میں ان دونوں پہلوؤں سے اذان، وضو، نماز کے ظاہری ارکان، اس کی قرأت تحمید و تقدیس، دعاؤں اور باطنی کیفیتوں کی صاف اور سادہ طریقہ سے تشریح کی گئی ہے، اس قسم کی تعبیرات ذوقی ہیں، ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق تعبیر کرتا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب عام مسلمانوں کے مذاق اور ان کے مطالعہ کے لائق ہے۔

لمعات - مرتبہ جناب پروفیسر ضیا احمد صاحب بدایونی ایم اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۴۴ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت: ۔ ۶؍ پتہ: جناب مرتب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے ملے گی،

لمعات جناب رضی احمد صاحب بدایونی مرحوم کے کلام کا انتخاب ہے جسے ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر ضیا احمد صاحب نے مرتب کیا ہے، مصنف مرحوم شاعر کی حیثیت سے کسی خاص شہرت کے مالک نہ تھے، ان کے جاننے والوں اور قدردانوں کا حلقہ محدود تھا لیکن ان کو شاعری سے فطری مناسبت تھی، اور اس کا ذوق ان کو اپنے اصحاب علم و ادب اسلاف سے ورثہ میں ملا تھا، ان کی شاعری کا آغاز اور نشو و نما ایسے زمانہ میں ہوا جب پرانے طرز شاعری کا خاتمہ اور نئے کا آغاز ہو رہا تھا، اس لیے ان کے کلام میں دونوں کے اثرات ہیں، فن کی مہارت، کلام پر قدرت و پختگی اور زبان کی صحت و صفائی قدما کی ہے، اور خیالات میں نئے اثرات نمایاں ہیں، گو یہ انتخاب مختصر ہے، لیکن خیالات

کے اعتبار سے ان میں بڑا تنوع ہے، تغزل کی زمزمہ سنجی بھی ہے، فلسفہ و حکمت کی گہرائی بھی، اور تصوف کی مستی و حرارت بھی، لیکن تغزل کی رنگینی میں خیالات کی لطافت و پاکیزگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، اردو کے چند قصائد اور فارسی کی چند غزلیں بھی ہیں، قصائد خیالات کی رفعت، الفاظ کے شکوہ اور زور بیان کے اعتبار سے اساتذہ کے قصائد کے پہلو بہ پہلو رکھے جا سکتے ہیں، دیوان کے شروع میں پروفیسر آل احمد سرور اور جناب مرتب کے قلم سے طویل تعارف اور تبصرے ہیں، جو مصنف کے کلام پر تبصرہ کے ساتھ ادبی حیثیت سے نفس شاعری پر ناقدانہ مقالے کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ مجموعہ مختلف حیثیتوں سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

کاخ بلند۔ از جناب حکیم عبدالکریم صاحب ثمر، تقطیع اوسط، ضخامت ۳۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۳ے، پتہ: تاج کمپنی لمیٹڈ، قرآن منزل، ریلوے روڈ، لاہور،

آج کل کے نوجوانوں کی شاعری کی جولانگاہ عموماً حسن و عشق کے سفلہ اور پست جذبات اور اس کی بے جان داستان سرائی ہے، ان کی ترقی کی سب سے بڑی معراج ملحدانہ اور بے دینی کے خیالات ہیں، ان کے دلوں سے حرارت ملی، اور سوز حیات مفقود ہے، لیکن ہر کلیہ میں مستثنیات ہوتے ہیں جناب ثمر کا کلام بھی انہی مستثنیات میں ہے، کاخ بلند ان کے کلام کا اسم با مسمی مجموعہ ہے، اس میں سو کے قریب نظمیں ہیں، اور پورا کلام شاعری کے مفاسد سے پاک، اور خیالات کی بلندی و پاکیزگی دینی و ملی جذبات اور زندگی کی تپش سے لبریز ہے، مصنف نے خیالات اور طرز ادا دونوں میں اقبال کا تتبع کیا ہے، اور اس حد تک اس میں کامیابی حاصل کی ہے، کہ بعض اشعار پر اقبال کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے، یہ معلوم کرکے اور بھی تعجب ہوا کہ مصنف اصل میں پنجابی زبان کے شاعر ہیں اور اردو میں کل دو تین برسوں سے مشق سخن شروع کی ہے، گو ابھی کلام میں خامیاں ہیں لیکن ایسی قلیل مدت میں اتنی مشق بہم پہنچا لینا ان کے مستقبل کے لیے فال نیک ہے

اگر ان کی مشق سخن جاری رہی تو یہ خامیاں دور ہو جائیں گی، اور پنجاب اقبال کے طرز شاعری سے خالی نہ ہوگا،

ادب کے مادی نظریے - از جناب ظہیر کاشمیری تقطیع اوسط ضخامت ۱۲۵ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ کمال پبلشرز ۲۶ مال روڈ، لاہور،

سوشلزم نے زندگی کی دوسری اقدار کی طرح ادب اور لٹریچر کو بھی خالص مادی قدروں میں محدود کر دیا ہے، اس کے نقطۂ نظر سے صحیح ادب وہی ہے جو انسانی صرف مادی زندگی اور اس کے حیوانی پہلو کا ترجمان ہو، اس کے علاوہ اسکے علمی، ادبی اور اخلاقی پہلو وغیرہ صرف ایوان تعیش کے نقش و نگار ہیں، اس کتاب میں اسی نقطۂ نظر سے ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، پہلے انسانی معاشرہ سے اسکا تعلق دکھایا گیا ہے، پھر اردو نظم و نثر کی پیدایش سے لیکر اسوقت تک اس میں مختلف تمدنی معاشرتی سیاسی اور اقتصادی عوامل کے ماتحت جو تغیرات ہوئے، ان پر اجمالی نگاہ ڈالی گئی ہے، اس سلسلہ میں جستہ جستہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے متفرق واقعات، اس کے اثرات و نتائج اور زندگی کے مختلف زاویوں کے متعلق سوشلزم کے نقطہائے نظر بھی آگئے ہیں، ایک باب میں ادب کے اس نظریہ کے بارہ میں لینن کے خیالات پیش کیے گئے ہیں، آخر میں مغربی ادب پر بین الاقوامی سیاسی و اقتصادی تغیرات کے اثرات دکھائے گئے ہیں، ادب کے متعلق سوشلزم کے نظریہ کے اس جزو سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ ادب کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہئے، یہ تو بالکل فطری چیز ہے، لیکن خود زندگی مختلف حیثیتیں اور مختلف پہلو رکھتی ہے اور ان سب کی اہمیت یکساں ہے، انھیں یک قلم نظر انداز کرکے اشرف المخلوقات کی زندگی کے مقصد اور نصب العین کو محض جسمانی خواہشات اور اسکے مظاہر تک محدود کر دینا انسانیت کی توہین ہے، گو ادب کے متعلق مصنف کے بعض خیالات صحیح ہیں لیکن ان میں کوئی نئی بات نہیں ہے اور مذہب وغیرہ کے متعلق وہی پرانی عامیانہ باتیں دہرائی گئی ہیں، بعض تاریخی غلطیاں بھی ہیں،

"م"

تابعینؒ

مرتبہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور اُن کے تربیت یافتہ تابعین
م رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہؓ
لیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت
ن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت
م جعفر صادقؒ، حضرت محمد حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ
رت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحول شامیؒ، قاضی شریحؒ، وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ
ے سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

ضخامت :- ۵۷۰ صفحے،

قیمت :- چار روپیے،

مینیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات اعمال وعبادات اور اہل بیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے اور دوسرے عبادات سے اُن کا مقابلہ و موازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق، فضائل اور آداب کے عنوان اور اس کی ذیلی سرخیوں کے تحت اخلاقی تعلیم کی تفصیل ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول زیر طبع للعہ حصہ دوم تقطیع خورد صہ روپیہ، حصہ سوم تقطیع کلاں للعہ تقطیع خورد شعہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں باختلاف کاغذ صہ روپے و تقطیع خورد عہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ و للعہ و تقطیع خورد صہ روپیہ، حصہ ششم تقطیع کلاں صہ، للعہ و تقطیع خورد عہ و صہ،

(پرنٹر و پبلشر صدیق احمد،)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۱ مارچ ۱۹۴۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت:- چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

دارالمصنفین کی نئی کتاب

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ،

ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا قافلہ سندھ میں اترا تھا، اور ان کی پہلی حکومت یہیں قائم ہوئی تھی، اور وہ ایکہزار سال سے اوپر یہاں کے حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے اُن کے آثار نمایاں ہیں، لیکن اس کے باوجود اردو میں اسلامی سندھ کی کوئی مفصل و محققانہ تاریخ موجود نہیں تھی، دارالمصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ میں یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس میں سندھ کا جغرافیہ مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر تک کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ میں جن حکومتوں کے ماتحت رہا، ان کی پوری تاریخ اور ان تمام دوروں کے نظام حکومت علمی و تمدنی حالات اور رفاہِ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اسکو یاد کرنیکی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت میں شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہاں ایک نئی حکومت کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے،

قیمت:- چھ روپے،

منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

جلد ۶۱ ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۴۸ء عدد ۳

مضامین

شذرات

یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اردو ہندو مسلمانون کی مشترک زبان ہے، دونون نے مل کر اس کو بنایا اورانہی کی کوششون نے اس کو پروان چڑھایا، اوراحسان شناس اردو دونون کی تمدنی نشانیون کو سینے سے لگائے ہوئے ہے لیکن یہ کس قدر افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ آج اسی صوبہ کی حکومت جہاں اردو پل کر جوان ہوئی اور اس کا رنگ روپ نکھرا، اس کے ساتھ اجنبیون اور پردیسیون سے بھی بدتر سلوک کر رہی ہے، اور ہندو مسلم اتحاد کی اس سب سے بڑی یادگار کو مٹانے کے درپے ہے،

صبح تک تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے بادِ صبا   یادگارِ شمع تھی کل تک جو پروانہ کی خاک

اس بارہ مین ہم اپنے خیالات اس سے پہلے ظاہر کر چکے ہین، آج اس سلسلہ مین پاکستان سے بھی کچھ کہنا ہے،

ہندوستان مین اردو کی بے بسی کے بعد قدرۃً پاکستان کی جانب اس کی نگاہین اٹھتی ہین کہ اسی سے اس کی دستگیری کی امید ہو سکتی ہے، پاکستان جس دعویٰ کے ساتھ اور جس نظریہ کے ماتحت قائم ہوا ہے اس کے لحاظ سے اردو کا تحفظ محض اس کا فرض ہی نہین ہے، بلکہ اس کے بغیر اس کے مقاصد کی تکمیل نہین ہو سکتی اور اردو کی خدمت وسرپرستی پاکستان کا احسان نہین ہوگا، بلکہ خود اس کا مفاد اس سے وابستہ اور پاکستان کے مسلمانون کی وحدت بڑی حد تک اردو پر منحصر ہے،

پاکستان کے تمام صوبون کی زبانین مقامی اور ایک دوسرے سے مختلف ہین، اردو ہی ایسی زبان ہے جو سب صوبون

مین بھی اور مغربی پاکستان کے بعض علاقون اور خاص خاص طبقون مین بولی بھی جاتی ہو اس لئے یہی وہان کی مشترک زبان ہوسکتی ہو، پاکستان کی تمام زبانون مین سب سے زیادہ اسلامی اثرات مذہب اسلام سے متعلق معلومات اور اسلامی علوم وفنون کا سب سے بڑا ذخیرہ اردو ہی مین ہو، اس لئے اُن سے واقفیت اور اسلامی کلچر کے تحفظ اور اشاعت کا ذریعہ بھی اردو ہی ہو، اور ہندوستان اور پاکستان کا جو مسلمان اردو سے جس قدر ناواقف ہوگا، اسی قدر وہ عام مسلمانون اور اسلامی کلچر سے بیگانہ رہے گا جس کی مثال بنگال کے مسلمان ہین،

علمی اور تعلیمی پہلو سے بھی پاکستان کی کوئی زبان اردو کا مقابلہ نہین کرسکتی اس حیثیت سے وہ ان سب مین زیادہ سرمایہ دار ہو، دارالترجمہ حیدرآباد کے بدولت اس کا دامن جدید علوم وفنون سے بھی خالی نہین رہا، اس جامعہ عثمانیہ مین ہر فن کی اعلیٰ تعلیم اسی کے ذریعہ ہوتی ہو جس کے کامیاب نتائج سب کے سامنے ہین، اس لئے اردو ہر اعتبار سے ایک ترقی یافتہ زبان ہے اور مذہبی علمی سیاسی اور تمدنی ہر حیثیت سے پاکستان کے لئے ضروری ہو، یہ اس کی خوش قسمتی ہو کہ اس کو ایک بنی بنائی ہوئی مکمل زبان مل گئی جو اس کی جملہ ضروریات کی کفیل ہوسکتی ہے، اور وہ زبان سازی کی زحمت سے بچ گیا، اس سے فائدہ نہ اٹھانا بڑی غلطی اور ناشکری ہوگی،

پاکستان کے قریب قریب کل صوبے اردو کی حمایت مین ہین لیکن بنگال سے اس کی مخالفت کی آواز بلند ہوتی رہتی ہو، گو وہان کے بہت سے خواص اور ذمہ دار اشخاص اردو کے حامی ہین، لیکن عام بنگالی مسلمان ابھی تک اس کے نام سے بھڑکتے ہین، حالانکہ دوسرے صوبون کے مسلمانون سے اُن کی اجنبیت وبیگانگی اور اسلامی تہذیب ومعاشرت سے اُن کی دوری کا بڑا سبب اردو سے ان کی ناواقفیت ہو، اس لئے وہ سب سے زیادہ انہی کیلئے ضروری ہے،

اس کا یہ منشا نہین ہو کہ صوبائی اور مقامی زبانون کی حق تلفی کیجائے، یا ان کو نقصان پہنچایا جائے، بلکہ صرف یہ مقصد ہو کہ پاکستان کی صوبائی زبانون کی مقامی اہمیت کو پوری طرح قائم رکھتے ہوئے، سرکاری زبان اردو

کو بنایا جائے، اس کی تعلیم لازمی قرار دی جائے، اور رفتہ رفتہ اس کو اعلیٰ تعلیم کا بھی ذریعہ بنایا جائے،

اردو کی ترقی و اشاعت کے وسائل پر غور کرنے کے لئے ۲۶، ۲۷، ۲۸ مارچ کو پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے لاہور مین اردو کانفرنس ہو رہی ہے، اس مین پاکستان و ہندوستان دونون کے اصحاب علم و ادب کو شرکت کی دعوت دی گئی ہو اس مین مذکورہ بالا مسائل بھی زیر بحث آئین گے، سرکاری زبان بنانا تو حکومت کا کام ہو، لیکن ہم کو توقع ہے کہ کانفرنس مین اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مسئلہ اور اس کی ترقی و اشاعت کے دوسرے وسائل طے کرلئے جائین گے، اور اسے سرکاری زبان بنانے کے لئے حکومت پر بھی زور ڈالا جائے گا، اور امید ہو کہ وہ اردو کی خدمت و توسیع مین علمی ادبی اور تعلیمی ادارون کی پوری مدد کرے گی،

اس مین شبہہ نہین کہ جو لوگ عرصہ سے انگریزی مین کام کرنے کے عادی چلے آرہے ہین، ان کے لئے دفعۃً اس کو چھوڑ کر اردو کو اختیار کرلینا آسان نہین ہے، اور ابتداءً ان کو ضرور دقت محسوس ہوگی لیکن اس بارہ مین اتنی عجلت کی ضرورت نہین کہ انھیں اردو کے سیکھنے، اس سے مانوس ہونے اور اس مین کام کی مشق بہم پہنچانے کا موقع بھی نہ دیا جائے، لیکن انگریزی حکومت کے خاتمہ کے بعد اس کی زبان کو بھی دیر سویر بہرحال ختم ہونا ہے، اس لئے اس کا فیصلہ ہو جانا تو ضروری ہو کہ حکومت کی زبان اردو ہوگی، اور رفتہ رفتہ اس کو تمام شعبون مین رائج کر دیا جائیگا

پنجاب ہمیشہ سے اردو کی خدمت مین پیش پیش رہا ہے، اور شمال ہند مین اردو کا مرکز عرصہ سے لاہور ہو گیا تھا، اور اب تو پنجاب پر اردو کا دوہرا حق ہے، اس لئے یقین ہے کہ اردو کی اس سب سے بڑی خدمت کا سہرا بھی اسی کے سر رہے گا،

مقالات

تجدید تعلیم

از

جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی

"مولانا عبدالباری صاحب ندوی (سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ) جو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے متعدد خلفاء میں سے ایک ہیں، حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مجددانہ کارناموں پر ایک مستقل و مفصل کتاب لکھ رہے ہیں، اس کے دو سلسلے سیاسی اور تبلیغی تجدید معارف اور الفرقان میں شائع ہو چکے ہیں، اب اس کا تیسرا حصہ تعلیمی آج معارف کے ذریعہ شائع کیا جا رہا ہے،

یہ حقیقت ہے کہ یورپ کے تعلیمی نظریات کی ہمہ گیری نے اسلامی تعلیمی نظریہ کو نہ صرف عام مدارس بلکہ ہمارے دینی مدارس والوں کے دلوں سے بھی بھلا دیا ہے، انتہا یہ ہے کہ وہ مدرسے بھی جو صرف دین کی خدمت کے لئے قائم تھے، اور جن سے سالہا سال تک دین کی خدمت انجام پاتی رہی، وہ بھی دانستہ یا نادانستہ اوس سے دور سے دور تر ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور وہ خوش ہیں، کہ وہ زمانہ کی ضرورت پوری کرتے جا رہے ہیں،

صاحب مقالہ نے مضمون کے اندر کئی جگہ بنظر شفقت دار العلوم ندوہ کا ذکر کیا ہے اور اُن کی

تنقید کی ہے ہم کو اپنے عیوب کے تسلیم کرنے مین کبھی ہچک محسوس نہیں کرنی چاہئے بے شبہہ دار العلوم
ندوہ کے طلبہ مین اس قسم کی کمزوریان ہین منتظمین مدرسہ ہمیشہ اس کی کوشش کرتے رہتے ہین کہ وہ
ان کمزوریون پر فتح پائیں، لیکن ضرورت اس کی ہے کہ جہان ہم اپنے مدرسون سے اُن کو دور
کرنا چاہتے ہین، اُن کو اپنے گھرون سے بھی دور کرین، اور اپنے تعلیمی زاویہ نظر کو بدلنے کی بھی کوشش
کرین، تاکہ مسلمان والدین اپنی اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت کو سمجھ سکین،

آج ملک مین انگریزی سلطنت کے خاتمہ سے انقلاب کا نیا دور شروع ہو رہا ہے، یہی وقت ہے
کہ مسلمان اپنے تعلیمی نظریہ کو پورے طور سے سمجھین، امید ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ کے
مسلمان اس مضمون کو بغور پڑھین گے، اور اس سے آیندہ کے لئے فائدہ اٹھائین گے"

"س"

حضرت مجدد وقت (مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ) کی جامع تجدیدات پر بنام جامع المجددین جو مستقل کتاب راقم الحروف
کے زیر تحریر بلکہ قریب تکمیل ہے، یہ اسی کا ایک اور باب ہے، اس سے پہلے ایک باب" قومیات و سیاسیات حاضرہ"
کا اسی معارف[1] مین اور ایک تجدید تبلیغ کا رسالہ الفرقان[2] (لکھنو) مین شائع ہو چکا ہے،

جن اہل علم و بصیرت حضرات کی نظر حدیث تجدید کے مغز و مدعا پر ہے، وہ جان سکتے ہین، کہ وقت کی سب سے
بڑی دینی و اسلامی خدمت تجدید یافتہ پیغام اسلام کی اشاعت ہے، یون تو ختم نبوت کے بعد سے برابر تجدید دین
و بعثت مجددین کا سلسلہ صدی بصدی اسی طرح جاری ہے جس طرح ختم نبوت سے قبل انبیاء علیہم السلام کی بعثت
کا جاری تھا، نیز ختم نبوت کے بعد ہی سے تعلیمات دین مین طرح طرح کے مفاسد کی راہ پا لی ہر مابعد کی صدی کا
مین ماقبل سے جس طرح بڑھتی گئی ہے وہ بھی معلوم و مسلم ہے، اور اب تو طول و عرض و عمق دین کے سارے ابعاد
مین یہ مفاسد اس طرح سرایت کر گئے ہین، کہ مشکل سے عقائد و اعمال کا کوئی گوشہ و ریشہ ان سے محفوظ

[1] دسمبر ۴۶ء وجنوری و فروری ۴۷ء کے تین نمبرون مین شائع ہوا، [2] ماہ شعبان و رمضان،

رہا ہوگا، اس لئے لازماً اب تجدید دین کے لئے ایسے ہی جامع مجدد دین کی بعثت کا وقت تھا جس کی تجدیدات ساری گمراہیون کی تسدیدات کو جامع ہون،

حضرت مجدد وقت کی اس جامعیت کا اندازہ حضرت کی کم وبیش ایک ہزار تصانیف کی وسعت اور اُن کے مطالعہ سے بخوبی فرمایا جاسکتا ہے، دین کے سارے ایمانی وعملی ابواب واحکام کا کوئی چھوٹا بڑا اجزء جو ذرا بھی اصلاح طلب یا محتاج تجدید رہا ہو، ایسا نظر آئے گا جو حضرت علیہ الرحمہ کی جامع نظر سے نظرانداز ہوا ہو، اہلِ حضرات کو متوجہ نہ پاکر اس نااہل نے اپنی بری بھلی فہم وبساط کے موافق ہزارہا ہزار صفحات کو چند صفحون مین سمیٹنے کی سعی مین بھی پیش نظر رکھا ہے، کہ حضرت کی جامعیت تجدید کے کم ازکم نمایان خد وخال اس مرقع مین نظر آجائین جس کا بہت کچھ اندازہ خود حاضر وقت باب (تجدید تعلیم) اور اس کے قبل کے مذکورہ بالا شائع شدہ ابواب سے فرمایا جاسکتا ہے، قومیات وسیاسیات، تبلیغ وتعلیم وغیرہ کے یون تو ہر شعبہ مین مسلمانون کی مختلف جماعتین اپنی اپنی راہ کے مطابق کام کررہی ہین، اور اسلام ہی کا نام لے کر کررہی ہین، لیکن چونکہ اکثر صورتون مین اسلام کے اصلی اصول وتعلیمات اپنی بے غبار اور صاف ستھری تجدید یافتہ شکل مین سامنے نہین، اس لئے قدرۃً فکر وعمل کے تیر زیادہ تر نشانہ کے باہر گرتے ہین، صدی بصدی تجدید دین کی یہی بڑی حکمت ومصلحت تھی، کہ دنیا کا آخری دین ہر صدی کے نوپیدا مفاسد سے پاک ہوکر اپنے جمال وکمال کے ساتھ تر وتازہ صورت مین دنیا کے سامنے برابر موجود رہے، تاکہ کم ازکم مخلص اہلِ طلب واہلِ دین تو دین کی طلب وخدمت مین نادانی سے ترکستان کی راہ پر نہ چل پڑین،

لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ بعض حضرات پر (جس کا بڑا سبب حجاب معاصرت معلوم ہوتا ہے) حضرت مجدد وقت کے لئے جامعیت اور بعثت کا لفظ استعمال کرنا گران ہے، حالانکہ بعثت کا لفظ خود تجدید کی مشہور حدیث مین استعمال فرمایا گیا ہے، اور "جامعیت" ایک ایسا واقعہ ہے جو حضرت کے اصلاحی وتجدیدی کارنامون کی ہمہ گیری کو پڑھ کر جیسا ابھی عرض کیا گیا، ہر آنکھ والا خود اپنی آنکھ سے دیکھ لے سکتا ہے، البتہ اس کا کوئی

علاج نہین کرع

دیکھتا سب کچھ ہون لیکن سوجھتا کچھ بھی نہین

حدیہ کہ صاحب الفرقان جیسے محترم و مخلص صاحب علم و عمل کے نزدیک تو حضرت کی اصلاحات و ہدایات کو آپ کے منصب مجددیت کی بنا پر پیش کرنا اُن کی افادیت کے دائرہ کو بہت محدود کر دیتا ہے" اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ حدیث تجدید کو اب منسوخ قرار دے دیا جائے، اور اگر کسی کا مجدد ہونا آفتاب نصف النہار کی طرح نظر آرہا ہو، تو بھی اُس کی مجددیت کا نام زبان پر نہ لانا چاہئے، اع

این سخن را چہ جواب است تو خود می دانی

رہا یہ کہ "کسی بزرگ کی اچھی سے اچھی تعلیمات اور سیدھی سے سیدھی اصلاحات کو بھی اگر اس کے اہل زمانہ کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ ان بزرگ کے لئے کوئی خاص منصب تسلیم کرانا چاہین، تو اس کا دائرہ قبول بہت ہی محدود ہوگا" تو طلب حق کی راہ سے اس حجاب معاصرت کو ہٹانے کی سعی کرنی چاہئے، خصوصاً اہل حق کو نہ یہ کہ الٹے چشمۂ آفتاب ہی کا نام لینا گناہ قرار دیدیا جائے،

البتہ یہ بالکل سچ ہے کہ مجددیت کوئی ایسا منصب نہین، جسے منوایا ہی جائے" اور بلاشبہہ یہ بھی ضروری نہین کہ کسی دور کا مجدد دین کے ہر شعبہ مین جو کچھ کہے وہ سب واجب التسلیم ہی ہو، یہ شان تو صرف نبوت کی ہے" اس وسوسہ کا محترم موصوف جیسے اہل علم کی طرف سے تو قطعاً راقم کو وسوسہ تک نہ تھا، ہان عوام یا معاندیہ اعتراض کر سکتے، یا پیدا کر سکتے تھے، اسی لئے قومیات و سیاسیات" والے مضمون کے سلسلہ مین معارف[1] مین پہلی دفعہ ہی حضرت کی مجددیت کی طرف متوجہ کرتے وقت اس بے بنیاد وسوسہ یا اعتراض کی نسبت عرض کر دیا گیا تھا کہ

نبی و مجدد مین ایک فرق یہ ہے کہ نبی وقت پر ایمان نفس نجات و مغفرت کے لئے لازم ہے

---

[1] ماہ دسمبر ۱۹۴۶ء ص ۴۲۱،

بخلاف اس کے مجدد وقت کی یافت و پیروی پر نجات موقوف نہیں وہ تو انشاء اللہ خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نفس ایمان کے بعد بھی مر پٹ کر حاصل ہی ہو جائے گا لیکن دین کے اصل و پاک سر چشمہ تک پہنچنا، اس کی کامل و بے غبار تعلیمات کو سمجھنا اور ان پر عمل کی دینی و دنیوی برکات کا پوری طرح حاصل ہونا اس کے لئے بلاشبہ مجدد وقت کا پانا، اور اس کا دامن تھامنا لابُد ہے، ورنہ پھر بعثت مجددین اور تجدید دین کے کوئی معنی نہیں، بیشک مجدد نبی کی طرح معصوم نہیں ہوتا، بشری لغزشیں اس سے بھی ہوں گی، لیکن دیگر علماء و محققین کے مقابلہ میں نسبتہً کم، اس لئے مجدد وقت کی تجدید کا قبول و اتباع اسلم و احوط ہر حال میں ہوگا

اس کے علاوہ اسی سلسلہ میں مجدد کی یافت و اتباع کے کچھ اور فوائد و مصالح بھی عرض کئے گئے ہیں، اگر محترم موصوف ان کو ایک نظر مکرر ملاحظہ فرمالیں تو غالباً یہ نہ فرمائیں گے کہ مولینا موصوف (راقم احقر) نے مجددیت کے مسئلہ و منصب کو بنیاد بنانے میں جو دینی مصلحتیں سمجھی ہوں ہم اُن کے ادراک سے قاصر ہیں، کیونکہ مجددیت کا مسئلہ اگر غور فرمائیں تو اتنی بڑی دینی مصلحت پر مبنی ہے، کہ اس کے بغیر ختم نبوت کے عقیدہ ہی کو سنبھالنا مشکل ہے، دینی مفاسد تو (معمولی عقائد و اعمال کا کیا ذکر) کفر و شرک تک کے روز افزوں ہیں، پھر آخر نبوت کی ضرورت کیسے ختم ہو گئی، ! ایسی ہی باتوں کو سہارا بکر کر تو خود امت مسلمہ میں بہت سے متنبی اٹھ کھڑے ہوئے، ان چیزوں کی مزید تفصیل انشاء اللہ اصل کتاب کے مقدمہ میں ملے گی، سردست اگر یہ اشارات بھی نامقبول ہیں، تو اس کے سوا کچھ عرض کرنا نہیں کہ ع

محبوب من است آنچہ بنزدیک تو زشت است

بہر حال حضرت علیہ الرحمہ کی تعلیمات و تجدیدات سے یوں تو الحمد للہ مختلف طبقات کے اہل سعادت کی ایک کثیر تعداد فیضیاب ہے لیکن نسبتہً جدید طبقہ نام کے علاوہ حضرت کے اصلی اصلاحی کام سے بہت ہی کم آشنا ہے، حالانکہ ایک طرف وقت کے حالات نے مسلمانوں کی دنیوی قیادت و رہنمائی کی عنان

بالکلیہ اسی طبقہ کے ہاتھ مین پہنچا دی ہے، دوسری طرف انہی حالات نے خود دنیا ہی کی راہ سے اس طبقہ کے اندر دین کی ایک طلب بیدار کر دی ہے، اس لئے اگر ان کی رسائی دین کی صحیح فکر و عمل تک ہو جائے تو انشا اللہ ان ہی کے ہاتھون دنیا مین دین بچا سکتی ہے،

راقم ہذا نے بھی جامع المجددین نام کی کتاب مین اس خیال کو خاص کر پیش نظر رکھا ہے اور اس لئے جا بجا بعض باتون کی تفصیل مین خود اپنی طرف سے تطویل تک مین تامل نہین کیا گیا، تاہم اپنی نااہلی کا پورا ادراک ہے اور اصل مین اس خدمت کے بڑے اہل حضرت سید الطائفہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، حضرت گیلانی مولانا سید مناظر احسن، اور حضرت دریابادی (مولانا عبد الماجد) جیسے حضرات تھے، کہ ایک طرف مجدد وقت کے مقام و مرتبہ سے آگاہ ہین، اور دوسری طرف خود جدید طبقہ مین مقبول و مسلم مشاہیر اہل قلم کا درجہ رکھتے ہین، پھر ان حضرات پر حضرت علیہ الرحمہ کے ساتھ عقیدتمندانہ و خادمانہ تعلق و نسبت کی بنا پر اس خدمت کا حق بھی زیادہ عائد ہے،

اور حضرت دریابادی صدق کی وساطت سے اس حق کو کچھ نہ کچھ ادا بھی فرماتے رہتے ہین، جس کی بدولت کم از کم صدق خوان طبقہ حضرت علیہ الرحمہ سے تھوڑا بہت روشناس ہو گیا ہے، گو سمندر کے چند قطرات ہی کی حد تک سہی، حضرت سید الطائفہ نے بھی جدید طبقہ ہی کو خصوصاً پیش نظر رکھ کر اشرف السوانح[۱] کو جدید قالب مین ڈھالنا شروع کر دیا تھا، مگر بھوپال کے تعلق اور دیگر مصروفیات نے شاید حق تقدم حاصل کر لیا، کاش مکرر توجہ فرما سکتے، اپیغام[۲] اسلام کے ایک بڑے سرگرم رکن سے یہ معلوم کر کے دل باغ باغ

۱؎ یہ استانہ اشرفی کے امیر خسرو حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب رحمۃ اللہ کی مرتب فرمودہ عاشقانہ و والہانہ ساتھ ہی مستند و مکمل تین جلدون مین سوانح حیات ہے جو حضرت علیہ الرحمۃ کی حیات مبارکہ ہی مین شائع ہو گئی تھی، اور جس کا استناد اس سے بڑھ کر کیا ہو گا، کہ خود حضرت کی مہر توثیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے،

۲؎ یہ رسالہ حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی یادگار مین لاہور سے نکلنے والا تھا، مگر ۱۵ اگست کے بعد کے حالات کی بدولت دیکھئے کب نکلتا ہے،

ہو گیا کہ انھون نے اپنی سرگرمی سے ہمارے حضرت گیلانی سے بھی غالباً حکیم الامت کا جادۂ اعتدال کے نام سے ایک مضمون حاصل کر لیا ہے، اگر مولانا گیلانی کے قلم کی عنان ادھر پھر جائے، تو وہ احسنیت و سرعتِ وزن کی ایسی جامع ہے کہ ایک آدھ سال ہی مین دوسروں کی طرف سے بھی اس فرض کفایہ کو پورا فرما دے سکتی ہے،

آخر مین ان معروضات کے ساتھ وہی درخواست ہے، جو پہلے اسی معارف اور پھر الفرقان مین پیش کیجا چکی ہے، کہ حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کے سمندر کی زور گہرائی کو مختلف ابواب کے اُن کو۔ دون مین پیش کرنے سے اس نااہل و نادان سے جو کوتاہیاں اور غلطیان ہوئی ہون، ان پر اگر مطلع و متنبہ فرمایا جائے تو بڑا احسان ہوگا، اور کتاب کی اشاعت مین انشاء اللہ اس کا ازالہ ہو سکے گا، بلکہ مزید درخواست یہ ہے کہ جو حضرات محض مجدد کے نام سے ناراض ہو کر استفادہ کے دروازہ کو اپنے اوپر بند کر لینا چاہتے ہون، وہ مجدد ماننے بغیر ہی اعتقاد و عناد دونون سے خالی الذہن ہو کر حضرت کی تجدیدات نہ سہی اصلاحات پر غور فرمائین اور اُن مین جو مسامحات نظر آئین، اُن سے بھی مطلع فرمائین، تاکہ اُن کا بھی ازالہ ہو سکے، کیونکہ معصوم تو بہرحال حضرت نہ تھے، اور اپنی تصنیفات کی اصلاح کے لئے خود ترجیح الراجح کا ایک مستقل باب کھول رکھا تھا، معارف مین "قومیات و سیاسیات" کا جو باب شائع ہوا ہے اُس کو حضرت کے بہت سے ایسے اکابر خلفاء اور اہلِ عقیدت نے جو حضرت ہی کی طرح لیگ یا کانگریس کے اکھاڑون سے عملاً کنارہ کش تھے بالاستیعاب اور توجہ سے ملاحظہ فرما کر الحمد للہ بڑی حد تک اپنی تصویب و توثیق سے ہمت بخشی ہے البتہ بعض حضرات نے کچھ جزئی ترمیمات کا مشورہ دے کر شکر گذار فرمایا ہے جس سے انشاء اللہ اصل کتاب مین استفادہ ہوگا۔

واکاجر عند اللہ۔

تعلیم کا مطلب فرنگی دجل کے اس دور کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اکثر سیاہ کو سفید اور زنگی کو کافور کا نام دے کر پروپگنڈے کا ڈھول اس زور سے پیٹا گیا ہے، کہ اس کے مقابل دوسری آواز کان پڑی سنائی نہین دیتی، یہی برعکس نام نہند زنگی کا فور کا معاملہ تعلیم کے ساتھ ہوا ہے، کہ یہ لفظ سنکر بے ساختہ

ذہن اسی نام نہاد نظام تعلیم کی طرف جاتا ہے جس کا جال کروروں، اربوں کے مصارف سے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سر بفلک عمارتوں کے اندر ساری دنیا میں پھیلا دیا گیا ہے حتی کہ تعلیم یافتہ سے مراد اب اسی تعلیم کا حامل اسفار ہوتا ہے، اس لئے حضرت مجدد وقت کی تعلیمی تجدیدات و اصلاحات کا محل و مقام سمجھنے کے لئے ذرا خود تعلیم کا صحیح مطلب سمجھ لینا مقدم ہے،

تعلیم کے صحیح معنی "متعلم کو اس کے مقصد وجود اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے علم عطا کرنا ہیں" لیکن تعلیم جدید نے انسان کو اپنے اور کائنات کے وجود کا جو علم و تصور عطا کیا ہے، وہ یہ کہ سارا کارخانۂ عالم بس ایک خودرو جنگل ہے، جس کا کوئی باغبان نہیں، جس نے برگ وبار اشجار و اثمار کو کوئی خاص مقصد پیش نظر رکھ کر قصد و ارادہ کے ساتھ لگایا ہو، اس جنگل میں طرح طرح کے خودرو جانور چرند و پرند بھی بھرے ہیں، جن میں سے ایک انسان بھی ہے، البتہ وہ سب سے اعلیٰ درجہ کا حیوان (Highe man imal) یا سب سے بڑھیا جانور ہے، مگر ہے جانور ہی، اور اس جنگل کے دیگر خودرو نباتات و حیوانات کی طرح اس کو بھی کسی دیدہ و دانستہ مقصد سے نہیں پیدا کیا گیا ہے، اس لئے اس کے حق میں تعلیم کے یہ معنی بھی بالکل بے معنی ہیں، کہ وہ نام ہے اس کے کسی خاص مقصد اور تکمیل مقصد کی علم آموزی کا،

انسان اور کائنات کے متعلق اس علم و تصور کی منطق کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے، کہ جنگل کے دوسرے جانوروں کی طرح یہ بھی زندگی کی ساری تگ و دو اور کشمکش، کھانے پینے رہنے سہنے اور جننے جنانے (یا تولد و تناسل) کی نذر کر دے، البتہ چونکہ یہ اعلیٰ درجہ کا جانور ہے، اس لئے اس کی بود و ماند کے سامان بھی قدرۃً اعلیٰ درجہ کے ہوں گے، جانور اگر بھٹ میں رہتے ہیں، تو یہ بنگلہ میں رہے، وہ اگر چر چگ کر کھاتے ہیں، تو یہ میز کرسی پر کھائے، وہ اگر توالد و تناسل کے وظائف سیدھے سادے فطری طریقوں سے انجام دیتے ہیں، تو یہ ان کو کوک شاستر کا آرٹ بنا دے،

غرض جب انسان من حیث انسان کا نہ کوئی جداگانہ مقصد و مقام ہے، نہ ماضی نہ مستقبل، یعنی نہ ماضی کی طرف اس کی آفرینش مین کسی کی مرضی و مشیت یا قصد و ارادہ کو دخل جس کی بنا پر اس کے وجود کا کوئی خاص مقصد و مراد یا مطلب و معنی ہون، نہ مستقبل مین اس کی موجودہ زندگی کا کوئی حساب کتاب یا جزا و سزا، تو اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے، کہ وہ آغاز و انجام سے یکسر بے پروا ہو کر تمام تر اسی سامنے کی مادی و فانی زندگی کے ماکولات و مشروبات، شہوات و رغبات، جاہ و جلال، آرایش و نمایش، کبریائی و سربلندی کے انفرادی و اجتماعی مقابلہ و مسابقت مین سرتاپا غرق رہے، اور اسی کو تعلیم و تہذیب، ترقی و تمدن کا کمال جانے،

ساتھ ہی چونکہ اس اعلیٰ درجہ کے جانور (انسان) مین اعلیٰ درجہ کی عقل و ذہانت بھی ہے، اس لئے بالآخر اعلیٰ درجہ کے حیوان سے ترقی کرکے اعلیٰ درجہ کا شیطان بن جاتا ہے، اور اس بے لگام عقل و ذہانت کی بدولت ایک طرف ذہنی و دماغی عیاشیون کا شکار ہوتا ہے، اور دوسری طرف طرح طرح کی ایجادات و اختراعات سے حیوانی و جسمانی راحت و زینت، تعلّی و ترفع کے سامان مہیا کرتا ہے، پھر قدرۃً اسی میدان مین افراد و اقوام سب کی دوڑ شروع ہوتی ہے، اور ایک دوسرے کو ڈھکیل کر آگے نکل جانے مین بھی اسی اعلیٰ درجہ کی عقل و ذہانت سے مطلب برآری کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی مکاریون اور چالاکیون سے کام لیتا ہے، اور ان کو سیاسیات و معاشیات وغیرہ کی ظاہر فریب و خوشنما اصلاحات مین تعبیر کرکے زندگی کا نام ہی کا نور نہین رکھدیتا بلکہ ایسا مسحور کردیتا ہے، کہ سیاہ واقعاً سفید دکھلائی دینے لگتا ہے، وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا،

لازماً ایسی بے سروپا تعلیم، جس کے تصور مین نہ زندگی کا کوئی سر ہے نہ پیر، نہ ماضی نہ مستقبل، نہ مبدء نہ معاد، وہ قدرۃً محض حیوانی یا مادی زندگی کے تعیش و تفوق کے لئے فرد فرد، قوم قوم اور ملک ملک کو ایک دوسرے کے مقابلہ مین نبرد آزما کردیتی اور انسانی بستیون مین جنگل کے قانون کے سوا کوئی قانون کارفرما نہین رہ جاتا، البتہ جنگل کے جانور سینگ اور پنجے مارتے، یا دانت سے نوچتے پھاڑتے ہین، وہ بھی ایک نے

بہت سے بہت دو چار کو کھا جا ڈالا، لیکن یہ اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ جانور اپنی عقل و تعلیم کے زور سے ایٹم بم کے ایک ہی وار میں شہر کے شہر بوڑھوں، بچوں، عورتوں، بیماروں کی تمیز کے بغیر نیست و نابود کر ڈالتا ہے، اس شتر بے مہار تعلیم کی بدولت ساری زمین شر و فساد سے بھر گئی ہے، جنگوں اور خانہ جنگیوں نے کسی گوشہ میں امن و امان کا نشان نہیں چھوڑا، جنگ عظیم اور پھر جنگ عالمگیر کے برپا کئے ہوئے انفرادی و اجتماعی مصائب ابھی ختم نہیں ہوئے، بلکہ روز افزوں ہیں، کہ تیسری جنگ عالم سوز کے فریق دانت نکال کر نمودار ہو گئے ہیں، اور ہاتھ طبل جنگ پر ہے،

ابھی حال ہی میں امریکہ کے ایک وظیفہ یاب امیر البحر کا مضمون شائع ہوا ہے کہ مختلف قوموں نے دور دراز فاصلوں تک تباہی اور بربادی پھیلانے والے ایسے آلات حرب بنائے ہیں، جو روئے زمین سے انسانی و حیوانی اور نباتی زندگی کا آخری نام و نشان تک مٹا ڈالیں گے" (پائنیر ۳ر اکتوبر ۵۸ء ص ۱۱) اور یہ ساری برکت انھی بڑے نام والے علوم جدیدہ حیاتیات (بیالوجی) جرثومیات (بیکٹریالوجی) موسمیات (کلائمٹولوجی) وغیرہ کی ہے، جن پر عصر جدید کی تعلیم و ترقی کو سب سے زیادہ فخر ہے،

خود ہمارے ملک ہندوستان میں اسی تعلیم جدید کے سوا قانون کی حاصل کردہ آزادی کی برکات نے چند ہفتے کے اندر ہی کشت و خون کی آزادی کا جو ناقابل بیان بازار گرم کر رکھا ہے، وہ آنکھوں کے سامنے ہے، سیکڑوں ہزاروں نہیں لاکھوں انسان جان و ایمان، جان و مال، عزت و آبرو، وطن و دیار سے محروم کئے جا چکے، سفر و حضر میں کہیں امان نہیں، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آگے اور کیا کیا دیکھنا پڑے گا،

تعلیم جدید کا مبلغ پرواز

اگر کشت و خون، شر و فساد کے اس وبال و نکال تک بفرض محال نوبت نہ بھی آئے، تب بھی تعلیم جدید کا رقاص (پنڈلم)، اپنے بے آغاز و بے انجام تصور تعلیم کی رو سے قدرۃً صرف نفسانی و حیوانی زندگی، لذت و مسرت جاہ و مال کے مابین ہی رقص کرنے پر مجبور رہے، علم و تعلیم کے اس "مبلغ پرواز" کا ایک دلچسپ تجربہ خود حضرت علیہ الرحمہ نے اپنا نقل فرمایا ہے کسی مقام پر حضرت کی،

"ایک انگریز جنٹلمین سے اس کی خواہش پر ملاقات ہوئی، دوران گفتگو مین اس نے پوچھا کہ ہم نے سنا آپ نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے، تو آپ کو کتنا روپیہ ملا، حضرت فرماتے ہین کہ مین نے دل مین کہا کہ واہ وا بس یہ ہے آپ کا مبلغ پرواز اور مطمحِ نظر، جب مین نے کہا کہ کچھ نہین ملا تو بڑے تعجب سے پوچھا، کہ اتنی بڑی کتاب لکھی، اور کچھ بھی نہ ملا تو پھر کیا فائدہ اتنی محنت ہی کیون کی،...... خیر مین نے اس کے مذاق کے مطابق اس کو سمجھایا، کہ اس سے مجھے دو فائدے ہوئے، ایک تو یہ کہ علاوہ اس زندگی کے مسلمانون کے اعتقاد مین ایک دوسری زندگی بھی ہے، وہان ایسے کامون کا عوض ملنے کی ہم کو توقع ہے"

یہ تو صاحب کے مبلغ علم کی سمجھ مین کیا آتا، البتہ آگے جب حضرت نے فرمایا کہ

"دوسرا فائدہ دنیا کا بھی ہے کہ مین نے یہ تفسیر اپنے بھائی مسلمانون کے فائدہ کے لئے لکھی ہے جب اپنے بھائیون کے ہاتھ مین دیکھتا ہون تو خوشی ہوتی ہے، کہ میری قوم کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے، چونکہ یہ تقریر اس کے مذاق کی تھی، اس کے نظر مین میری بڑی وقعت ہوئی، غرض جو روپیہ پیسہ اور جاہ کو مقصود سمجھے گا، وہ ضرور ایسے شخص کو کہے گا، کہ بڑا بے وقوف ہے کہ محض دین کے لئے اپنا جاہ ومال سب برباد کر دیا"

(وعظ طریق القلندر ص ۳۵ و ۳۶)

لاکھون کرورون کے سامانون اور فلک بوس ایوانون کے اندر بڑے بڑے دعوون کے ساتھ آج کل جو تعلیم دیجاتی ہے، بھلا بتلائیے کہ اس کا "مبلغ پرواز" اس فانی و مادی زندگی کے جاہ و مال لذت مسرت کے سوا کیا ہے، اور بہت بلند اڑے تو انفرادی سے آگے اجتماعی، یا قومی و ملکی، یا بڑے زبانی دعوون مین اور بھی اونچے اڑے، تو ساری انسانیت کے لئے انھین چندروزہ حیوانی منافع و نفسانی لذات کو مطمحِ نظر بنالیا، جب فرد و قوم یا انسان زیادہ سے زیادہ ایک اعلیٰ درجہ کا حیوان ہے، اور دیگر حیوانات کی

طرح کھاپی کر مر جانے کے سوا اوس کا کوئی اور انجام نہین، تو پھر اس کی تعلیم مین زیادہ سے زیادہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ حیوانی لذات و فوائد فراہم کرنے سے آگے نظر آخر جا ہی کیسے سکتی ہے، خواہ اس کا نتیجہ بالآخر اعلیٰ درجہ کے حیوان سے ترقی کرکے اعلیٰ درجہ کا شیطان بن کر خود اس دنیاوی زندگی کی خودکشی اور اس کے امن و امان بلکہ ساری آبادی کی بربادی کی صورت مین ظاہر ہوا،

سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کے تصور مین انسان نہ نرا اعلیٰ درجہ کا حیوان ہے، نہ اسلام کا تعلیمی تصور اوس کی عارضی و ضمنی حیوانیت کو ترقی دے کر اس کو اعلیٰ درجہ کا شیطان بنانا چاہتا ہے، انسان انسان ہے، اور اس کی تعلیم کا مقصد اس کو انسان کامل بنانا ہے، اسلام کی نگاہ مین انسان کی اصلی انسانیت نفخت فیہ من روحی والی الٰہی روحانیت ہے، اس روحانیت کے مطالبات اتنے اعلیٰ و نامحدود ہین، کہ ان کی سمائی دنیا کی ادنیٰ و محدود زندگی مین ناممکن ہے، وہ اس زندگی کو آغاز و انجام سے ناآشنا، یا ماضی و مستقبل سے غیر مربوط لایعنی و عبث قرار نہین دیتا، بلکہ اس فانی و محدود کا دامن ایک غیر فانی و غیر محدود ذات و انجام سے بندھا ہوا ہے، واللہ خیر و ابقیٰ والآخرۃ خیر و ابقیٰ اور دینی تعلیم کا مقصد دنیاوی زندگی کو اسی خیر و ابقیٰ کے شایان شان بنانا ہے، نہ کہ انجام و منزل سے آنکھین بند کرکے خود راستہ ہی کو منزل بنا لینا، اور اس طرح خوردن برائے زیستن، اور پھر زیستن برائے خوردن کے چکر مین جان دیدینا، جس کو راقم ہذا اس گندی زندگی کے مناسب گندی ہی مثال مین طعام خانہ اور پاخانہ کے درمیان چکر کاٹنے کی زندگی کہا کرتا ہے، کہ کھانا اور ہگنا، اور پھر کھانا اور پھر ہگنا، اور یہی کرتے کرتے جانورون کی طرح مر جانا، اور کبھی یہ سوال تک نہ پیدا ہونا کہ کھانا پینا سب کچھ ہمارے لئے، تو ہم آخر کس لئے؟ دین اور تعلیم دین دراصل اسی سوال کا جواب ہے، کہ ہمارا حقیقی مقام و مطلب Man's place in nature. -اس کائنات مین کیا ہے، یا بالفاظ دیگر تمام علوم و فنون کا موضوع انسان کی اس دنیوی زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ کی مادی و حیوانی ضروریات و حاجات کو

پورا کرنا ہے، اور علم دین کا موضوع (بلکہ دین کی نگاہ مین علم نام ہی اس کا ہے جس کا موضوع) خود اس زندگی کا مقصد و منتہی متعین کرتا ہے، اور دینی تعلیم کا مقصد اسی مقصد و منتہی تک پہنچانا ہے ان للہ نہایۃً فانتھوا الی نھایتکم،

اصل مین تو یہ گفتگو اور زیادہ تفصیل و تطویل کی طالب ہے، جو انشاء اللہ مستقلاً اپنے موقع پر ہوگی یہان مختصراً اہل بصیرت کے لئے چند اشارات عرض ہین،

۱- انسان اور کائنات کی فطرت و ساخت مین ایک اعتبار سے بڑا تضاد ہے، انسان کی الٰہی یا روحانی فطرت خیر مطلق، بقاے دوام اور نامحدودیت کی طالب ہے، حتی کہ لباس و طعام مسکن و قیام کی خالص نفسانی و حیوانی لذات و حاجات تک جن مین دیگر حیوانات اپنی جبلت کی بندھی ہوئی راہ پر کھا پی کر مر جاتے ہین، ان مین بھی انسان کسی ایک نقطہ پر چین نہین لیتا، نہ کسی نقص و شر کو باقی رہنے دینا چاہتا، بلکہ کامل سے کامل تر اور خوب سے خوب تر کی دھن مین لگا رہتا ہے، کہ

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہان   اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جاکر نظر کہان

لیکن کائنات کی ساخت ایسی واقع ہوئی ہے، کہ یہان کی ہر شے محدود و فانی، اور ہر چیز کے ساتھ شر توام ہے، جو خود اس بات کی فطری دلیل ہے، کہ انسان کی یہ زندگی کسی اور زندگی کی طالب ہے، جہان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہونی چاہئے، کہ انسان کی مشیت نامحدود ہو جائے، جو یہ چاہے وہ ہو، جو مانگے، وہ پائے، ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون اور یہ زندگی اُسی نامحدود زندگی کا محض راستہ ہے، نہ کہ خود منزل مقصود، اور راستہ کی کامیابی یہی ہے، کہ نظر کسی وقت بھی منزل سے روگردان نہ ہو، نہ کوئی قدم بے راہ پڑے،

۲- اب اگر انسان کا کوئی عقلمند قافلہ منزل کو فراموش کرکے راستہ یا مسافر خانہ ہی کی راحت و لذت کے مقابلہ و مسابقت مین لڑلڑ کر جان دیتا ہے، تو اس کی منزل معلوم اراستہ بہرحال راستہ ہے،

اس مین منزل کی کامل آسودگی کی فکر حماقت کے سوا کیا ہے، ہ اس طرح انسانون کے مختلف افراد اور قافلے (اقوام) اپنی فطرت کے نامحدود مطالبات کا سارا زور اگر اس دنیا کے جاہ و مال کے محدود مطلوبات و لذات پر لگا دین، تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ باہمی اور کتون کی جنگ اور خودکشی کے سوا کیا نکل سکتا ہے؟ نسوا اللہ فانساھم انفسھم،

پس یہ دو باتین اگر سمجھ مین آجائین، تو اسلامی تعلیم کی اس بنیاد کو سمجھ لینے مین بھی کوئی دشواری نہ ہوگی، کہ اس کا اصلی مقصود مستقبل کی اُس خیر و ابقیٰ زندگی کی فلاح و کامیابی ہے، جو انسانی فطرت کے اعلیٰ حقیقی مطالبات کی کامل آسودگی کا مظہر ہوگی، اور موجودہ زندگی کی حیثیت مقصود کی نہین، بلکہ وسائل کی ہے، اور اس وسیلہ کو مقصود بنانا ویسی ہی خود فریبی و نادانی ہے، جیسے بخیل آدمی خود مال کو مقصود بنا کر اس کے پیچھے عزت و راحت سب کچھ بلکہ جان تک گنوا دیتا ہے، اور نتیجہ الٹ کر یہ ہوتا ہے، کہ روپیہ پیسہ جس عزت و راحت کا وسیلہ تھا، اسی سے محروم رہتا ہے، ومن یوق شح نفسہ فاولٰئک ھم المفلحون،

یہی حشر خدا و آخرت کو فراموش کرکے جاہ و مال پر جان دینے والی تعلیم کا آنکھوں کے سامنے ہے کہ خود دنیا بھی اس کی بدولت آخر کار جہنم بن کر رہی، افراد و اقوام سب اسی جاہ و مال کی آتش رقابت مین بھسم ہوتے جاتے ہین، اور قلب کا آرام و اطمینان یا دل کا سکھ چین نہ حکومت و وزارت کی کرسیون کو نصیب، نہ صنعت و تجارت کے کارخانون اور کوٹھیون مین، سب کے سینہ مین ھل من مزید کی بھٹی دہک رہی ہے، ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا

راز وہی ہے کہ جب مطلوب قلیل و محدود ہو، اور طلب کثیر و نامحدود، تو باہمی طلب میں رقابت و مزاحمت ناگزیر ہے، دنیا کا حال یہی ہے کہ یہ اور اس کی ہر شے جاہ و مال، حکومت و تجارت، لذت و راحت، سب ہی انسان کے نامحدود مطالبات کے مقابلہ مین نہایت محدود، اس لئے اگر سا مانِ

ان ہی کی مطلوبیت پر صرف کر دیا جائے، اور تعلیم یہ ہو کہ اس فانی و محدود زندگی کے ان فانی و محدود مسلوبات کے سوا نہ آگے کوئی "خیر و ابقی" مطلوب ہے، نہ خیر و ابقی زندگی، بس جو کچھ ہے یہی محدود ناقص دنیا، اور یہی ناقص و فانی زندگی جس کو جو کچھ لینا ہے، یہیں لیلے، تو یہ جنگ و فساد جنگی کا علانیہ اعلان و مبارزت نامہ نہیں تو اور کیا ہے، ؟ اور اسی راستہ پر چل کر بالآخر اگر ساری زمین قومی و بین الاقوامی کارزار کا میدان بن گئی، تو تاسف جتنا ہو، لیکن تعجب کی کیا بات ہے،

پھر اس اندھیر کا کچھ ٹھکانا ہے، کہ اسلئے دین کی تعلیم ہی کو شرو فساد کی جڑ متہم کر دیا گیا، جو اس محدود و فانی دنیا کی محدود و فانی مطلوبات و لذات سے انسان کی نظر کو اونچا کر کے اس کی اصلی فکر و عمل کی عنان کو باقی و نامحدود کی طرف موڑ دینا چاہتی ہے، کیونکہ خدا و آخرت ہی ایک ایسا غیر فانی و غیر محدود مطلوب ہے، جو ایک طرف انسان کی غیر محدود طلب کی تمام و کمال تشفی و آسودگی کا ضامن ہو سکتا ہے، اور دوسری طرف اس دنیا کے فانی و محدود حیوانی و مادی مطلوبات و لذات سے نظر کو اونچا کر کے جاہ و مال تجارت و صنعت، حکومت و سیاست کی باہمی عداوت و رقابت اور روز روز کے فساد و خونریزی سے نجات بخش سکتا ہے، اس لئے کہ خدا و آخرت دنیاوی دولت و حکومت کی طرح کوئی ایسی حقیقت نہیں کہ اگر ایک حصہ پر کسی ایک کا قبضہ ہو جائے، تو دوسرے کے لئے اس سے بھی زیادہ بلکہ زیادہ سے زیادہ کی گنجایش نہ رہے، تو پھر لڑائی جھگڑے کی گنجایش کہاں، ؟ نہ دین نے دنیاوی حکومت و تجارت لذت و راحت، جاہ و مال میں تفوق و برتری کے لئے جنگ و جدال کی اجازت دی ہے، بلکہ اس کی جنگ تو صرف انہی لوگوں سے ہے، جو انسان کو اس کے مطلوب و مقصود خدا و آخرت کی راہ سے روک یا کج راہ کر کے تمام تر مادی و نفسانی لذات و مطلوبات میں فنا کر کے انسان کو انسان کے بجائے حیوان بنا دینا چاہتے ہیں، الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ،

باقی جو لوگ دین کا نام لے کر دنیا ہی کے مقاصد کے لئے لڑتے مرتے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، وہ دین کی نگاہ میں خالص دنیا پرستوں سے بھی بڑھ کر مجرم ہیں، کہ خدا کی باتوں کو کوڑیوں کے دام فروخت کرتے ہیں، (یشترون بآیات اللہ ثمنا قلیلاً) اور اگر کوئی زہر کا نام تریاق رکھ کر پینا پلانا شروع کر دے، تو نتیجہ زہر ہی کا برآمد ہوگا، تریاق کا کیا قصور، دین سچ پوچھئے تو زیادہ تر صرف اپنے دوست نما دشمنوں ہی کے ہاتھوں بدنام ہوا اور ہو رہا ہے،!

غرض دیکھا جائے تو ہمارے موجودہ انفرادی و اجتماعی مصائب و مفاسد میں سب سے زیادہ حصہ اسی موجودہ نظام تعلیم ہی کا ہے، جس نے خدا و آخرت کی مطلوبیت و مقصودیت کو عملاً زندگی سے خارج کرکے صرف جاہ و مال حکومت و تجارت اور نفسانی و حیوانی لذت و راحت کو انسان کا مطمح نظر اور مبلغ پرواز بنا دیا ہے، محرومیت قلب کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے، کہ افراد کی بددینی والحاد پسندی سے گذر کر اب حکومتیں اپنا سب سے بڑا دانشمندانہ کارنامہ یہ قرار دیتی ہیں، کہ اپنے بددین یا لادینی (Secular) ہونے کا فخریہ اعلان و تبلیغ کرتی رہیں، جو اپنے دین کو پہلے ہی سے کھو چکے ہیں، وہ گمراہی میں جتنی دور بھی نکل جائیں، چنداں تعجب نہ تھا، غم و غصہ تو اپنے حال پر ہے، جو زندہ و پائندہ دین کی شاہراہ پر (صراط مستقیم) پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اس کی طرف بلانے کے بجائے خود اُن کی آواز میں آواز ملانے اور راہبری کا منصب چھوڑ کر گمراہوں کے پیچھے چل رہے ہیں، فماذا بعد الحق الا الضلال،

اس گم کردہ راہ دنیا کے از سر نو راہ پر آنے کی فقط ایک ہی صورت ہے، کہ قدرت کی طرف سے راہنمائی کی مشعل جس امت کے ہاتھ میں دی گئی ہے، پہلے وہ خود خداشناسی و آخرت طلبی کی شاہراہ پر آگے آگے ہو، اور اس کی فقط ایک ہی صورت ہے، کہ خداشناسی و آخرت طلبی کی تعلیم و تربیت اور ساتھ ہی تبلیغ کا ایسا جامع و محیط نظام اختیار کیا جائے، جو امت مبعوثہ کے عوام

زن و مرد، پڑھے اور ان پڑھے سب کو حاوی و محیط ہو، حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے دین کی تعلیم و تبلیغ دونوں کی ایسی ہی جامع و حاوی تجدید فرما دی ہے، کہ اس کے قبول و عمل کے بعد نہ کوئی طبقہ انشاء اللہ محروم رہ سکتا ہے، نہ کوئی فرد، نظام تبلیغ کی اصلاح و تجدید کی اس جامعیت کا اندازہ اہل نظر الفرقان کے مضمون، تجدید تبلیغ سے فرما سکتے ہیں، اور تجدید تعلیم کی اصلاحی جامعیت کا اندازہ اوراقِ ذیل سے فرمایا جائے، لیکن ثمرات باغبانی کی کسی بہتر سے بہتر خالی کتاب کے پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوسکتے، وہ تو اصول و قاعدہ کے موافق باغ لگانے ہی سے حاصل ہوں گے، ان اصول و قواعد کی تفصیل و تجدید آگے ملاحظہ ہو،

اوپر تعلیم الدین، اصلاح انقلاب، اور بہشتی زیور کے مضامین کی تفصیل سے اتنا بخوبی واضح ہو چکا ہے کہ حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کا مشن نہا و جامع و کامل دین کی جامع و کامل اصلاح و تجدید تھی، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت کے ہاتھوں اوس کو بوجہ اتم پورا فرما کر امت پر اتمام حجت فرما دیا، خود حضرت بطور تحدیث نعمت فرمایا کرتے تھے، کہ الحمد للہ دین و طریق صدیوں کے لئے صاف و بے غبار ہوگیا، اب بڑا سوال یہ ہے کہ اس تجدید یافتہ کامل و جامع دین کی تعلیم و تبلیغ امت کے سارے طبقات، عوام و خواص ذکور و اناث میں کیونکر ہو، جیسا کہ اوپر اصلاح انقلاب میں معلوم ہوا، مسلمانوں کے دینی و روحانی امراض کے بنیادی اسباب حضرت علیہ الرحمہ کی تشخیص کی رو سے دو ہیں، بڑا اور پہلا سبب قلت علم یعنی علوم و احکام دین سے بے خبری ہے، ظاہر ہے کہ آدمی اپنے بُرے بھلے کو اگر جاننے کی طرح جان لے، تو جان بوجھ کر اپنے نفع و ضرر سے کون بے پروا ہو سکتا ہے، سقراط نے تو اسی بنا پر تعلیم اخلاق کا اصل الاصول یہی قرار دیا تھا، کہ "علم ہی نیکی ہے"، غرض دین کی تعلیم و تبلیغ کے نظام میں بھی ایسی جامع و ہمہ گیر اصلاح و تجدید کی حاجت تھی، کہ اگر اس کے مطابق انتظام کر لیا جائے، تو کسی طبقہ اور کسی فرد کے لئے بھی بجز اپنی کوتاہی، و کم نصیبی کے محرومی کا کوئی جائز عذر نہ رہ جائے لہذا تجدید دین ہی

کا ایک جزیہ تھا، کہ دین کو لوگون تک پہنچانے یا اس کی تعلیم و تبلیغ کی صورتون اور انتظامات مین ضروری اصلاح و تجدید کے ساتھ اُن کو آسان سے آسان تر کر دیا جائے، پھر بھی اگر لوگ متوجہ نہ ہون تو (افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین)

تعلیم و تبلیغ کی ان اصلاحی و تجدیدی صورتون اور تدبیرون کا کچھ ذکر اصلاح انقلاب کی ابتدا مین گذر چکا ہے[۱] کے علاوہ ایک مستقل رسالہ اسی موضوع پر حقوق العلم کے نام سے اور کئی وعظ آداب و تبلیغ الدعوۃ الی اللہ وغیرہ کے نام سے ہین، آگے اُن پر مختصر گفتگو ہے،

علم دین کے دو درجے فرض عین و فرض کفایہ جس طرح دنیوی تعلیم کے دو معیار یا درجات قرار دیئے جاتے ہین، ایک لازم (کمپلسری) جس سے کسی فرد کو مستغنی و مستثنیٰ نہیں سمجھا جاتا، اور دوسرا اوس کے اوپر کا درجہ جس مین خاص خاص ضرورتون کے لحاظ سے مختلف علوم و فنون داخل ہوتے ہین، اسی طرح دینی تعلیم کی بھی ایک مقدار لازم و واجب ہے جس سے کسی دینی زندگی بسر کرنے والے کا استغنا و استثنا جائز نہین، یعنی زندگی کے مختلف شعبون کے وہ ضروری شرعی احکام جن سے کم و بیش سب کو سابقہ پڑتا ہے اس کی نسبت ارشاد ہے،

"علم دین کی دو مقدارین ہین، ایک یہ کہ ضروری عقائد کی تصحیح کیجائے، فرض عبادتون کے ضروری ارکان و شرائط و احکام معلوم ہون، معاملات و معاشرات مین جن سے اکثر سابقہ پڑتا ہے، ان کے ضروری احکام معلوم ہون، مثلاً نماز کن چیزون سے فاسد ہوجاتی ہے، قصر کتنے سفر مین ہے، زکوٰۃ کن اموال مین واجب ہے، نکاح کن عورتون سے حرام ہے، رضاعت سے کون کون رشتے حرام ہوجاتے ہین، اجرت ٹھہرانے مین کون صورتین جائز ہین، کون ناجائز، لباس کون حلال ہے، کون حرام،

[۱] تبلیغ کا حصہ الفرقان مین ملاحظہ ہو،

نوکریان کون جائز ہین، کون ناجائز (اگرچہ بدقسمتی سے ناجائز مین مبتلا ہو مگر ناجائز کو ناجائز سمجھے گا، اور دوجرمون کا مرتکب نہ ہوگا، ایک تو جانا ئز کا ارتکاب دوسرے اس کو جائز سمجھنا) اگر کوئی صاحب حکومت ہے تو اس کو فیصلۂ مقدمات کے شرعی قوانین کا علم بھی ہونا چاہئے، گو ان کے نافذ کرنے پر قادر نہ ہو، مگر جاننا اس لئے واجب ہے کہ شرعی فیصلون کے ناحق اور غیر شرعی کے حق ہونے کا اعتقاد نہ کر بیٹھے"

اس زمانہ مین مسلمان حاکمون کو غیر اسلامی قوانین کے تحت فیصلے کرنا پڑتے ہین، اُن کے لئے یہ امر کتنا ضروری ہے، کہ کم از کم اپنے اعتقادی کو درست رکھ سکین، تاکہ منفعل و مستغفر کے درجے سے تو نہ گر جائین،

"ماکولات و مشروبات مین کیا جائز ہے، یا ناجائز اسباب تفریح مین کس کا استعمال درست ہے کس کا نادرست" باطنی اخلاق مین محمود و مذموم کا امتیاز، ریا و کبر، ظلم و غضب، حرص و طمع وغیرہ کی حقیقت اور ان کے علاج کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ اپنے اندر ہونا یا نہ ہونا معلوم ہو سکے، اور ہونے کی صورت مین ان کے ازالہ کی تدبیر کر سکے، اور کوتاہی پر استغفار کرے"

"غرض علم دین کی یہ مقدار عام طور پر ضروری ہے، کیونکہ بدون اس کے حق تعالیٰ کی ناراضی اور معصیت مین مبتلا ہونا پڑے گا"

"وہ مسلمان جو آج کل اعلیٰ تعلیم یافتہ کہلاتے ہین، اپنے دینی احکام کی مقدار واجب تک سے ان کی لاعلمی کا یہ حال ہے، کہ حضرت فرماتے ہین، کہ حقیقی بھانجے کی لڑکی سے نکاح حلال جاننے والا مین نے خود دیکھا ہے، باقی نوکری لباس اور اسباب تفریح مین تو ایسے صاحبون کے نزدیک کوئی چیز ممنوع ہی نہین، اور اخلاق مین بجز تفاخر مسلمانون کی تحقیر اور حرص دنیا کے جس کا نیا لقب ترقی ہے، اور کچھ سیکھا ہی نہین یہ

"دوسری مقدار یہ ہے کہ اپنی ضروریات سے تجاوز کرکے مجموعۂ قوم کی ضرورتوں پر لحاظ کرکے نیز دوسری قوموں کے شبہات اسلام کو جس مضرت کا اندیشہ ہے، اس پر نظر کرکے ایک ایسا وافی ذخیرہ معلومات دینیہ مع اس کے متعلقات ولواحق اور آلات وخوادم علوم کے جمع کیا جائے، جو مذکورہ ضرورتوں کے لئے کافی ہو"[5]

"پہلی مقدار فرض عین تھی، اور یہ دوسری فرض کفایہ ہے، فرض عین کا حکم یہ ہے، کہ ہر ہر فرد انفرادی طور پر اس کا مکلف ہے، جو اس میں کوتاہی کرے گا گنہگار ہوگا، اور فرض کفایہ کا حکم یہ ہے کہ اگر ہر مقام ایک ایسی جماعت موجود ہے، کہ ان ضرورتوں کو پورا کرسکے، تو سب مسلمان گناہ سے بچے رہیں گے، ورنہ سب مسلمان گناہ میں شریک ہوں گے"

بقدر واجب علم دین کے حصول کی آسان تدبیر

اس تقسیم سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ علم دین کی جس مقدار کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہے، وہ اتنے کم وقت کی طالب ہے، کہ حریص سے حریص طالب دنیا

---

[5] ایک نامی گرامی درس گاہ خاص طور پر یہی مقصد لے کر اٹھی تھی، لیکن افسوس کہ ایک طرف تو اس کی باقاعدہ تعلیم کا کوئی بند وبست نہیں، سارا سرمایہ سُنی سنائی، یا گھٹی واخباری باتیں ہیں، باضابطہ درس میں وہی فرسودہ نونیات کا چرخہ چلایا جارہا ہے، یا نری زبان کی حد تک معمولی انگریزی شریک کردی گئی ہے، جس سے حال وقال میں ایک طرف فرنگیت کے رجحانات کو تقویت ہوتی ہے، دوسری طرف دنیا طلبی کا ایک ارزاں راستہ اسی دینی درسگاہ سے ہوکر بھی نکل آتا ہے۔ ان مفاسد ومضار کو خود ذمہ داران کار نے بھی محسوس فرمایا، مگر آگے آئی آیت۔ متعدد بار عرض کیا گیا، کہ اگر اصل مقصد جدید علوم عقلیہ کی صحیح ومستند کتابوں کی تعلیم اور اُن سے پیدا ہونے والے شبہات کے مقابلہ کے لئے طلبہ کو تیار کرنا ہے، تو جامعہ عثمانیہ کی بدولت ایسی مستند کتابیں خود اردو میں منتقل ہوگئی ہیں، جن کی تعلیم کا انتظام کیا جاسکتا ہے، اور انگریزی کو ایسی صورت دیجاسکتی ہے جس سے ایسی کتابوں کے خود انگریزی میں مطالعہ کی استعداد پیدا ہوسکے" (باقی ایندہ ص ۱۸۵ پر)

دنیا طلبی یا آج کل کی نام نہاد ترقی میں کسی درجہ میں بھی مانع و مخل نہیں ہو سکتی، راقم احقر تجربہ کی بنا پر
ں کرتا ہے، کہ ساری عمر میں صرف دو تین مہینے وہ بھی پورا وقت نہیں، صرف دو تین گھنٹے روزانہ اگر جی لگا کر دید
ن، تو اس فرض عین کی ادائی کے لئے بالکل کافی ہیں، یعنی دنیاوی علوم کے طالب اور ترقی کے خواہان
اپنی دس بارہ سال کی طالب علمانہ زندگی میں صرف ایک سال کی بڑی تعطیل کے صرف دو تین گھنٹے
زانہ حضرت کی تجویز کے مطابق حضرت ہی کی کتابوں کے ذریعہ علم دین کی طلب میں صرف کر دیں، تو
ل کے نام نہاد سند سے بھاگنے والے مولویوں کے مقابلہ میں نہ صرف دین کے مسائل و معلومات کی حد
ب بلکہ انشاء اللہ فہم دین اور تعلق مع اللہ میں بھی کمتر نہیں، برتر ہی رہیں گے،

ابھی عین اس تحریر کے دوران میں ایک تازہ تجربہ ہوا ہے، کہ ایک طالب صادق تین مہینے کی
ت سے احقر کے پاس آکر مقیم ہو گئے ہیں، صبح دو گھنٹے کے لئے مدرسہ فرقانیہ کلام مجید کی تصحیح کے لئے جاتے
ن، تیسرے پہر ایک بچے کو پڑھاتے ہیں، باقی وقت احقر کی مجوزہ ترتیب کے مطابق حضرت کی کتابوں
مطالعہ کرتے ہیں، اور عصر و مغرب کے مابین راقم کے پاس بیٹھکر اس مطالعہ میں اگر کچھ شبہات رہ جاتے
ن، ان کو صاف کر لیتے ہیں، اسی سلسلے میں کچھ گفتگو ہو جاتی ہے، ابھی ایک ہی مہینہ ہوا ہے، کہ ایک طرف

بقیہ حاشیہ ص ۱۸۴) مزید برآں ایک خاص دور کے بعض حالات و باقیات کی بنا پر کچھ ایسی سمیت اس درسگاہ
ن سرایت کر گئی ہے، کہ اب تک خود اس کے طلبہ کے اعمال ہی میں نہیں عقائد میں بھی ہستی باقی ہے: تو دوسرو
دیہ کیا جیتی بخشیں گے، نفس دینی احکام کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ حضرت مجدد نے جس مقدار کو عامی کے لئے داخل
ٹھرایا ہے اس کی توقع وہاں کے عالم سے بھی بمشکل کیجا سکتی ہے، بلکہ فقہی مسائل کا تو یک گونہ قلب میں احتقار و استخفاف ہوتا ہے
مستثنیات کا اعتبار نہیں ورنہ عام حالت یہی ہے، جو وہاں کے اساتذہ کی شہادت اور خود اپنے ذاتی تجربہ
کی بنا پر ذاتی طور سے بھی سالہا سال تک عرض کیا گیا، اور یہاں حسب موقع اس لئے عرض کیا کہ کاش ان باتوں
اصلاح کی طرف اب بھی کسی کو توجہ ہو سکتی، تو حضرت مجدد کی تعلیمی تجدید و اصلاح کا ایک بڑا کام ہو جاتا،

بحمد اللہ پارۂ عمّ نصف سے زائد صحت مخارج کے ساتھ حفظ کر چکے ہین، جس سے قرأت نماز بقدر واجب صحیح ہو گئی، جو ہمارے سندی مولویون مین بھی خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہ کتنون کی ہوتی ہے، دوسری طرف تعلیم الدین بہشتی زیور، اور بہشتی گوہر کے ضروری حصے ذاتی مطالعہ اور احقر سے رفع شبہات کے ساتھ قریب ختم ہین، کچھ ملفوظات بھی روزانہ پڑھ لینے کی ہدایت ہے، اس کے بعد چالیس مواعظ، یہ پورا نصاب انشاء اللہ تین مہینے کے اندر ہی پورا ہو جائے گا، اسی دوران مین ضروری مسائل و معلومات کے ساتھ حضرت کی کتابون خصوصًا ملفوظات کی برکت سے دماغ دین کی فہم اور دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا بھی کچھ نہ کچھ لذت آشنا ہو چلا ہے،

اب انگریزی اسکولون، کالجون مین پڑھنے پڑھانیوالے جو طلبہ و اساتذہ اپنی صرف ایک سال کی ایک تعطیل اور عام مسلمان ساری زندگی مین دو تین مہینے بھی ایک ساتھ یا حسب فرصت متفرق اوقات مین آخرت کی ابدی زندگی و فلاح کے لئے نہین دے سکتے، وہ اپنے ہی گریبان مین سر ڈال کر سوچین، کہ ایسی صورت مین کس مُنہ سے اپنے کو مسلمان کہنے، اور خدا و رسول کو سچا جاننے، اور ان پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہین، یہ تو ایک ضروری جملہ معترضہ تھا،

اصل مطلب یہ ہو کہ جو علم دین فرض عین یا ہر شخص کے لئے فردًا فردًا واجب و لازم ہے، اس کے معنی یہ بالکل نہین کہ ہر شخص کا پورا اور اصطلاحی عالم ہونا لازم ہے، کہ دنیوی یا معاشی مشاغل مین خلل کا عذر و اندیشہ ہو، البتہ سارے مسلمانون کے ذمے،

"یہ انتظام ضروری ہے کہ ایک معتدبہ جماعت ایسی بھی ہو، جو ہر طرح علوم دینیہ مین کامل و محقق ہو اور عمر کا بڑا حصہ ان علوم کی تحصیل مین اور ساری عمر اُن کی خدمت و اشاعت مین صرف کرین جس کے سوا ان کا کوئی کام نہ ہو، قرآن مجید اس آیت مین اسی جماعت کا ذکر ہے، ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون

بالمعروف وینھون عن المنکر، اور حدیثوں مین اصحاب صفہ کی یہی مثال ہے"

باقی عام مسلمان اسی جماعت سے تقریراً و تحریراً اپنی دینی ضرورتوں کو رفع کیا کرین

جو پڑھنے کے قابل ہین، جیسے بچے یا جو قدرے معاش سے فارغ ہین، اُن کے لئے بہتر یہ

ہے کہ اس جماعت سے سبقاً سبقاً کچھ رسائل عقائد و مسائل کے پڑھ لین، پھر پیش

آنے والے واقعات کے متعلق وقتاً فوقتاً اس جماعت سے پوچھتے رہین، اس طرح تھوڑے

زمانہ مین بڑا ذخیرہ معلومات کا جمع ہو جاتا ہے، اور جو کسی سبب سے اس طرح نہین پڑھ سکتے

وہ کم از کم ہفتہ مین ایک روز گھنٹہ دو گھنٹے نکال کر ایک معین وقت پر کسی سمجھ دار ذی علم سے

درخواست کرین، کہ ایسے رسائل پڑھ کر سُنا اور سمجھا دیا کرے، اور ضرورت کے وقت پوچھتے

رہنا، یہ تمام عوام، بلکہ علماء کے لئے بھی (جو باتین ان کو معلوم نہ ہو) واجب ہے، پھر ان طریقون

سے زبانی یا کتاب کے ذریعہ جب خود احکام پر مطلع ہو رہین، تو اپنے اپنے گھر کی مستورات کو

پڑھاتے یا سُناتے رہین"

دینی علم کی مقدار واجب کے لئے پڑھا لکھا ہونا بھی ضروری نہین، سماعت وصحبت سے یعنی کتابین

سُن سُنا کر یا اہلِ علم کی صحبت و دینی تربیت سے بآسانی اس مقدار واجب کو حاصل کیا جا سکتا ہے،

...کی مرض شناسی | اصلی سوال اس مذکورہ بالا جماعت کے انتظام معاش کا ہے جن کے لئے

علوم دینیہ مین کامل و محقق ہونا ضروری تجویز فرمایا گیا ہے، اور اس لئے عمر کا بڑا حصہ ان علوم کی تحصیل

مین اور پھر تمام عمر ان کی اشاعت و خدمتِ دین مین صرف کرنا" ضروری ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح

ساری عمر خدمتِ دین کی راہ مین نذر کر دینے کے بعد اُن کو کسبِ معاش کا موقع کیسے مل سکتا ہے، اس

مشکل کا قدرتی و صحیح اور ساتھ ہی سب سے مفید و آسان حل تو دہی ہے، جس کی طرف ترغیباً و ترہیباً ہر طرح

حضرت علیہ الرحمہ نے کثرت سے جابجا اپنی کتابون اور مواعظ وغیرہ سب میں متوجہ فرمایا ہے کہ امراء کا

طبقہ جو بقدر کفایت معاش کی فکر سے آزاد ہے، اس کے ذمہ زیادہ حق تھا، کہ اپنی اولاد کو اس خدمت کے لئے وقف کرتے، پھر اولاد مین بھی جو ذہین وفطین وسلیم وفہیم ہو نہ کہ جو سب سے کودن ہو، (ض حقوق العلم) اور جو ہزارون روپیے ہندوستان سے لے کر ولایت تک ان کی دنیوی تعلیم پر صرف کرتے ہین، اسی کی آمدنی (کسی جائداد یا کاروبار مین لگاکر) ان کی رئیسانہ وامیرانہ نہ سہی تو متوسط درجہ کی ساری ضرورتون کو کافی ہوسکتی تھی، پھر چونکہ یہ اولاد آسودہ حال گھرانون کی ہوتی، اس لئے قدرۃً ان مین بالعموم وہ دناءت وتنگ نظری وغیرہ بھی نہ ہوتی، جو غریبون مین متوارث ہوتی ہے، اور جس کا راسخ اثر علوم دینیہ کی تعلیم سے بھی دور نہین ہوتا، مگر ظلم یہ ہے کہ امراء خود اپنی اس کوتاہی پہ تو نادم نہین ہوتے، کہ جو خدمت دراصل اُن کے کرنے کی تھی، وہ بیچارے غریب غربا کرتے ہین، بلکہ اگر ان غریب گھرانون کے علماء مین کچھ موروثی اثر سے اخلاقی خرابیان رہجاتی ہین، تو ان کی بنا پر الٹے علماء کی ساری جماعت پر لعن وطعن کرتے ہین، یہی نہین، بلکہ ان خرابیون کو نہایت جسارت کے ساتھ نفس دینی وعربی تعلیم کا نتیجہ قرار دیتے ہین، حالانکہ واقعہ بقول حضرت علیہ الرحمہ کے یہ ہے کہ :-

"اُن غرباء کو انگریزی تعلیم دیجاتی تو اس سے بھی بدتر حال ہوتا، اور امراء و شرفاء کے بچون کو اگر دینی تعلیم کے لئے وقف کیا جاتا، تو ان کے اخلاق وعادات اس سے ہزارون درجہ بہتر ہوتے، جو انگریزی پڑھ کر ہوتے ہین"

بات یہ ہے کہ ایک تو امراء پر امارت کے باوجود بالعموم دنیا طلبی کا غلبہ غرباء سے بھی زائد ہے، دوسرے علم دین کی جو وقعت قلب مین ہوتی چاہئے وہ نہین، اس لئے وہ امراء ایک :-

"جو دینی مکتب ومدارس قائم کرتے ہین، اسلامی وقومی خیرخواہی کا دعوی بھی کرتے ہین، مگر اس کام کے لئے اپنی اولاد کو کبھی نہین تجویز کرتے، اولاد کے لئے ڈپٹی کلکٹری منصفی، سب ججی، وبیرسٹری ہی تجویز ہوتی ہے، اور مولویت کے لئے جس کو بزعم خود ذلیل

کام سمجھتے ہین، ذلیل لوگون کو منتخب کیا جاتا ہے، غور کا مقام ہے کہ جس کام کے لئے غریب لوگ منتخب کئے جاتے ہین، اس کی وقعت اُن کے قلب مین کیا ہوگی، اگر یہ کام ضروری و باوقعت ہے، اور اس کا اہتمام کرنا قومی و اسلامی خیرخواہی ہے، تو اس شرف کے لئے خود اپنی اولاد کو کیون نہین تجویز نہین فرمایا جاتا،

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جو کام معزز طبقہ کے ہاتھون مین ہوتا ہے وہ عام نظرون مین بھی معزز و ضروری سمجھا جاتا ہے، لہذا امرا کے ذمہ بہ نسبت غربا کے زیادہ حق ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اس خدمت کے لئے وقف کر دین، پھر اولاد مین بھی جو ذہین و فطین و سلیم و فہیم ہو نہ کہ جو سب سے کودن ہو" (ص ۸۰)

علماء و مشایخ کی مہلک خود فراموشی امرا تو خیر امرا ہی ہین، اب تو بڑے بڑے خاندانی علما و مشائخ تک جو نسلاً بعد نسل سے علوم دین کے حامل و خادم چلے آرہے ہین، وہ بھی انگریزی دانوان کے مقابلے مین خود اپنے اور اپنے دینی علوم کو عملاً ذلیل و حقیر خیال کرتے، اور اولاد کو دھڑا دھڑا اسکولون کالجون مین پہنچاتے چلے جارہے ہین، اور جب امرا و علماء کا یہ حال ہے تو عوام تو بالعموم ان کے پیچھے چلتے ہی ہین، ان عوام مین بھی خال ہی خال کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہوگا، جو دین، اور علوم دین کو ضروری و باوقعت جان کر اپنی اولاد کو اس طرف جانے دیتا ہو، ورنہ خود تکلیف اٹھا کر قرض کرکے بھیک مانگ کے یا اولاد ہی سے ٹیوشن کرا کے زیادہ تر کوشش یہی ہوتی ہے، کہ اگر بی اے ایم اے نہین تو میٹرکیولیٹ ہی ہو جائے اس لئے عوام یا متوسط طبقہ کی جو اولاد عربی مدرسون مین نظر آتی ہے، وہ زیادہ تر کسی مجبوری بیچارگی ہی سے آجاتی ہے،

غیر مستطیع علما کے مسئلہ معاش کا قرآنی حل پھر بھی عربی و دینی درسگاہون کی جو کچھ آبادی ہے، وہ بہت کچھ غریب عوام و متوسط طبقہ ہی کے دم سے ہے، اس لئے بڑا سوال ان کی فکر معاش

کاہو سکتا ہے کہ مولوی بن کر اور ساری زندگی علوم دین کی تحصیل و تبلیغ مین لگا کر آخر کھائین کہان سے اس کا مفصل جواب حضرت جامع المجددین نے قرآن کی ایک آیت سے دیا ہے، جو لفظاً بلفظ نقل کرنے کے لائق ہے، آیت یہ ہے:۔

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضرباً فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیماھم لا یسئلون الناس الحافاً وما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم۔"

"جس سے ایک قاعدہ مفہوم ہوتا ہے جس سے فقہانے بہت سے فروع متفرع کئے ہین، وہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص کسی کی منفعت کے لئے محبوس ہو تو اس کا نفقہ اسی پر واجب ہے جیسے زوجہ کا نفقہ زوج پر (یہ تو انفرادی وجوب کی صورت ہے، دوسری صورت جماعتی وجوب کی ہے) جیسے قاضی و والی کا نفقہ بیت المال پر جس کا حاصل تمام مسلمانون پر وجوب ہے (کیونکہ بیت المال کا سرمایہ تمام مسلمانون کو ہوتا ہے) لہذا جب یہ جماعت خدمتِ دین کے لئے (جو مدلول ہے فی سبیل اللہ کا) محبوس و وقف ہے (جو مدلول ہے احصروا کا) تو ان کے حوائج کی بقدر کفایت تکمیل (جو مدلول ہے، فقراء کا) مسلمانون کے ذمہ واجب ہے، (جو مدلول ہے لام استحقاق کا) تو اب اس جماعت کے مصارف کی کفالت جمہور مسلمانون کا کام ہے، خواہ تعین کے ساتھ، جیسے مدرسین و واعظین کی تنخواہ، خواہ بلا تعین جیسے متوکلین کی خدمت بس یہ شبہہ منقطع ہو گیا، کہ مولویون کی جماعت کھاوے کہاں سے،

"اس آیت سے اور بھی چند فوائد نکلتے ہین، جن کو گو اس بحث مین دخل نہین، مگر تعلق ہے اس لئے ذکر کئے جاتے ہین :۔

ایک یہ کہ ایسی جماعت کو تحصیل معاش مین بالکل مشغول نہ ہونا چاہئے، جیسا کہ لا یستطیعون

ضربًا فی الارض اسی پر دلالت کرتا ہے، اور اس سے وہ الزام بھی جاتا رہا، جو عوام الناس علماء پر طلبِ معاش میں اپاہج ہونے کا لگاتے ہیں، کیونکہ اس معنی میں ان کا اپاہج ہونا ضروری ہے، اور راز یہ ہے کہ ایک شخص سے دو کام پوری طرح ہوا نہیں کرتے، خصوص جب ایک کام ایسا ہو کہ ہر وقت اس میں مشغول رہنے کی ضرورت ہو، خواہ ہاتھ کو خواہ زبان کو، خواہ دل کو خدمتِ دین ایسا ہی کام ہے، اور علوم دینیہ کی تدریس یہ ذرائعِ معاش میں داخل نہیں بلکہ اس کی تنخواہ بوجہ خدمت دین میں محبوس ہونے کے ہے، اور تنخواہ کی تعیین اس مصلحت سے ہوتی ہے کہ نزاع نہ ہو،

"ایک یہ کہ ایسے لوگوں کو کسی دنیا دار کے سامنے اپنی حاجت پیش نہ کرنا چاہئے، بلکہ اغنیا کی طرح مستغنی رہیں، جیسے یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف اس پر دال ہے،"

واقعی ان آیات میں دین اور خادمانِ دین دونوں کی خدمت کا ایسا سہل و شایستہ اور اور تمام مفاسد سے پاک صاف انتظام اور ساری مشکلات کا حل اور سارے شبہات کا جواب موجود ہے، کہ اگر دنیا کے معمولی معاملات کے برابر بھی ہمت و اہتمام سے کام لیا جائے تو اپنے پرائے کوئی دین کی تعلیم و تبلیغ سے محروم نہیں رہ سکتے، حالانکہ دین کا حق اور عاقبت اندیشی کا تقاضا تو یہ تھا، کہ اس کے چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے بھی دنیا کے بڑے سے بڑے کام کے مقابلے میں بدرجہا زائد ہمت و اہتمام سے کام لیا جاتا، لیکن جب غفلت اور ناعاقبت اندیشی کا یہ حال ہو کہ دین کے بڑے سے بڑے معاملے کی دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے کی برابر بھی فکر نہ ہو، تو مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے، کہ اُن کی یہی غفلت خسرانِ آخرت ہی نہیں، خسرانِ دنیا کا بھی سبب ہے، اس لئے کہ اُن کی فلاحِ دنیا کا دامن فلاحِ دین کے ساتھ بندھا ہوا ہے، اور اُن کو اپنی دنیا کا قیاس غیروں کی دنیا پر ہرگز نہ کرنا چاہئے،

(باقی)

اسلام کا معاشیاتی نظام

از

جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی

(۲)

اسلام کے معاشی نظام کی نظریاتی خصوصیات

کسی نظریۂ زندگی کی خوبی اور برتری کا معیار یہ ہے کہ وہ کہان تک انسانی ضرورتون کی تکمیل کرتا ہے، اور مختلف انسانی طبقات مین اس کا ردِ عمل کیا ہے، دنیا کے مختلف نظریہ ہاے زندگی کے حسن و قبح کو اسی معیار پر پرکھا جا سکتا ہے،

یون تو ہر نظام کے موسسین کا دعوی ہے کہ ان کا بنایا ہوا نظام انسانون کی تمام مجلسی، معاشی اور سیاسی ضرورتون کا کفیل ہے، مگر یہ ضروری نہین کہ ہر دعوی واقعیت اور حقیقت پر مبنی ہو، بلکہ جہان تک تجربہ و مشاہدہ کا تعلق ہے، ہر انسانی نظام کی تہ مین خود غرضی، تفریق و امتیاز اور ظالمانہ تفوق و برتری کے عوامل کارفرما نظر آتے ہین، یہی وجہ ہے کہ آج حریت و مساوات کے بلند بانگ دعوون کے باوجود انسان، انسان ہی کو نگل رہا ہے، اور اپنے ہی ابناء نوع کے گوشت پوست اور خون مین سب سے زیادہ لذت محسوس کرتا ہے، اگر حریت و مساوات یہی ہے تو پھر درندگی، سفاکی، وحشت و بربریت، اور غصبِ حقوقِ انسانی کس چیز کا نام ہے،

حقیقت یہ ہے کہ انسانی طبائع کسی حال مین بھی منفعتِ ذاتی اور غرض مندی کے جذبات سے مُبرا نہین ہو سکتین، اپنی ذات انسان کو ہر چیز سے عزیز تر ہے، اس کے بعد درجہ بدرجہ نسل خاندان اور وطن

یرہ کے تعلقات عزیز ہین اس لئے انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے مفاد کو دوسرون کے مفاد پر مقدم
ال کرتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس امتیازی طرز عمل کو خوبصورت اور دلکش پیرایہ میں حق بجانب قرار
ے سکتا ہے، اور اس کے جواز کے لئے دلائل و براہین کے انبار لگا سکتا ہے، مگر قلبِ انسانی کی بڑھتی
دئی خلش شاہد ہے کہ ع

خود غلط بود آنچہ یا پنداشتیم

انسانون کا بنایا ہوا کوئی نظام طبقاتی اور نسلی احساسات سے مبرا نہین ہو سکتا، اس لئے وہ
الم انسانیت مین حقیقی مساوات قائم کرنے اور حیاتِ انسانی کی پیچ در پیچ گتھیون کو حل کرنے سے قاصر ہے
اس کے مقابلہ مین اسلامی نظریۂ اجتماع خالق کون و مکان کا بنایا ہوا ہے، اس لئے اس مین کسی طبقہ یا
گروہ کی رعایت کا سوال ہی پیدا نہین ہوتا، اور ہر طبقہ اور ہر نسل کے انسانون کے لئے اس کی افادیت
یکسان ہے کیونکہ اسلام مین انسانی وحدت کی بنا وحدتِ فکر پر ہے، اور اس ہمہ گیر قومیت (Internationalism) مین علائق نسل و وطن اور عصبیاتی جذبات و احساسات کو قطعاً کوئی دخل نہین
اس بنا پر یہ دعوی کہ ہر سلیم الفطرت انسان کے لئے قابلِ قبول ہوگا کہ اسلام کا سماجی نظام ہی نوعِ انسانی
کو حقیقی معنی مین حریتِ اجتماع، مجلسی اور معاشی مساوات سے بہرہ ور کر سکتا ہے،

اسلام مین انسان کے معاشی حقوق کا احترام | اسلام کا نظریۂ معیشت و تمدن حقوقِ انسانی کی جیسی نگہداشت کرتا ہے اس کی مثال
دنیا کا اور کوئی نظام نہین پیش کر سکتا یون تو ہر سیاسی اور معاشی نظام حریت و مساوات کا دعویدار ہے مگر اس حقیقت سے
کون انکار کر سکتا ہے کہ آج تک کوئی انسانی نظام انسانیت کے دکھ کا علاج نہین کر سکا، اور اس کا مرض
برابر بڑھتا جاتا ہے، اور حریت و مساوات کے بڑے بڑے دعوؤن کے علی الرغم آج انسانیت پہلے سے کہین زیادہ مضطرب نظر
آتی ہے، دنیا کے کروڑہا انسان انتہائی محنت و مشقت اٹھانے کے باوجود نانِ شبینہ کے محتاج ہین اس کی
وجہ صرف یہ ہے کہ موجودہ تمام نظریہ ہائے اجتماع مین ملوکیت و استبداد کی روح کارفرما ہے؛ دولت کا طغیان

مین اب بھی حرص دولت اور سرمایہ پرستی کے جراثیم پرورش پا رہے ہین اور پس ماندہ طبقے اُن کے ہاتھون زندگی اور موت کی کشمکش مین مبتلا ہین،

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است ۔۔۔ نظامش خام و کارش ناتمام است
غلام فقر آن گیتی پناہم !!! ۔۔۔ کہ در دینش ملوکیت حرام است (اقبالؒ)

مگر اسلام کے نظام معیشت و اجتماع کی بنیاد انسانیت مطلقہ کی فلاح و نجات ہے وہ ایک طرف اعلیٰ طبقون کی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور ان کے سفاکانہ طریقون کی نہایت معتدل اور موثر طریقہ سے اصلاح کرتا ہے، اور دوسری طرف طبقہ غربا کو ذلت و محکومیت کی پستی سے اٹھا کر عزت و شرف کی بلندی تک لیجاتا ہے،

عرب مین عام عربون کا ایک ایسا گروہ موجود تھا جس کو اشراف عرب نے انسانیت کے بنیادی حقوق سے بھی محروم کر رکھا تھا، اور ان سے اسی طرح کا سلوک کیا جاتا تھا، جو آج تک ہندوستان کی اچھوت اقوام سے ہوتا ہے، یہ وہ گروہ تھا جسے غلام کے حقارت آمیز نام سے پکارا جاتا تھا، مگر دنیا جانتی ہے، کہ اسلام ہی نے سب سے پہلے اس انسانی تفریق و امتیاز کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور اعلان کر دیا، کہ نسلی شرافت اور قبیلوی وجاہت کوئی چیز نہین، انسانون مین اگر کوئی چیز وجہ امتیاز بن سکتی ہے، تو وہ تقویٰ اور طہارت اور کردار کی بلندی ہے،

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثیٰ وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (حجرات)	اے انسانون ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا، اور تم کو مختلف گروہون اور قبیلون مین اس لئے تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے سے پہچانے جاسکو ورنہ اللہ کے نزدیک معزز ترین اور شریف ترین وہ انسان جو تم مین سب سے زیادہ صاحب تقویٰ ہے،

آقا اور غلام مین مجلسی اور معاشی مساوات پیدا کر دی گئی اور واضح الفاظ مین حکم دیا گیا کہ یہ تمھارے غلام تمھارے دینی اور اسلامی بھائی ہین، اُن سے وہی سلوک کرو جو اپنے سگے بھائیون سے کرتے ہو،

عن المعرورؓ قال لقیت اباذرؓ بالربذة وعلیه حلة وعلی غلامه حلة فسألته عن ذلك فقال انی ساببت رجلا فعیرته بامه فقال لی النبی صلی الله علیه وسلم یا اباذر اعیرته بامه انك امرؤ فیك جاهلیة اخوانكم خولكم جعلهم الله تحت ایدیكم فمن كان اخوه تحت یده فلیطعمه مما یاكل ولیلبسه مما یلبس، (بخاری)

معرور کہتے ہین کہ مین ربذہ کے مقام پر ابوذرؓ سے ملا، وہ ایک حلہ پہنے ہوئے تھے، اور اُن کے غلام نے بھی اسی طرح کا حلہ پہن رکھا تھا، مین نے اُن سے اس بارہ مین سوال کیا، تو انھون نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ مین نے ایک کو گالی دی، اور اس کو اس کی ماں کا طعنہ دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، اے ابوذر تم نے اس کو اس کی ماں کا طعنہ دیا ہے؟ تم مین اب تک جاہلیت کی خو باقی ہے، یہ لوگ تمھارے خدمتگذار بھائی ہین، جن کو اللہ نے تمھارے قبضہ مین دیا ہے، جس شخص کے ماتحت اس کا بھائی ہو، اوس کو وہی کھانا کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی لباس پہنائے جو خود پہنتا ہے۔

یہ تو غلامون کی نسبت فرمایا گیا ہے، سرمایہ دار طبقون کے غرور وپندار کو مٹانے اور عام غربا کو ذلت وپستی سے اٹھا کر عزت وشرف کی بلندی پر لیجانے کے لئے یہ حیات بخش پیغام دیا :-

هل تنصرون وترزقون الا — اے طبقۂ امراء غریبون کے ذریعہ تمھین

بضعفاء کم، (بخاری) ہر قسم کی مدد اور خوراک ملتی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختصر مگر جامع فقرہ میں امیروں کے غرور و تمرّد کی حقیقت ظاہر فرمادی ہے، یعنی تم کیا ہو؟ تم تو مخلوقِ خدا کے لئے بوجھ بنے ہوئے ہو، تمھیں کمانا اور محنت کرنا نہیں آتا، البتہ کھانا آتا ہے، سرمایہ و دولت جو تمھیں آبا و اجداد سے وراثت میں ملی ہے، یا تم نے خود مکر و فریب اکٹھی کرلی ہے، اس کے ذریعہ تم غریبوں پر حکومت کرتے ہو، اور گوشت و پوست کے بیکار مجسمے بنے ہو، تمھارا ہر سانس غریبوں کی جانفشانیوں کا رہین منت ہے، اس لئے تمھیں اُن کے حقوق کا پوری طرح احترام کرنا چاہئے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کی عملی کوششوں سے ہر طرح کے طبقاتی امتیازات ختم ہوگئے، اور انسانوں میں حقیقی مساوات پیدا ہوگئی،

سرمایہ پرستی کی مذمت اسلام نے دولت جمع کرکے اسے روک رکھنے کی شدید ممانعت کی ہے، اس قسم کی جمع دولت ہی تمام مفاسد اجتماعیہ کا سرچشمہ ہے، اور حرصِ دولت ہی سے خودغرضی اور حبِ نفس کا مکروہ جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو انسانی سوسائٹی کے لئے سمِ قاتل ہے،

الذین یکنزون الذھب والفضۃ	جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور
ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم	ان کو اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے
بعذاب الیمہ	اے نبی! آپ اُن کو دردناک عذاب کی
(توبہ)	خبر دیں،

مسلمان کا مقصدِ حیات اتنا بلند ہے کہ دولت و زر اور جسمانی راحتوں کے ساز و سامان اس کی نظر میں ذرہ برابر بھی وقعت نہیں رکھتے، وہ مال و دولت فراہم کرتا ہے، مگر اس لئے نہیں کہ اس کے ذریعہ غریبوں پر جابرانہ تسلط قائم رکھے یا خود دولت کی پرستش کرے، اور دوسروں سے اپنی پرستش کرائے، کہ تری المال عند الباخلین معبدًا،

اس باب مین اسلام کا نقطۂ نظر بالکل الگ ہے، وہ حصولِ دولت کی اجازت اس لئے دیتا ہو کہ اس کے ذریعہ فرائضِ ملی اور احکامِ مذہبی انجام پائین، غربا اور اہلِ حاجت کی حاجت برآری ہو، اُسی کے ساتھ صاحبِ دولت اپنی واجبی ضروریات بھی پوری کرے اور اپنی خودداری کو برقرار رکھ سکے، مگر اس کا دل حبِ دولت کی آلائشون سے پاک ہو، اسلام ہر ایسی محبت کو انسان کے لئے مہلک تصور کرتا ہے،

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا،

لوگون کو عورتون بیٹون، سونے اور چاندی کے ڈھیرون نشان زدہ گھوڑون، چارپایون اور کھیتی کی محبت مین فریفتہ کیا گیا ہے، لیکن یہ صرف حیاتِ دنیوی کی متاع ہے،

خداے قدوس نے دنیاوی علائق سے قلبِ مومن کو آزاد کر دیا ہے، اور اسے صرف خدا اور رسول کی محبت کا گہوارہ بنایا ہے، اس لئے وہ حقیقی محبت صرف اپنے معبود سے کرتا ہے والدین بیٹون بھائیون، بیویون، اموال واملاک اور سر بفلک عمارات کی محبت قلبِ مومن مین گھر نہین کر سکتی،

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ، (توبہ)

اے نبی آپ مسلمانون سے کہہ دین کہ اگر تمھارے والدین بیٹے بھائی بیویان رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے حاصل کئے، اور وہ تجارت جس کے خسارہ کا تمھین اندیشہ رہتا ہے، اگر خدا رسول اور جہاد سے زیادہ محبوب ہین تو تمھین عذابِ الٰہی کا انتظار کرنا چاہئے،

اسلام میں دولت فی ذاتہ بُری چیز نہیں، اور نہ اس کے حصول کی کوشش مذموم ہے، بلکہ جائز حدود کے اندر اس کی طلب و جستجو اور اس کی خاطر سعی و عمل کو مستحسن قرار دیا گیا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں دولت و مال کو خیر اور فضل کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے،

مَا اَنفَقْتُمْ مِنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالاَقْرَبِیْن، (بقرہ)	تم اپنی دولت سے جو خرچ کرنا چاہتے ہو تو اس کا بہترین مصرف والدین اور اقارب ہیں
وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا، (جمعہ)	تم اللہ کے فضل (مال) کی طلب میں نکل کھڑے ہو اور اللہ کا ذکر زیادہ کرو،

احادیث نبوی میں طلب حلال کو نہ صرف مستحسن بلکہ اُخروی درجات کا بھی ذریعہ قرار دیا گیا ہے،

الطیب الکسب عمل الرجل بیدہ وکل بیع مبرور (احمد فی مسندہ والطبرانی الکبیر والحاکم فی المستدرک)	پاکیزہ ترین کسب، انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرکے کمانا اور ہر ایسی تجارت ہے، جو دیانت سے انجام پا
ان اللّٰہ یحب العبد المحترف (الطبرانی فی الکبیر والبیہقی فی شعب الایمان)	اللہ تعالیٰ محنت و مشقت کرنے والے بندہ کو پسند کرتا ہے،
من طلب الدنیا حلالاً استعفافاً عن المسئلۃ وسعیاً علیٰ اھلہٖ وتعطفاً علیٰ جارہٖ لقی اللّٰہ یوم القیامۃ ووجہہٖ مثل قمر البدر (ابو نعیم فی الحلیہ)	جو شخص سوال سے بچنے اہل و عیال کی پرورش اور پڑوسی پر لطف و کرم کرنے کی غرض سے رزق حلال کے لئے سعی کرتا ہے، وہ قیامت کو اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں

([illegible])

اس کی وجہ یہ ہے کہ حصولِ دولت مین مسلم اور غیر مسلم کے نقطۂ نظر مین زمین وآسمان کا فرق ہے، غیر مسلم صرف مادی ضرورتون کی تکمیل اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لئے مال حاصل کرتا ہے، اور اس کے سوا کوئی دوسرا تصور اُس کے ذہن مین نہین ہوتا، مگر مسلمان کی زندگی کا ہر عمل ایک بلند نصب العین سے وابستہ ہے اس لئے بال بچون کے لئے بھی اس کی محنت جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ رکھتی ہے،

التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء یوم القیامۃ (ابن ماجہ والحاکم)	سچے اور امین تاجرون کا حشر قیامت مین نبیون، صدیقون اور شہداء کے ساتھ ہوگا،

ترکِ دنیا اور ترک وسائل کے راہبانہ تصور کو اسلام سے کوئی نسبت نہین، اس نے جدوعمل اور حرکت وسعی کو انسان کے لئے لازمی قرار دیا ہے، اور جمود وسکون اسلام مین بدترین جرم ہے، مگر اس کے باوجود مسلمان خدا اور اس کی محبت کے سوا کسی دوسری چیز کی محبت کو اپنے دل مین جگہ نہیں دیسکتا، اور اس کی زندگی کی ہر حرکت کا اصلی مرکز رضائے الٰہی ہے،

ان اصول کا حاصل یہ نکلا کہ اسلام کسی مسلمان فرد یا جماعت کو حصول دولت کو اصل مقصد بنانے کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے خزانے تو دولت وزر سے معمور ہون اور دنیا کی کثیر آبادی غربت وافلاس مین بسر کرے، یا آمدنی کے تمام وسائل پر چند افراد کا تسلط ہو، اور دوسرے لوگ اُن کی نازبرداریون کے باوجود سوکھی روٹی کو بھی ترسین، اسی کو موجودہ اصطلاح مین سرمایہ داری (Capitalism) اور اسلام مین اکتناز سے تعبیر کیا گیا ہے، اسلام نے اکتناز واحتکار کی سختی سے مخالفت کی ہے، کہ اس سے دولت کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے، دراصل دولت کا مفہوم ہی اس امر کا متقاضی ہے، کہ وہ کسی ایک جماعت مین محدود نہ رہے، بلکہ تمام انسانون مین پھیلتی اور بٹتی رہے، کَیْلَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ تاکہ دولت چند سرمایہ دارون ہی مین گردش نہ رہے،

اکتناز و احتکار | اکتناز کے معنی ہیں سونے اور چاندی کے خزانے جمع کرنا، مگر اس طرح کہ اُن سے حقوق خداوندی اور حقوق ملت ادا نہ کئے جائیں، اس تعریف کی بنا پر اکتناز ایسی صورت میں ہوگا جبکہ کوئی شخص جمع شدہ دولت سے مذکورہ حقوق ادا نہ کرے لیکن جو شخص اس کو ادا کرتا ہے، اس کی دولت پر کنز کا اطلاق نہ ہوگا، اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام میں نفس جمع دولت بری چیز نہیں، بلکہ اسے اس طرح روک رکھنا کہ اس کے حقوق ادا نہ کئے جائیں برا ہے

عن ابن عمر کل مالٍ اُدیت زکوتہ فلیس بکنز وان کان مدفونا تحت الارض وکل مالٍ لا تودی زکوتہ فھو کنز وان کان ظاھراً (اخرجہ العقیلی)	جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی جائے، وہ کنز نہیں ہوتا، اگرچہ وہ زمین میں دفن کیا جائے، اور جس مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ کنز ہے اگرچہ وہ سامنے پڑا ہو،

اکتناز کی حرمت قرآنِ کریم کی نص قطعی سے ثابت ہے،

الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم (توبہ)	جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں، اور اُن کو اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے، اُن کو اے نبی دردناک عذاب کی خبر کردو،

احتکار کے معنی ہیں اشیاے خورد و نوش کو نرخ کی گرانی کے انتظار میں روک رکھنا تاکہ اُن سے زیادہ منافع حاصل کیا جاسکے لیکن احتکار کو اگر وسیع مفہوم میں لیا جائے تو اس میں وہ مال و دولت بھی شامل ہوسکتی ہے جس کو اس غرض سے روک کے رکھا جائے نہ اس سے غلہ کی بڑی مقدار خرید کر کے آگے گران نرخ پر فروخت کیا جائے، یا اس سے صنعتی کارخانوں اور دیگر وسائل معیشت پر تسلط حاصل

کی جائے، چنانچہ موطا امام مالک کی اس روایت میں احتکار کے یہی معنی لئے گئے ہیں،

عن مالکؒ ان عمر ابن الخطابؓ	ہمارے بازار میں کوئی احتکار نہ کرے
قال لاحکرۃ فی سوقنا لا یقصد	جن لوگوں کے قبضہ میں ضرورت سے
رجال بایدیھم فضول من	زائد روپیہ ہے، وہ کسی غلہ کو جو ہمارے
اذھاب الی رزق من ارزاق	ملک میں آئے، خرید کر اسے روک نہ دے
اللہ نزل بساحتنا فیحتکرونہ	یعنی احتکار نہ کرے،

(موطا امام مالک باب الحکرۃ والتربص)

غرض احتکار اور اکتناز اگرچہ نفس مفہوم کے اعتبار سے جدا ہیں، مگر منشار کے لحاظ سے دونوں ایک ہیں اور سرمایہ داری (کیپٹل ازم) کی اصطلاح دونوں کو شامل ہے، احتکار کی ممانعت میں متعدد احادیث و آثار وارد ہیں

عن عمرؓ الجالب مرزوق والمحتکر	غلہ کو بیچنے کی غرض سے باہر بیجانے والا
ملعونٌ۔	مرزوق ہے، اور احتکار کرنے والا
(اخرجہ ابن ماجہ)	ملعون ہے،
عن ابی ھریرۃؓ یحشر الحکارون	احتکار کرنے والوں اور انسانوں کو
وقتلۃ الانفس الی جھنم فی درجۃ	قتل کرنے والوں کو جہنم کے ایک ہی درجہ
(اخرجہ ابن عساکر و ابن عدی فی الکامل)	میں جمع کیا جائے گا،

ان حقائق سے ظاہر ہے کہ اسلام کی روح سرمایہ داری کے سخت خلاف ہے، اور اسلام کا منشا یہ ہے کہ دولت کسی ایک گروہ میں مقید ہو کر نہ رہ جائے، بلکہ عام انسانوں میں پھیلتی اور چکر کاٹتی رہے، اسلام کے تمام معاشی قوانین میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے چنانچہ قانون وراثت، زکوٰۃ، عام صدقہ و خیرات کے احکام سود، احتکار و اکتناز کی تحریم وغیرہ سب میں ایک ہی روح کارفرما ہے، اور ان قوانین پر عمل کرنے سے انسانی سوسائٹی میں بتدریج ہمہ گیر معاشی مساوات بروے کار آسکتی ہے، مگر ان میں اور سوشلزم کے اصول میں بڑا بنیادی

فرق ہے، اسلام کی راہ عمل عین انسانی فطرت پر مبنی ہے، وہ سوشلزم کی طرح انسان کو اس کے حقوقِ ملکیت سے محروم نہین کرتا، کہ اس سے انسان کے جذبۂ سعی وعمل کو سخت نقصان پہنچتا ہے جس سے انسانی سوسائٹی مین اختلال وفساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہے،

تحریم سود کی اصل وجہ سودی کاروبار موجودہ اقتصادیات کا ایک ضروری حصہ ہے، اور اس کو دولت کا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے، اور آج دنیا کے اکثر مہذب ممالک مین وسیع پیمانہ پر سودی کاروبار چل رہا ہے، اور موجودہ حکومتی نظام مین کوئی ایسا قانون نہین، جو سودی لین دین کو ممنوع قرار دیتا ہو، بلکہ ہر مہذب حکومت اس کاروبار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، اور اپنے حدود مملکت مین اس کو مختلف طریقون سے وسعت دی رہی ہے، حالانکہ سود اس ظالمانہ عہد کی یادگار ہے، جب کہ انسانیت، تہذیب وتمدن، علم وحکمت اور جمہوریت ومساوات کی روشنی سے محروم اور جہالت اور ملوکیت واستبداد تاریکی مین مبتلا تھی، لیکن حیرت ہے کہ آج بھی جب کہ دنیا کے ہر ملک مین حریت ومساوات کے روح پرور نغمے گونج رہے ہین، یہ لعنت بدستور بڑھتی ہی چلی جارہی ہے

سود کا لین دین، خود غرضی، انسان کشی، اور انتہائی سفاکی کی ایک معاملاتی شکل ہے، اس لئے اسلام نے اس کی حرمت قطعی کا حکم دیا ہے، اور اخلاق ودیانت کا اقتضا بھی یہی ہے کہ انسان دوسرے کی عسرت وتنگدستی کی حالت مین اوس کی بے لوث اور بے غرضانہ خدمت کرنے سے قاصر ہے، تو کم از کم اوس کی مجبوریون سے ناجائز فائدہ تو نہ اٹھائے، کوئی شخص بھی انتہائی مجبوری کے بغیر سودی قرض لینا پسند نہین کرتا، اس حالت مین شرافت واخلاق کا تقاضا یہی ہے، کہ ایسے شخص کے بوجھ کو ہر ممکن طریق سے ہلکا کرنے مین اوس کی امداد کی جائے، نہ کو اسے اور زیادہ زیر بار کردیا جائے

اسلام نے ایسی حالت مین قرض حسن کے ذریعہ حاجت مند کی امداد کرنے کی ہدایت کی ہے، اور قرض حسن سے مراد یہ ہے کہ قرض دینے والے کا مقصد غریب بھائی کی امداد، اور رضاے الٰہی کے سوا اور کچھ نہ ہو، پھر اس قرض کے وصول کرنے مین بھی مقروض کی سہولت کا پورا لحاظ رکھا ہے کہ اس

کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے، قرض دینے والا اگر اپنا واجب الوصول قرض معاف کر دے تو یہ اس کے اُخروی درجات کا باعث ہوگا،

وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ	اگر وہ شخص تنگدست ہو تو ایک مدت
اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ	تک اُسے مہلت دیجائے، اور بالکل
لَّكُمْ (سورۂ بقر)	معاف کر دینا تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے

امداد کی دوسری صورت یہ ہے کہ مصیبت زدہ شخص کی کوئی چیز بطور رہن رکھ کر اسے حسب ضرورت رقم دیدیجائے، یہ بھی دراصل قرض حسن ہی کا دوسرا درجہ ہے، اس میں بھی قرض دینے والے کو مرہونہ چیز سے نفع اٹھانے کی اجازت نہیں، دراصل یہ بھی سود ہی کی ایک قسم ہے،

اس بنا پر قرآن حکیم نے نہایت شدت سے حرمتِ سود کا حکم دیا ہے،

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور بقایا
ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	سودی روپیہ بالکل چھوڑ دو، اگر تم سچے
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ	مومن ہو، اور اگر تم ایسا نہیں کرنا چاہتے
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ	تو خدا اور اوس کے رسول کے ساتھ جنگ
فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ	کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ، اور اگر تم توبہ
وَلَا تُظْلَمُوْنَ،	کرتے ہو تو تمھارے واسطے تمھارا اصل
(بقرہ)	مال ہو نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے

عام لوگوں کی نظر محسوسات سے آگے حقائق تک نہیں پہنچ سکتی، اس لئے ہر چیز کے ظاہری حسن و قبح یا سود و زیان پر ہی، اُن کی نگاہیں جمی رہتی ہیں، اور وہ غیر محسوس فوائد کا اندازہ نہیں کر سکتے، اسی لئے قرآن حکیم نے سود اور زکوٰۃ کا ان الفاظ میں موازنہ کیا ہے،

مَا آتیتم من رَبا لیربوا فی اموال الناس فانہ لا یربو عند اللہ وَ ما آتیتم من زکوٰۃ تریدون وجہ اللہ فاولئک ھم المضعفون (روم)

تم جو اس غرض سے سودی قرض دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے اموال میں بڑھے، تو وہ اللہ کے نزدیک بڑھتا نہیں، اور جو تم رضائے الٰہی کے حصول کے لئے زکوٰۃ دیتے ہو تو اس سے دولت میں کئی گنا اضافہ ہوتا ہے۔

جو لوگ محض سطحی نظر سے اشیا کو دیکھتے ہیں، اُن کے نزدیک پہلی صورت میں دولت بڑھتی ہے اور دوسری میں گھٹتی ہے مگر خدا کے نزدیک ایسا نہیں، اس کی نظر ہر چیز کے انجام اور نتائج پر ہے، اسی لئے اسلام کا معاشی نظام اخلاقی اور انسانی حدود و اقدار میں جکڑا ہوا ہے، اور کوئی ایسا کاروبار جس میں سود، احتکار، رشوت یا کسی دوسرے امر ممنوع کا شائبہ بھی موجود ہو، اسلام کی نظر میں حرام ہے، مسلمانوں کو بار بار حکم دیا گیا ہے، کہ وہ معیشت کی راہ میں پورے احتیاط سے کام لیں، اور کبھی ان کی محنت کے حاصل میں حرام کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ ورنہ سب کیا کرایا اکارت ہوکر رہ جائے گا

وَلا تیمموا الخبیث منہ تنفقون (بقرہ)

ناپاک مال کے حصول کا قصد نہ کرو کہ اسے اللہ کے راستہ میں خرچ کرو،

عن عمرؓ قال ان آخر ما نزل من القرآن آیۃ الربا وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبض ولم یفسرھا لنا فدعوا الربا والریبۃ (ابن شیبہ، مسند احمد وابن ماجۃ وابن جریر وابن المنذر والبیہقی) عن الشعبی قال قال عمرؓ ترکنا

قرآن کریم کی آیات میں سب سے آخر میں آیت ربا نازل ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے، اور آپ نے ہم سے اس کی تفسیر بیان نہیں فرمائی، پس یقین ہر قسم کی ربا، اور اس کے شبہ سے بچنا چاہیے حضرت عمرؓ نے فرمایا ہم نے ربا کے ڈر سے

دسعتہ اعشار الحلال مخافتہ الربا[1] حلال کے نو حصے بھی چھوڑ دئے ہین،

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا معاشی نظریہ کتنا بلند ہے، وہ کسی انسان کی معمولی سے معمولی حق تلفی کو بھی برداشت نہین کرتا، اور انسانی معاشات کو ایک خاص ربط و انقباط (Regu- lation) کے تحت چلانا چاہتا ہے تاکہ کوئی شخص اپنے سرمایہ کے زور سے دوسرون پر مشق ستم نہ کر سکے، اور کسی کو غریب انسانون کا خون چوسنے کا موقع ہی نہ مل سکے،

فریضہ زکوٰۃ کی حکمت، عام لوگون کی نظر مین اشیا کی کثرت اور قلت کا دار و مدار مقدار حجم یا تعداد پر ہے مگر اسلام کے نزدیک ہر چیز کی کثرت اور قلت ایک غیر مرئی حقیقت سے تعلق رکھتی ہے، اگر تھوڑی چیز مین بھی معنوی عظمت موجود ہے، تو وہ خدا کی نظر مین کثیر ہے، لیکن جو چیز لوگون کی نظر مین بظاہر بہت بڑی معلوم ہوتی ہے، مگر وہ معنوی عظمت سے محروم ہے، تو وہ خدا کے نزدیک قلیل ہے اور یہ چیز صرف تصورات ہی تک محدود نہین، بلکہ حقائق و واقعات کی دنیا مین بھی اس کا تجربہ کیا جا چکا ہے، جس طرح پاکباز صالح اور منظم انسانی جماعت انتہائی قلت کے باوجود دنیا کی بڑی سے بڑی اکثریت پر غالب آسکتی ہے، اور اس کی عددی اقلیت اکثریت کا حکم رکھتی ہے، اسی طرح وہ صالح اور پاک مال جو نیک اور جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو، اگرچہ بظاہر کم ہو، مگر وہ اس دولت کے انبار سے ہزار درجہ بہتر ہے، جو غریبون کا خون چوس چوس کر اکٹھی کی گئی ہو،

لا یستوی الخبیث والطیب و	ناپاک اور پاک مال برابر نہین ہو سکتے،
لو اعجبک کثرۃ الخبیث	اگرچہ ناپاک کی کثرت کتنی ہی بھلی معلوم
(مائدہ ع ۱۳)	ہو رہی ہو،

جو غلہ غریب کسانون کے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے سمیٹا جاتا ہے، جو دولت ہزارہا انسانون کے وسائل معیشت پر غاصبانہ قبضہ سے کس مزدورون پر ظلم سے جمع کی جاتی ہے، جو تاج کروڑون

---

[1] عبدالرزاق فی الجامع،

انسانون کے خونِ ناحق کے بدلے مین حاصل کیا جاتا ہے، اور جو تخت بے گناہ مخلوق کی گردنون کے لاشون پر بچھایا جاتا ہے، اس سے وہ قوت لاہوت اور مردِ مومن کی گلیم کہنہ بہتر ہے، جو حلال اور پاک طریقون سے حاصل ہوتی ہو۔

وہ قبا جس پہ ہون دہقان کے لہو کے چھینٹے

اس سے بہتر ہے کسی مردِ قلندر کی گلیم

یہی وہ مقدس جذبہ ہے جو مسلمانون کے ہاتھ کو خونِ ناحق سے رنگین نہین ہونے دیتا، اور اسی جذبہ کی تقویت کے لئے قرآنِ حکیم نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے، جو شخص اپنی ضروریاتِ زندگی سے بچا کر چالیس روپیہ جمع کرتا ہے، اس کو سال مین ایک مرتبہ ایک روپیہ بہ مدِ زکوٰۃ مین دینا ضروری قرار دیا گیا ہے، اسی طرح اگر وہ دس کروڑ روپیہ کا مالک بنجاتا ہے، تو سال مین اسے قریبًا ۲۵ لاکھ روپیہ دینا پڑتا ہے، جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ حبِ دولت کا وہ منحوس جذبہ جو نظام سرمایہ داری (کیپٹل ازم) کا محرک ہے، اور جس سے ہزارہا مفاسد اجتماعیہ رونما ہوتے ہین، آہستہ آہستہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے،

حبِ دولت را فنا سازد زکوٰۃ   هم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

دل ز حتی تنفقوا محکم کند   زر فزاید الفت زر کم کند (اقبال)

قرآنِ حکیم نے کس شانِ بلاغت سے اس مضمون کو ادا کیا ہے،

یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقٰت   اللہ تعالیٰ سود کو گھٹاتا ہے

(بقرہ)   اور صدقہ و خیرات کو بڑھاتا ہے

....

انسان کی فہم ناقص بہت سی چیزون کو سمجھنے سے قاصر ہے اگر خداوند تعالیٰ اپنے حکیمانہ احکام

کے ذریعہ انسانون کو فکر و عمل کے بلند ترین مقام پر لیجانا چاہتا ہے، انسان انتہا درجہ کا حریص اور خودغرض واقع ہوا ہے، وہ جمع دولت ہی کو اپنے لئے ذریعۂ نجات تصور کرتا ہے، حالانکہ حقیقی نجات وہ ہے جو پوری سوسائٹی کی خوشحالی اور انسانی مساواتِ عامہ سے حاصل ہوتی ہے، اور سوسائٹی کی خوشحالی اس وقت تک وجود مین نہین آسکتی، جب تک کہ اس کے ہر فرد مین ہمدردی و مساوات اور ایثار کا جذبہ نہ پایا جاسے،

اپنی دولت کا ایک حصہ جماعت کے پس ماندہ افراد مین تقسیم کرنے سے کوئی انسان مفلس نہین ہوجاتا، بلکہ اس سودے مین فائدہ ہی فائدہ ہے، اسی نکتہ کی جانب قرآن کریم نے ایک لطیف اشارہ کیا،

وما اٰتیتم من زکوٰۃ تریدون	تم جو رضاے الٰہی کے حصول کے لئے زکوٰۃ
وجہ اللہ فاولٰئک ھم المضعفون	دیتے ہو، تو اس سے تمھارے مال مین کئی
(روم)	گنا اضافہ ہوتا ہے،

سورۂ بقرہ مین حکم انفاق کے بعد ارشاد ہوتا ہے،

الشیطان یعدکم الفقر و یامرکم	شیطان تمھین فقر و احتیاج کی راہ دکھاتا ہے
بالفحشآء واللہ یعدکم مغفرۃ	اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ
منہ و فضلاً واللہ واسع علیم	تم سے مغفرت اور رزقِ حلال کا وعدہ کرتا
(بقرہ ـ ۳۰)	ہے، اور اللہ کا علم وسیع ہے،

اس آیت مین عدمِ انفاق کو فقر اور مال کو فضل سے تعبیر کیا گیا ہے اور نہایت لطیف پیرایہ مین اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کے فہم کے لئے خداداد علم و حکمت کی ضرورت ہے، اس لئے اس کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے،

یوتی الحکمۃ من یشاء ومن	خداوند تعالیٰ جسے چاہتا ہے، علم و حکمت

یُؤتی الحکمۃ فقد اُوتی خیراً کثیراً وما یذکر الا اولوالالباب (بقرہ ۷) | عطا فرماتا ہے، اور جس کو حکمت دی گئی، آسے تو بافر کثیر ہاتھ آگئی اور نصیحت تو عقلمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں،

متعدد احادیث و آثار میں بھی اس حقیقتِ باہرہ کا اظہار کیا گیا ہے،

عن ابن عمرؓ ان الصدقۃ لاتزید المال الا کثرۃ (ابن عدی فی الکامل) | صدقہ مال میں کثرت اور برکت پیدا کرتا ہے،

عن بریدۃ ما منع قوم الزکوٰۃ الا ابتلاھم اللہ بالسنین (اخرجہ الطبرانی فی الاوسط) | جس قوم نے زکوٰۃ روک لی، اللہ تعالیٰ اس کو قحط سالی میں مبتلا کرتا ہے،

زکوٰۃ ایک اجتماعی فریضہ ہے، اور قرآن حکیم نے بار بار اس کی تاکید کی ہے، جہاں نماز کا ذکر آتا ہے وہاں زکوٰۃ کے حکم کا بھی بلا فصل ذکر کیا گیا ہے، اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ نماز شریعت حقہ کا ایک ایسا رکن ہے، جو کفر اور اسلام میں فارق علامت ہے، قرآن حکیم کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے ہر جگہ نماز اور زکوٰۃ کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور اسلامی برادری کی رکنیت و عضویت کے لئے نماز کی طرح زکوٰۃ کو بھی شرط قرار دیا گیا ہے،

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین، (توبہ) | پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں،

حضرت ابوبکرؓ نے فتنۂ ارتداد اور مانعین زکوٰۃ کے مقابلہ میں جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا وہ اسی اصل پر مبنی تھا،

واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ، (بخاری) | خدا کی قسم جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا اس سے میں جنگ کروں گا

اس کی تفصیل تو کسی دوسرے موقع پر آئے گی، یہان صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ اسلام نے انسانی معیشت کے جو زرین اصول بنائے ہین، وہ انسانون کو حریتِ اجتماع اور امن و مساوات کی برکات سے مالا مال کرنے کے لئے بالکل کافی ہین، ایک طرف اوس نے سرمایہ دار طبقون کے ظالمانہ تسلط سے غریب انسانون کو رہائی دلانے کی غرض سے سود اور اس قسم کے تمام ذرائع کا سدباب کیا ہے اور دوسری طرف غربا کی امداد و اعانت اور مساوات عامہ کے لئے زکوٰۃ اور تقسیم دولت کے دوسرے ذرائع اختیار کئے ہین، یہ ظاہر ہے کہ آج دنیا مین جس قدر اجتماعی مفاسد پائے جاتے ہین، ان کی سب بڑی وجہ حُبِّ دولت اور جذبۂ سرمایہ داری ہے، یہی وہ تخمِ خبیث ہے، جس سے خود غرضی، حُبِّ نفس جذبۂ نفرت اور انسان کشی کی شاخین پھوٹتی ہین، اور اسی مذموم جذبہ نے تقسیم دولت کے قدرتی اصولون کو ناممکن العمل بنا دیا ہے، اور آج دنیا کے ہر گوشے مین سرمایہ دار اور مزدور مین خطرناک طبقاتی کشمکش جاری ہے،

سوشلزم اور کمیونزم کے بھیانک نظریے اسی مکروہ جذبہ کا ردِ عمل (ری ایکشن) ہین مگر اسلام نے دنیا کو جس معاشی نظام کی دعوت دی ہے، وہ تقسیم دولت کے قدرتی اصولون پر مبنی ہے اور اس مین کسی قسم کی طبقاتی جنگ کا خطرہ نہین، حکومتِ اسلامی کا شعبۂ مالیات ہر طبقہ کی تسکین کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل رکھتا ہے جس سے کسی انسان کو شکایت کا موقع ہی نہین مل سکتا،

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۶ء مین مدراس مین سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤن پر آٹھ خطبے دیئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانون نے ان کو بے حد پسند کیا۔

قیمت ۱۲ ضخامت صفحے "منیجر"

اشرف علی فغان

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب (علیگ)

(۳)

فغان کے قطعات فغان نے کثرت سے قطعات بھی لکھے ہیں، عام طور سے قطعہ میں کوئی حکیمانہ خیال یا اخلاقی سبق ہوتا ہے لیکن شعرائے متقدمین و متوسطین نے بعض قطعوں میں کسی مرکب خیال کو ظاہر کیا ہے اور رنگ تغزل ہی کو قائم رکھا ہے، اس لئے یہ قطعات گویا مسلسل غزلوں کا مجموعہ ہی ہو گئے ہیں، فغان کے قطعات بھی اسی رنگ کے ہیں، اُن کے قطعات میں حکمت و اخلاق کے مسائل اور پند و نصائح کے مضامین نہیں، بلکہ عاشق کی ناکامی، بے چارگی اور معشوق کی بے دردی، لاپروائی اور بے اعتنائی کی داستان ہے لیکن اُن میں بعض ایسی بھی تصویریں ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یہ فغان کے خود قلبی تاثرات اور ذاتی واردات ہیں، ایک عاشق کی زبون حالی ملاحظہ ہو،

وقتِ بہار مجھ دلِ شیدا کا اے فغان — یہ تھا شعار دشت کو ہر سال دیکھنا
اس سال مجھ کو دیکھ غزالان نے یون کہا — منظور گر ہے قیس کا احوال دیکھنا
جا دیکھ آج دشت میں ماتم نشین ہے بید — مجنون کی خاک پر وہ کھلے بال دیکھنا

شبِ فرقت کی جانگدازی دیکھئے،

سو گئی شبِ فراق میں آرام سے فغان — یہ ہی خیال محض وہ بیدار ہی رہا

کافر ہو گر پلک سے لگی ہو کبھی پلک یکتا ہوا سدا در و دیوار ہی رہا

اسی خیال کو ایک دوسرے قطعہ مین اس طرح باندھا ہے،

سونا شبِ فراق مین آرام سے فغان یہ تو کسی کی چشم سے اب تک نہ ہو سکا
تو نے جو رات خواب مین دیکھا تھا یار کو کیونکر پڑی تھی نیند تجھے کیونکہ سو سکا

بعض جگہ یہی مضامین کس قدر سوز و غم کی ہو بہو تصویرین گئے ہین،

کیا پوچھتے ہو حال فغان کا سنا نہین خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا
اس وصال و ہجر مین یون ہی گذر گئی دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا

پھر اس قطعہ مین معشوق کی جفا اور عاشق کے حسرت و یاس کا کیسا موثر بیان ہے،

تنہا اگر مین یار کو پاؤن تو یون کہون انصاف کو نہ چھوڑ مروت اگر گئی
آخر فغان وہی ہے اسے کیون بھلا دیا وہ کیا ہوئی تپاک وہ الفت کدھر گئی
مجھ سے جو پوچھئے تو ہر حال شکر ہے یون بھی گذر گئی مری وون بھی گذر گئی

ایک جگہ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ بھی کھینچا ہے،

خونِ دلِ غریب کو پیتا ہون ہر سحر لختِ جگر تو آذقۂ شام ہو گیا
اپنی کہو اے ہم سفرانِ رہِ عدم میرا تو ہر طرح سے سرانجام ہو گیا
کیون کر شفا نہ ہو دلِ بیمار کو فغان یہ اشک چشم روغنِ بادام ہو گیا

ایک جگہ صوفیانہ مضمون بھی ہے، مثلاً

ایک دن شیخ و برہمن سے فغان کہتا تھا کعبہ و دیر میں تم کرتے ہو تکرار عبث
خوب دیکھا تو مرے رشتۂ الفت کے حضور تیری تسبیح غلط ہے ترا زنار عبث

ایک جگہ کچھ رندانہ مستیان بھی ہین،

ے واسطے ساقی نہ میں اب چشم تر آیا دل دیکھتے ہی ابر کو ناچار بھر آیا
مت ڈھونڈ گزک کو اری مخمور ادھر دیکھ اے لے تری خاطر میں لخت جگر آیا
زاہد کے تئیں دیکھ کے کہتا ہوں حرم میں عیسیٰ کو فلک بھیج دیکعبہ میں خر آیا
حیران و پریشان و دل افگار و قبا چاک سنتے تھے فغاں کو سو وہ آج ہی نظر آیا

رباعیات | فغاں کی رباعیات میں بھی وہی عاشقانہ مضامین ہیں، جو اون کے جذبات کی پختگی اور قادرالکلامی کی واضح مثالیں ہیں، ان میں سے ایک دو ملاحظہ ہوں،

ہم وہ نہیں جو وصل میں سوتے رہتے مژگاں میں دُر اشک پر وتے رہتے
پے خندۂ یار کیا ہے گریہ میں مزا ہنستا رہتا تو ہم بھی روتے رہتے

اے دل آرام تجھ کو ہونا معلوم در در شب ہجر جی سے کھونا معلوم
اس چشم سے خواب کی توقع مت رکھ رونا تو نصیب میں ہو سونا معلوم

فغاں اور ان کے معاصرین | اوپر کی سطروں میں ہم نے فغاں کی شاعری کی توصیف اس لئے میں کی ہے کہ ہم کو ان کا دیوان ناظرین کے سامنے پیش کرنا ہے، بلکہ یہ محض اُن کے کمال کا اعتراف ہے، جس کی داد فغاں کے معاصرین اور بعد کے ناقدین نے دل کھول کر دی ہے، میر سے خراج تحسین حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی، یقین جیسے باکمال شاعر کے بارے میں میر لکھتے ہیں،

بعد از ملاقات این قدر خود معلوم شد کہ ذائقہ شعر فہمی مطلق نہ دارد ...... جمع
بر این اتفاق دارند کہ شاعری او خالی از نقص نیست[۱]،

لیکن فغاں کے ذکر میں رقمطراز ہیں کہ

"بسیار جوان قابل ہنگامہ آرا شعر ریختہ را بخوبی می گوید گاہے فکر غزل فارسی ہم می کند"

فغاں کے مندرجہ ذیل دو شعر میر صاحب کو بہت پسند آئے ہیں،

---

[۱] نکات الشعراء ص ۹۳ ایضاً ۷،

ساقی نہیں یہاں آیئے کچھ چشم تر آیا | دل دیکھتے ہی ابر کے ناچار بھر آیا
آوارہ و پریشان و شکستہ دل بدنام | سنتے تھے فغان جس کو آج ہی نظر آیا[1]

میر کا فغان کو پسند کرنا ایک لحاظ سے فطری تھا کیونکہ بعض جگہ ظاہری اور معنوی حیثیت سے فغان کا کلام میر سے بالکل ملتا جلتا ہے، مثلاً

رونا جہان تلک تھا میری جان رو چکا | مطلق نہیں ہے چشم میں نم کا اثر کہیں
باور اگر تجھے نہیں آتا تو دیکھ لے | آنسو کہیں ڈھلک گئے لخت جگر کہیں

بہار آئی میرے پاؤں میں پھر زنجیر پڑتی ہے | مبارک ہو جنوں گھر کو تیرے آباد کرتا ہوں
لب خندان کو میری دیکھ کیا شاداں کوئی ہوئے | میں ہنس ہنس عمر کو گل کی روشن یاں کرتا ہوں

کیا پوچھتے ہو حال فغان کا سنا نہیں | خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا
اس کی وصال و ہجر میں یوں ہی گذر گئی | دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا

عالم کو بحر خون میں یہ قاتل ڈبو سکا | لیکن میرے لہو کو نہ دامن سے دھو سکا
پہنچا گئے مجھے تیرے در تک یہ سیل اشک | اتنا تو ہو سکا کہ میری جان رو سکا

مندرجہ بالا اشعار میں میر کی زبان اور سوز و گداز کا کتنا صحیح مرقع ہے۔

مرزا سودا بھی فغان کے بہت ہی معتقد تھے، مجموعہ نغز میں ہے، کہ

"مرزا محمد رفیع سودا بسیار ستایش دیوانش کرد"

فغان نے اپنے سے سودا کی عقیدتمندی کا اعتراف خود کیا ہے۔

---

[1] نکات الشعراء صفحہ، پیش نظر دیوان میں یہ دو شعر اس طرح درج ہیں :-

ے واسطے ساقی نہیں آپ چشم تر آیا | دل دیکھتے ہی ابر کو ناچار بھر آیا
حیران و پریشان و دل افگار و قبا چاک | سنتے تھے فغان کو سو وہ آج ہی نظر آیا

فغاں کون اب خریدار سخن تھا اگر یہ حضرت سودا نہ ہوتا

سودا نے اپنے جوش عقیدت میں فغاں کے قطعات پر قطعات لکھے، اور ایک ایک شعر پر لمبے لمبے قطعات لکھے ہیں، مثلاً فغاں کے ایک قطعہ کا ایک شعر ہے،

شکوہ تو کیوں کرے ہے مری اشک سرخ کا تیری کب آستین مرے لوہو سے بھر گئی

اس پر سودا نے جو قطعہ لکھا ہے وہ گو ذرا طویل ہے لیکن دلچسپ ہے، اس لئے ہدیۂ ناظرین ہے،

سودا فغاں کو خط یہ لکھا اس کے یار نے جس وقت اس کے حال کی اس کو خبر گئی
سن اے فغاں جہان میں عاشق جو ہو گیا معشوق سے اسے روش اس کی گذر گئی
شیریں نے جور کب نہ کیا کوہکن کے ساتھ مجنوں پہ کیا جفا تھا کہ لیلیٰ نہ کر گئی
کل ہی پڑے سسکتے تھے بلبل چمن کے بیچ ذرہ نہ اس کے حال پہ گل کی نظر گئی
پروانہ رات شمع سے اتنی جلی کہ صبح خاکستر ان کی لیکے صبا دوش پر گئی
میں تازہ کچھ کیا ہے، کہ بدنامی کو مرے آوازہ آہ و نالہ ترے گھر بہ گھر گئی
حرمت رکھی نہ رعد کی فریاد نے تری رونے سے تیرے آبروے ابر تر گئی
لوہو سے تیرے سر کے ہے دیوار گھر کی سرخ آنکھوں سے موج خون کی پیرہن در گئی
دل کو ترے نہیں ہے اگر تاب درد ہجر تو کار عشق سے تو مرے لال کر گئی
القصہ خط کو پڑھکے یہ اس نے کہا کہ خیر تیرے ہی دل کی مہر نہ جانوں کدھر گئی
شیریں کی ایک میں نہ رکھوں در نہ بار ہا لیلیٰ جدھر تھی وادی مجنوں ادھر گئی
یاں تک تو گھٹ میں لیلیٰ کے مجنوں سما گیا اس اتحاد سے انھیں باہم بسر گئی
جاری ہوا تھا خون رگ مجنوں سے وقت فصد لیلیٰ کے پوست بال اگر نشتر گئی
ظالم کرو در گل کا گریباں ہوا ہے چاک اک عندلیب گرا جل اپنے سے مر گئی

پروانہ کون ساتھ جلا شام کو شمع — روتی ہوئی نہ بزم سے وقت سحر گئی
یہ گفتگو تو قطع نظر اس سے مجکو کیا — مجھ سے جفا سے ہجر کی طاقت کدھر گئی
میرے لہو سے میری دیوار گھر کی سُرخ — میری ہی موج خون میری بیڑن در گئی

شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشک سُرخ کا
تیری کب آستین مرے لوہو سے بھر گئی

فغاں کا ایک دوسرا قطعہ ہے،

سونا شب فراق میں آرام سے فغان — یہ تو کسی کی چشم سے اب تک نہ ہو
تو نے جو رات خواب میں دیکھا تھا یار کو — کیونکر پڑی تھی نیند تجھے کیونکہ سو سکا

اسی کی تقلید میں سودا نے بھی ایک قطعہ لکھا ہے،

اے دیدہ خانماں تو ہمارا ڈبو سکا — لیکن غبار یار کے دل سے نہ دھو سکا
تجھ حسن نے دیا نہ کبھی دل کو چین، — فتنہ نہ تیرے دور میں بھر نیند سو سکا
جوں شمع تن ہوا شب ہجراں میں صرف اشک — پر جس قدر میں چاہے تھا اتنا نہ رو سکا
سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز — اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

فغاں کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے،

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں — لیتا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

اس پر بھی سودا نے ایک قطعہ لکھا ہے،

نامہ لکھا تھا یار کو میں یہ سمجھ کے ہے — عالم میں اسم نامہ و پیغام بر کہیں
لیکن سوائے بندگی و عجز و انکسار — نکتہ ہوا اس میں حرف تمنا سے گر کہیں

وان لا کے مجھ کو مارئیے گر دن کہ جس جگہ
پانی کے قطرے کا بھی نہو وے اثر کہین

ورنہ خدا کے واسطے انصاف تو کرو
آتا ہے ایلچی پہ زوال اس قدر کہین

اڑتا پھرے ہے نامہ گلی مین کسی طرف
دھڑ سے جدا پڑا ہے سر نامہ بر کہین

وقتیکہ دلبران جہان کا ہو یہ سلوک
پھر دل کو دو دن کہو تو کس امید پر کہین

کہین کہین تو سودا کے بعض اشعار فغان سے بالکل ملتے جلتے ہین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونون نے ایک ہی جذبات سے متاثر ہو کر کہا ہے، بات یہ تھی کہ سودا کو فغان کے ساتھ غیر معمولی شیفتگی تھی اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے، اور بہت تعریف کیا کرتے تھے، ایسی حالت مین اُن کے بعض مضامین اگر فغان سے مل گئے ہین تو کیا تعجب ہے،

سودا	فغان
خونناب یون کبھو نہ مری چشم سے بہا	باور اگر تجھے نہین آتا تو دیکھ لے
اٹکا نہ جب تلک آن کے لخت جگر کہین	آنسو کہیں ڈھلک گئے لخت جگر کہین
میری طرف سے دیجو صبا گل کو یہ پیام	میری طرف سے خاطر صیاد جمع ہے
آؤن قفس بھی توڑ کے پر بال و پر نہین	کیا اُڑ سکے گا طائر بے بال و پر کہین
کیون مجھ سے بے گناہ کو ناحق کرے ہے قتل	ایذا فغان کے حق مین بہا تنگ وا نہ رکھ
اے یار تیرے دل مین خدا کا بھی ڈر نہین	ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے تو ڈر کہین
	نے دادخواہ ہون نہ گریبان دریدہ ہون
نے بلبل نہ چمن نہ گل نو دمیدہ ہون	خستہ جگر ہون چاشنی غم چشیدہ ہون
مین موسم بہار مین شاخ بریدہ ہون	نے شعلہ و نے برق و نہ اخگر نہ شرر ہون
	مین عاشق دل سوختہ ہون تفتہ جگر ہون

فغان

مت قصد کر صبا تو دلِ داغدار کا
ظالم یہ ہے چراغ کسی کے مزار کا
اے فغان درد دل سنون کب تک
اُڑ گئی نیند اوس فسانہ سے

سودا

بے کس کوئی مری تو جلے اوس پہ دل مرا
گویا یہ ہے چراغ غریبون کی گور کا
سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانہ مین

فغان کی تقلید مین سودا کا قطعات اور غزلین کہنا اُن کے باکمال شاعر ہونے کی بین دلیل ہے
...مین آزاد نے لکھا ہے، کہ فغان کے کمال کی سند اس سے زیادہ نہین ہو گی کہ مرزا رفیع جیسے صاحب
...ل اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے، اور بہت تعریف کیا کرتے تھے حقیقت مین
...ا کا خود بھی یہی انداز تھا کیونکہ ان کے کلام مین بھی ہندی کے محاورے نے فارسیت کے ساتھ نئے
...ت سے پختگی پائی، اور ہر خیال کو لطافت اور چوچلے کے ساتھ ادا کرتے ہین[۱]، مولانا عبدالسلام صاحب
...ی بھی رقمطراز ہین، کہ فغان شاعرانہ حیثیت سے میر اور سودا کے ہم پلہ وہم مرتبہ تھے،

مگر میر اور سودا کی مختلف حیثیتون سے اردو شاعری مین جو جگہ ہے، اس لحاظ سے فغان کو اُن کا
...پلہ وہم مرتبہ کہنا ذرا مشکل ہے، عام طور سے یہ دونون استاذہ سخن اپنی ندرتِ خیال، طرزِ بیان اور قدرتِ زبان
...لحاظ سے اپنا جواب نہ رکھتے تھے، فغان کے یہان نہ میر کا سوز و گداز ہے، اور نہ سودا کا جوش و خروش،
...ن کے یہان صرف زبان ہے، اور زبان مین شگفتگی، ہمواری اور موسیقیت ہے، اور شاید اپنی زبان
...ن شگفتگی کی خاطر انھون نے غزلون مین شگفتہ طرحون کے سوا کوئی اور طرح اختیار نہین کی ہے، یہی وجہ
...ہ اُن کے کلام مین شروع سے آخر تک یکرنگی، ہمواری اور توازن ہے،

البتہ اس حیثیت سے فغان کو میر اور سودا کے مقابلہ مین امتیاز حاصل ہے، کہ میر کی غزلون پر
...اس اعتراض "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" کا آج تک کوئی جواب نہ ہو سکا، سودا بھی

---

[۱] آب حیات صفحہ ۱۱۴،

اس الزام سے بری نہین ہین، لیکن استاذی مولانا عبد السلام صاحب ندوی لکھتے ہین، کہ اس اعتراض سے صرف خواجہ میر درد اور فغاں کا کلام بالکل محفوظ ہے"، اس رائے کی تائید پیش نظر دیوان سے حرف بحرف ہوتی ہے، جس کی مثالین دینا ضروری نہین ہے، چند غزلون کو چھوڑکر ناظرین شروع سے آخر تک دیوان مین توازن اور یکرنگی پائین گے،

فغاں ریختہ گو جہان مین بہت ہین کوئی تجھ سا دنیا مین پیدا نہ ہوگا

میر درد مرزا کے علاوہ فغاں کے معاصر شیخ محمد قیام الدین قائم نے بھی ان کی سخن سنجی کی تعریف کی ہے،

سلیقہ سخن سنجی درست دارد، چنانچہ ارسیاق وسباق ... کلامش پیدا است"[۱]

میر قدرت اللہ قاسم (۱۲۶۶ھ - ۱۲۴۲ھ) جنھون نے فغاں کا زمانہ دیکھا تھا، اپنے مجموعہ نغز مین رقمطراز ہین :-

"شورش پختگی نام دارد، سرآمد سخن سنجان فصاحت اما مرزا محمد رفیع سودا بسیار ستائش دیوانش می کرد"[۲]

گلشن ہند کا مصنف فغاں کو "شیرین کلام" لکھ کر کہتا ہے، کہ

"نظم ریختہ مین طبیعت ان کی رسا ہے"[۳]

مصحفی (۱۲۴۰ھ - ۱۱۵۶ھ) لکھتے ہین :-

"شعر را بہ صفائی تمام می گوید"[۴]

موجودہ دور میں فغان کی تحسین | موجودہ دور کے ارباب کمال نے بھی فغاں کی قدردانی کم نہیں کی، شیخ محمد ابراہیم ذوق نے فغاں کے دیوان کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہے، محمد حسین آزاد نے جب اس دیوان کو پڑھا تو ان کی آنکھین روشن ہوگئین، چنانچہ وہ لکھتے ہین کہ اگرچہ فغاں کی زبان اسی زمانہ کی زبان ہے

---

۱ مخزن نکات ص ۴۴، ۲ مجموعہ نغز حصہ دوم ص ۲، ۳ گلشن ہند ص ۱۳۰، ۴ تذکرہ ہندی ص

فن شاعری کے اعتبار سے نہایت بااصول اور برجستہ ہے، اور الفاظ کی بندش ان کی مشق سخن پر گواہی ہے...... ان کی طبیعت ایشیا کی شاعری کے لئے نہایت مناسب تھی[1] مولانا عبدالحی نے بھی فغان شعروسخن کا ماہر کہا ہے[2] استاذی مولانا عبدالسلام ندوی مصنف شعرالہند نے تو ان کو میر اور سودا کا ہم پلہ، ہم مرتبہ قرار دیا ہے[3]،

فغان کی گمنامی کا سبب مگر افسوس ہے کہ ایسے باکمال استاد کے دیوان سے اب تک ارباب ذوق ناآشنا رہے، یہی وجہ ہے کہ فغان اتنے مشہور نہ ہو سکے جس کے وہ مستحق تھے، مولانا عبدالسلام صاحب مدظلہ کا خیال ہے کہ فغان اگر مرشدآباد اور عظیم آباد جانے کے بجائے دلی یا لکھنؤ ہی میں مقیم رہتے، تو اُن کو وہی شہرت حاصل ہوتی، جو میر کو تھی، وہ لکھتے ہیں، کہ اس وقت مرشدآباد اور عظیم آباد بھی اگرچہ شاعری کے مرکز ہو گئے تھے، تاہم شہرت کے جو اسباب لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے، وہ ان مقامات میں کہاں میسر آسکتے تھے اس لئے قدرتی طور پر شہرت کے جو سامان میر وغیرہ کو حاصل ہوئے، اس سے اشرف علی فغان محروم رہ گئے،

فغان کے مشہور نہ ہونے کی وجہ تو خیر یہ ہو سکتی ہے لیکن معلوم نہیں ان کا دیوان اب تک طباعت اور اشاعت سے کیوں محروم رہا، حالانکہ ہر دور کے معمولی معمولی شعراء کے دواوین شائع ہو چکے ہیں، بہرحال یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ فغان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ الاصلاح دیسنہ ضلع پٹنہ میں محفوظ ہے، اس کے ناظم جناب سید عبدالحکیم صاحب نے اسے ۳۲ء میں استاذی مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے پاس بھیجا، مولانا موصوف نے معارف اپریل ۳۲ء میں اس پر ایک مختصر لیکن جامع تبصرہ تحریر فرمایا ہے آخر میں لکھا کہ یہ بہترین یادگار اس قابل ہے کہ اس کو نہایت محنت کے ساتھ اڈٹ کر کے عام طور پر شائع کیا جائے، لیکن افسوس اب تک اس کی نوبت نہ آئی شاید یہ سعادت راقم سطور کے لئے مقدر تھی، یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس فرض کو میں نے پورے طور سے انجام دیا ہے، لیکن بہرحال جو کچھ بھلا برا بن پڑا،

---

[1] آب حیات ص ۱۴۱، [2] گل رعنا ص ۱۱۵، [3] معارف نمبر ۴ جلد ۹۔

پیش کر دیا گیا ہے۔

پیش نظر دیوان نہایت خوشخط نسخہ ہے، جس مین فغان کے فارسی اور اردو دونون کلام ہین، شروع مین (۲۶ ورق یعنی ۲۰۵ صفحے فارسی غزلین، قطعات اور ایک ہجو ہین، فارسی کلام کو مین نے آخر مین منسلک کر دیا ہے، اس کے بعد اردو کلام ہے، جس مین غزلون کے علاوہ شروع مین دو قصیدے ہین جو جناب امیر اور حضرت امام علی موسیٰ رضا کی منقبت مین لکھے گئے، غزلون کے ساتھ ہی جا بجا قطعات ہین، آخر مین چند رباعیان متفرق اشعار، دو مخمس اور ہجوین ہین، اردو کا کلام ۳، ورق یعنی ۶۴ صفحے پر پھیلا ہوا ہے، یہ نسخہ ایک انگریز کرامت جنگ جمیس ولیم کلکٹر گورکھپور نے اپنے کسی اہلکار کو تحفۃً دیا تھا، پھر اتفاقاً یہ جناب بشیر الحق صاحب بیدل (سب انسپکٹر پولیس پنشن یافتہ) کے ہاتھ آیا، جن کو بجا طور پر شمع علم و فن کا پروانہ کہا جا سکتا ہے انھون نے اپنے محبوب وطن کے کتب خانہ کو نذر کر دیا،

اس نسخہ مین فارسی کلام کے آخر مین یہ عبارت لکھی ہوئی ہے،

"ہذا ختمت انتخاب دیوان مرزا اشرف علی المتخلص بہ فغان مخاطب بخطاب ظریف الملک کوکہ خان بہادر سلمہ اللہ الرحمان مالکہ"

اردو کلام کے آخر مین بھی یہی عبارت صرف چند الفاظ کے اضافہ کے ساتھ لکھی ہوئی ہے،

"ہذا ختمت انتخاب دیوان مرزا اشرف علی خان المتخلص بہ فغان مخاطب بخطاب ظریف الملک مصاحب الدولہ کوکہ خان بہادر یکہ تاز جنگ سلمہ اللہ الرحمن

ٹھیک اس عبارت کے پہلے کاتب کی ہجو مین مندرجہ ذیل قطعہ لکھا ہوا ہے،

یہ جو میرا ہے راقم دیوان　　　تحفہ سنّے کا بھولا بھالا ہے

کچھ نہ سیکھا غلط نویسی میں　　　ہوش جس روز سے سنبھالا ہے

ہائے ہوز وہ لکھے ہے حنا　　　آپ کا رسم خط نرالا ہے

قاتل طبع زاد ہے ظالم مین نے دشمن بغل مین پالا ہے
زندگی ہے میری سخن جس کو سہو کاتب نے مارڈالا ہے

یہ قطعہ اس بات کی دلیل ہے کہ بیشتر ہنظر دیوان فغاں نے خود لکھوایا، اور شاید کلام کا انتخاب بھی خود کیا، اور یہی گویا اُن کے اذکار سخن کا اصلی سرمایہ ہے محمد حسین آزاد نے شیخ ابراہیم کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو فغاں کا دیوان دیکھا تھا، وہ صرف غزلون کا مجموعہ اور مقدار مین دیوان درد سے بڑا تھا، لیکن موجودہ دیوان تو درد کے دیوان سے بہت بڑا ہے، اور غزلون کے علاوہ بھی اس مین بہت کچھ ہے،

راقم الحروف کو فغاں کے دیوان کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے بھی ملا، جو بالکل کتب خانۂ الاصلاح کے نسخہ سے ملتا جلتا ہے، دونون مین کوئی فرق نظر نہ آیا، دونون کا کاتب بھی ایک معلوم ہوتا ہے، خان بہادر محمد شفیع (سابق پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور) نے بھی ازراہ نوازش فغاں کے دیوان کا ایک نسخہ اپنے ذاتی کتب خانہ سے استفادہ کے لئے بھیجا، مگر یہ بہت ناقص تھا، اس کی ضخامت بھی کم تھی، اس مین بہت سے ایسے اشعار تھے، جو مذکورۂ بالا دونون دیوان مین نہ تھے، شاید فغاں نے ان اشعار کو رد کرکے اپنے اصلی دیوان سے نکال دیا ہو، ان تینون دیوان پر ایک طویل تبصرہ اس مسودہ مین تھا، جو انجمن ترقی اردو کو بھیجا گیا تھا، افسوس ہے کہ ہم پھر اس پر کچھ خامہ فرسائی کرنے سے بالکل قاصر ہین،

خلفائے راشدین

فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین

از

جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب رفیق دار المصنفین

خاتمہ فتاویٰ عالمگیری کے چند اور جامعین کے حالات یا نام بعض حال کے اردو تذکروں میں مل گئے ہیں، اگرچہ کسی قدیم تذکرہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی، لیکن اس خیال سے ان کے نام یا مختصر حالات کا تذکرہ کر دیا جاتا ہے، تاکہ اصحاب علم میں کسی صاحب کو اگر اُن کے صحیح حالات اور فتاویٰ کی تالیف میں اُن کی شرکت کی تائید کسی قدیم ماخذ سے مل جائے، تو وہ اس کو پیش کر سکیں،

فتاویٰ کے مولفین کے نام کے ذکر کرنے میں زیادہ احتیاط اس وجہ سے کرنی پڑتی ہے کہ اس کے جمع و ترتیب کی نسبت بہت سے لوگوں کی طرف غلط مشہور ہوگئی ہے، اس غلطی کی وجہ ظاہر ہے کہ فتاویٰ عالمگیری ہندوستان کے علماء کا ایک بڑا اور مایۂ فخر کارنامہ ہے، اس میں علما کی ایک کثیر تعداد شریک تھی، دوسرے کام چونکہ کئی برس تک ہوتا رہا، اس لئے اشخاص میں ردّ و بدل بھی ہوتا رہا، اس بنا پر جن اشخاص جس خانوادہ کا فتاویٰ کی شرکت کے علاوہ علمی تعلق دربار عالمگیری سے تھا، اُن کی طرف بھی نادانستہ طور پر فتاویٰ کی تالیف کی نسبت کا ہو جانا چنداں تعجب خیز نہیں ہے، نیز جن لوگوں نے اپنے خاندانی بزرگوں کے حالات لکھے، انھوں نے بھی اپنے اجداد کو اس شرف میں شریک کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ ہر بڑے اور باعثِ امتیاز کاموں میں شرکت کی نسبت ہوتا ہے،

یہ چند سطریں اس لئے لکھ دینا ضروری معلوم ہوا کہ مؤلفین فتاویٰ کی فہرست میں جو نام بھی داخل

کئے جائیں، اس میں پوری احتیاط سے کام لیا جائے، بہرحال ان کے نام یا مختصر حالات یہ ہیں،

ملا محمد غوث | محمد غوث نام ابو محمد کنیت اور وطن کاکوری تھا،

۱۰۵۹ھ میں کاکوری میں پیدا ہوئے، مکتبی تعلیم کے بعد ملا محمد زمان ملا ابو الواعظ اور ملا قطب الدین سہالوی سے عربی کی تکمیل کی،[۱]

تکمیل کے بعد دلی چلے گئے، اُن کے تبحر علمی نے دربار عالمگیری میں پہنچایا، عالمگیر ان کا بڑا اعزاز کرتا تھا، حدیث میں خاص طور سے اُس نے اُن سے استفادہ کیا تھا،

مؤلف مشاہیر کاکوری کے بیان کے مطابق ملا محمد غوث بارہ سال تک عالمگیر کے ساتھ دکن میں رہے،

ملا غوث نے درس و تدریس کا مشغلہ بھی ہمیشہ جاری رکھا، اور بہت سے تشنگان علم کی پیاس بجھائی، اُن کے مشہور تلامذہ میں شاہ محمد وارث، شیخ عبد اللہ بن شیخ امان اللہ، اور مولوی غلام مرتضیٰ مولف جواہر الاسرار ہیں،

۶۲ سال کی عمر میں ۲۶ رصفر ۱۱۲۱ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی، صاحب مشاہیر کاکوری فتاویٰ میں اُن کی شرکت کے متعلق لکھتے ہیں،

"تبحر علمی نے شاہ عالمگیر کے دربار تک پہنچایا، اور وہاں مجلس جامعین و مؤلفین فتاویٰ عالمگیری میں مقرر ہوئے" (ص ۲۵۴)

مولف نے اُس کے ثبوت میں قاضی نجم الدین علی خان (جو ملا غوث کے پوتے ہوتے ہیں) کی کتاب اشک۔ ریاض سے ایک فارسی عبارت نقل کی ہے، لیکن فتاویٰ کی تالیف میں شرکت کے متعلق کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے اس لئے ان کو مؤلفین فتاویٰ میں شامل کرنے کے لئے مزید ثبوت اور تصدیق کی ضرورت ہے

---

[۱] یہ بھی مؤلفین فتاویٰ میں ہیں جنوری ۱۹۴۸ء کے معارف میں اُن کے حالات لکھے جا چکے ہیں [۲] مشاہیر کاکوری ص ۲۵۴

نواب علی حسن خان قاضی نجم الدین کے حالات مین لکھتے ہین،

" وجد بزرگوارش ملا محمد غوث فضائل پناہ وکمالات دستگاہ ودر علم حدیث استاد اورنگزیب عالمگیر بادشاہ بود، (گلشن)

لیکن انھون نے بھی فتاوی کی شرکت کے متعلق کچھ نہین لکھا ہے،

ملا سعید | ملا سعید ملا قطب الدین شہید سہالوی کے مجھلے صاحبزادے تھے، تعلیم کی تکمیل اپنے والد ہی سے کی، اور عرصہ تک والد کے ساتھ درس وتدریس کا مشغلہ رکھا، حضرت شہید کی شہادت کے بعد انھون نے عالمگیر کے دربار سے تعلق قائم کیا، اور وہان سے فرنگی محل کے قیام کی سرکاری سند ملنے کے بعد مع اہل وعیال سہالی سے لکھنؤ منتقل ہوگئے،

ولادت اور وفات کی تاریخ کی کوئی تصریح نہین مل سکی، پسماندگان مین دو صاحبزادے مولانا احمد عبد الحق، اور مولانا عبد العزیز یادگار چھوڑے،

فتاوی کی تالیف کی شرکت کے بارہ مین صاحب تذکرہ علمائے فرنگی محل نے لکھا ہے، کہ:-

" مشہور ہے کہ فتاوی عالمگیری کی تدوین ملا سعید بھی دوسرے علمار کی مانند شریک تھے، (ص ۶۳)

لیکن محض شہرت قطعی ثبوت کے لئے کافی نہین ہے،

علامہ ابوالفرح | حیات جلیل ص ۱۳ مین مذکور ہے،

" امیر میران علامہ ابو الفرح معروف بہ سید معدن جو فتاوی عالمگیری کی ترتیب وتالیف مین دیگر علمائے عصر کے دست وبازو تھے،

" موتعت نے کسی [illegible] کا حوالہ نہین دیا ہے، اس لئے قطعی طور سے فتاوی کی تدوین

مین اُن کی شرکت کے متعلق کچھ نہین کہا جاسکتا،

ملا غلام محمد برادر محترم مولانا ابو ظفر صاحب ندوی نے ایک خط مین ملا غلام محمد قاضی القضاۃ کے متعلق لکھا تھا، کہ وہ بھی مولفین فتاوی مین ہین، اور انھون نے ایک قلمی کتاب آثار اشرف کا حوالہ بھی دیا تھا، لیکن کوشش کے باوجود وہ کتاب دستیاب نہین ہو سکی، کتاب ملنے کے بعد اسکی مزید تفصیل پیش کیجائے گی

حیاتِ شبلی

حصّہ اوّل

مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی

یہ نوسو صفحون کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری ہی نہین، بلکہ درحقیقت مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی ادبی، سیاسی تعلیمی، مذہبی، اور قومی تحریکات و واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اس سلسلہ مین بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوتے ہین، جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لئے جاننا ضروری تھا، شروع مین ایک دیباچہ ہے جس میں جدید علم کلام کی نوعیت اس کی حیثیت اور اس سے متعلق مولانا شبلی مرحوم، اور ان کے متقدمین و معاصر علماء کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، اس کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے، جس مین دیار مشرق مین علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے، جو بڑی دیدہ ریزی سے یکجا ہوئی ہے، ضمناً ہر عہد کے مشہور اکابر علماء کے حالات بھی آگئے ہین۔ اس کے علاوہ دار المصنفین ندوۃ العلماء مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اور شبلی ڈگری کالج کی عمارتون کے ہاف ٹون بلاک ٹون بھی شامل ہین،

کاغذ و طباعت اعلیٰ ضخامت ۹۲۰ صفحے

قیمت غیر مجلد ۱۲ عہ مجلد لعہ علاوہ محصولڈاک

"منیجر"

استفسار و جواب

علامہ ابن جریر طبری کی دو کتابین

جناب منور احمد صاحب
نمبر ۱۸ کمال اسٹریٹ اسلامیہ پارک لاہور

" براہ کرام مندرجۂ ذیل استفسار کا جواب معارف کے ذریعہ دے کر مشکور فرمائین،

(۱) ابن جریر طبری کی تفسیر جامع البیان میں ان کی دو اور کتابون کا ذکر اکثر آتا ہے، جو اس تفسیر سے قبل لکھی گئی تھین، ایک کا نام " کتاب لطیف القول فی احکام شرائع الدین ہے، اور دوسری کا کتاب البیان عن اصول الاحکام " چنانچہ مثال کے طور پر ان کا ذکر جلد نمبر ۹ کے ص ۲۱۳ ورص ۲۲ پر علی الترتیب موجود ہے، اُن کے متعلق مین یہ دریافت کرنا چاہتا ہون، کہ آیا یہ کتابین موجود ہین، طبع ہوئی ہین یا اُن کے مسودات کسی لائبریری مین موجود ہین،

مین بہت مشکور ہون گا اگر جناب اس کے متعلق میری رہنمائی فرمائین، کیونکہ مجھے ان کتابون کے دیکھنے کا شوق ہے،

" والسلام

معارف:۔ آپکے دونون گرامی نامے ملے، افسوس ہے کہ تفسیر ابن جریر طبری کا جو نسخہ ہمارے یہان مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر ہے، اس کی نوین جلد کے ص ۲۲ و ۲۱۳ مین ان دونون کتابون کا تذکرہ موجود نہین ہے، اس کے مزید صفحے بھی دیکھے، مگر تذکرہ نظر نہین آیا، شاید آپکے پیش نظر نسخہ مطبع بولاق ہو، جس آیت کی تفسیر کے ذیل مین اُن کا ذکر آیا ہے، اس کا حوالہ آپنے دیا ہوتا تو آسانی ہوتی،

بہر حال علامہ ابن جریر طبری کی ان دونون کتابون مین سے اول الذکر کا تذکرہ ان کے سوانح

ن موجود ہے، نیز ابن ندیم نے الفہرست مین اس کا تذکرہ کیا ہے، کہ "یہ فقہ مین ہے اور کتب فقہ کے طرز پر مختلف
تابون اور ابواب پر مشتمل ہے" اس نے کتاب کا نام صرف کتاب اللطیف فی الفقہ لکھا ہے، (ص ۳۲۷، ذکر طبری)
حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ مین کتاب "لطیف القول فی الفقہ" کے نام سے تذکرہ کیا ہے، کہ "یہ بہترین
تصنیف ہے، جس مین انھون نے اپنے اختیار کئے ہوئے مسائل قلمبند کئے ہین، (جلد ۲ ص ۲۸۳) علامہ سبکی نے
بھی طبقات الشافعیہ مین محض اسی قدر لکھا ہے کہ "یہ فقہ مین اُن کی مختصر تصنیف ہے"، (جلد ۲ ص ۱۳۶) یاقوت
حموی نے ابن جریر کا تذکرہ بڑی تفصیل سے لکھا ہے، اور ایک سے زیادہ مقام پر اس مین اس کتاب کا ذکر
آیا ہے، ایک جگہ اس نے اس کتاب کے متعلق خود علامہ جریر طبری کا قول بھی نقل کیا ہے، کہ وہ فرماتے ہین

"میری دو کتابین ہین جن سے کوئی فقیہ بے نیاز نہین رہ سکتا، وہ الاختلاف اور اللطیف ہین"

یاقوت نے اس کے بعد ان دونون کتابون کے مباحث ومعلومات مین موازنہ کیا ہے اور آخر مین لکھا ہے،

"کتاب لطیف القول فی احکام شرائع الاسلام ایک ایسا مجموعہ ہے جس مین انھون نے اپنے مذہب ومسلک کے
مطابق مسائل قلمبند کئے ہین اُن پر وہ خود اور اُن کے پیرو اعتماد کرتے تھے، یہ خود ان کی تصنیفات اور
فقہ مین دوسرے فقہا کی تصنیفات مین نفیس ترین تصنیف ہے"......

"ابوبکر ابن رامیک کہتے ہین کہ کسی خاص مذہب ومسلک پر جو کتابین لکھی گئی ہین، ان مین سے ابوجعفر کی
کتاب اللطیف اُن کے مذہب پر بہترین تصنیف ہے،..... اُن کی کتاب الاختلاف (جو چھپ چکی ہے) سے اس
مین چند کتابین (ابواب) کتاب اللباس، کتاب امہات الاولاد اور کتاب الشرب زیادہ ہین، یہ بہترین
کتابون مین سے ہے، اور اپنے موضوع پر منفرد ہے، کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ اس کے "لطیف" سے موسوم ہونے کی
وجہ سے وہ مختصر اور خفیف بھی ہے، بلکہ لطیف سے مراد "لطیف القول" ہے، یہ کتاب تقریباً ڈھائی ہزار اوراق
پر مشتمل ہے..... اس مین اصول فقہ، اجماع، خبر واحد، مراسیل، ناسخ ومنسوخ وغیرہ مباحث بھی ہین، (ص ۴۴۴ و ۴۴۵)
لیکن افسوس ہے کہ یورپ، مصر اور ہندوستان کے معروف کتب خانون مین سے کسی مین اس کا کوئی نسخہ محفو

نہین اس لئے یہ کہا بھی نہین جاسکتا کہ اس کا وجود بھی باقی رہ گیا ہے یا علامہ ابن جریر کی بہت سی دوسری کتابون کی طرح ناپید ہوچکی ہے،

آپ نے دوسری کتاب البیان عن اصول الاحکام کا جو تذکرہ کیا ہے، افسوس ہے، کہ اس کا ذکر اُن کے سوانح حیات یا فہرست کتب مین موجود نہین،

علامہ ابن جریر طبری کی فن اصول مین ایک مختصر تصنیف التبصیر فی معالم الدین کے نام سے ہے معجم الادبا مین اس کا نام التبصیر کے بجائے البصیر چھپا ہے، یہ تیس اوراق کا ایک مختصر رسالہ ہے، پھر انھون نے علم اصول مین ایک کتاب الموجز فی الاصول کے نام سے لکھنی شروع کی تھی لیکن اس کا لکھنا انھون نے موقوف کر دیا، اور انھین اس فن مین ایک نئی کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا، مگر وہ خیال عمل مین نہ آسکا، (معجم الادبا، جلد ۶ ص ۴۲۷، ۴۵۲، طبقات الشافعیہ جلد ۲ ص ۱۳۶ و تذکرۃ الحفاظ،)

تفسیر مین البیان عن اصول الدین کا ذکر معلوم نہین کس حیثیت سے آیا ہے، یاقوت نے علامہ محمد بن جریر کے سوانح حیات دو اہم ماخذ سے مرتب کئے ہین اور اچھے خاصے مفصل ہین، یہ دونون ماخذ علامہ کے صاحبزادے عبد العزیز بن محمد طبری اور ابو بکر بن کامل کی تصنیفات ہین جو خاص سیرت طبری پر لکھی گئی ہین، (معجم الادبا جلد ۶ ص ۴۲۴) اس لئے معجم الادبا مین طبری کی تصنیفات مین البیان عن اصول الدین کا تذکرہ نہ ملنا نظر انداز کئے جانے کے لائق نہین، ممکن ہے یہ وہی اُن کی موعود تصنیف ہو جس کو وہ اصول دین مین لکھنا چاہتے تھے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ انھون نے اصول و فروع مین بکثرت کتابین لکھی تھین، (مفتاح السعادہ جلد اول) ہوسکتا ہے کہ البیان عن اصول الدین کے نام سے بھی کوئی کتاب تصنیف پائی ہو، لیکن بہرحال وہ ابن ندیم صاحب الفہرست حاجی خلیفہ صاحب کشف الظنون اور طاش کبری زادہ صاحب مفتاح السعادہ وغیرہ کی نظر سے نہین گذری ورنہ اُن کی تصنیفات مین اس کا ذکر موجود ہوتا، اس لئے اس سلسلہ مین کسی آخری اور حتمی بات کا کہنا دشوار ہے، قیاسی طور پر جو باتین ذہن مین آسکتی ہین، وہ عرض کی گئین، آپ ان پر غور و خوض فرما سکتے ہین، والسلام

"س"

وفیات

ماتم گسار برامکہ کا ماتم

مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری نے جو البرامکہ کے مصنف کی حیثیت سے مشہور تھے، پچاسی برس کی عمر میں ۸ ار فروری ۱۹۴۸ء کو بمقام بھوپال اپنی نواسی کے گھر میں ۲ بجے رات کو یکایک انتقال کیا، وہ کچھ دنوں سے بیمار تھے، اُن کے داماد ان کو علاج کی خاطر دلی لے گئے تھے، اور غرض یہ بھی تھی کہ اُن کے بعض پچھلے مسودات وہاں چھپ جائیں کہ دلی میں ہنگامہ ہوا اور لوگوں میں بھگدڑ مچی، مولوی صاحب موصوف کو اُن کے عزیز ہوائی جہاز سے بھوپال لائے، جہاں ایک زمانہ سے مختلف خدمتوں کے تعلق سے ان کا قیام تھا،

مرحوم سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۰۳ء میں لکھنؤ دارالعلوم ندوہ کے احاطہ کے اندر اس وقت ہوئی جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے سبب سے ملک کے اکابر و مشاہیر لکھنؤ آئے تھے، البرامکہ کو میں پڑھ چکا تھا، مصنف سے واقف تھا، شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اس زمانہ میں دارالعلوم میں قیام فرما تھے مشتاقوں کا ان کے پاس ہجوم تھا، انہی میں مولوی عبدالرزاق صاحب تھے، شاہ صاحب نے ان کی طرف اشارہ کرکے مذاقاً فرمایا کہ یہ برامکہ صاحب ہیں، اس تعارف سے مجھے خوشی ہوئی،

اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں جب حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ حیدرآباد سے قطع کرکے دارالعلوم میں معتمد ہوکر آئے، تو مرحوم کی آمد و رفت بکثرت ہونے لگی یہ وہ زمانہ تھا، جب

مرحوم نظام الملک سلجوقی لکھ رہے تھے، اور اس سلسلہ سے اپنے مسودات مولانا کو دکھانے لاتے تھے اور ان سے مشورہ چاہتے تھے،

مرحوم کی علمی استعداد اسی قدر تھی کہ وہ فارسی اچھی طرح جانتے تھے، اور عربی سے مانوس تھے، اور عبارت سے مطلب سمجھ لیتے تھے، البرامکہ لکھتے وقت اس سے بھی کم واقفیت تھی، اوس زمانہ مین ندوہ کا دفتر کانپور مین تھا، اور اسی تعلق سے مولانا سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم ندوۃ العلما جو بہت اچھے ادیب تھے، کانپور مین رہتے تھے، اور منشی عبدالرزاق صاحب جیسا کہ وہ اس وقت کہلاتے تھے، البرامکہ لکھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو فطری مذاق بخشا تھا، اور حیات سعدی و المامون وغیرہ سے اردو مین سوانح نگاری کی ایک طرح پڑ چکی تھی، مرحوم عربی تاریخی اور ادبی کتابون کو لفظاً لفظاً دیکھتے تھے، اور جہان برامکہ یا برکی کا لفظ دیکھتے، نشان لگا دیتے تھے، اور بعد کو اس کا مطلب سمجھ کر اس کو اردو مین لکھ دیتے، عربی اشعار کے سارے ترجمے جیسا کہ سُنا مولانا سید عبدالحی صاحب کے کئے ہوئے ہین، اور پورا مسودہ حضرۃ الاستاذ کی نظر سے گذارا گیا تھا، اور شاید اسی جذبہ کے تحت مصنف نے بڑے ادب کے ساتھ مولانا کے نام اس کو منسوب کیا تھا، اور یہ شعر لکھا تھا،

مسندِ علم از وجودت منبع آداب باد　　　آستانت قبلۂ جان اولی الالباب باد

کانپور مین اس وقت جدید ادبی مذاق کا مرکز منشی رحمت اللہ صاحب رعد مالک نامی پریس کانپور کا مطبع تھا، جہان سے منشی صاحب پہلے ایک مصور رسالہ نکالتے تھے، اور پھر نامی جنتری نکالنے لگے تھے، منشی عبدالرزاق صاحب اوس وقت جیسا کہ یاد آتا ہے، کانپور میونسپلٹی مین ملازم تھے، اور وہین رحمت اللہ رعد اور مولوی عبدالرزاق صاحب مین دوستانہ اتحاد پیدا ہوا، منشی رحمت اللہ رعد صاحب کو سرسید کی تعلیمی تحریک سے دلچسپی اور سرسید کے نورتن سے ادبی لگاؤ تھا، اس تعلق سے مولوی عبدالرزاق صاحب بھی اسی مرکز سے وابستہ ہوئے، اور تاریخ کی دلچسپی کے سبب سے خاص طور سے مولانا شبلی سے اُن کو زیادہ اُنس ہوا، مولینا نے

سلسلۂ فرمانروایانِ اسلام کی بنیا وڈالی تھی، اور المامون لکھ چکے تھے، اور الفاروق کا غلغلہ تھا، اس مناسبت سے مولوی عبد الرزاق صاحب کے ذہن مین "سلسلۂ وزراے اسلام" لکھنے کا خیال آیا، اور سب سے پہلے ۱۸۹۶ء مین البرامکہ اور اس کے ۱۵ برس بعد ۱۹۱۲ء مین نظام الملک سلجوقی لکھی، اور ملک مین بہت مقبول ہوئی، البرامکہ خصوصیت سے زیادہ مقبول ہوئی، اور بہت پڑھی گئی، اور کئی دفعہ چھاپی گئی، اخیر اڈیشن ابھی چند سال ہوئے، مرحوم نے نظرِ ثانی کے بعد مع جدید اضافون کے شائع کیا تھا، ان دو تصنیفات کے علاوہ انھون نے مضامین بھی لکھے ہین، مرزا فرحت شیرازی کی کتاب آثارِ عجم سے لے کر ایرانی یادگارون پر کچھ ان کے مضامین معارف علی گڈھ مین نکلے تھے، زردشت، جاماسپ اور بزرجمہر وغیرہ کے حکایات اور امیرون کے پرانے افسانون سے بھی اُن کو دلچسپی تھی،

مرحوم کی بچاسی سال کی عمر کے لحاظ سے ۱۸۶۳ء مین پیدائش ہوئی ہوگی، اور اُن کے ہوش کا زمانہ سرسید اور اُن کے رفقاء کی جد وجہد کا دور تھا، وہ علی گڈھ جاکر مولانا شبلی کے یہان بھی مقیم ہوتے تھے، اور خود مولانا بھی ندوہ کے تعلق سے کانپور آتے جاتے تھے، اس لئے اس دور کے اکابر اور مشاہیر فن سے ان کی شناسائی تھی، اسی تعلق سے مین نے اُن سے خواہش کی تھی، کہ اپنے زمانہ کے دیکھے ہوئے بزرگون اور ان کی محفلون کے مشاہدات یکجا کر دین، چنانچہ اس زمانہ مین جب سرراس مسعود بھوپال مین وزیرِ تعلیم ہوکر آئے، انھون نے اپنے ان مشاہدات کو قلمبند کیا، اور وہ سلسلہ کسی مقامی پرچہ مین چھپتا رہا، بعد کو ان مطبوعہ اوراق کو میرے پاس بھیجا کہ مین انھین مطبعِ معارف سے شائع کر دون، مگر یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، کاغذ کی نایابی سے وہ ہمارے ہان نہ چھپ سکا، اور مولف کو واپس کر دیا گیا، سنا ہے کہ وہ حیدرآباد دکن سے چھپ کر شائع ہو۔۔

نظام الملک کی قدردانی نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے پوری کی، ریاستِ آصفیہ کی طرف سے اس کے بہت سے نسخے خرید لئے گئے، اور شاید مصنف بھی انعام سے سرفراز ہوئے، اسی سلسلہ مین حیدرآباد

کے ارادہ سے وہ بھوپال وارد ہوئے، اور سرکار عالیہ نواب سلطان جہان بیگم مرحومہ سے ملے، انھون نے ازراہ قدردانی اپنی ریاست مین تحصیلداری کے عہدہ پر مقرر کر دیا، یہ واقعہ ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء کا ہوگا، بعد کو جب کسی ضرورت سے میرا یہاں آنا ہوا تو سابق نواب وحید بہادر کی ڈیوڑھی سے ان کو وابستہ پایا اور ان کی فرمایش سے وہ اس زمانہ مین اُن کے والد نواب احمد علی خان کی سوانحعمری اور افغانان جلال آباد (ضلع مظفر نگر) کی تاریخ قلمبند کر رہے تھے، مین نے مبارکباد دی کہ کیا عجب آپ بھی کسی زمانہ مین یہان کے نظام الملک بن جائین، مگر وحید بہادر نے ۱۹۲۲ء مین وفات پائی، اور سرکار عالیہ نے ان کو تاریخ اسلام لکھنے پر مقرر فرمایا، یہ اس کام کو ایک مدت تک انجام دیتے رہے مگر پھر بساط ایسی الٹی کہ گوشہ نشین ہو گئے، اس کے بعد سر راس مسعود نے اپنی وزارت تعلیم کے عہد مین جب تالیف و ترجمہ کا ایک سرکاری ادارہ قائم کیا، تو مرحوم اس کے اسٹاف مین داخل ہوئے، اور تاریخ بھوپال وغیرہ کی طرح ڈالی، مگر سر راس مسعود کا زمانہ جلد ختم ہو گیا، اور ۱۹۳۵ء مین انتقال کر گئے، تو یہ ادارہ بھی خواب پریشان ہو کر رہ گیا،

وہ ادھر ضعف عمر کے سبب سے کمزور بھی ہو گئے تھے تاہم کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے تھے، اخیر تصنیفات تاریخ اسلام وغیرہ کے مسودات ان کے وارثون کے پاس ہین، اور عجب نہین کہ وہ اُن کو شائع کرین،

مرحوم چونکہ یوپی سے بھوپال آگئے تھے، اور وہان کے علمی و ادبی حلقون سے الگ ہو گئے تھے، اس لئے لوگ ان کو اُن کی زندگی ہی مین بھول چکے تھے، اور انھین خود بھی یہ خیال تھا کہ لوگ انھین مردہ سمجھ چکے ہونگے، اس لئے مجھ سے دو دفعہ غالبًا یہ خواہش کی کہ مین ان کی زندگی کی خوشخبری لوگون کو پہنچا دون چنانچہ معارف کے شذرات مین ان کی یہ تحریرین ہون گی،

مولانا شبلی مرحوم کے دوسرے دوستون کے ساتھ مین جو ادب ملحوظ رکھتا تھا، وہی اُن کے ساتھ رکھتا تھا، اور وہ بھی مجھے اپنے عزیزون مین شمار کرتے تھے، آج اس مساوات کے زمانہ مین ہمارے نوجوان خوردی و بزرگی کے ان آداب کو شاید نہ سمجھ سکین،

۱۰ ر فروری ۱۹۷۲ء کی دوپہر کو دفتر دار المصنفین میں ٹیلیفون سے مجھے کسی نے اطلاع دی کہ رات مولوی عبدالرزاق صاحب نے انتقال کیا، ۲ بجے نماز جنازہ ہوگی اور امین شاہ کے تکیہ میں مدفون ہوں گے، لیکن افسوس کہ جب میں قبرستان میں پہنچا، تو ان کے احباب اور اعزہ ان کو دفن کرکے واپس جا چکے تھے، اور اس وقت ان کی قبر کو مزدور پتھر سے گھیر رہے تھے، دعائے مغفرت پڑھی، اور ان کے عزیز کے گھر جا کر جہاں انھوں نے وفات پائی تھی فرض تعزیت ادا کیا،

مرحوم بلند بالا، خوش خلق اور متواضع تھے، ہر حال میں وہ اپنے علمی کاموں میں منہمک رہتے تھے، اب زمانہ کے حالات میں جو انقلاب ہو رہا ہے اسکو دیکھتے ہوئے ایسے شائقین و خدمتگزاران علم و ادب کی توقع بہت کم کی جا سکتی ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، ص

نواب غلام احمد کلامی مدراس

ہمارے بوڑھے قومی خدمتگزاروں میں مدراس کے ایک بزرگ نواب غلام احمد کلامی تھے، ملت کے کاموں میں ہمیشہ ہاتھ بٹاتے رہے اور ان کی مالی قربانیوں کا دم بھرتے رہے، ندوۃ العلماء کی تحریک سے ان کا تعلق مدراس میں حسن تحریک ہی سے دلچسپی تھی، ان میں ایک نام ان کا بھی ہے، اسی تعلق سے ندوہ کی رودادوں میں ان کے تذکرے آئے ہیں، متعلقین میں مولانا ابوالکلام کے نام کے خطوں میں بھی ان کا ذکر ہے، افسوس ہے کہ مرحوم نے ۹۰ برس کی عمر میں ۲ ستمبر ۱۹۷۲ء (۱۰ رماہ صفر المظفر ۱۳۹۲ھ) کو بروز جمعرات بوقت عصر اس جہان فانی کو الوداع کہا،

ان کا قیام اور کاروبار کولار واقع ریاست میسور میں تھا جہاں سونے کی کان ہے، ریاست میسور کی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمایندگی بھی کرتے تھے اور وہاں کے مسلمانوں کی خدمت کرتے تھے، معارف کے قدردانوں میں تھے، شروع سے آخر دم تک اس کے خریدار رہے، خاکسار کو سب سے پہلے ۱۹۵۲ء میں جب مدراس میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کا اتفاق ہوا تو اس تقریب سے مرحوم کی خدمت میں کولار حاضر ہونے کا بھی موقع ملا تھا، اور انہی کے توسط سے کولار کے طلائی معدن کے کارخانہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس کے بعد میسور کی طرف جب جانا ہوتا تو ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا، کبھی کبھی خط و کتابت کا بھی اتفاق ہوتا تھا، بہت نیک، ملنسار اور متواضع بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

”س“

ادبیات

نعتِ رسول

از جناب ابو طاہر مصلح الدین صاحب ڈھاکہ

مرے ذوقِ طلب کی ہے یہ خامی کہ قسمت مین لکھی ہے تشنہ کامی
زبان کو چشمۂ کوثر سے دھولے یہ کس کا لے رہا ہے نام نامی
جہان مین رحمت اللعالمین ہین محمد مصطفےٰؐ اسمِ گرامی
ملک ہین جن کے در پر سر بسجدہ شہنشاہ ہون کو ہے فخرِ غلامی
ہوا جو زینتِ عرشِ الٰہی شبِ معراج یہ عالی مقامی
بیان ہون کس طرح اسکے فضائل خدا سے جس کو حاصل ہم کلامی
خدا کا وہ، خدائی اس کی ساری الٰہی اس کی یہ عالی مقامی
جو جان و دل سے قربان بنی ہو مقدر مین ہے اس کے شادکامی
مئے وحدت کا نشہ چھا رہا ہے طبیعت مین ہے اک کیفِ دوامی
مین یہ سمجھوں مقدر جاگ اٹھا ہے ترے در کی جو مل جائے غلامی
جو با دل سیرِ یثرب کو روان ہین مرے جذبات دل کے ہیں پیامی

جبیں سے داغِ عصیاں کو مٹا کر
درِ حضرتؐ پہ طاہر دے سلامی

غزل

از

جناب مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

دل کو پھر اضطراب ہوتا ہے پھر وہی پیچ و تاب ہوتا ہے

تم کو معلوم کیا محبت مین کون خانہ خراب ہوتا ہے

کس سے کہئے کہ داغِ دل روشن ہر شبِ ماہتاب ہوتا ہے

ذکر تیرا دلِ حزین کے لئے و دیہ جام شراب ہوتا ہے

نگہِ غور سے اگر دیکھو، ذرہ بھی آفتاب ہوتا ہے

کس کو ہے فردِ جرم سے انکار کیون سوال و جواب ہوتا ہے

یاد سے اس کی بزمِ رنگیں کی تازہ عہدِ شباب ہوتا ہے

جرم بھی بے شمار کرتے ہین عفو بھی بے حساب ہوتا ہے

اُس گُلِ تر کی یاد مین ہر شب فرشِ گُل فرشِ خواب ہوتا ہے

سعیِ پیہم شعار ہو جس کا بس وہی کامیاب ہوتا ہے

آج پھر مائلِ کرم ہین وہ آج پھر فتحِ باب ہوتا ہے

شاعری مین عزیزؔ سچ یہ ہے

وقت خاصا خراب ہوتا ہے

مطبوعات جدیدہ

اسلامی نظریہ اجتماع از جناب مولوی حید زمان صاحب صدیقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۴۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۱۲ؔ، پتہ نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدرآباد دکن،

موجودہ عالمگیر بدامنی اور فساد فی الارض کا سب سے بڑا سبب انسانون کے خود ساختہ اخلاق و روحانیت سے خالی خالص مادی نظامات ہین جن کی بنیاد عالمگیر انسانی اخوت کے بجائے جغرافی وطنیت اور نسلی قومیت پر ہے، اس کے مقابلہ مین اسلام کے نظام اجتماعی کی اساس خداشناسی اخلاق و روحانیت عدل ومساوات، اور عالمگیر قومیت پر ہے اور اس کے سارے اجزا مین یہ روح ساری ہے، یہ مباحث مصنف کا خاص موضوع ہین، اور اس پر معارف مین بھی اُن کے مضامین نکلتے رہتے ہین، اس کتاب مین انھون نے اسلامی نظام اجتماع اور دوسرے مادی نظامون کا فرق اور اسلامی نظام کے فوائد وبرکات اور دنیا وی نظامون کے مفاسد اور نقصانات دکھائے ہین، اور تاریخی حیثیت سے اسلامی نظام اجتماع کی برہمی کے اسباب پر نگاہ ڈالی ہے، اور اس کے بعض اہم اجزا، اسلامی جہاد، تنظیم ملی کی اساس آزادی کے اسلامی مفہوم وغیرہ کی وضاحت کی ہے، موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے کتاب کے مباحث سرسری اور تشنہ ہین، تاہم اُن سے اسلامی نظام اجتماع کا بنیادی تصور سامنے آجاتا ہے، مصنف کی یہ دینی خدمت لائق تحسین لیکن صحیح اسلامی تعلیمات اور اس کے نظام اجتماعی کو پیش کرنے کے لئے یہ ضروری نہین ہے، کہ پوری اسلامی تاریخ پر خط نسخ پھیر دیا جائے، جو واقعہ کے اعتبار سے بھی غلط ہے، یہان تک تو بلاشبہہ صحیح کہ دینی اعتبار سے اسلامی تاریخ کا بہترین دور خلافت راشدہ کا ہے، اس کے بعد ملوکیت قائم ہو گئی

ر اس کے ساتھ اس کی بہت سی برائیاں بھی پیدا ہوگئین، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ دورِ ملوکیت کا
ارا نظام غیر اسلامی تھا، اور تمام اموی خلفاء انتہا درجہ کے عیاش، بدکردار اور ظالم تھے، ہیں ""اور عباسی
لفاء ان سے بھی گئے گذرے تھے، ہیں""، قطعاً غلط ہے وہ دنیا وی بادشاہ تھے، ان مین اچھے بھی تھے برے
ی اور اپنی شخصی کمزوریون کے باوجود ان مین سے بہتون نے اسلام اور مسلمانون کی بہت سی مفید خدمات بھی انجام
ین اس سے تاریخ کا کوئی واقف کار انکار نہین کرسکتا، اور گو ان کا طرزِ حکومت اسلامی روح سے خالی تھا
لیکن حکومت کا قانون اسلامی ہی تھا، یہ اور بات ہے، کہ اس کے تمام اجزاء پر عمل نہ رہ گیا تھا، خلافتِ راشدہ
کے بعد سارے نظامون کو باطل قرار دینے کے معنی تو یہ ہین، کہ اسلامی نظام مین زندہ رہنے کی صلاحیت ہی نہ
تھی کہ وہ ایک تہائی صدی سے زیادہ نہ چل سکا، اور ایک معترض یہ کہہ سکتا ہے، کہ جب اموی اور عباسی
دور مین جو عہدِ رسالت سے اس قدر قریب تھا، یہ نظام قائم نہ رہ سکا، اور اس زمانہ کے بڑے بڑے ائمہ
تابعین اور تبع تابعین، اور دوسرے علماء و اخیارِ امت اس کی اصلاح نہ کر سکے، تو آج جب کہ
ان مین سے کوئی خصوصیت بھی باقی نہین ہے، اس کا احیاء کس طرح ممکن ہے، لیکن اگر ان نظامون کو
باطل اور غیر اسلامی کہنے کے بجائے اس کو نقص و فساد سے تعبیر کیا جائے، تو اس کی اصلاح کی کوشش ہر زمانہ
مین ہو سکتی ہے، مصنف نے تاریخی واقعات کا بھی صرف ایک رُخ دکھایا ہے، خلیفہ منصور نے بلاشبہ حضرت
امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو سزا دی تھی، لیکن محمد مہدی کی حمایت کے جرم مین نہین، بلکہ اس لئے کہ منصور کے
اصرار کے باوجود وہ عہدہ قضا قبول نہین کرتے تھے، گو اس سے منصور کا جرم ہلکا نہین ہو جاتا، لیکن مقصود
واقع کی تصحیح ہے، لیکن اس کے باوجود وہ امام موصوف کے کمال کا اتنا معترف تھا، کہ ان کو قید سے بلوا کر
استفادہ کرتا تھا، اسی طریقہ سے حضرت امام مالک کو مدینہ کے ناقدر شناس والی جعفر نے سزا دی تھی، اس مین
منصور کی مرضی اور منشاء کو کوئی دخل نہ تھا، اس کو جب جعفر کی اس گستاخی کا علم ہوا، تو سخت برہمی ظاہر کی
اور اس کو سزاءً ذلت کے لئے گدھے پر سوار کرکے مدینہ سے بغداد بلوایا، اور امام موصوف سے معذرت کی منصو

امام مالک کی بڑی عظمت کرتا تھا، اس کے بہت سے واقعات تاریخون مین مذکور ہین، واقعات کا صرف ایک رُخ پیش کرنے سے اُن کی تصویر بہت غلط آتی ہے، پوری اسلامی تاریخ کو تاریک دکھانا اسلام کی کوئی اچھی خدمت نہین ہے، اسی طریقہ سے ان اسلامی تعلیمات کی تعبیر جن کا تعلق نئے مسائل اور حالات سے ہے، جدید مذاق کی رعایت سے نئی اصطلاحون مین کرنا بُرا نہین ہے، لیکن اسی حد تک جس سے اُن کے اصل مفہوم و منشا مین فرق نہ آنے پائے، لیکن تجدد کے شوق مین مصنف کے قلم سے کلام مجید کے ترجمہ تک مین لغزش ہوگئی ہے، مثلاً اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِلْعَالَمِیْنَ مین ذکر کا ترجمہ ضابطہ حیات ص ۱۱، اور تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ کی تشریح خیر و شر اور نیک و بد کے اعتبار سے اشیاء کی قدرین متعین کرو، معلوم نہین کس لغت اور تفسیر کے اعتبار سے صحیح ہے، بلکہ اس کے ضابطۂ حیات اور قدرین کی اصطلاح کو خواہ مخواہ لانا مقصود تھا، ایک طرف تو یہ شدت کہ خلافت راشدہ کے علاوہ ساری اسلامی حکومتون کے نظام باطل دوسری طرف یہ تجدد کہ ہر نئی اصطلاح کو خواہ اس کا موقع و محل ہو یا نہ ہو کلام مجید کے ترجمہ تک مین کھپانے کی کوشش کیجاے، ہر چیز مین اعتدال ضروری ہے، امید ہے کہ لائق مصنف آیندہ ان امور مین احتیاط ملحوظ رکھین گے، ایک ہوشیار طبیب کیلئے مرض کے علاج مین مریض کے پورے مزاج کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ورنہ علاج دوسرے امراض کا سبب بن سکتا ہے،

"تاریخ اسلام کے حیرت انگیز کارنامے" مترجمہ جناب عبدالوہاب صاحب ظہوری تقطیع اوسط ضخامت ۳۰۷ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۔/۔ ہے، پتہ نفیس اکیڈمی عابد روڈ، حیدرآباد دکن،

مسلمانون کا عروج و زوال دونون حیرت انگیز واقعات و حوادث پر مشتمل ہے، اُن کے دورِ عروج مین ایشیا افریقہ یورپ تین براعظم ان کی اولوالعزمیون کا جولانگاہ تھے، یورپ سے صدیون ان کا گہرا رابطہ رہا، وہان انھون نے بڑے دیرپا اثرات چھوڑے، اس لئے اُن کی ترقی اور تنزل دونون کے اثرات عالمگیر تھے، مصنف نے اس کتاب مین دونون دورون کے ان واقعات و حوادث کو جن کے عالمگیر اثرات پڑے،

خصوصاً جن کا تعلق یورپ سے ہے، موثر انداز میں جمع کر دیا ہے، مثلاً عربوں کا ظہور ان کی دینی سیادت، یورپ کی حکومتوں سے اُن کے تعلقات، قسطنطنیہ پر پہلا حملہ صلیبی لڑائیاں مغربین ان کے اثرات، قرون وسطی میں غلامی کا رواج، اسلام کی اصلاحات مسلمانوں کی بحری سیادت، اُن کے سمندری کارنامے، مدوما کے معرکے اسلامی اسپین کے اہم واقعات، یہاں اُن کی تمدنی خدمات اسپین سے ان کا زوال، اور اُن کے علمی آثار مارکو پولو کی سیاحت، ابن بطوطہ کی سیاحت اور اس کا درجہ وغیرہ اُس نوع کے اور بہت سے مباحث اور اسلامی تاریخ کے اہم واقعات اس کتاب میں آگئے ہیں، گو بظاہر ان میں باہم کوئی ربط و علاقہ نہیں ہے، اور وہ تاریخ اسلام کی کوئی مسلسل اور مربوط کڑی نہیں معلوم ہوتے، لیکن ان سے ایشیا، افریقہ خصوصاً یورپ سے مسلمانوں کے تعلق اور یہاں اُن کے عروج و زوال کے اثرات کے بہت سے رخ سامنے آجاتے ہیں، اور تاریخ میں اُن کی اہمیت اور اُن کے درجہ کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے، اصل کتاب قاہرہ کے ایک صاحب علم و قلم بیرسٹر عبد اللہ عنان کی تصنیف ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے،

راجپوت اور مغل زن و شو کی معاشرت } از جناب مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، قیمت مجلد ۱۲؎

پتہ:- الہ آباد پبلشنگ ہاؤس الہ آباد،

ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے جو مخلوط تمدن پیدا ہوا جس کی تکمیل تیموریوں کے زمانہ میں ہوئی، ان کی اور راجپوتوں کی قرابت سے جب ہندو تمدن ایوان شاہی میں پہنچا، تو ایرانی تمدن کے اختلاط سے ایک ایسا دو آتشہ بوقلموں اور دلآویز تمدن ہوا جو ہندوستان کا معیاری تمدن قرار پایا، جو ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی سب سے بڑی نشانی ہے، فاضل مولف نے اس کے ایک دلچسپ پہلو "راجپوت اور مغل زن و شو کی معاشرت" پر یہ کتاب لکھی ہے، لیکن یہ موضوع جس قدر دلکش ہے، اسی قدر مشکل بھی ہے، اور تاریخ سے اس معاشرت کا پورا مرقع دکھانا آسان نہیں ہے، اسی لئے چار سو صفحوں

کی اس ضخیم کتاب مین ہندوستان نے مسلمان سلاطین خصوصاً تیموریون اور راجگان ہند کے تعلقات، اُس سے متعلق مختلف واقعات وحالات، اور اس دور کے دوسرے متفرق معلومات تو کافی ہین، اور اس کے حواشی وتعلیقات بھی قابلِ قدر ہین، لیکن اُن کو اصل موضوع سے بہت کم علاقہ ہے، اور یہ حصہ گویا اس کی صرف تمہید ہے، غالبًا کتاب کے دوسرے حصہ مین اس پر بحث ہوگی، تاہم یہ کتاب اس دور سے متعلق مختلف النوع معلومات کا دلچسپ مجموعہ ہے، اور کمن سال مصنف کے قلمی تبرک کی حیثیت رکھتی ہے، موضوع کی دلکشی کے اثر سے جابجا مصنف کے قلم مین جوانی کی رنگینی اور چمک آگئی ہے،

ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط

از جناب محمد معین الدین صاحب دردائی، ایم اے علیگ

تقطیع اوسط، ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت اوسط، قیمت مجلد عہ، پتہ طیب حسن اینڈ برادرس، اسلامیہ بک ڈپو، آرہ،

مذکورہ بالا کتاب مین مصنف نے تاریخی علمی، اور لسانی حیثیت سے ہندی کے مقابلہ مین اردو کی اہمیت، اور لسانی اور صوتی، اور کتابت و طباعت کی سہولتون کے لحاظ سے اردو رسم الخط کی خصوصیات اور اس کی آسانیان دکھائی ہین، اور اس پر جو اعتراضات کئے جاتے ہین، اس کے جوابات دئیے ہین، اور دیوناگری رسم الخط کے نقائص اور اس کی دشواریان ظاہر کی ہین، لیکن راج ہٹ کے مقابلہ مین اس قسم کے سارے سنجیدہ دلائل اور بحثیں بے کار ہین، اردو کا سب سے بڑا عیب اور قصور یہ ہے کہ وہ مسلمانون کے دورِ حکومت کی پیداوار ہے، اور اس مین اسلامی اثرات بھی ہین، اور ہندی اور سنسکرت خالص ہندوؤن کی قدیم زبان اور اسلامی اثرات سے بالکل پاک ہین، اس کے بعد اور کسی دلیل کی ضرورت ہی نہین رہجاتی،

"م"

تابعینؓ

مرتبہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

علم وعمل اور مذہب واخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور اُن کے تربیت یافتہ تابعین
م رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد انہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہؓ
لیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت
ن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت
م جعفرؒ صادق، حضرت محمد حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ
ت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحول شامیؒ، قاضی شریحؒ، وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ
، سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور علمی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

ضخامت :- ۵۶۰ صفحے،

قیمت :- چار روپے،

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرة النبی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرة النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے مین ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہین، اور ابتدار مین ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس مین فن سیرت کی تنقید وتاریخ ہے، دوسرے حصہ مین تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات اعمال وعبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ مین آپ کے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہے، اس مین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہین، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے، جو بروایات صحیحہ ثابت ہین اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط ... تنقید وتفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ مین ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہین کوشش کی گئی ہے کہ اس مین قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائین، پانچوین حصہ مین عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے اور دوسرے عبادات سے اُن کا مقابلہ وموازنہ ہے، چھٹے حصہ مین حقوق، فضائل اور آداب کے عنوان اور اس کی ذیلی سرخیون کے تحت اخلاقی تعلیم کی تفصیل ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول زیر طبع للعہ حصہ دوم تقطیع خورد صہ روپیہ، حصہ سوم تقطیع کلان للعہ تقطیع خورد شعہ، حصہ چہارم تقطیع کلان باختلاف کاغذ صہ روپیہ وتقطیع خورد عہ، حصہ پنجم تقطیع کلان صہ وللعہ وتقطیع خورد صہ روپیہ، حصہ ششم تقطیع کلان صہ للعہ وتقطیع خورد عہ وصہ،

(بکڈپو ... صدیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر ا ۔۱۸۱

اپریل ۱۹۴۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت:- چھ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے مین ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہین، اور ابتدا مین ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس مین فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے دوسرے حصہ مین تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات اعمال وعبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ مین آپکے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہے، اس مین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثین کی گئی ہین، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے، جو بروایات صحیحہ ثابت ہین اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایتون کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے چوتھے حصہ مین ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کیے گئے ہین کوشش کی گئی ہے کہ اس مین قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائین، پانچوین حصہ مین عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے اور دوسرے عبادات سے اُن کا مقابلہ وموازنہ ہے، چھٹے حصہ مین حقوق، فضائل اور آداب کے عنوان اور اس کی ذیلی سرخیون کے تحت اخلاقی تعلیم کی تفصیل ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول زیر طبع للعہ حصہ دوم تقطیع خورد ہے روپیہ، حصہ سوم تقطیع کلان للعہ تقطیع خورد للعہ، حصہ چہارم تقطیع کلان باختلاف کاغذ عہ روپے و تقطیع خورد للعہ، حصہ پنجم تقطیع کلان عہ و للعہ و تقطیع خورد عہ روپیہ، حصہ ششم تقطیع کلان عہ للعہ و تقطیع خورد للعہ عہ،

(… ضیاء الحق احمد،

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۱ اپریل ۱۹۴۸ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈھ

دارالمصنفین کی نئی کتاب

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ،

ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا قافلہ سندھ میں اترا تھا، اوران کی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی، اور وہ ڈیڑھ ہزار سال سے اوپر یہاں کے حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے اُن کے آثار نمایاں ہیں لیکن اس کے باوجود اردو میں اسلامی سندھ کی کوئی مفصل و محققانہ تاریخ موجود نہیں تھی، دارالمصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ مین جن حکومتون کے ماتحت رہا، ان کی پوری تاریخ اوران تمام دورون کے نظام حکومت علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اسکو یاد کرنیکی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت مین شائع ہو رہی ہے، جب سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہاں ایک نئی حکومت کی بنیادین استوار ہو رہی ہین،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے،

قیمت:- چھ روپیے،

منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

جلد ۶۱ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۴۸ء عدد ۴

مضامین

شذرات

ہم گذشتہ مہینہ میں پاکستان میں اردو کے مسئلہ پر اپنے تفصیلی خیالات ظاہر کر چکے ہیں تازہ خبروں سے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ وہاں کی سرکاری زبان اردو ہو گی، یہ دانشمندانہ فیصلہ ہر لحاظ سے پاکستان کے لئے مفید ہو گا لاہور کی اردو کانفرنس میں بھی اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے مناسب تجویزیں پاس ہوئیں، ان پر عمل کی بھی ضرورت ہے لیکن پاکستان کے اس فیصلہ سے ہندوستان میں اردو کے مسئلہ کا حل نہیں ہوتا جس سے کوئی ہوا خواہ اردو دست بردار نہیں ہو سکتا، اس کے لئے برابر کوشش جاری رہنا چاہئے، گو جبری اور مصنوعی طریقہ سے نہ کوئی زبان پیدا کی جا سکتی ہے اور نہ مٹائی جا سکتی ہے، اس لئے اردو کا مٹنا آسان نہیں ہے لیکن اس سے بھی نہیں انکار کیا جا سکتا، کہ زبان کی ترقی و تنزل میں حکومت کی حمایت اور مخالفت کو بڑا دخل ہے خصوصاً ایسی حالت میں جب اس کو قومی مسئلہ بنا دیا جائے،

زبان کا مسئلہ خالص لسانی اور تمدنی تھا، اس کو محض اغراض کی بنا پر سیاسی بنا دیا گیا ہے چنانچہ آج بھی ہندوؤں کی خاصی تعداد بجا طور پر اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتی، اور اس کا برملا اعتراف کرتی ہے جتنی کہ وہ منصف مزاج اور ذمہ دار ہندو بھی جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے اسی کو ہندوستان کی مشترک زبان سمجھتے ہیں، اور جبری زبان سازی کو پسند نہیں کرتے، حال ہی میں مرکزی اسمبلی کے صدر مسٹر ماولنکر نے جن کی مادری زبان غالباً گجراتی ہے بنارس کی ایک تقریر میں زبان کے بارہ میں جو خیالات ظاہر کئے ہیں، وہ مخالفین اردو کے لئے لائق غور ہیں، اُن کے نزدیک:۔

"اردو ہندی کا جھگڑا محض سیاسی ہے اگر تعصب کو ترک کر کے صرف لسانی حیثیت سے اس پر غور کیا جائے، تو بہت سی تلخیاں دور ہو جائیں محض نام کا پابند ہونا حماقت ہے، بعض نام محض اس لئے رکھے گئے ہیں کہ اختلاف پیدا ہو

ہندوستان کی زبان کے لئے ہندوستانی نہایت موزون نام ہے جب پہلی مرتبہ اسمبلی مین مادری زبان مین تقریر کرنے کی اجازت دی گئی تو مقررون نے اردو اور ہندی کی تقریرون مین فارسی اور سنسکرت الفاظ کی بھرمار کردی، لیکن یہ جوش اب ختم ہوگیا ہے، ایک مشترکہ زبان کی بنیاد عصبیت اور اکل کھرے پن پر نہین رکھی جاسکتی" (پائنیر، ۲؍مارچ ۱۹۴۸ء)

اس تقریر مین جس زبان کو ہندوستانی کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی وہ زبان جس مین فارسی، عربی اور سنسکرت الفاظ کی کثرت نہ ہو وہی روزمرہ کی اردو ہے، محض نام کا اختلاف تو کوئی اختلاف ہی نہین تھا، اردو کے بجائے ہندوستانی نام رکھ لینے پر تو کسی کو بھی اعتراض نہین ہوسکتا، لیکن یہان تو مقصد ہی کچھ اور ہے جس کا ثبوت ہر عمل سے مل رہا ہے، بہرحال مسٹر ماولنکر کے ان خیالات سے کس کو اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن جب اصحاب اقتدار کو اس پر غور کرنے کی توفیق ہو۔

یہ عجیب تضاد ہے کہ زبان سے تو اردو کی مخالفت سے برأت ظاہر کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اردو کو بھی ترقی کے مواقع حاصل ہین، لیکن عمل یہ ہے کہ اس کو سرکاری دفاتر سے خارج کیا جارہا ہے، اس کی تعلیمی حیثیت گھٹائی جارہی ہے اور وہ تمام صورتین اختیار کی جارہی ہین، جس سے اردو کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے، صوبہ کی اسمبلی مین بہت سی تقریرین ایسی زبان مین ہوتی ہین جن کو مسلمان نہین سمجھ سکتے، اور اگر ٹوکا جاتا ہے تو ابروے تمکنت پر بل پڑ جاتے ہین، معلوم نہین یہ جمہوریت اور قومیت کی کونسی قسم ہے، ہم ہندی کے مخالف نہین، مسلمانون کو ضرور ہندی پڑھنی چاہئے، اور اس مین اتنی مہارت پیدا کرنی چاہئے کہ ان مین پھر امیر خسرو، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخانان اور میر عبدالجلیل بلگرامی جیسے ہندی کے قادر الکلام شاعر پیدا ہون، لیکن ہندی کو ہندی ہی رکھا جائے، سنسکرت نہ بنایا جائے، جسے ہندو بھی نہ سمجھ سکین، اردو کے ساتھ دشمنی نہ برتی جائے اور اس کو اس کے واجبی حق سے محروم نہ کیا جائے، اگر ہندوستانیون مین قومیت کا صحیح احساس پیدا کرنا ہے، تو حکومت کو ایک نہ ایک دن زبان کے بارہ مین اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا، مشترک زبان کے بغیر ہندوستانی قومیت کی تعمیر نہین ہوسکتی،

یہ بڑے افسوس کا مقام ہو کہ ان حالات میں جب کہ پہلے سے کہیں زیادہ اردو کی خدمت کی ضرورت ہو دہلی کے گذشتہ ہنگامہ میں اردو کے ممتاز اداروں انجمن ترقی اردو اور ندوۃ المصنفین کو جس نے اپنی تھوڑی سی عمر میں علم و ادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں، بڑا نقصان پہنچا، مکتبہ جامعہ بھی برباد ہو گیا، ہم کو ان کے مخلص کارکنوں سے امید ہے کہ وہ ہمت سے اس صدمہ کو برداشت کریں گے، اور اُن کے کاموں پر اس کا مستقل اثر نہ پڑنے پائے گا، اور انجمن ترقی اردو اپنی مہم جاری رکھے گی، اس وقت اس کی جد و جہد کی بڑی ضرورت ہے،

مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے مولانا سید فضل اللہ صاحب استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ نے جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت علم کے ساتھ صلاح و تقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ فرمایا ہو، امام بخاری کی ادبِ المفرد کی عربی میں شرح لکھی ہے، اور ازراہ حسن ظن اس کا مقدمہ اور بعض اجزاء راقم کو بھی مطالعہ اور اظہار رائے کے لئے مرحمت فرمائے ہیں، میں اس کا اہل نہیں، اس کے بارہ میں صحیح رائے تو اصحابِ فن محدثین ہی دے سکتے ہیں لیکن میں نے تعمیلِ ارشاد میں جا بجا سے اس کو پڑھا، اور اپنی محدود نظر کے مطابق یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مولانا نے محنت اور تحقیق کا پورا حق ادا کیا ہو، احادیث کی شرح اُن کے مشکلات کا حل، اجمال کی تفصیل، احادیث کی تخریج، روایات کی تحقیق و تنقید، مسائل کا استنباط وغیرہ ہر پہلو فاضل مصنف کی وسعت علم، دقت نظر، تفقہ اور اجتہاد و فکر کا شاہد ہے، احادیث کی شرح میں بایں ہمہ حافظ ابن حجر اور ابن دقیق العید کی نکتہ سنجی کی جھلک آ جاتی ہے، اور کہیں کہیں پر استدلال کے ساتھ قدماء کی رائے سے اختلاف بھی کیا گیا ہو، زبان سلیس شگفتہ اور ادیبانہ ہے،

اس زمانہ میں جب کہ ہندوستان میں فنِ حدیث کا ذوق گھٹتا جاتا ہو فاضل مصنف کی یہ دینی و علمی خدمت بڑی قابلِ قدر اور لائق ستایش ہو، اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر دے، مولانا اپنے خرچ سے اس کو مصر میں چھپوا بھی رہے ہیں، کتاب کی اہمیت اس کی متقاضی تھی کہ علمی و مذہبی ادارے اور علم دوست اصحابِ ثروت اس کی طبع و اشاعت کی خدمت انجام دیتے، حیدرآباد میں جہاں ایسے اداروں اور قدر دانوں کی کمی نہیں، اس کا سامان ہو جانا کچھ مشکل نہیں ہو،

مقالات

تجدید تعلیم

از

جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی

(۲)

علما پر اعتراضات کی تحقیق آگے کچھ ان سطحی اعتراضات پر گفتگو ہے، جو بالعموم مولویوں اور عربی پڑھنے والوں پر دنیا داروں کی طرف سے کئے جاتے ہین، مثلاً یہ کہ مولوی ہو کر "پست خیالی، کم ہمتی، ذلت پسندی، تنگ چشمی، ودنائت، نیز قوتِ انتظامیہ کی کمی، وغیرہ صفاتِ رذیلہ پیدا ہوجاتی ہین"، اور اس لئے، یہ اولاد کے لئے مولویت کو پسند نہین کرتے، ان الزامات مین جتنی واقعیت ہے اس کو اور اس کے واقعی اسباب کا ذکر تو آگے آتا ہے، پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ زیادہ تر ان کی بنیاد برعکس نہند نام زنگی کافور پر ہے، کہ لوگ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کہنے اور سمجھنے لگے ہین یعنی دنیا دارون نے

"دنیا مین مالی ترقی نہ کرنے کو پست خیالی اور اس ترقی کی فکر و تدبیر نہ کرنے کو جو قناعت ہے کم ہمتی اور اخلاق میں جاہ وکبر حاصل نہ کرنے کو اور وضع مین سادگی اختیار کرنے کو ذلت پسندی اور اپنے پرائے کے حقوق کے امتیاز کو تنگ چشمی اور اسراف نکرنے کو دنائت اور دنیوی فضولیات مین انہماک نہ ہونے کے سبب اپنے بعض مصالح میں فروگذاشت کو قوتِ انتظامیہ کی کمی کا نام رکھ لیا ہے"

سو اکثر اہل علم میں ان امور کا ہونا مسلّم مگر یہ رذائل ہیں یا بخلاف دنیاداروں کے زعم کے فضائل،
تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس فیصلے کے لئے قرآن مجید و حدیث کافی ہے"

"قرآن میں ہے کہ زُیّنَ للنّاس حبّ الشّهوات مِنَ النّسآء وَالبنینَ والقناطیر
المقنطرۃ مِنَ الذّهب والفضّة والخیل المسوّمة والانعام والحرث
ذٰلک متاع الدّنیا واللّٰه عندهٗ حُسن المآب ۔ الّذینَ ضَلّ سَعیهُم
فی الحیوٰة الدّنیا وَهُم یحسبُون انّهم یحسنون صُنعا انّ اللّٰه لا یحبّ
کل مختال فخور ۔ عباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض هونًا واذا خاطبهم
الجاهلون قالوا سلامًا ، لا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل ، انّ المبذّرین
کانوا اخوان الشیاطین وغیرہ آیات اور اُن کے علاوہ حدیث کی کثیر روایات میں غور کیجئے
تو معلوم ہو گا، کہ صفاتِ مذکورہ جو اہلِ علم میں پائے جاتے ہیں، آیا رذائل ہیں، یا فضائل، اُن
معترضین نے ان کا نام رذائل رکھ کر اُن کے مقابل میں جو فضائل ٹھہرائے ہیں، نصوص میں
اُن پر وعیدیں وارد ہیں، اور شریعت میں اُن کے نام یہ ہیں، حرص، طولِ امل، کبر، عجب
اتلافِ حقوق، اسراف و تبذیر، حُبِّ دنیا، غفلت من الآخرہ،

شریعت سے قطع نظر اخلاقی اعتبار سے بھی حرص وغیرہ کا شمار اخلاق ذمیمہ ہی میں ہے
اب ان صفات کو بھی سُن لیجئے، جو علوم دین نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں، اور اس حالت میں
اور زیادہ پیدا ہوتی ہیں، جب کہ علوم دین نہ ہونے کے ساتھ دوسرے علوم باطلہ یا صحبت
اہلِ باطل نے بھی اثر کیا ہو، اُن کے عنوانات یہ ہیں :۔

قارونیت، فرعونیت، ظلم و حمق، جزیرہ جن کا حاصل باالفاظ دیگر وہی حرص و طول امل
وغیرہ ہے، تو اگر علمائے دین کو پست خیال ذلیل وغیرہ کہا جائے، تو اس سے زیادہ مزدوری

کہ مقابل کی جماعت کو فرعون وقارون کہا جائے"

اور اگر ان الفاظ کے صحیح معنی لئے جائین یعنی پست خیالی، یہ کہ فقط اپنی تن پروری وشکم پروری سے مطلب ہو، اور دوسرون کو نفع پہنچانے کا خیال نہ ہو، اور کم ہمتی یہ کہ مشقت سے گھبرائے آرام کی فکر مین رہے، اگو اس سے ضروری حقوق تلف ہونے لگین، اور ذلت یہ کہ مال کو آبرو پر مقدم رکھے، اور اس کی تحصیل مین غیرت وحیا کو طاق پر رکھدے، اور تنگ چشمی یہ کہ ذرا ذرا چیز مین بخل کرے، شریعت ومروت کو چھوڑ دے، تعلقاتِ واجبہ کی پروا نہ کرے، اور دنائت ہی جو حاصل ہے ذلت وتنگ چشمی کا، اور قوتِ انتظامیہ کی کمی یہ کہ اوقات کا پابند نہ ہو، جن ضوابط وآداب معاشرت کے ساتھ دوسرے کے مصالح وابستہ ہون ان کے خلاف کرے جس سے اُن کی مصلحتین فوت ہون،

علما کی اخلاقی کمزوریان علم دین کا اثر نہین ہین

تو بلا شبہہ یہ اخلاقِ رذیلہ ہین، اور یہ بھی مسلم ہے، کہ بعض مصلین علم مین یہ رذائل پائے بھی جاتے ہین لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ علم دین کا خدا نخواستہ اثر ہے، یا کسی اور چیز کا، اس کا فیصلہ اس طرح نہایت آسان ہے کہ یہ اخلاقِ رذیلہ سب اہلِ علم مین پائے جاتے ہین، یا بعض مین پائے جاتے ہین، اور بعض مین نہین، شق اُولی مشاہدہ سے غلط ہے، اور دوسری شق سے اتنا تو ثابت ہو گیا، کہ یہ علم دین کا اثر نہین، ورنہ سب مین ہوتا،

تو ضرور یہ کسی دوسری چیز کا اثر ہے، جو میری تحقیق مین خاندان وصحبت کی کمی ہے، یعنی بعضے خاندانی حیثیت سے پست ودنی ہوتے ہین [illegible] اگر صحبت بھی نہ [illegible] تو نری تعلیم کافی نہین، لا محالہ ان مین خاندانی رذائل [illegible] لگے لیکن ان کے مقابل مین [illegible] اہلِ علم کو کیون نہین دیکھتے، جو عالی خاندان یا فطرۃً سلیم ہین، یا

صحبت نے اُن کو دُرست کر دیا ہے،

اور افسوس ہے کہ اس وقت عالی خاندان لوگوں نے چونکہ سرتاپا انگریزی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے، اور عربی کثرت سے ایسے ہی لوگ پڑھتے ہیں، جو خاندانی طور پر دنی، دیہات میں رہنے کے سبب سے صحبت و تہذیب سے محروم ہوتے ہیں، اور اس میں تبدیل کے اسباب جمع نہیں ہوتے، تو لامحالہ بہت سے لوگ ایسے ہی نظر آئیں گے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علم دین نے پھر بھی ان کو کسی قدر مہذب بنا دیا ہے، ورنہ اور زیادہ بے تہذیب ہوتے، گو ایسی طبیعت کے لوگ انگریزی پڑھتے، تو اُن سے بھی زیادہ رذائل اُن میں پائے جاتے،

زیادہ الزام معزز طبقہ پر ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس الزام کا زیادہ مورد معزز طبقہ ہے جس کے علم دین سے اعراض کی بدولت ادنی خاندان کے لوگ اہلِ علم میں زیادہ پائے جاتے ہیں، جن کو دیکھ کر بقاعدہ للاکثر حکم الکل سب پر یہی گمان کیا جاتا ہے، حالانکہ اگر خاندانی لوگ اپنی اولاد کو علوم دین میں کامل بناتے، تو ان میں کثرت سے علما پائے جاتے، اور بوجہ علو خاندان ان میں فضائل طبعیہ زیادہ ہوتے، اور رذائل مفقود ہوتے، تو جب اکثر علما ایسے نظر آتے، تو للاکثر حکم الکل کے قاعدہ سے عام طور پر علماء کو فضائلِ اخلاق کا جامع سمجھا جاتا، اور علم دین سے بدگمانی نہ ہوتی، چنانچہ جو علما رخاندانی ہیں خصوصاً جن کو اہلِ طریق کی صحبت میسر ہو گئی، ان میں کسی کو پست خیال کم ہمت، تنگ چشم دکھائیے گو ساز و سامان اُن کے پاس امیرانہ نہ ہو پھر بھی اُن کی شان یہ ہے کہ ع

شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

بلکہ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ بدونِ علم دین کے فضائلِ اخلاق و سیر چشمی و بلند نظری، عالی دماغی تہذیب، اعتدالِ افعال و انتظامِ اقوال میسر ہونا ممکن نہیں، چنانچہ بے علم امراء میں

ان اخلاق کا نام نہین ہوتا، لیکن مال کی بدولت خوشامدیون کا اجتماع رہتا ہے، اس لئے اُن کے عیوب پر پردہ پڑا رہتا ہے"،

مولوی سے مراد عالم باعمل ہے

سب سے بڑی اور آخری بات یہ ہے کہ مولوی سے مراد عالم باعمل ہے جس کا نام چاہے، آپ درویش رکھ لیجئے، جو ایسا نہین، ہمارے نزدیک وہ مولویون مین داخل ہی نہین، ہم صرف عربی جاننے والے کو مولوی نہین کہتے، مصر و بیروت مین بہت سے عیسائی، و یہودی عربی دان ہین، (حتی کہ علوم اسلامیہ کے بڑے بڑے واقف ہین، مصر و بیروت کے علاوہ خود یورپ مین) تو کیا ہم اُن کو مقتدائے دین کہنے لگین گے"،

مثلاً اہلِ علم کی وضع و لباس اکثر سادہ کبھی اپنے گھر کا دھلا ہوا کبھی پیوند لگا ہوا کبھی بند یا بٹن کھلا ہوا، دیکھا جاتا ہے، اس سے ان پر تذلل کا شبہہ کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ تواضع ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عزت کا مدار استغنا، اور تذلل کا احتیاج ہے، لباس و وضع کو اس مین دخل نہین، اگر کپڑے پرانے ہین، اور ہفت اقلیم کا بھی دست نگر نہین، تو وہ معزز ہے، اور اگر لباس و وضع نوابون کا سا ہے، ہزارون تنخواہ ہے، ہزارون روپیہ جائداد کی آمدنی ہے، سامان امیرانہ ہے، مگر نظر اس پر ہے کہ اس مقدمہ میں کچھ اور مل جائے، فلان معاملے مین کچھ اور ہاتھ آجائے، تو ایسا شخص بالکل ذلیل ہے"،

ہمارے جدید تعلیم کے معززین اگر عزت و ذلت کے اس صحیح معیار کو پیش نظر رکھ کر خود اپنی عزت کا کچھ مشاہدہ فرمائین، تو انشاء اللہ پھر دین کی تعلیم والون پر ذلت کی نگاہ ڈالنے یا اپنی اس بلند ہمتی کے مقابلہ مین ان کو پست ہمت کہنے کی ہمت نہ ہوگی،

پھر اگر عالم دین واقعی عالم دین ہے، تو اس کو اپنے دینی و علمی مشاغل نماز و روزہ تہجد و تلاوت

درس و تدریس، تعلیم و تبلیغ وغیرہ مین انہماک سے خود اپنے بناؤ سنگار کی طرف توجہ کیسے ہو سکتی ہے، کہ ہر وقت بالون کی درستی اور پتلون کی شکن پر نظر رکھ سکے،

"یہ شخص تو قومی انجن کا ڈرائیور ہے، ڈرائیور کو غسل اور صابون ملنے کی اور کوٹ پتلون کے جھاڑنے کی فرصت کہان، اگر فسٹ اور سکنڈ کلاس کے متنعم اس پر اعتراض کرین تو یہ نہ سمجھین کہ ہم ولایت اسی کی بدولت پہنچے ہین، اور وہان سے ڈگریان حاصل کرکے فسٹ و سکنڈ مین سفر کر رہے ہین، تو نادانی کے سوا کیا ہے"،

اور علوم دین پر کیا موقوف علوم دنیا کے جو سچے اور پکے، طالب ہوتے ہین، وہ بھی اپنی دھن مین لگے رہتے ہین، عورتون کی طرح بناؤ سنگار کی فرصت نہین رکھتے،

تعصب اور غصہ کا اعتراض | کچھ اس طرح کے اعتراضات بھی غریب مولویون پر کئے جاتے ہین، کہ یہ کسی سوال کا جواب نہ بن پڑنے پر یا غلبۂ تعصب سے غصہ کرنے لگتے ہین، اپنی بات رٹے جاتے ہین، دوسرون کی سمجھنے کا قصد نہین کرتے، باہم حسد و نفسانیت کا زور اور ایک دوسرے کی برائی اور بدگوئی مین لگے رہتے ہین،

"اس کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ انگریزی کے فاضلون مین یہ اخلاق بدرجہا زیادہ پائے جاتے ہین، ذرا اختلاف مزاج بات ہو جائے، غصہ سے بیخود ہو جاتے ہین، بات بات مین کبر و نخوت پروری کا اظہار ہوتا ہے، تہذیب کی کمی کا یہ حال کہ جس کی طرف چاہا پشت کر لی، جس کی طرف چاہا پاؤن جوتون سمیت پھیلا دئے، بزرگون کا لحاظ و ادب نہین، مان باپ تک سے مساوات، بلکہ تحقیر کا معاملہ، اس سے زیادہ کیا بیحیائی ہو گی کہ کسی بڑے عہدہ کی طلب مین خواہ تنخواہ نہ ملے، محض جاہ کے لئے ان کی حسد و نفسانیت، بلکہ تو تو مین مین دیکھنے کے قابل ہوتی ہے"،

کالج یونیورسٹی تک کے نام نہاد علمی فضائل اور ان کی کمیٹیون وغیرہ کی بحث و گفتگو اور ان کے

آپس کے تعلقات مین حسد ونفسانیت کے جومناظر چوتھائی صدی سے زیادہ راقم الحروف کے خود ذاتی تجربہ ومشاہدہ مین آتے رہے، اُن سے نام کا یہ مولوی بھی اکثر شرما جاتا تھا،

"بس اتنا فرق ہے کہ اگر اہل علم مین ان اخلاق کا کوئی اثر ہو تو اس کا منشاء اکثر دین ہوتا ہے، اور ان اہلِ ترقی مین اس کا منشاء دنیا ہوتی ہے، مثلاً مولویون کو دین کی بات پر غصہ آوے گا، اور ان حضرات کو دنیا کی بات پر کیونکہ دین کی خود وقعت ہی اُن کے دل مین نہین، اس لئے اُن کو جوش بھی نہین آتا، لہذا اُنکو حلیم اور مولویون کو تندخو قرار دیا ہے یہی حال اور اعتراض کا بھی ہے، یہ تو الزامی جواب تھا،

اور تحقیقی جواب یہ ہے کہ بالکل غلط ہے، کہ علما کو نفس سوال پر غصہ آتا ہے، غصہ اگر آتا ہے، تو اس پر کہ سوال ایک تو بطور استفادہ کے ہوتا ہے، اور وہ سوال بھی ضرورت کا ہو اس پر تو مین دعوی کے ساتھ کہتا ہون کہ کوئی شخص کسی عالم کا ایک جگہ بھی غصہ نہین ثابت کر سکتا، اور ایک سوال بطور تعنت یا تمسخر و مشغلہ یا محض اعتراض والزام کے لئے ہوتا ہے چونکہ اس مین شریعت کی توہین ہوتی ہے تو جس کے دل مین شریعت کی عظمت ہوگی، وہ اس توہین کو کب گوارا کرے گا اسی طرح بعض اوقات سوال مین مخاطب کی اہانت ہوتی، سو اس کی بھی ناگواری طبعی امر ہے، جو مذموم نہین، اسی طرح فضول یا اپنی فہم سے ماورا سوال کیا اور سمجھانے سے سمجھ مین نہ آیا، تو بھی غصہ آجانا طبع سلیم کا مقتضا ہے، جو بجائے خود ایک کمال ہے، چنانچہ سید الانبیاء والعلماء حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خود بعضے لایعنی سوالون پر غصہ فرمانا کثیر حدیثون مین وارد ہے، کیا اگر کوئی شخص عدالت کی توہین کرے، یا عدالت سے کچھ سوال کرے مثلاً ادنی سی بات ہے، کہ درخواست پہ ٹکٹ لگانے کی نسبت پوچھنے لگے کہ ایسا قانون کیون مرتب کیا، یا اس فیس سے نصف فیس کیون نہ مقرر ہوئی، تو کیا

توہین عدالت کو جرم اور اس فضول سوال کو ناگوار اور اگر باز نہ آئے، تو موجب غصہ نہ کہا جائے گا، کیا اس غصہ کو اخلاق رذیلہ مین داخل کیا جائے گا،

کیا مطلق غضب و تشدد کا شمار اخلاق رذیلہ مین ہے، اگر کسی کی عفیفہ ماں کے متعلق کوئی بادِ شرارت سوال کرے، کہ سنا آپ کی والدہ ایک زمانہ مین چکلہ مین بیٹھا کرتی تھین تو کیا کوئی شخص ٹھنڈے دل سے اس کی تغلیط پر دلائل قائم کرے گا، یا اگر ایسا کیا تو شرفا اوس کو بے غیرت قرار نہ دین گے، یا اگر وہ غضب و شدت سے کام لے تو عقلا کے نزدیک غیور و باحمیت ہوگا"

یا اگر آپ کا سائیس درخواست کرے، کہ مجھ کو اقلیدس کی پانچوین شکل اس طرح سمجھا دیجئے کہ نہ اس مین اشکالِ سابقہ کا حوالہ ہو، نہ اصولِ موضوعہ و متعارفہ کا، تو کیا آپ سمجھانے بیٹھ جائین گے، یا فرمائین گے، کہ بھائی یہ تیری سمجھ سے باہر ہے، پھر بھی اگر وہ اصرار کرے، تو کیا آپ اس کو گدہا، احمق نہ کہنے لگین گے، اور کیا ایسا کہنے سے کوئی یہ کہے گا کہ آپ کو جواب نہین آتا،

(۷) تہذیب کا معاملہ اس کی نسبت کیسی دقیق و عمیق حقیقت کی جانب اشارہ فرمایا گیا ہے تہذیب کا معیار صرف مذہب صحیح ہوسکتا ہے، باقی آج کل،

"تہذیب کا معیار جو یورپ کا رسم و رواج سمجھ لیا گیا ہے، تو خود اس معیار کے صحیح ہونے کی کیا دلیل ہو کیا اہلِ یورپ کی کوئی رسم تہذیب سے گری ہوئی نہین، معیار دو ہی چیزین ہوسکتی ہین، عقل سلیم یا مذہب صحیح، مگر سلیم ہونے کے لئے پھر بھی کسی معیار کی ضرورت ہوگی، کیونکہ عقل متفاوت ہین، بس معیار ہونے کی صلاحیت صرف مذہب صحیح مین ہوسکتی ہے جب تہذیب کا معیار مذہب صحیح اور دینِ الٰہی قرار دیا گیا، تو خلاف تہذیب

کا مصداق خلاف دین ہوا، تو اب دیکھ لیجئے، کہ دین کے خلاف علماء مین زیادہ اقوال پائے جاتے ہین، یا غیر علماء مین اس سے معلوم ہو جائے گا کہ بے تہذیب کون کہلانے کا مستحق زیادہ ہے،

باہمی اختلافات کا شبہ | ایک شبہہ یہ ہے کہ مولویون مین اکثر مسئلون مین اختلاف ہوتا ہے جس سے لوگون کو عمل کرنے مین سخت حیرت ہوتی ہے، کہ کس پر عمل کرین، جواب یہ ہے کہ کیا اطباء مین باہم تشخیص و تجویز مین اختلاف نہین ہوتا، اور کیا کوئی شخص اپنے مریض کو بلا علاج ہی چھوڑ دیتا ہے، کہ اختلاف کی حالت مین کس کا علاج کرین، تو لاؤ سب ہی کو چھوڑ دین، بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کون طبیب زیادہ تجربہ کار اور ماہر فن ہے اور کس کے ہاتھ سے مریض زیادہ شفایاب ہوتے ہین، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ آدمی جس امر کو ضروری سمجھتا ہے، اس مین ایسے اختلافات سنگ راہ نہیں ہوتے پھر کیا ہر اختلاف ہر شخص کے لئے مذموم ہی ہے، اگر ایسا ہے تو چاہئے کہ عدالت مین جب کوئی مقدمہ پیش ہو تو عدالت بجاے اس کے کہ تنقیح و تحقیق کا بار اپنے ذمہ لے محض اس بنا پر کہ یہ لوگ باہم اختلاف کرتے ہین، اور اختلاف مطلقاً مذموم ہے فریقین کو ہمیشہ سزا کر دیا کرین، کہ ایسے جرم اختلاف کے کیون مرتکب ہوئے، یا اگر سزا نہ کرے تو کم از کم مقدمہ کو خارج ہی کر دیا جائے، اس سے صاف معلوم ہوا کہ اہل اختلاف مین سے ہر ایک کو الزام دینا اور دونون کو محض اتفاق کا مشورہ دینا عظیم غلطی ہے بلکہ پہلے تحقیق کر کے معلوم کرین کہ کون حق پر اور کون باطل پر ہے، جو حق پر ہو، اس کی طرف ہو کر صاحب باطل کو مجبور کرین اور راے دین کہ تم کو اختلاف کرنا جائز نہین،

فتوے مین مصلحت زمانہ کے لحاظ نہ کرنے کا اعتراض | ایک اعتراض یہ ہے کہ علماء اپنے فتاوی مین مصلحت زمانہ

کا لحاظ نہیں کرتے، وہی پرانے مسائل تبلاتے چلے جاتے ہین، زمانہ بدل گیا ہے اب علما کو چاہئے، کہ سود وغیرہ معاملات کو درست قرار دین، اس اعتراض کا باطل (بلکہ مہمل) ہونا ظاہر ہے، اس لئے کہ شریعت کے احکام اگر کسی بشر کے بنائے ہوے ہوتے تو اس احتمال کی گنجایش تھی، کہ اس کی نظر آیندہ مصالح پر نہ تھی، لیکن جب احکام شرع خداتعالیٰ کے مقرر کئے ہوے ہین، جس سے قیامت تک کے مصالح کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی مخفی نہین، تو یہ احتمال ہی کب ہے، کہ ان مین آیندہ کے مصالح کی رعایت نہین، بلکہ جس مصلحت کی اس مین رعایت نہین، وہ مصلحت ہی نہین"،

رہے اجتہادی احکام تو اجتہاد بھی مجتہد یا علما اپنے دل سے نہین کرتے، وہ بھی کتاب و سنت ہی پر مبنی اور اس سے مستنبط ہوتے ہین، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قیاس مثبت نہین مظہر ہوتا ہے یعنی وہ خود کسی بات کو اپنی طرف سے ثابت نہین کرتا، بلکہ جو کچھ قرآن و حدیث سے ثابت ہے، اسی کو ظاہر کر دیتا ہے، اور پھر قیاس بھی کیسے مجتہدین کا جن کا علم و فہم، تقوی و تدین ایسا غیر معمولی تھا، کہ کم از کم ہمارے مقابلہ مین ان سے خطا و لغزش کا بہت کم احتمال ہے، پھر اس خطائے اجتہادی پر مواخذہ نہین، بلکہ اجر ہے، اس لئے کہ اگر اجتہاد کے شرائط کسی مین موجود ہین، اور اس نے ہر طرح تحقیق کا حق ادا کیا، تو ماجور ہوگا، اور اگر از راہ بشریت حق کے ادا کرنے پر بھی خطا کی تو معذور ہے،

گوشہ گیری کا اعتراض ایک اعتراض مولویون پر یہ ہے کہ یہ اپنے گھرون مسجدون اور مدرسون مین بیٹھے رہتے ہین، قوم کی تباہی پر رحم نہین آتا، کہ گھرون سے نکل کر گمراہون کی دستگیری کرین، لوگ بگڑتے چلے جاتے ہین، کوئی اسلام چھوڑ رہا ہے، کوئی احکام سے بے خبر ہے"

تو اولاً تو مختلف ذرائع سے اسلام و احکام کی اتنی اشاعت ہو چکی ہے، کہ اب تبلیغ کے وجوب کا درجہ باقی نہین رہا، جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا اور سمجھتا ہے، اگر اس کو اپنے اسلام اور دین کی کچھ بھی قدر

اور پیدا ہو تو طرح طرح کی واہیات اور خرافات کتابین اخبارات و رسائل وغیرہ تک پڑھنے سننے مین وقت صرف کرتا، اور لڑائی بھڑائی مین دنیا بھر کی واہی تباہی خبرین معلوم کرنے مین لگا رہتا ہے، تو کیا دین کی کتابین اور رسالے نہین پڑھ اور سن سکتا، یا جاننے والون سے مسئلے مسائل نہین دریافت کر سکتا، اسی طرح غیر قومون نے کیا اسلام کا نام نہین سُنا، اور اگر مذہب کوئی اہم معاملہ ہے، تو کیا وہ آسانی سے دو ایک رسالے پڑھ یا سُن کر اتنا نہین معلوم کر سکتے، کہ اسلام ہے کیا، اور وہ اصولاً چاہتا اور کہتا کیا ہے،

اس کے علاوہ مسجدون اور مدرسون مین جو مولوی پڑے ہین، وہ بھی تو آخر کچھ نہ کچھ اپنی بساط بھر دین کی خدمت کر رہے ہین، تاہم تبلیغ اس مین شک نہین، کہ دین کی بہت بڑی، بلکہ سب سے بڑی اور اعلیٰ خدمت ہے لیکن

"کیا اسلام کی یہ خدمت صرف علمار ہی کے ذمہ ہے، دنیا دار اور مالدار مسلمانون کے ذمہ نہین؟ کیا وہ اتنا نہین سمجھ سکتے کہ علمار کو معاش سے فراغ نہین، لہذا آپس مین سرمایہ جمع کر کے علمار کی ایک جماعت کو اس کام کے لئے مقرر کر دین، جس طرح مشنری لوگ بڑے بڑے مشاہرے پا رہے ہین، جابجا لکچر دیتے اور رسائل تقسیم کرتے پھرتے ہین،

" اور ہمارے معترضین کو علمار پر جو یہ اعتراض سوجھا وہ انہی مشنریون کی مساعی دیکھکر اور یہ اس وقت عام عادت ہوگئی ہے، کہ اصل حقیقت مین غور نہین کرتے بس غیرون کے رسم ورواج کو اپنا رہنما اور معیار استحسان قرار دے لیا ہے حقیقت بینی سے قطعاً یہ بھی نہ دیکھا کہ اپنے علمار پر اُن کے علمار کے برابر سعی نہ کرنے کا الزام دینے سے پہلے یہ بھی دیکھ لین، کہ آیا ہمارے دنیا داران کے برابر اعانت مالی بھی کرتے ہین یا نہین؟"

حالانکہ بیچارے ہمارے بدنام "مولوی" اب بھی اتنے قانع اور قلیل المصارف ہین کہ مشنریون سے

بہت کم پر گذر کر سکتے ہیں لیکن اپنے بال بچوں کے واجبات اور حقوق نفس کا ادا کرنا بھی تو شریعت ہی کا
حکم ہے، اور مستحب تبلیغ کے مقابلے میں واجب بلکہ واجب تبلیغ پر بھی مقدم ہے، اس سے معلوم ہوا کہ
زیادہ کس کا ہے، ؟ دنیا داروں اور مالداروں کا یا مولویوں کا، غرض تبلیغ و اشاعت کا وجوب
علما رکے ساتھ خاص نہیں، سب مسلمانوں پر اپنی وسعت و اہلیت کے بقدر واجب ہے"

تحریر و تقریر میں تصور کا شبہہ | ایک شبہہ عربی کے طالب علموں اور علما پر یہ بھی کیا جاتا ہے
کہ یہ لوگ تقریر و تحریر میں قاصر رہتے ہیں، تو یہ کلی حکم تو نہایت بے انصافی ہے، کیا علما
و طلبار میں بہت سے ایسے بجد خوش تحریر و خوش تقریر نہیں پائے جاتے جن کا مقابلہ دوسری
تعلیم کا بڑا سے بڑا فاضل بھی نہیں کر سکتا"
البتہ اتنی ضرورت اس زمانہ میں ضرور معلوم ہوتی ہے، کہ خوش تحریری و تقریر ی کی مشق
کا اہتمام بھی مدارس میں بالالتزام کیا جائے، اور طلبار کا اختیاری امر نہ رہے، بلکہ سب کو
اس امر پر مجبور کیا جائے"

شاید ندوہ والوں کا خیال ہو کہ اس جدید ضرورت کا احساس پہلے پہل انہی کو ہوا، لیکن علما
کی نظر کسی جدید ضرورت سے کیسے محجوب رہ سکتی تھی، یہ اور بات ہے کہ قدیم درسگاہوں نے اس تجدید
کرنے میں تاخیر کی، اور ندوہ کی تعجیل قابلِ تحسین ہے، لیکن وہاں یہ استحسان اعتدال کی حد سے نکل کر
غیر مستحسن حد کو پہنچ گیا ہے، یعنی ندوی اب اپنا اصلی کمال انشا پردازی اور انشا نگاری ہی کو جانتے
ہیں، حتی کہ اس کے پیچھے درسیات میں استعداد کی بھی پروا نہیں کرتے، اور دوران طالب علمی میں ع
درسی کتابوں سے زیادہ اردو کی انشا پردازانہ کتابوں کی طلب و مطالعہ میں لگ جاتے ہیں، ابھی
(۱۱ رجون ۱۹۴۸ء) یہ سطریں لکھ ہی چکا تھا کہ روزنامہ تنویر میں طلباء ندوہ کی جمعیۃ الاصلاح
کا رنامہ چھپا اور پڑھا تھا کہ" علمی وادبی مجالس میں دلچسپی اور انشا پردازی اور تقاریر کی طرف اشتیاق

پایا جاتا ہے" یہی نہیں اور آگے اصلی ندویت یہ لیجئے کہ "جن حضرات نے زیادہ دلچسپی لی، اور ہمیشہ اپنی تقریروں سے جلسہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، انھیں کپ دمڈل دے کر ہمت افزائی کی گئی، غریب طلباء سے زیادہ علماء ندوہ اور منتظمین ندوہ کو سوچنا چاہئے کہ اغیار کی اس نقالی کے سوا ہمت افزائی کا کیا اور کوئی طریقہ نہیں، اور اس نقالی کے مفاسد کہاں تک جاتے ہیں، اور غیروں کی تقلید و اتباع کی اس سے کتنی ہمت افزائی ہوتی ہے، ہمارے مشہور خوش تحریر و خوش تقریر غیر ندوی فاضل اجل مولانا گیلانی نے تو اسی بنا پر ندوہ کا نام "مدرسۃ الصحافۃ والخطابۃ" رکھ دیا ہے، اس کے علاوہ جن کو فطری مناسبت نہیں ان کو مجبور کرنے اور مشق کرنے سے بھی طوطے ہی بنے رہیں گے، اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ پہلے اندازہ کر لیا جائے، اور جن کو مناسبت نہ ہو، ان کو اپنا وقت خراب نہ کرنے دیا جائے، جیسا کہ حضرت نے ہدایت فرمائی ہے، کہ "پھر بھی ایسے لوگ ثابت ہوں گے جن کو فطری طور پر تقریر و تحریر سے کم مناسبت ہوگی، سو ایسے لوگ اپنے عمل کیلئے علم حاصل کریں، دوسروں کے افادہ کے لئے اور بہت سے لوگ مل سکیں گے، یہ کیا فرض ہے کہ ہر کام ہر شخص کرے" (ص ۳۲)

علماء کی وقعت اور عظمت کی حفاظت نہایت اہم ہے

عربی و دینی تعلیم کے طلبا و علماء کو طرح طرح کے معقول و نامعقول صحیح و غلط اعتراضات کا ہدف بنانا، خصوصاً نئے فیشن کے لوگوں میں جو ایک فیشن بن گیا ہے، اس کی طرف جامع المجددین علیہ الرحمۃ نے جو اس قدر بلیغ توجہ فرمائی، اور راقم ہذا نے اس کے بیشتر حصہ کی تلخیص ضروری جانی، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تعلیم و تبلیغ کی اصلاح و تجدید کے سلسلہ میں حضرت کی نگاہ تجدید میں دین کی حفاظت کے لئے علماء و فقہاء کی وقعت و عظمت کی حفاظت اہم و اقدم ہے،

اس لئے کہ سارے مسلمان سارے اسلامی علوم اور احکام و مسائل کے عالم و محقق نہ کبھی ہوئے ہیں نہ آئندہ ہوں گے، لازماً اگر کوئی خاص جماعت "ولتکن منکم" کے تحت ہمیشہ اور ہر عہد میں نہ موجود رہے تو جمہور مسلمین کو ایمان اور عمل صالح کے مختلف ابواب اور شعبوں کے احکام آخر کون بتائے، اور کس سے معلوم کریں یہی نہیں بلکہ اگر خدانخواستہ علماء کی جماعت کسی عہد یا کسی نسل میں بالکلیہ ناپید ہو جائے، تو دین کا وجود ہی

خطرہ میں پڑجائے، خالی کتابوں اور کتبخانوں سے دین ہرگز محفوظ نہیں رہ سکتا، جب تک ان کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ تواتر کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ مستمر نہ رہے، خوب یاد رہنا چاہئے، کہ زبانی یا درسی تعلیم و تعلم کا تسلسل و تواتر ٹوٹ جانے سے خالی کتاب سے ہر چیز کا صحیح سمجھ لینا بھی ممکن نہیں، ایک عالم نفسیات خوب سمجھ سکتا ہے کہ کتابوں کی فہم کی استعداد بھی زبانی تفہیم کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے، شرح و حواشی بھی زبانی فہم و تفہیم سے مستغنی نہیں بنا سکتے، کسی معمولی فن کو بھی جس نے استاذ سے نہیں پڑھا ہے، محض کتابوں سے بیسیوں مقامات پر ٹھوکر کھائے گا،

غرض جب علماء کا وجود ایک طرف دین کی تعلیم و تبلیغ کے لئے اور دوسری طرف اس کی بقاء و تحفظ کے لئے ناگزیر ہے، تو اگر امت کے اندر یہ جماعت خدا نا کردہ موجود نہ رہے، یا موجود ہو اور اس کی اتنی تحقیر و توہین جا بجا الزامات سے دلوں میں راسخ کر دیا جائے کہ لوگ ان سے بیزار ہو کر استفادہ نہ کریں، تو پھر علماً و تعلیماً اور بالآخر عملاً معاذ اللہ دین کے فنا ہو جانے کے سوا اور کیا نتیجہ ہوگا، گو جس دین کی حفاظت خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہو وہ فنا نہیں کیا جا سکتا، لیکن کیا اس سے ہم اپنے واجبات سے سبکدوش اور مواخذہ سے بری ہو جا سکتے ہیں، حضرت کی کتابوں اور مواعظ و ملفوظات وغیرہ سب میں کثرت سے اس پر تنبیہات موجود ہیں، کہ ہر مسلمان کو کسی نہ کسی عالم سے تعلق رکھنا، اور احکام دریافت کرتے رہنا ضروری ہے، بالکل اسی طرح، بلکہ اس سے بڑھ کر جیسے ہر شخص یا ہر خاندان کسی طبیب سے عادۃً تعلق رکھتا ہے، اور چھوٹی بڑی بیماریوں میں زیادہ تر اسی کی طرف رجوع کرتا رہتا ہے، کیا روحانی صحت جسمانی صحت کے برابر بھی لائق التفات نہیں، اگر قریب کوئی عالم نہیں ہے، تو حضرت کی تاکید ہے کہ دور ہی کے کسی عالم سے تعلق رکھے، اور خط و کتابت سے احکام معلوم کرتا رہے، اسی طرح دینی مدارس قائم کرنے اور جو قائم ہیں اُن کی حفاظت و ترقی کی تاکید جا بجا فرمائی ہے، کیونکہ ہماری گاڑی کے انجن ڈرائیور یہیں سے پیدا ہوتے ہیں، اگر خدانخواستہ عربی درسگاہوں سے اُن کی فراہمی منقطع ہو جائے تو

امراء کے فرسٹ وسکنڈ متوسطین کے انٹر او بزرگ عوام کے تھرڈ، سارے کے سارے ڈبے اپنی جگہ بے حرکت کھڑے رہ جائیں، ہر طبقہ کی دینی حیات و حرکت ان مدرسوں سے نکلے ہوئے بُرے بھلے علماء یا مولویوں ہی کے دم سے قائم ہے، اور جس قدر اُمت کے مختلف طبقات اپنی اپنی اہلیت وحیثیت کے موافق ہماری دینی گاڑی کے ان ڈرائیوروں یا ہلانیوالوں کی بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت، خدمت و اعانت کا بند و بست کریں گے، اسی قدر ہماری دینی حرکت وحیات جاندار و پائدار ہوگی، اور اسی نسبت سے انشاء اللہ دنیا بھی درست ہوگی۔

علم دین کے حقوق طلباء وعلماء پر — یہاں تک ان حقوق کی علم پر گفتگو تھی، جو زیادہ تر عامۂ مسلمین کے ذمہ ہیں، آگے باب دوم میں ایسے حقوقِ علم میں کوتاہیوں اور اُن کی اصلاح کو بیان فرمایا گیا ہے جو خود علم دین کے طلباء وعلماء پر ہیں

"بعض طلباء یہ خیال کرتے ہیں، کہ ابھی تو ہمارا تحصیل علم کا زمانہ ہے، اس میں عمل کی چنداں ضرورت نہیں، یہ سراسر شیطانی دھوکا ہے، نصوص نے وجوبِ احکام میں طلباء وعلماء میں کہیں فرق نہیں کیا، البتہ اعمال زائدہ جیسے طویل اوراد یا مجاہدات، ریاضات کہ اُن میں مشغول ہونے سے طالب علم کے لئے مطالعہ اور تکرار سبق افضل ہے"،

بعض نام نہاد علماء علوم دین کو دنیا طلبی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، خواہ طلبِ جاہ ہو، یا طلب مال، لیکن اُن پر سب کو نہ قیاس کرنا چاہئے "کیا کوئی اناڑی عطائی آدمی خلافِ اصول طب کسی کا علاج کرے یا کسی کو دھوکا دیکر ٹھگ لے، تو اس سے ملک کے تمام ماہرین اطباء کے کمال کی نفی جائز ہوگی"، بہرحال:-

"بعضے ایسا کرتے ہیں کہ وعظ کو پیشہ بنا لیتے ہیں، اور اسی غرض سے وعظ کرتے پھرتے ہیں، کہ کچھ وصول ہو، اور اس قسم کی وعیدوں کو بھلا دیتے ہیں، کہ مثلاً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ

من تعلم علمًا ممّا يبتغى به وجه	جس نے اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے
الله لا يتعلمه الا ليصيب به	علم کو دنیا کی کسی غرض سے سیکھا اس
عرضًا من الدّنيا لم يجد عرف	کو قیامت میں جنت کی بو بھی نصیب
الجنة يوم القيامة	نہ ہوگی،

علم دین کے دینی و دنیوی استعمال مین فرق

البتہ جس طرح اوپر آیت للفقراء الذین احصروا کے تحت وعظ کی نوکری کا جائز ہونا معلوم ہوچکا، اسی طرح اگر اشاعت احکام، محض حسبۃً للہ ہو، اور لوگ کچھ خدمت کردین جس کی قلب مین طمع نہ ہو، (گو احتمال وسوسہ ہو) تو وہ جائز ہے، اور اس کا امتحان یہ ہے کہ وعظ کیلئے یہ شخص کن مقامات کو منتخب کرتا ہے، اُن کو جہان روپیہ ملنے کی زیادہ اُمید ہے، یا اُن کو جہان تبلیغ، حکام کی زیادہ ضرورت ہے یہی امتحان علوم دینیہ کی تدریس کی نوکری کا ہے، کہ اگر تنخواہ پر نظر نہو گی، تو جس صورت مین ایک جگہ پر گذر ہوا ہوگا، اور وہان علوم دینیہ کی ضرورت بھی زیادہ ہو، تو ایسی جگہ کو چھوڑکر ترقی پر نہ جائے گا، اور نہ خود کوشش کرکے ایسی جگہ جانا چاہے گا، اور فقہا رنے جو تعلیم علوم دینیہ اور وعظ پر اُجرت کی اجازت دی ہے، اس سے مراد یہی صورت ہے، ورنہ حنفیہ رحمہم اللہ طاعات مقصودہ پر اُجرت کو بوجہ نہی کے کسی طرح جائز نہین رکھتے"

علما رکا امرار سے اختلاط

بعض علما، امرا، و اہل اموال سے اختلاط اسی غرض سے رکھتے ہین، کہ اُن سے وقتًا فوقتًا کچھ حاصل ہوتا رہے، اس مین کاہے یہان تک نوبت آتی ہے، کہ اُن کی غرض سے مسئلہ بتا دیتے یا بنا لیتے ہین، جس سے سردست تو وہ خوش ہوجاتے ہین، لیکن بہت جلد ہی ایسے علما ر اُن کی نظر سے گر جاتے ہین"

ان پر تمام علماء کو قیاس کر کے جماعت کی جماعت سے نفور ہو جاتے ہین"
اگر اس اختلاط سے امرار کی اصلاح ہو، کہ ان کو احکام دینیہ بتلائے جائین، خصوص
وہ خود خواہش کرین، اور اُن کو حاضر ہونے کی مہلت نہ ہو، تو ایسا اختلاط نہ
ہے نہ موجب مذلت، مگر جب قرائن یا شرائط سے یہ معلوم ہو کہ آزادی کے ساتھ حق ظاہر
سکے گا، اور ایسی حالت مین اگر وہ کچھ خدمت کرین تو لینے مین کچھ مضائقہ نہین، مگر
مشورہ یہی ہے، کہ ہرگز قبول نہ کرے، بلکہ جانے کے قبل شرط کرے، کہ لینے دینے
قصہ نہ ہوگا، جس کا اثر فطری طور پر بہت اچھا ہوتا ہے، کیونکہ اس صورت مین
کا حوصلہ نہین پڑتا، کہ علمار کو اپنا تابع بنانے کا وسوسہ بھی دل مین لائین، بلکہ
رح انہی کو تابع ہونا پڑتا ہے، اور یہی امر قسم بالشان ہے اور اگر خود امرا آئین تو یہ اختلاط
ین عین مطلوب ہے اُن سے بے رُخی نہ کرے اخلاق سے پیش آئے مگر استغنار کو اب بھی ہاتھ سے نہ دے

حیلہ بتانا | بعض علما، کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری غنی بنایا ہے، اُن کو کسی کے ہاتھ کی
ن دیکھنے کی نوبت نہین آتی، لیکن اپنے مالی معاملات مین ایسا کرتے ہین، کہ اگر شریعت
عمل کرنے سے کوئی اُن کی مالی منفعت ضائع ہوتی ہو تو ضعیف تاویلون اور غیر مشروط
حیلون سے (گو نام اُن کا حیلہ شرعی رکھتے ہین) کام لیتے ہین، یہان تک کہ عام لوگون
زبان زد ہو گیا ہے، کہ مولوی اپنے مطلب کا مسئلہ جس طرح چاہتے ہین بنا لیتے ہین
ری نزدیک اگر گناہ کر کے اپنے کو گنہگار سمجھے اور گناہگار ہونے کا اقرار کرے تو اتنا مفسدہ نہین جتنا گناہ
کھینچ تان کر جائز بنانے مین مفسدہ ہے، اس سے عام لوگ گمراہ ہوتے علمار سے بداعتقاد ہوتے اور یہ بھی
اپنے معاملات مین تاویلین اور حیلے پوچھتے ہین، اور اگر کوئی نہین بتاتا تو قیاس فاسد سے خود ہی اپنی من سمجھوتی کر لیتے ہین

عوام کی حفاظت | علمار کی شان تو یہ ہے کہ اگر کوئی چیز بلا تاویل بھی جائز ہو، مگر کسی وجہ

سے اوس کے ارتکاب میں عوام کی دینی مضرت ہو تو اپنا ضرر بقصد تحمل گوارا کریں لیکن عوام کا دین بچائیں، نہ کہ اُن کے لئے فتنہ کا دروازہ کھول دیں لیکن اس سے صحیح معاملات کی ان وجوہ پر (گو اُن کو بھی بعض کتابوں میں حیلہ سے تعبیر کیا گیا ہے) کوئی شبہ نہ کرے، جن میں بلا کسی نفسانی غرض کے، عام مسلمانوں کو تنگی سے نکالنے اور معاصی سے بچانے کیلئے اذن دیا گیا ہے، جیسا کہ خود حدیث میں ہے کہ بع الجمع بالدراھم ثم ابتع بالدراہم الجنیب وغیرہ ہے، فرق دونوں میں یہ ہے کہ جس سے مقصود کسی شرعی مقصود کا ابطال ہو، وہ مذموم ہے اور جس کا مقصود کسی مقصود شرعی کا حاصل کرنا ہو، وہ محمود ہے، مثلاً ربوا مقصود نہ ہو بلکہ خود اجناس ہی قیمت میں متفاوت ہوں لیکن اتحاد بدلین کے سبب تفاضل ممنوع ہو وہاں حدیث مذکور کے موافق تصحیح کر لینا جائز و مشروع ہے"،

علماء کی جاہ طلبی | یہ تو بصورتِ مال دنیا طلبی تھی، بصورتِ جاہ دنیا طلبی کی چند صورتیں ملاحظہ ہوں،

"بعضے علماء اس لئے امرا سے ملتے ہیں، کہ لوگوں میں عزت و وقعت بڑھے گی، حالانکہ عام مسلمان اس کو اہل علم کے لئے عیب سمجھتے ہیں، واقع میں بھی علماء کی عزت و شان کے لئے یہی مناسب ہے کہ دین کی خدمت کریں، امراء سے مستغنی رہیں، غربا کے ساتھ خوش خلقی کریں، اور امراء کی نظر میں تو اس سے اچھی خاصی ذلت ہوتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ خوشامد کے لئے ملتے ہیں، اور ایک اثر امراء و غربا، دونوں پر ایسا ہوتا ہے، کہ تحقیق دین اور فتویٰ کے باب میں اعتبار اٹھ جاتا ہے، ان کے وعظ فتوی اور تقریر پر وثوق نہیں رہتا، خیال ہوتا ہے کہ شاید دنیا داروں کی خوشامد میں ایسا کرتے ہیں"،

لیکن ایک اثر جو خود علماء پر امراء کی صحبت کا پڑتا ہے، وہ تو اتنا خطرناک ہے، کہ بالآخر اُن کے دین ہی کو لے ڈوبتا ہے، یعنی امراء کے منکرات پر روک ٹوک ان کے لئے دشوار ہو جاتی ہے، کیونکہ پھر تو

ان سے لطف صحبت ہی باقی رہنا متصل ہوگا، جانبین کو انقباض ہوگا، اور چونکہ امراء کو بالعموم مخدوم بنا کر ملا جاتا ہے، ان کی خلاف شرع حرکتوں پر سکوت کرنا پڑتا ہے،

جس سے علماء کے اندر مداہنت کی کیفیت پیدا ہوتی اور صحبت کی ترقی سے اس میں ترقی ہوتی ہے، حتی کہ قلب سے اس کا اثر زبان پر آتا ہے یعنی پہلے قلب میں حق کی عظمت اور باطل سے نفرت کم ہو جاتی ہے، پھر زبان سے اظہار حق کی ہمت گھٹتی ہے، پھر باطل کا اظہار خفیف معلوم ہونے لگتا ہے، پھر اس کا صدور ہونے لگتا ہے، حتی کہ ان امراء کو اس کا احساس ہو کر اتنا حوصلہ ہو جاتا ہے کہ اپنی نفسانی خواہشوں کے موافق ان علماء سے توجیہات کی فرمایش کرنے لگتے ہیں، اور یہ اُن کو پورا کرنے لگتے ہیں،

اس مقام پر پہنچ کر اُن کا قلب مسخ ہو جاتا ہے، اور حق بینی کی استعداد ہی ضائع ہو جاتی ہے، بلکہ الٹے کبھی کبھی اہل حق سے جدال و عناد پر آمادہ ہو جاتے ہیں،

"پھر خود اُن کی اصلاح کی کوئی توقع نہیں رہتی، اور اُمت محمدیہ کے لئے (العیاذ باللہ) ابلیس سے زیادہ ضرر رساں ہو جاتے ہیں، کہ اُن کے ہوتے ہوئے اگر شیطان فارغ ہو بیٹھے تو بھی بعید نہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے ایسے ہی طالب دنیا کو دیکھا ہے، کہ ایک ہزار روپیہ لے کر اور ایک ترکیب تراش کر حقیقی ساس کے ساتھ حلت نکاح کا فتوی لکھ دیا، حدیث میں اسی طرح کے مسخ قلب کا ذکر ہے، کہ لمّا وقعت بنو اسرائیل فی المعاصی نھتھم علماءھم فلم ینتھوا فجالسوھم وآکلوھم وشاربوھم فضرب اللہ قلوب بعضھم ببعض ولعنھم علی لسان داؤد وعیسی ابن مریم ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون"،

لیکن یہ سب خرابیاں اسی وقت ہیں جب امراء کو مطلوب بنا کر جاویں اسی کی مذمت احادیث صحیحہ میں ہو کہ ابغض القراء الی اللہ الذین .... یعنی اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض

يزورون الامراء وامرا العلماء امناء — وہ علماء اچھے ہیں جو امراء سے ملتے ہیں اور

الدين ما لم يخالطوا الامراء فاذا خالطوا — علماء دین کے محافظ ہیں، جب تک امراء

الامراء فهم لصوص الدين۔ — سے میل جول نہ رکھیں، ورنہ دین کے ڈاکو ہیں

امراء سے اختلاط واجتناب کے شرائط | البتہ اگر امراء طالب ہو کر حاضر ہوں، یا کسی ضرورت سے خود علما کو مدعو کریں، تو اس معاہدہ کے بعد کہ ہم آزادی سے جو چاہیں گے کہیں گے، اور نذرانہ وغیرہ قبول نہ کریں گے، تو ایسی مخالطت محافظت دین ہے، کیونکہ اگر علماء اس طرح بھی اُن سے نہ ملیں، تو اُن کو دین کیونکر پہنچے گا، مگر اس طرح کا اختلاط فرض عین نہیں، کہ سب پر ضروری ہو، فرض کفایہ ہے، اور اس کے لئے ایسا شخص موزوں ہے، جو قوی القلب اور غنی النفس ہو، ورنہ ضعیف کے لئے سلامتی اسی میں ہے، کہ امراء سے بالکل نہ ملے، تبلیغ کے لئے دوسرے لوگ یا رسائل، اور کتابیں کافی ہیں،

سبحان اللہ کیا فہم دین ہے، اگر حدود سے تجاوز پر یہاں بھی تنبہ فرمایا، جو حضرت جامع المجددین کی تجدید کی خاص ونمایاں خصوصیت ہے کہ

اُمراء سے اجتناب کرنے میں ان کو حقیر اور اپنے کو مقدس نہ سمجھے، بلکہ ان کو مبتلائے دنیا وجہل سمجھ کر رحم و دعا کرے، اور اپنے کو ضعف دین کا مریض جان کر اجتناب کو ایسا سمجھے جیسا کمزور طبیعت والے کو جس میں تاثر کا مادہ زیادہ ہو، متعدی مرض کے مریض سے بچاتے ہیں، اور ساتھ ہی اس متعدی مرض کے مبتلا پر غصہ بھی نہیں کرتے، بلکہ رحم کھاتے ہیں

سبحان اللہ کیسی مجددانہ حدود شناسی اور پھر کیسی حکیمانہ اُن کی تفہیم ہے! ساتھ ہی پھر تنبیہ ہے کہ اس عدم غصہ اور عدم بغض کی بھی ایک حد ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص حق سے عناد اور اہل حق سے بغض رکھے

یا تکبر کرے، تو اس سے بغض کرنا واجب و عبادت ہے، اور بغض فی اللہ یہی ہے،

آگے جاہ طلبی کی ایک اور دقیق تدبیر کا بیان ہے، کہ

جاہ طلبی کی ایک دقیق تدبیر | بعضے دنیا داروں کو دھتکار دیتے ہیں، سخت سست کہتے ہیں، حتیٰ کہ بعضے پہرا بٹھا دیتے ہیں، اگرچہ یہ لوگ متکبر امراء کا پورا علاج ہیں جن سے امراء کو اُن کے تکبر کی سزا ملتی ہے لیکن یہ تکوینی علاج ہے تشریعی نہیں، اور ایسا برتاؤ یا اخلاق شرع کے بالکل خلاف ہے، پھر بعضے ایسے بھی ہیں، کہ ان کا مقصود یہی ہوتا ہے، کہ اس طریقہ سے امراء میں شہرت ہوتی ہے، لوگ بڑا بزرگ سمجھتے ہیں، لہٰذا ایسے لوگوں کو بہ نسبت متکبر کے ریا کار (اور جاہ طلب) کہنا زیادہ زیبا ہے،

یہ تو وہ لوگ تھے، جن کے اس طرزِ عمل کی غایت ہی جاہ تھی، بعضوں کے ہاں جاہ غایت و سبب نہیں، بلکہ مسبّب ہوتی ہے،

"اور وہ لوگ واقع میں اپنے کو مقدس اور دوسروں کو گنا ہگار سمجھتے اس لئے اُن سے نفرت کرتے ہیں، ایسوں کو بہ نسبت ریاکار کے متکبر کہنا زیادہ بجا ہے، (اور یہ تکبر دنیا داروں کے تکبر سے بھی زیادہ قبیح و شنیع ہے، کیونکہ ان لوگوں کو بہ نسبت دنیا داروں کے علم زیادہ ہے، اور علم کے ساتھ بڑائی عند اللہ مبغوض ہے؛ ان لوگوں کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اعتبار خاتمہ کا ہے، (لہٰذا ان کو کیا معلوم کہ جس کو یہ گنا ہگار جان رہے ہیں، اس کا خاتمہ کیسا ہوگا، اور خود اپنے کو جو مقدس یقین کر رہے ہیں، ان کا خاتمہ کیسا ہوگا)

ع تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

مناظرہ و مجادلہ کی حقیقت | بعض لوگ ضرورت بلا ضرورت بات بات میں مجادلہ و مناظرہ کرتے، اور دن رات اسی میں لگے رہتے ہیں، جس سے اکثروں کی غرض اپنی علمیت کا سکہ بٹھانا یا علمی جاہ طلبی

ہوتی ہے جس کا،

"بعض اوقات یہاں تک اثر ہوتا ہے، کہ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی باطل پر اصرار کئے جاتے ہیں اکہ بات ہیٹی نہ ہو جائے، میں نے ایک ایسے ہی کا فتوی ایک قطعی رضاعی رشتہ میں نکاح کا دیکھا، کہ ابتداء میں تو ان سے غلطی ہو گئی، مگر پھر بات کی پچ پڑ گئی، اور باوجود سارے علماء کی مخالفت اور تحریراً و تقریراً تنبیہ کرنے کے ہرگز رجوع نہ کیا تھی کہ بعض ثقہ لوگوں سے سُنا گیا کہ خود اپنے ایک بزرگ سے کہا کہ اب کیا کروں قلم سے نکل گیا اب تو تائید ہی کرنا ضروری ہے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مَا ضل قوم بعد هدى كانوا عليه الا اوتوا الجدل ثم قرء هذه الآية ما ضربوه لك الا جدلا بل هم قوم خصمون جدل سے یہاں مراد عناد، اور اپنے مذہب کی ترویج کے لئے تعصب ہے"

اور بعض آیات و روایات میں مجادلہ و محاجہ کا جو امر و اذن ثابت ہے، تو یہ مطلب نہیں، کہ ہر مجادلہ ہر حال میں مذموم ہے، البتہ ہمارے زمانہ میں زیادہ تر ایسے ہی مجادلہ کا رواج ہے جو مذموم ہے یا جس کا ترک محمود ہے، اور جس کی مذمت آیات و احادیث اور بزرگوں کے کلام میں موجود ہے، اس کی تفصیل آج کل کے مناظرہ پسندوں کے لئے کان کھول کر سننے کی ہے،

ظنی و قطعی مسائل کے حکم کا بڑا اہم فرق

مسائل دو قسم کے ہیں، ایک جن کی ایک شق یقیناً حق اور دوسری باطل ہو، خواہ سمعاً خواہ عقلاً، یہ مسائل قطعیہ کہلاتے ہیں، دوسری قسم جس میں دونوں جانب حق و ثواب کا احتمال ہو، یہ مسائل ظنیہ کہلاتے ہیں، مسائل کلامیہ اکثر قسم اول سے ہیں، اور بعض ثانی سے، اور مسائل فقہیہ اکثر قسم ثانی سے ہیں، اور بعض اول سے"

"مسائل ظنیہ مین صرف ظنی ترجیح ثابت کرنے کے لئے اہل علم مین باہم گفتگو و مکالمت جائز ہے، بشرطیکہ نہ بغض و عناد ہو، نہ ایک جانب کی قطعیت کا اعتقاد ہو، نہ دوسری جانب کے قطعی باطل ہونے کا یقین جازم، نیز جب سمجھ مین آجائے، تو اپنی راے سے رجوع اور حق کے قبول کا عزم ہو،

"مگر مصلحت اس مین بھی یہ ہے کہ عوام تک اس کی اطلاع نہ ہو، اگر زبانی گفتگو ہو، مجمع خواص کا ہو اور اگر تحریری ہو، تو عام فہم زبان مثلاً ہندوستان مین اردو مین نہ ہو، عربی مین ہو، یا کم از کم فارسی مین تاکہ اگر کسی وقت وہ شائع ہو جائین، تو عوام تک اس اختلاف کا اثر نہ پہنچے، اور سلف سے اسی طرح کی گفتگو منقول ہے، نہ کہ جیسی آج کل ہوتی ہے، کہ ایک قراۃ خلف الامام کا حق ہونا، اس طرح تبلا رہا ہے کہ اس کے نزدیک تمام حنفیہ تارک صلوٰۃ اور فاسق ہین، اور دوسرا اس کی اس طرح نفی کر رہا ہے، کہ گویا اس کے نزدیک، قرأۃ خلف الامام کی کوئی حدیث ہی نہین، اور عین مناظرہ مین اگر مقابل کا قول دل کو لگ بھی جائے، تب بھی ہرگز قبول نہ کرین، بلکہ گفتگو شروع کرتے ہی رد ہی کا پختہ ارادہ رکھتے ہین، اور اسی نیت سے سنتے ہین، کیونکہ مقصود تمامتر اپنا غلبہ اور دوسرے کو ساکت کرنا ہوتا ہے، پھر باہمی عناد و فساد، حتی کہ نوبت عدالت تک پہونچتی ہے، کیا یہ دین ہے، کیا سلف صالح اور حضرات صحابہؓ کا ان مسائل مین یہی طریقہ تھا،

افسوس اگر آج مسلمان ان ظنی مسائل مین اختلاف و گفتگو کو اپنے حدود مین رکھتے اور مجدد وقت کی حدود شناسی کو مشعلِ راہ بناتے، تو کتنے اور کیسے کیسے مہیب و مہلک مفاسد کا سدباب ہو جاتا، پھر ہمارے آج کل کے سیاسی و ملکی مسائل تو ان فقہی مسائل سے بھی زیادہ ظنی ہین، ان

مین ایک دوسرے پر لعن طعن، سب و شتم، تکفیر و تفسیق اور وہ بھی کسی خاص مجمع اور خاص زبان مین نہین، بلکہ عوام الناس کے بھرے جلسون، اور ہزار دو اخبار کے کھلے کالمون مین سیاسی و ملکی ہی کیا، اور عوام یا انگریزی دانون ہی پر کیا موقوف بعض مستند اور بہت سے غیر مستند مدعیان علم دین فقہی و ذہنی مسائل تک کو رسائل و اخبارات کے میدان مین عوام الناس کے سامنے ڈال دینا عین خدمت دین جانتے ہین، ع :-

ببین تفاوت رہ از کجا است تا بکجا

کاش اسلام کے یہ نادان دوست مجدد وقت کی ان باتون پر کان دھرتے، تو آج مسلمان ان دینی و دنیوی ہلاکتون اور ذلتون سے کیون دوچار ہوتے، حضرت جامع المجددین کی اصلاحات و تجدیدات ہر معاملہ مین ایسی جامع ہین، کہ بے ساختہ دل گواہی دیتا ہے، کہ اگر ان کا اتباع ہو تو دین و دنیا کی صلاح و اصلاح سب کا نقشہ سلف خدا چاہتا پھر سامنے آجاتا،

مسائل قطعیہ مین اختلاف کی مختلف حالتون کا حکم

اب رہ گئے مسائل قطعیہ جیسے کفر و اسلام کا اختلاف، یا اہل حق کے نزدیک جو متفق علیہ بدعت و سنت ہے اس کا اختلاف تو اس مین چند حالتین ہین،

ایک یہ کہ صاحب باطل متردد و طالب حق ہے، اور اپنے شبہات صاف کرنا چاہتا ہے اور اس غرض سے گفتگو یا مناظرہ کرتا ہے، تو جو شخص حق کی تائید پر قادر ہو اس پر ایسا مناظرہ واجب و فرض ہے، اور جب جواب سے عجز ہو تو صاف کہدینا چاہئے کہ اس کا جواب میری سمجھ مین نہین آتا، سوچ کر یا پوچھ کر بتلاؤن گا، یا اپنے سے زیادہ جاننے والے کا پتہ بتلا دے، اور طالب کو چاہئے، کہ وہان جاکر رجوع کرے، ایسے مناظرہ سے انکار معصیت اور مَن سُئِل عن علم فکتمہ الخ مین شامل ہوگا،

(۲) دوسری حالت یہ ہے کہ مخاطب طالب حق نہین لیکن متکلم مناظرہ کو قوت و احتمال اثر کہ

شاید حق کو قبول کرلے، سو جب تک اس کی اُمید ہو، مناظرہ کرنا، تبلیغ احکام مین داخل ہے،
کہ جہان تبلیغ واجب ہے، وہان یہ مناظرہ واجب اور جہان مستحب ہے، وہان مستحب ہے،
جناب سرور عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اہل کتاب وخوارج سے
مناظرات اسی قبیل کے تھے،

(۳) اور تیسری حالت یہ ہے کہ وہ طالب بھی نہین، نہ قبول کی امید ہے، مگر کسی مفسدہ
ومضرت کا بھی اندیشہ نہین، اور کسی ضروری امر مین خلل کا بھی احتمال نہین، تو ایسی
صورت مین ایسا مناظرہ مستحب ہے،

(۴) چوتھی حالت یہ ہے کہ طالب سے نہ امید قبول نہ کسی ضروری امر مین خلل نہ کسی مضرت
کا اندیشہ ہے، تو اس صورت مین قوی ہمت کے لئے عزیمت واولیٰ ہے، اور ضعیف الہمت
والے کے لئے رخصت وغیر اولیٰ،

(۵) پانچوین حالت یہ کہ نہ طالب سے توقع قبول اور ساتھ ہی کسی دینی مضرت کا احتمال
یا کسی اہم دینی منفعت کے فوت ہونے کا احتمال ہے، اس صورت مین اس سے اعراض
اور ضروری مین اشتغال واجب ہے، قرآن مجید مین اعراض، اور ترک جدال کا امر
ایسے ہی موقع پر ہے، سورہ عبس کی شانِ نزول کا جو قصہ تھا، جناب رسول اللہ
(صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اجتہاد سے اس کو تیسری حالت مین داخل سمجھا، اور اللہ تعالیٰ
نے اوس کو پانچوین حالت مین داخل تبلایا،

(۶) چھٹی حالت یہ ہے کہ مناظرہ کرنے مین تو مخاطب کی نہ کوئی منفعت متوقع ہے، اور نہ
اس کو کسی خاص مضرت کا احتمال ہو، اور مناظرہ نہ کرنے مین عوام اہلِ حق کے شبہہ مین پڑجانے
کا خوف ہو، اور مسئلہ ایسا ہو کہ عوام اہلِ حق کو اس کے غلط ہونے کا احتمال بھی نہ ہو،

تاکہ علمائے اہلِ حق سے دریافت کر سکیں، تو اس صورت مین اس کی تدبیر واجب ہے جو دو ہین،

"ایک یہ کہ خود اہلِ باطل کو مکالمہ یا مکاتبہ مین مخاطب بنایا جائے، دوسری یہ کہ اس سے خطاب نہ کیا جائے، بلکہ عام خطاب سے حق کو ثابت اور باطل کو رد کیا جائے"

ان مین جس تدبیر کو اختیار کیا جائے، واجب ادا ہو جائے گا،

(۷) ساتوین حالت یہ ہے کہ قیود مذکورہ حالتِ ششم کے ساتھ وہ مسئلہ بھی ایسا ہو کہ عوام اہلِ حق کو اس کے غلط ہونے کا شبہہ واقع ہو سکتا ہو، اس صورت مین خود ان عوام پر واجب ہے، کہ علما سے تحقیق کرین اور علما پر جواب دینا واجب ہوگا، ورنہ بدون سوال وہ سبکدوش ہون گے،

"اور ان تمام صورتون مین یہ واجب ہے کہ الفاظ و مضمون متانت و تہذیب کے خلاف نہ ہون، اور اگر دوسرا درشتی کرے تو بھی صبر افضل ہے،

ممنوع و مذموم بحث و مباحثہ | یہ ساری تفصیل و تقسیم ان امور مین ہے کہ جو شرعاً مقصود ہون بعض وہ امور ہین، جو شرعاً مہتم بالشان نہین، جیسے خاندان چشتیہ کا باہم تفاضل، یا بعض وہ امور جن مین بحث کرنے یا حکم لگانے سے شارع علیہ السلام نے منع فرمایا ہے، جیسے تقدیر کا یا کوئی دوسرا ایسا ہی مسئلہ، مثلاً با وجود اس کے کہ کسی کا کلام صحیح معنی کو محتمل ہو، پھر بھی اس پر کفر کا حکم لگانا، ایسے امور مین بحث و مباحثہ کرنا ممنوع و مذموم ہے جس مرتبہ کی نہی یا منہی عنہ ہوگا، اسی مرتبہ کی ممانعت و مذمت ہوگی،

"اس سے معلوم ہوا کہ نہ ہر مناظرہ محمود ہے، نہ مذموم، نیز تمام وہ نصوص و اقوال اور عادات ائمۂ دین جو بظاہر اس باب مین متعارض نظر آتے ہین، اُن مین تطبیق ہو گئی"

اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس زمانہ مین زیادہ ایسے ہی مناظرے شائع ہین، جو مذموم ہین[1]

مسٹرون کے ملکی و سیاسی مناظرون نے مولویون کے دینی و مذہبی مناظرون کو بھی مات کر دیا

البتہ مولویون اور مذہب کے میدانی یا تحریری مناظرات کی جگہ جن مین پھر بھی دین سے ایک لگاؤ تھا، اب حکومت و سیاست اور "مسٹرون" کے پنڈالی یا اخباری مناظرات نے حاصل کر لی ہے، جن کو تحقیقِ حق و قبولِ حق سے اتنا بھی تعلق نہین جتنا دینی مناظرون کے معمولی سے معمولی فریقین کو ہوتا تھا،

بس ہر جماعت اس کے ہر لیڈر، و اڈیٹر اور ہر جلسہ و جلوس کا فرض یہ ہے کہ اپنی ہی بات جہان تک ہو سکے، اتنے غل و ہنگامہ کے ساتھ کہے جائے کہ دوسرے کی نہ خود سُنے نہ کسی کو سننے دے اور اس فرض کی ادائی مین بغض و عناد، دروغ و بہتان، مکر و فریب لعن و طعن یہ سب فریقین کے لئے عین سیاست اور عین تہذیب ہے، کیونکہ یہ سب پروپگنڈا ہے، یہی نہین، بلکہ ہر درجہ کا طوفان بے تمیزی فتنہ و فساد، ملک و قوم کی عین خدمت، بلکہ درجۂ جہاد ہے، فریق مخالف کے جلسون اور جلوسون مین فتنہ برپا کر دینا، مقرر کو تقریر نہ کرنے دینا، شرم شرم کے نعرون سے آسمان سر پر اٹھا لینا، حسب ضرورت سوڈے کی بوتلون اور انڈون کی مار سے تواضع کرنا، اس سے بھی کام نہ چلے، تو اینٹین اور پتھر ہین، اور پھر یہ فتنہ و فساد کوئی اتفاقی نہین، بلکہ ہر جلسہ و جلوس مین اس کا احتمال، اس لئے پہلے سے جلسہ و جلوس کی اجازت اور پھر موقع کے لحاظ سے پولیس یا فوج کی نگرانی لازم ہے، اور جو خوش قسمت اس قومی و سیاسی جہاد مین پولیس کے ڈنڈون، فوج کی گولیون کیلئے سینہ پیش کر

---

[1] ایک مناظرہ ہی کی بحث مین حضرت مجدد کی ان تجدیدی تنقیحات و تفصیلات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح ہر مسئلہ کے تمام جزئی پہلو آئینہ فرماتے جاتے ہین، اور بظاہر متضاد سے متضاد جزئیات کی چولین کس طرح اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہین، اور ہر شے اپنی حد مین رہتی ہے، ع

این سعادت بزور بازو نیست

کام آسکے، اس کے مجاہد و شہید ہونے مین کیا شک، جلسون اور جلوسون ہی کی قید نہین، یون بھی فریقین مین جو دہشت انگیزی اور کشت و خون مین بازی لیجا سکے، مثلاً فلسطین کے یہودی، تو بس وہی برسر حق ہے، اس کے علاوہ نہ امریکہ کے گروہین کے پاس "گرو" یا حق کا کوئی معیار ہے، اور نہ برطانیہ کے پاس انصاف یا اپنے وعدون کی شرم، بھلا حق و باطل کے پرانے مولویانہ مناظرہ کے فریقین کے پاس احقاق حق و ابطال باطل کے لئے ایسی دہشت انگیزی کی منطق اور دلائل کہان موجود تھے، جن کا مقابلہ بڑی بڑی حکومتون کو اپنی فوجون سے کرنا پڑے،

مسلمانون کی جیت سیاسی مباحثہ و مناظرون مین بھی حضرت مجدد کے تجدید فرمودہ اصول مین ہے

کاش مسلمان اب بھی آنکھین کھولتے کہ انھون نے وحیٔ نبوت کی روشنی کو رکھتے ہوئے دین و دانش دونون آنکھون کے کیسے اندھون کا دامن تھام رکھا ہے، اس مسلمانون کی تو دنیا کا بھی ہر اہم مسئلہ کسی نہ کسی طرح نفیاً یا اثباتاً بالواسطہ یا بلا واسطہ دین ہی کا مسئلہ ہے، اس لئے اگر وہ اغیار سے اخباری و پنڈالی بحث و مناظرہ مین صرف اپنی دینی راہ کے ان حدود و شرائط پر عمل پیرا ہو جائین، جو حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ نے آخر مین بطور خلاصہ تحریر فرمائے ہین، تو انشاء اللہ نصرت حق کی بدولت معاندین کے باطل پروپگنڈے اور ناحق کی خونریزی و دہشت انگیزی کو بھی بالآخر مغلوب ہی ہونا پڑے گا، بس ذرا ایمان و عمل صالح کے ساتھ تواصی بالحق و تواصی بالصبر کی ضرورت ہے، بہرحال مسلمانون کے لئے بہ حیثیت مسلمان حکومت و سیاست کے بظاہر دنیادی مسائل مین بھی بحث و مباحثہ کے وہی آداب و شرائط ہین جو خاص دینی مسائل مین ہین،

"یعنی وہ مسئلہ دین مین مقصود بھی ہو، دل سے یہ عزم ہو کہ حق واضح ہو جائے گا تو فوراً قبول کرلین گے، یہ نیت نہ ہو کہ ہر بات کو رد کرین گے، گو سمجھ مین بھی آجائے، مخاطب پر شفقت ہو، اگر وہ شفقت کے قابل نہ ہو، تو صبر و معدلت کے ساتھ مقابلہ کرے،

اگر قرائن سے عناد مشاہد ہو تو مناظرہ سے معافی کی درخواست کرے' الفاظ و مضمون نرم ہو'

جو بات معلوم نہ ہو، نہ جاننے کا اقرار کرے، عار نہ کرے'۔

ذرا ان اصول کو مسلمان امتحاناً ہی کچھ عرصہ صبر و عزیمت کے ساتھ اپنے اخباری و سیاسی مباحثوں اور اکھاڑوں مین آزما دیکھین، گو یہ صبر و عزیمت دین سے تعلق کے بغیر نصیب ہونا آسان نہین تاہم جہاں ترقی کی سب تدبیرین کرتے ہین، دین کے تعلق کو بھی بطور تدبیر ہی اختیار کر دیکھین، مگر جب خود علماے دین ہی طوفان بے تمیزی کے اس اکھاڑے مین کود پڑے ہون، تو عوام سے کیا، اور کس منہ سے کہا جائے، اور دینی اعتبار سے لیڈرون کا شمار عوام ہی مین ہے ورنہ دہی ہوتا تھا جو آج آنکھون کے سامنے ہے کہ ان باتون کو دیکھ کر

"عوام الناس علمار سے بھی بدگمان ہو گئے ہین، کہ یہان ہر شخص دوسرے کی تکذیب کرتا ہے، اس لئے یا تو سب ہی کو چھوڑ دیتے ہین، یا ایک کی طرف ہو کے مقابل کی بے آبروئی اور ایذارسانی کے درپے ہوتے ہین، اور باہمی عداوت قائم ہو کر ایک دوسرے کی ذاتی (بلکہ جان تک) کی فکر مین لگ جاتے ہین، اور گروہ بندیان ہو کر مسلمانون کی قوت و قعت مین روزانہ ضعف و انحطاط ہوتا جاتا ہے، کبھی مار پٹائی ہو کر نوبت بعدالت پہنچتی ہے"

کیا یہ سب کچھ ابھی حال ہی مین جمعیۃ و لیگ وغیرہ کے انتخابات[1] کے سلسلہ مین دن دوپہر سنا ہندوستان مین دیکھا نہین گیا، مگر علمار نے ان شرمناک واقعات سے یہ عبرت حاصل کی جو اس اکھاڑے مین نہین تھے،[2] وہ بھی اپنی ہی جماعت یعنی علما ہی کے مقابلہ مین تال ٹھوک کر اُتر آئے، البعض لوگ ان مفاسد سے قطع نظر کرکے اخباری یا پنڈالی بحث و مباحثون کے طرح طرح کے مصالح و فوائد بیان کرتے ہین، مگر شرائط بالا کے فقدان کی صورت مین ہوتا وہی ہے، جو ایسے مذہبی مناظرات مین

---

[1] سنہ ۴۶ء کے انتخابات مین، [2] جمعیۃ علمائے اسلام،

ہوتا تھا کہ "ملا آن باشد کہ چپ نشود" اب لیڈر آن باشد کہ چپ نشود" یعنی

ہر شخص کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہتا ہے، ہر شخص دوسرے کا جواب، پھر وہ دوسرا اس کا جواب الجواب، پھر وہ پہلا اس جواب الجواب کا رد پھر دوسرا اس رد کا رد، دونون اس سلسلہ کو جاری رکھتے ہین"،

اور بقول ایک بڑے عالم ہی کے کہ "جب تک مولوی یا لیڈر کی زبان پر لقوہ اور ہاتھ پر فالج نہ گرے، اس رد وقدح کا تحریری و تقریری سلسلہ بند نہین ہوسکتا"!

پھر ایک خرابازاری یہ ہے کہ مولویانہ وعظ کی طرح جس کس وناکس کا جی چاہے لیڈرانہ تقریر کے لئے بھی کھڑا ہو جاتا ہے، حالانکہ وعظ کے متعلق حدیثون مین ہے کہ

لا یقص الا امیراً و ماموراً و مختال او مرائی یعنی وعظ امیر کہتا ہے یا مامور کہتا ہے (یعنی اس کو کہنا چاہئے) یا پھر شیخی باز (مختال) یا ریا کار، اسی طرح ہے کہ من تعلم صرف الکلام لیسبی قلوب الناس لم یقبل اللہ یوم القیامۃ صرفاً و لا عدلاً، یعنی جو آرٹیری (صرف الکلام) یا باتین بنانا اس لئے سیکھتا ہے کہ لوگون کے دلون کو پھانسے، اس کا قیامت کے دن فرض عمل قبول فرمائے گا نہ نفل،

آج کل اس "صرف کلام" یا باتین بنانے اور الٹ پھیر کرنے کا جیسا زور اور جیسا بیجا استعمال ظاہر ہے، اور جیسے بہت سے واعظ بدون کافی علم کے وعظ کہنے لگتے ہین اور ضلوا واضلوا کا مصداق ہوتے ہین ویسے ہی آج کل کے بہت سے لیڈر و اڈیٹر سیاسی و دنیوی مسائل کو بھی پوری طرح اور سمجھے بغیر نام کے رہنما (لیڈر) بنکر خود بھی گمراہ ہوتے، اور دوسرون کو بھی گمراہ کرتے ہین،

(باقی)

اشتراکی مابعد الطبیعاتی افکار

اسلام کی روشنی مین

از جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی، بی، اے

مارکسیت کیا ہے؟ فویرباخ (Feuerbach) پر اپنے گیارہوین مضمون مین مارکس لکھتا ہے:-

"فلسفیون نے اپنے اپنے خیال کے مطابق صرف کائنات کی توجیہ کی ہے لیکن بنیادی سوال تو یہ ہے کہ اسے تبدیل کیسے کیا جائے، اس سے ظاہر ہے کہ مارکس نے اپنے فلسفہ کو ایک عملی طریق کار کی حیثیت سے پیش کیا، اور اگرچہ نظری اصول بھی مارکسیت کے اہم اجزار ہین لیکن مارکس کے نزدیک عمل نظریہ مقدم ہے، اس کے معنی یہ نہین ہین کہ مارکسیت مین مرتب نظریات کی کوئی کمی ہے، بلکہ علوم طبعی (Physical Sciences) کے نظریات کی طرح مارکسی نظریات بھی اپنی تفصیلات مین مارکسیت کے عملی طریق کار کو دنیا کے حقیقی حالات و واقعات پر منطبق کرنے سے وجود مین آتے ہین،

ہالڈین اپنی کتاب (Marxist philosophy and sciences) مین لکھتا ہے کہ

مارکسیت کائن (Being) سے نہیں بلکہ حدوث (Becoming) سے بحث کرتی ہے، یعنی وہ یہ نہین دیکھتی ہے کہ اشیائے عالم کیا ہین، اور کیا نہین، بلکہ کیا ہورہی ہین، اسی لئے مارکسیت کا دعوی ہے کہ وہ ہم مین صرف معاشی اور سیاسی انقلابات سمجھنے کی نہین، بلکہ جملہ تغیرات عالم کے فہم وادراک کی قابلیت پیدا کرتی ہے، اور اس طرح ہمین اس بات پر قادر بنا دیتی ہے کہ ہم ان

تغیرات پر قابو حاصل کرین، چنانچہ مارکسیت علم اور عمل کی وحدت کا اثبات کرتی ہے اور اُن کے درمیان کسی تفریق کو روا نہین رکھتی، لیکن ساتھ ہی وہ عمل کو مرجع اور مقدم قرار دیتی ہے، انجلس لکھتا ہے:

"یہ سوال کہ آیا انسانی فکر معروضی صداقت (Objective reality) یا خارجی حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے، محض نظری مسئلہ نہین ہے، بلکہ ایک عملی سوال ہے، کیونکہ عمل کی دنیا مین انسان کو اپنے افکار کی صداقت کا ثبوت دینا ضروری ہے، یعنی اس بات کا ثبوت کہ اس کے افکار بے حقیقت اور بے اثر نہین ہین، بلکہ اس دنیا اور اس کے واقعات کے لئے نتیجہ خیز ہین، عالم خارجی، اور اس کے واقعات سے ہٹ کر انسانی فکر کی حقیقت رسی کی بحث بالکل لایعنی ہے،

بالڈین لکھتا ہے کہ اس نقطۂ نظر سے مارکسیت اور نتائجیت[1] (Pragmatism) مین ایک گہری مماثلت ہے، لیکن اور ہر اعتبار سے ان دونون مین بڑا فرق ہے، خصوصًا اس لحاظ سے کہ مارکسیت تغیراتِ عالم پر خاص طور سے زور دیتی ہے، عالم خارجی کی حقیقت کا اثبات کرتی ہے اور یہ دعوی کرتی ہے کہ اگرچہ انسان صداقت مطلق تک کبھی نہین پہنچ سکتا ہے، لیکن وہ اس سے قریب تر ہو سکتا ہے،

مارکسیت اور جدلیات مارکسیت کے بنیادی اصول جدلیاتی اصول (Dialectical principles) کہلاتے ہین، جدلیات کا لفظ یونانی فلسفہ سے ماخوذ ہے، یونانی زبان مین ابتداءً اس لفظ کے معنی مکالمہ کے تھے، سوفسطائیون کے عہد مین مکالمہ اور بحث و تکرار ایک مستقل فن بن گیا تھا، اس فن کے قواعد جدلیات (Dialectics) کہلاتے تھے،

---

[1] نتائجیت وہ فلسفہ ہے جس کی رو سے کسی نظریہ کی صداقت کا معیار یہ ہے کہ وہ عملی زندگی مین اپنے نتائج کے لحاظ سے کامیاب ثابت ہو، نتائجیت ہر صداقت کو اس کی عملی کامیابیون یا ناکامیون کے لحاظ سے صحیح یا غلط قرار دیتی ہے،

س قسم کے مباحث کا طریقہ یہ تھا، کہ متکلم کوئی خاص دعوی پیش کرتا تھا، اور اس کے بعد مخاطب
ں کوشش کرتا تھا کہ اس سے کوئی ایسی بات کہلوا دے جس سے اس دعوی کی نفی ہوتی ہو
ع جدلیات فی الاصل بحث و مکالمہ کا ایک خاص طریقہ ہے، خواہ یہ بحث و تکرار دو اشخاص کے
ہو یا کسی فرد واحد کے ذہن مین اس مین پہلے ایک دعوی کیا جاتا ہے، پھر ایک بالکل مخالف
ں کی تردید کرتا ہے، پھر دونون مین جو نقص و خطا ہوتی ہے، اسے دور کر دیا جاتا ہے، اور
ری بات نکل آتی ہے، جو حقیقت سے قریب تر ہوتی ہے، اس طرح یہ تردید و تطبیق کے ذریعہ
حقیقت کا ایک مخصوص طریقہ ہے،

یہ طریقہ دو اجزاے فکر پر مشتمل ہے، جن مین سے اگر ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو یہ باطل
ہو جاتا ہے، اولاً یہ اس پختہ عقیدہ پر مبنی ہے، جیسے افلاطون نے پیش کیا تھا، کہ عالم کائنات
ی اور اصلی حقیقتین اشیاء خارجی نہین بلکہ افکار و تصورات ہین، دوسرے یہ تصورات جامد
ہین، بلکہ سیال حالت مین ہین، اور مسلسل حرکت کرتے ہوے نشو و ارتقا کی منزلون سے گذرتے
لاطون نے افکار و تصورات کو کامل الذات غیر متبدل اور بے حرکت قرار دیا تھا، اور یہ نظریہ
تھا، کہ جدلیاتی طریق ہی سے حقیقت تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے، یعنی ایک ایسے طریقہ سے
مخالف افکار کا پہلے اقرار و اثبات کر لیا جائے، پھر ان کی تردید کی جائے، اور آخر مین اُن کے
تطابق و توافق پیدا کیا جائے، ہیگل نے اس کے خلاف یہ خیال ظاہر کیا، کہ تصورات خود
سہ گانہ یعنی اثبات تردید اور تطبیق سے گذرتے ہین بالفاظ دیگر عالم کائنات کی تمام
ں دراصل ایک واحد تصور کی جدلیاتی بحث و تکرار کا پرتو ہین جس مین یہ تصور اپنے
ور مخالف پہلوؤن کو اجاگر کرتا ہے، اور صرف مخصوص حقائق ہی نہین بلکہ کل عالم کائنات
مع تصور ہے، جو اپنے اضداد کا اثبات اور پھر اُن کی تردید کرتا ہے اور اس کے بعد ان کے

درمیان مطابقت پیدا کرکے اعلیٰ و برتر وحدتین قائم کرتا ہے، اس طرح یہ تصور تدریجاً اپنے باطن کا انکشاف عمل مین لاتا ہے، گویا کہ کائنات ذہنِ الٰہی (Divine mind) ہے جو منطقی وجوب (Logical necessity) کے تحت مدارج ارتقا کرکے اپنی تکمیل جدلیاتی طریقہ پہ کررہا ہے، ہیگل نے چند اصول فکر وضع کئے تھے، جنھین جدلیاتی اصول کہا جاتا ہے، اس کا نظریہ یہ تھا کہ یہ اصول[1] (Principles of Thought) ازل سے قائم ہین، اور ہمیشہ قائم رہین گے، عالم مادّی زمان ومکان مین ان فکری اصولون کا خارجی تحقق ہے، فویرباخ، مارکس اور انجلس نے اس کے خلاف یہ دعویٰ کیا، کہ عالم فطرت مین یہ اصول پہلے سے کارفرما ہین، اور عالم افکار مین اُن کی عملداری بعد مین قائم ہوئی، مارکس نے یہ خیال بھی پیش کیا، کہ فکر بشری درحقیقت عالم مادّی کا پرتو ہے، جو ذہن انسانی پر منعکس ہوتا ہے، اور اس کے سانچہ مین ڈھل جاتا ہے، اسی طرح انجلس نے ہیگل کی جدلیات کے متعلق یہ رائے قائم کی، کہ وہ اوّلاً مادہ کے خواص اور اس کے قوانین حرکت کو ظاہر کرتی ہے، اور اس سے قوانین فکر صرف ثانوی طور سے مستنبط کئے جاسکتے ہین، اس کا دعویٰ یہ تھا، کہ وہ اصول جو ہیگل نے عالم افکار کے لئے مرتب کئے تھے، مادی حالات و واقعات پر بھی منطبق ہوتے ہین، خواہ ان کا تعلق عمرانیات اور معاشرتی علوم سے ہو یا فلکیات، حیاتیات اور طبیعیات سے، چنانچہ انجلس ایک مقام پر لکھتا ہے،

ہیگل کے فلسفہ کی رو سے جدلیاتی ارتقار (یعنی اضداد کی ترکیب سے ایک اعلیٰ تر وحدت کا

---

[1] ان اصولون کا تفصیلی بیان آگے آتا ہے، مختصراً یہ اصول تین ہین، اوّلاً اضداد کی پیکار و آویزش سے اعلیٰ تر وحدتون کا قیام، دوئم کمیت (Quantity) کی کیفیت مین تبدیلی، اور اس کے برعکس کیفیت (Quality) کی کمیت مین تبدیلی، سوئم نفی کی نفی (Negation of Negation) کا اصول،

ظہور) جس کی مثالیں ہمیں خارجی فطرت اور انسانی تاریخ میں ملتی ہیں، اور جو عبارت ہے ایک ایسی ترقی پذیر حرکت سے جس میں ادنیٰ تر حدتیں اعلیٰ تر وحدتوں میں نمو کرتی ہیں، تصور کی اس ذاتی حرکت کا ایک موہوم چربہ ہے، جو ذہن انسانی کے افکار و خیالات سے الگ اور اس کی جولانیوں سے غیر متاثر ازل سے جاری ہے، مگر کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ کہاں"

اس الٹی بات کو کسی طرح سیدھا کرنا تھا، ہم نے پھر ایک مرتبہ تصورات کو مادی طریقہ پر سمجھنے کی کوشش کی یعنی اس حیثیت سے کہ وہ عالم خارجی کی حقیقی اشیا کی ذہنی تصاویر ہیں، نہ یہ کہ عالم مادی کی حقیقی اشیا، تصور کی فلاں فلاں ارتقائی منزل کی خارجی تصاویر ہیں، اس طرح ہیگل کی جدلیات عالم خارجی اور عالم افکار دونوں کے عام قوانین حرکت کا علم بن گئی، یعنی قوانین کے دو مجموعے ہیں جو در اصل ایک ہیں، لیکن اپنے طریق اظہار میں مختلف ہیں، اگر ایک طرف ذہن انسانی ان قوانین کو عالم خارجی کے حالات و واقعات پر پورے فہم و شعور کے ساتھ منطبق کر سکتا ہے، تو دوسری طرف عالم فطرت اور بڑی حد تک انسانی تاریخ میں بھی قوانین غیر شعوری طور سے کارفرما ہیں، اس طرح تصور کی جدلیات عالم حقیقی کی جدلیاتی حرکت کا آئینہ بن گئی، اور ہیگل کی جدلیات کو جو سر کے بل کھڑی تھی، سیدھا کر کے پیروں کے بل کھڑا کر دیا گیا،

جدلیاتی اصول جدلیات کا پہلا اصول اضداد کی وحدت کا اصول ہے یعنی ہر نظام زندگی، ہر تصور ہر مادی شے، اور معاشرتی حالت اپنے اندر اپنی ضد کو پرورش کرتی ہے، جو ایک خاص نوبت پر ظاہر ہو کر اس سے متصادم ہو جاتی ہے، پھر اس پیکار و تصادم سے ایک نئے نظام نئے تصور، نئی مادی شے یا معاشرتی حالت کی تخلیق ہوتی ہے، یا اس اصول کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے، کہ ہر شے دو متضاد حقیقتوں یا صفات کا مجموعہ ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ زید ایک انسان ہے، تو میں ایک مخصوص فرد کو چند مخصوص حالات میں ایک عمومی حقیقت یعنی انسان کے مترادف قرار دے رہا ہوں اس طرح

مین درحقیقت دو اضداد کو جمع کر رہا ہون، اسی طرح مین یہ کہہ سکتا ہون کہ اس میز کی لکڑی بہت سخت ہے، کیونکہ اگر وہ سخت نہ ہوتی، تو اس پر کوئی وزنی چیز نہین رکھی جا سکتی تھی، اور ساتھ ہی یہ لکڑی نرم بھی ہے، کیونکہ اگر وہ نرم نہوتی، تو اس کے ٹکڑے نہین کئے جا سکتے، اس طرح لکڑی مین دو متضاد صفات جمع ہین، اس قسم کے دعوون کی توجیہ ہم دو طرح سے کر سکتے ہین، ایک تو ہم افلاطون کی طرح یہ کہہ سکتے ہین، کہ اشیائے مادی بے حقیقت ہین، اور حقیقی وجود صرف عمومی تصورات یا اعیان (Geneva ideas) کا ہے، دوسرے ہم یہ کہہ سکتے ہین، جیسا کہ انجلس کا قول تھا، کہ مادہ مین دونون اضداد جمع ہین، لیکن اس کے معنی یہ ہون گے، کہ مادہ اس سے کہین زیادہ بامعنی اور پیچیدہ شے ہے، جتنا کہ اٹھارہوین صدی کے مادہ پرست سمجھتے تھے، دوسرا جدلیاتی اصول یہ ہے کہ کمیت (quantity) کیفیت (quality) اور کیفیت کمیت مین تبدیل ہو سکتی ہے جیسا کہ مارکس نے اپنی کتاب سرمایہ مین لکھا ہے،

"علوم طبیعی کی طرح یہان بھی معاشرتی علوم ہین"

ہیگل کے اس اصول کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ اس نے اپنی منطق مین پیش کیا ہے کہ کمی تغیرات (Quantitive changes) ایک خاص حد کے بعد کیفی تغیرات (Qualitative changes) مین تبدیل ہو جاتے ہین، اس کی ایک عام مثال یہ ہے کہ کیمیاوی خواص اس کے نقطۂ انجماد پر بدل جاتے ہین، اسی طرح اگر پانی کو حرارت پہونچائی جائے، اور حرارت کی مقدار مین اضافہ ہوتا رہے، تو حرارت کی ایک خاص مقدار کے بعد پانی کے خواص مین تبدیلی شروع ہو جاتی ہے، پانی کا حجم جو آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا، دفعۃً تیزی سے بڑھنے لگتا ہے، اور اس کے بعض دوسرے خواص ناپید ہو جاتے ہین مثلاً اس نقطۂ حرارت پر پانی مین کوئی چیز حل نہین کی جا سکتی ہے، اسی طرح کاربن ڈائی اکسائڈ Carbonal oxide

کی مثال ہے، سو سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا، کہ یہ گیس بالکل زہریلی ہے، اگر کوئی شخص خالص کاربن ڈائی آکسائڈ میں سانس لے تو فوراً مر جائے گا، لیکن اب یہ ثابت ہو گیا ہے، کہ اس گیس کی ایک محدود مقدار انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے، اسی طرح اشیاء کی مقدار کے تغیرات اس کے صفات بدل جاتے ہیں، یہی چیز بعض اخلاقی نظامات میں بھی صحیح پائی جاتی ہے، مثلاً ارسطو کا دعویٰ ہے کہ خیر و شر کا فرق زیادہ تر مقادیر کے فرق سے وجود میں آتا ہے، مثلاً بزدل آدمی بے باک آدمی اور جری آدمی میں فرق یہ ہے کہ بزدل آدمی بہت کم، اور بے باک آدمی بہت زیادہ خطرات برداشت کرتا ہے، ان کے مقابلہ میں جری آدمی ایک حد اعتدال تک خطرات برداشت کرتا ہے، معاشرتی علوم میں اس اصول کا عمل اس طرح ہوتا ہے، کہ وہ اصول و قوانین جو معاشرتی ارتقاء کی ایک خاص منزل پر انسانیت کی رہبری کرتے ہیں، حالات کی تبدیلی اور زمانہ کی ترقی سے دوسرے دور کے لئے بیکار ہو جاتے ہیں،

تیسرا جدلیاتی اصول نفی کی نفی (Negation of Negation) ہے، اس کی مثال مارکس نے معاشی تاریخ سے دی ہے، پہلے اس نے قرون وسطیٰ کی انگریزی صنعتوں کا حال بیان کیا ہے، جب دستکار اور مزدور اپنے آلات پیدائش کے خود مالک تھے، اور بعض صورتوں میں زمینوں کے مالک بھی ہوتے تھے، اس کے بعد صنعتی ترقی کا دور شروع ہوا، اور سرمایہ داری کا دور بڑھنے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ دستکار اور مزدور آلاتِ پیدائش کی ملکیت سے محروم کر دیئے گئے، ان کی زمینیں بڑے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں نے بجبر حاصل کر لیں تاکہ انھیں بڑے پیمانہ پر کاشت کر سکیں، اس کے علاوہ نئے کارخانوں کی مشینی پیداوار کے مقابلہ میں ان کی دستی صنعتیں بے کار ہو گئیں، اور یہ طبقہ آلاتِ پیدائش کی ملکیت سے محروم ہو گیا، جس کی وجہ سے اس کی حیثیت صرف بے بس مزدور کی سی رہ گئی، اس طرح گویا مزدوروں کی ملکیت کی نفی ہو گئی، لیکن مارکس دعویٰ کرتا ہے کہ اب اس نفی کی نفی ہو رہی ہے، یعنی اب اشتراکی تحریک کے ذریعہ سرمایہ دار جنھوں نے آلاتِ پیدائش

پر قبضہ کر رکھا ہے، ان کی ملکیت سے محروم ہو جائیں گے، اور ایک لحاظ سے مزدور پھر اجتماعی طور پر آلات پیدائش کے مالک ہو جائیں گے، مارکس کے خیال میں نفی کی نفی ایک ایسا اصول ہے، جو تمام ترقیات تنوعات اور جدتون کا سرچشمہ ہے، لینن، ایک جگہ لکھتا ہے،

"ارتقا کے دو بنیادی نظریات ہیں، ایک یہ کہ ارتقار درحقیقت نام ہے کمی بیشی، یا اعادہ کا دوسرا یہ کہ ارتقار عبارت ہے، اضداد کی ترکیب اور وحدت سے پہلا نظریہ خشک اور بیجان ہے، دوسرا زندگی اور حقیقت سے قریب تر ہے، یہی دوسرا نظریہ موجوداتِ عالم میں ہر شئے کی حرکت و ترقی کی توجیہ کرتا ہے، اسی سے ہم ان تغیرات کو سمجھ سکتے ہیں، جو اچانک طور پر واقع ہوتے ہیں، اور بظاہر فطرت کے تسلسل میں خلل ڈالتے نظر آتے ہیں، اسی سے ہم قدیم کی شکست اور جدید کی تخلیق کا سراغ پا سکتے ہیں، جدلیاتی عمل کی ایک اور مثال یہ ہے، کہ ہم کبھی عمل کو اس کے خارجی حالات سے جدا کر کے دیکھتے ہیں، اور اس کے متعلق ایک نظریہ قائم کرتے ہیں، جو بعد میں غلط ثابت ہوتا ہے؛ کیونکہ ہم نے اس شے یا عمل کے پس منظر پر غور نہیں کیا تھا، اب کسی نقاد کے لئے یہ کہدینا آسان ہے کہ تمھارا نظریہ پہلے ہی سے بالکل مہمل تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب تک ہم کوئی ایسا نظریہ نہ قائم کریں جو ایک خاص حد تک حالات و واقعات پر منطبق ہونے کے بعد پھر ان پر صحیح نہیں اترتا ہے، اس وقت تک ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا ہے، کہ اس نظریہ کی تشکیل میں ہم نے واقعات کے کن پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا تھا، جن پر غور کرنا ضروری تھا، اس طرح نظریات قائم کرنا اور پھر تجربہ سے ان کے نقائص دور کرنا ایک اہم جدلی عمل ہے،

مارکسیت اور مادیت مارکسیت کا دعوی ہے، کہ ذہنِ انسانی مادہ کی پیداوار ہے، نہ کہ اس کے برعکس، ہیگل کے نظریہ کے جو تصور کو کائنات کی بنیادی حقیقت قرار دیتا تھا، بالکل برعکس مارکسیت کا نظریہ یہ ہے، کہ اصلی اور حقیقی وجود صرف مادہ کا ہے، اور مادہ ہی کے درجہ بدرجہ ارتقا سے کائنات

کے جملہ مظاہر کی توجیہ کیجا سکتی ہے نفس انسانی، اس کا شعور اور اس کے تصورات یہ سب درحقیقت مادہ کی پیداوار ہیں لینن کہتا ہے، کہ طبعیات میں جو جدید انکشافات عمل میں آئے ہیں، اُن سے مادیت کے اس بنیادی تصور کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا ہے، کہ مادہ کا وجود ہمارے ذہن، اور ہمارے وقوف (Cognizance) پر منحصر نہیں ہے، بلکہ ایک معروضی حقیقت (Objective reality) ہے جو اپنی ذات سے موجود ہے، اور ہمارے ذہن و شعور کی کسی طرح محتاج نہیں ہے، یہی معروضی حقیقت ہمارے تمام علم و ادراک کا سرچشمہ ہے، بالفاظ دیگر انسانی علم و وقوف اشیاے مادی کے محتاج ہیں، کیونکہ یہی اشیا، حواس انسانی کو متاثر کرکے اس کے تجربات کا ذخیرہ بہم پہنچاتی ہیں، اور تجربہ ومشاہدہ علم انسانی کی بنیاد ہے، اس طرح مارکس نے ہیگل کے فلسفہ کو بالکل الٹ دیا، ہیگل کا دعویٰ یہ تھا، کہ اصلی وجود صرف تصورات کا ہے اور اشیاے مادی ان تصورات کا خارجی عکس ہیں، مارکسیت کا نظریہ یہ ہے، کہ فطرت (Nature) یا مادہ ازلی ہے، اور ذہن و شعور ثانوی حیثیت رکھتا ہے مادہ نے حیات کی صورت اختیار کی، حیات سے احساس پیدا ہوا، اور احساس سے ذہن، اس کی توثیق علم الارض (Geology) کی تحقیقات سے ہوتی ہے جنھوں نے بقول مادیین یہ ثابت کر دیا ہے کہ کرۂ ارضی انسان سے قبل وجود میں آیا ہے، چنانچہ اینجلس کہتا ہے،

"یہ مادی دنیا جس کا ادراک ہم اپنے حواس سے کرتے ہیں، یہی اور صرف یہی حقیقی ہے، ہمارا شعور اور ہماری فکر خواہ وہ ہمارے حواس و مدرکات سے بالاتر کیوں نہ معلوم ہوں، اسی مادی جسم اور اس کے اعضاء کی پیداوار ہیں، مادہ ذہن کی پیداوار نہیں، بلکہ ذہن مادہ کی پیداوار ہے"

مارکسیت اور نظریۂ ارتقا مارکسیت ڈارون اور اس کے جانشینوں کے مرتب کردہ نظریہ ارتقا کو تسلیم کرتی ہے، اور واقعات عالم کی توجیہ کے لئے اسی نظریہ کو استعمال کرتی ہے لیکن وہ ارتقا کے قدیم ڈارونی نظریہ کے ایک پہلو کو نہیں مانتی، ڈارون اور اس کے ہم خیال سائنسدانوں کا دعویٰ تھا

کہ فطرت مین جملہ ارتقائی تغیرات تدریجاً عمل میں آتے ہین، اور فطرت کا تسلسل کہین نہین ٹوٹتا، یہ نہیں ہوتا ہے کہ فطرت مین کوئی تغیر اچانک واقع ہو جائے، مارکسیت اس کے برعکس فطرت مین اچانک تغیرات کی قائل ہے، یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، کہ فطرت تدریج و تسلسل سے کام لینے کے بجائے ایک جست لگاکر آگے بڑھ جاتی ہے، اور کسی ایسی شے یا ذی حیات ہستی کو وجود مین لے آتی ہے جو اشکال و صفات کے لحاظ سے اپنے پیشروؤن سے بالکل جدا گانہ ہو، چنانچہ پاکھانوو (Plekhanov) لکھتا ہے:

بہت سے لوگ جدلیات کو نظریۂ ارتقاء کے مترادف قرار دیتے ہین، بیشک جدلیات بھی ارتقاء کا ایک نظریہ ہے، لیکن اس مین اور عام نظریۂ ارتقاء مین ایک بنیادی فرق ہے، قدیم نظریۂ ارتقاء اس یقین پر مبنی ہے، کہ نہ تو فطرت مین اور نہ انسانی تاریخ مین کوئی تغیر اچانک واقع ہو سکتا ہے کیونکہ دنیا مین تمام تغیرات تدریجاً عمل مین آتے ہین، ہیگل نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس مفہوم کا نظریۂ ارتقاء بالکل مہمل ہے؛

درحقیقت مارکسیت کا ارتقائی نظریہ لائڈ مارگن (Lloyd margan) کے جدید نظریۂ ارتقاء سے بہت قریب تر ہے جس کو نظریۂ بروز (Emergence theory) کہا جاتا ہے، بروز کا نظریۂ ارتقاء ان مشاہدات پر مبنی ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ عالم انسانی اور عالم فطرت دونون مین ایسے نئے صفات اور خواص کا ظہور ہوتا ہے، جو بالکل غیر متوقع ہوتے ہین، اور ہم سابقہ حالات سے ان صفات و خواص کا وہم و گمان بھی نہین کیا جا سکتا ہے، مثلاً دو رنگون کے امتزاج سے ایک نیا رنگ پیدا ہو جاتا ہے، جو بلحاظ صفات اپنے عناصر ترکیبی سے بالکل جدا ہوتا ہے، ہائڈروجن اور آکسیجن کے تناسب امتزاج سے پانی وجود مین آجاتا ہے، جو ان دونون سے بالکل مختلف خواص رکھتا ہے، اگر کوئی شخص ہائڈروجن اور آکسیجن کے خواص کا مطالعہ کرلے تو

یہ پیشین گوئی کبھی نہین کرسکتا کہ اُن کے امتزاج سے کوئی ایسی شے وجود مین آسکتی ہے، جیسے پانی، کیونکہ پانی کے خواص ہائڈروجن اور آکسیجن کی کسی خاصیت سے نہین ملتے، مارکسیت انسانی نفس و شعور کی توجیہ اسی طرح کرتی ہے، اس کا دعویٰ ہے، کہ انسانی تغیر اور اس کا شعور انھین مادی و جسمانی اعضاء کی کی ترکیب سے وجود مین آیا ہے لیکن جس طرح پانی ہائڈروجن اور آکسیجن سے لحاظ خواص بالکل مختلف ہے، اسی طرح انسان کا ذہن اس کے جسم سے باعتبار صفات بالکل جداگانہ ہے، یعنی اجزائے جسم کی ترکیب سے ایک اعلیٰ تر شے وجود مین آگئی جو بالکل نئی ہے، اور جس کی کوئی پیشین گوئی اس کے عناصر ترکیبی کو دیکھ کر نہین کی جاسکتی تھی، اسی طرح ذہن مادہ ہی کی پیداوار ہے، نہ یہ کہ مادہ ذہن کی پیداوار ہے، جیسا کہ ہیگل اور جرمن عینیت پرستون کا خیال ہے،

مارکسیت اور دائمی صداقتین مارکسیت کسی دائمی صداقت کو نہیں مانتی ہے، اس کا نظریہ یہ ہے کہ تاریخ اور فطرت کے جملہ مظاہر، تغیر اور نشو و نما، اور ترقی کے آثار و مشاہدات سے معمور ہین، اس لئے اس دائرہ مین کوئی صداقت دائمی نہین ہوسکتی، ہر انگلس کہتا ہے،

"جہان تک انسانی تاریخ کا تعلق ہے، دائمی صداقتین صرف اس قسم کی عملیات ہوسکتی ہین، لین جیسے تمام انسان فانی ہین، یا انسانیت اب تک ہمیشہ حاکم و محکوم طبقات مین منقسم رہی ہے، یا یہ کہ نپولین نے ۵ رمئی ۱۸۲۱ء مین انتقال کیا۔"

پھر بھی مارکسیت اس بات کو تسلیم کرتی ہے، کہ ایسے اصول ہوسکتے ہین، جو تاریخ کے کسی مخصوص دور مین انسان کی رہبری کا کام دین لیکن یہ دور ایک متعین زمانہ کے بعد ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد پھر وہ اصول کام مین نہین آسکتے، کیونکہ معاشرتی حالات بدل جانے کے بعد ان اصولون مین صداقت نہین رہتی ہے، مارکسیت انسانی فکر کی محدودیت کو تسلیم کرتی ہے، اور اسی محدودیت کے باعث انسان سے جو خطائین اور لغزشیں سرزد ہوتی ہین، وہ انسان کی آیندہ ذہنی ترقی اور صداقت فکر کی کامیاب

تلاش کے لئے ضروری قرار دیتی ہے، چنانچہ انجلس اس کے بارے میں لکھتا ہو،

انسانی فکر کی سیادت اور مطلقیت منفرد اشخاص کی محدود اور غیر مطلق فکر کے ذریعہ قائم ہوتی ہے،

وہ علم جو غیر مشروط یعنی مطلق صداقت کا حامل ہو، خطاؤں اور لغزشوں کے ایک طویل سلسلہ کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے، لیکن اس کے حصول کے لئے نوعِ انسانی کی حیات کا لامتناہی ہونا ضروری ہے، یہاں بھی ہمیں ایک عجیب تضاد نظر آتا ہے، وہ یہ کہ انسانی فکر اپنے منتہا، اور قابلیت کمال کے لحاظ سے تو مطلق ہے لیکن اس کا اظہار بہرحال اشخاص ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، جن کی پرواز فکر تنگ اور محدود ہے، یہ تضاد اس وقت حل ہو سکتا ہے، جب نسلِ انسانی کا سلسلہ لامتناہی ہو، اس لحاظ سے انسانی فکر کی سیادت اور غیر محدودیت ایک حقیقت ہے بھی اور نہیں بھی ہے، اپنے منصب، اپنے میلان ارتقا، اور اپنی تاریخی غایت کے لحاظ سے تو وہ یقیناً ایک بالاتر اور غیر محدود حقیقت ہے لیکن جب اس کا ظہور انسان کی انفرادی ذات میں ہوتا ہے، تو وہ محدود ہو جاتی ہے، اسی طرح کسی مخصوص تاریخی دور میں اس کا مجموعی ظہور محدودیت سے پاک نہیں ہو سکتا، یہی حال ابدی صداقتوں کا بھی ہے، اگر انسان کبھی اس منزل ترقی تک پہنچ جائے، جہاں وہ صرف ابدی صداقتوں کے ذریعہ دنیا کا کام انجام دیسکے، یعنی ایسے نتائج فکر کے ذریعہ جو غیر مشروط اور مطلق صداقت کے حامل ہوں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے، کہ انسان لامتناہی سلسلہ کی انتہا، کو پہنچ گیا، اور عالمِ حقیقی کے کل محدود امکانات بروے کار آچکے"،

مارکسیت اور وحی و الہام | مارکسیت انسان کے خارجی تجربات کو اس کے تمام علمی تصورات کا ماخذ قرار دیتی ہے، اس لئے وہ انسانی حواس و مدرکات کے سوا دوسری ذریعہ علم کو حقیقی نہیں تسلیم کرتی ہے، پروفیسر داس گپتا، اپنی کتاب (Materialism, Marxism, Determinism and Dialectics)

میں لکھتے ہیں:۔

"علم کا سارا مواد ہمیں عالم مادی کے تجربات سے حاصل ہو سکتا ہے، مختلف تجربات کے باہمی تعامل سے نئے افکار و تصورات پیدا ہو سکتے ہیں، جن کا ممکن ہے ہمارے خارجی مدرکات سے کوئی تعلق معلوم نہ ہو، لیکن اگر ان افکار و تصورات کی تہ تک پہونچنے کی کوشش کیجائے، تو معلوم ہوگا، کہ ہمارے سابقہ تجربات ہی میں سے کوئی نہ کوئی تجربہ ان کا ماخذ و سرچشمہ ہے، الہام ربانی، فکر خالص اور وجدان علم کے ذرائع نہیں ہو سکتے، یہ محض افسانے ہیں، درحقیقت انسان کے تجربات جن کا کبھی وہ شعور رکھتا ہے، اور کبھی نہیں رکھتا، لیکن اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں حاصل کرتا رہتا ہے، اس کے تمام تصورات و نظریات کا مواد ہیں، جب وہ انھیں عملی دنیا میں آزما لیتا ہے، تو یہی تصورات و نظریات علمی حقائق بن جاتے ہیں، ایک سائنسدان یا فلسفی اپنے علمی نظریات ان تجربات پر قائم کرتا ہے، جن کا وہ غیر شعوری طور پر حامل ہوتا ہے لیکن جس چیز کو الہام ربانی کہا جاتا ہے، اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ کسی لطیف اور حساس ذہن میں اس کے غیر شعوری تجربات جگہ پا لیتے ہیں، اور کسی تخلیقی مدعا کے حصول میں اس کی رہنمائی کرتے ہیں، جب کبھی یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ کوئی تصور خالص کسی تخلیقی عمل یا سائنٹفک انکشاف کا سبب ہے تو ہوتا یہ ہے کہ خارجی تجربات کا کوئی ذخیرہ کسی ذہین شخص کی بالغ نظر اور اعلیٰ صلاحیت فکر کے ساتھ مل کر ایک نئی صورت میں ظاہر ہوتا ہے"

مارکسیت اور خارجی ماحول مارکسیت کا ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ ہر مادی واقعہ اور ہر فکری فلسفہ کو ان حالات کی روشنی میں سمجھنا چاہئے، جن میں وہ وجود پذیر ہوا ہو، کسی واقعہ یا نظریہ کی صداقت کو اس کے خارجی احوال سے جدا کر کے سمجھنے کی کوشش کرنا اصولاً غلط ہے، اور یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، کیونکہ عالم ایک سلسلۂ واقعات ہے، جس میں ہر واقعہ دوسرے واقعہ کے ساتھ علت و

معلول کے رشتہ سے جڑا ہوا ہے، لیکن اگر ایک طرف مارکس ماحول کی تخلیقی قوت پر زور دیتا ہے تو دوسری جانب وہ یہ نظریہ بھی پیش کرتا ہے، کہ انسان اپنے ماحول میں تبدیلی کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے، چنانچہ پالکھانوز (Plekhanov) لکھتا ہے،

"مارکس کو اپنے مادہ پرست پیشروؤں سے یہ شکایت تھی، کہ انھوں نے اس امر کو نظر انداز کردیا کہ اگر ایک طرف آدمی اپنے ماحول کا مخلوق ہے، تو دوسری طرف ماحول خود اس کی کوششوں سے تبدیل ہو سکتا ہے، مارکس کے نظریہ کے مطابق تاریخی واقعات کی دنیا میں مادیت کا کام یہ ہے، کہ وہ اس امر کی تشریح کرے، کہ کس طرح ماحول ان ہی انسانوں کے ہاتھوں تبدیل ہوتا ہے جو اس کی پیداوار ہیں"،

ماحول کے تغیرات میں انسان جو حصہ لیتا ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے انگلس نے لکھا ہے:-

"طبعی علوم اور فلسفہ نے اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا کہ انسان کے مشاغل اور اس کے اعمال اس کی قوتِ فکر اور طرزِ خیال پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں، یہ علوم انسان کو ایک طرف رکھتے ہیں، اور فطرت کو دوسری طرف لیکن فطرت میں جو تبدیلیاں انسان خود اپنی سرگرمیوں سے پیدا کرتا ہے، وہی انسانی فکر کی لازمی اور حقیقی بنیاد ہیں، چنانچہ جس قدر انسان نے خارجی فطرت کو تبدیل کرنے میں کامیابی حاصل کی، اسی قدر اس کی عقلی قوت میں ترقی ہوئی، تاریخ کا طبیعاتی تصور جو ڈریپر (Draper) اور دوسرے طبعی سائنسدانوں (Natural Scientists) کی تحریروں میں ملتا ہے، اور جس کی رو سے تنہا خارجی فطرت انسان پر عمل کرتی ہے، اور صرف طبعی حالات انسانی تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں، بالکلیہ یکطرفہ ہے، اس تصور میں یہ امر فراموش کردیا گیا ہے، کہ انسان بھی فطرت پر عمل کرسکتا ہے، اس پر اثر ڈال سکتا ہے، اور اسے تبدیل کرکے زندگی کے نئے حالات پیدا کرسکتا ہے،

مارکسیت اور تاریخی حوادث تاریخی حالات وواقعات کے متعلق مارکسیت کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں کوئی واقعہ بلا وجہ نہیں ہوتا، بلکہ اپنے پیشرو واقعات کا نتیجہ یا معلول ہوتا ہے، اس طرح انسانی تاریخ میں علت ومعلول کا قانون اسی طرح کارفرما ہے، جس طرح خارجی فطرت میں اسی لئے تاریخی واقعات میں ایک خاص ترتیب نظر آتی ہے، لیکن تاریخ انسانی اور فطرت خارجی کے واقعات میں فرق یہ ہے کہ فطرت میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ بے شعوری کی حالت میں ہوتا ہے یعنی اشیاے خارجی غیر شعوری طور پر ایک فطری قانون کی پابند ہیں، اور ان میں جو تبدیلیاں اور ترقیاں نظر آتی ہیں. اُن میں اُن کے ارادہ واختیار اور شعور کو دخل نہیں، اس کے برخلاف انسان جو کچھ کرتا ہے، سمجھ بوجھ کر کرتا ہے، اور تاریخ انسانی کے تغیرات انسانی شعور وارادہ کے ماتحت ہوتے ہیں، پھر بھی انسانی تاریخ میں اضطرار بے شعوری اور عدم اختیار کا ایک عنصر ضرور موجود ہے، جس کے متعلق اینجلس لکھتا ہے

"ایک لحاظ سے انسانی معاشرہ کے ارتقار کی تاریخ ارتقاء فطرت سے بالکل جدا ہے، فطرت پر انسان جو اثر ڈالتا ہے، اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے، تو اس میں صرف کورانہ قوتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں، اور ان قوتوں کے تعامل سے عام قوانین، فطرت اپنا کام کرتے رہتے ہیں فطرت میں جتنے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، خواہ وہ ان بے شمار حوادث کی شکل میں ظہور پذیر ہوں، جن کا مشاہدہ اشیائے فطرت کے سطحی تغیرات میں کیا جاتا ہے. یا ان نتائج ہوں جن سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان حوادث کی تہ میں ایک باقاعدگی اور تسلسل موجود ہے، ان میں کوئی واقعہ بھی کسی ارادی کوشش یا شعوری مقصد کے تحت پیش نہیں آتا ہے لیکن انسانی معاشرہ کی تاریخ میں جتنی قوتیں کام کرتی ہیں. وہ سب اپنے مقصد کا پورا پورا شعور رکھتی ہیں کیونکہ انسان ہمیشہ سوچ سمجھ کر کسی مقصد کے تحت عمل کرتا ہے، کوئی عمل ایسا نہیں ہوتا ہے جس کی پشت پر کوئی شعوری مقصد نہو، لیکن اس بنیادی فرق کے باوجود یہ بھی

ایک حقیقت ہے کہ عمومی باطنی قوانین (General laws) تاریخ کی تشکیل کرتے ہین، کیونکہ یہان افراد کے شعوری مقاصد کے باوجود مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے، تو اتفاقات حوادث انسانی تاریخ پر فیصلہ کن اثر ڈالتے ہین جس چیز کے لئے ارادی طور پر کوشش کی جاتی ہے وہ بہت کم واقع ہوتی ہے، بیشتر صورتون مین مختلف افراد جماعتون کے ارادی اور شعوری مقاصد ایک دوسرے سے متصادم ہوجاتے ہین، یا خود وہ مقاصد اپنی فطرت اور نوعیت کے اعتبار سے ناممکن الحصول ہوتے ہین، اور ایسا بھی ہوتا ہے، کہ مقاصد تو قابلِ حصول ہوتے ہین، مگر اُن کے حصول کے ذرائع ناکافی ہوتے ہین، اس طرح مختلف منفرد اشخاص وجماعات کے ارادون اور کوششون مین تصادم واقع ہوتا ہے، جس سے انسانی تاریخ مین بھی وہی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، جو بے شعور فطرت مین ہے، انسانی اعمال وافعال کے مقاصد تو ارادی اور شعوری ہوتے ہین، مگر ان کے نتائج وہ نہین ہوتے ہین جن کی خواہش کیجاتی ہے، یا جن کا حصول پیشِ نظر ہوتا ہے، بلکہ اعمالِ انسانی اکثر اوقات ایسے نتائج پر منتہی ہوتے ہین، جو پیشِ نظر مقصد یا متوقعہ نتائج کے خلاف ہوتے ہین، اس طرح ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ تاریخی واقعات مین بھی اتفاقات وحوادث کی حکمرانی ہے، لیکن خواہ سطح پر اتفاقات حکمران نظر آئین، واقعہ یہ ہے، کہ تاریخ انسانی چند قوانین مستورہ کے مطابق حرکت کرتی ہے، اب یہ کام انسان کا ہے، کہ وہ ان قوانین کا انکشاف کرے،

کیا فکری غیر جانبداری اور بے لاگ ذہن کا وجود ممکن ہے؟

مارکسیت بڑے شد ومد سے اس خیال کی تردید کرتی ہے، کہ انسان کسی معاملہ مین بالکل غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر اختیار کرسکتا ہے، اس کا دعوی ہے کہ فکر کا کامل توازن غیر ممکن ہے، چنانچہ پروفیسر واس گپتا اپنی کتاب (Materialism Marxism, Determinism and Dialectics) مین لکھتے ہین،

"بے لاگ فکر کا قدیم نظریہ اور یہ خیال کہ انسان ذہن خالص کے ذریعہ کسی شے کی تحقیق وجستجو

کر سکتا ہے، بالکل غلط ہے، واقعہ یہ ہو کہ ہر تحقیق و جستجو مین محقق اور جستجو کنندہ ایک متاثرہ ذہن کے ساتھ کام شروع کرتا ہے، یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے :-

ہیزن برگ (Heisenberg) نے اپنے اصول لاتعین[1] (Principle of Indetermination) مین ثابت کر دیا ہے، کہ تفتیش و تحقیق کے عمل مین مفتش کا ملاً غیر جانبدار نہین رہ سکتا ہے، بلکہ اس کا ذہنی نقطۂ نظر اپنا اثر ضرور رکھتا ہے، اس حقیقت سے فرار غیر ممکن ہے، جوہری عالم (Atomic world) مین تحقیق اور محقق کے بارے مین جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ممکن ہے، کہ معاشرتی علوم مین صحیح نہو لیکن یہ یقینی ہے کہ مفتش عمل تفتیش پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے، لیکن اس تداخل ذات کے معنی یہ نہین کہ مفتش اپنے ذاتی میلان یا پہلے سے قائم کردہ نظریات کے مطابق کام کرنا شروع کرے، بلکہ اس سے مراد مفتش کی علمی اور ثقافتی روایات ہین، جس مین وہ پرورش پاتا ہی،

(باقی)

---

[1] سائنسدانون نے مادہ کے حقیر ترین ذرات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نظریہ پیش کیا، کہ جوہر (Atom) منفی و مثبت برقیون پر مشتمل ہوتا ہے جنھین الکٹرون (Electron) اور پروٹون (Proton) کہا جاتا ہے، الکٹرون پروٹون کے اطراف گردش کرتے ہین، ہیزن برگ نے یہ معلوم کیا کہ الکٹرون کی گردش کا کوئی اصول نہیں ہوتا ہے، یعنی یہ نہین کہا جا سکتا ہے، کہ الکٹرون اپنی گردش مین کیا راستہ اختیار کرین گے، ہر الکٹرون چند معینہ دائرون (Orbits) پر گردش کرتا ہے، لیکن ہیزن برگ نے بتایا کہ اکثر اوقات الکٹرون ایک دائرہ سے نکلنے کے بعد بیچ کے دائرون کو چھوڑ کر اگلے دائرہ مین گردش کرنے لگتا ہے، اس طرح الکٹرون کی حرکت اور گردش کے متعلق کوئی اصول نہین بنایا جا سکتا ہے، اور نہ کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے، یہی اصول لاتعین ہے،

اردو زبان کا غیر اسلامی مذہبی اور اخلاقی

از

جناب مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

"اردو کے عام اور مشترک زبان ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے
اور اہلِ مذاہب نے اسی کو اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت اور اپنی مذہبی و اخلاقی تع
تک پہنچانے کا ذریعہ بنایا اس میں اپنی مذہبی کتابوں کے ترجمے کئے، اور مذ
کے ہر پہلو پر بہ کثرت کتابیں لکھیں، بودھ، عیسائی، جین، سناتن دھرم، آریہ،
ایسا فرقہ نہیں ہے جس کی مذہبی و اخلاقی کتابیں، اردو میں موجود نہ ہوں
رفیق مولوی محمد عزیز صاحب نے اس موضوع پر مذکورۂ بالا عنوان سے ڈاکٹر
مقالہ لکھا ہے جس کا ایک ٹکڑا ہمارے پاس اشاعت کے لئے بھیجا ہے یہ مقالہ ارد
زبان ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے، اور اس لائق ہے کہ اردو کے مخالفین اس
اور دیکھیں کہ خود ہندوستان کے مذاہب اپنی تبلیغ میں کہاں تک اردو کے رہ
اُن کا کتنا لٹریچر اردو میں موجود ہے"، "م"

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے سیکڑوں برس پہلے اس ملک سے
قائم ہو چکے تھے، وہ ہندوستان کی پیداوار مصر اور شام کے ذریعہ یورپ تک
کا سامان، ہندوستان، جزائر ہند، چین، اور جاپان تک پہنچاتے تھے، عربوں کے

ور مغربی ممالک کی تجارت مین ایرانیون نے بھی بڑی سرگرمی دکھائی، ساتوین صدی عیسوی کے شروع مین جب مسلمانون نے ایران فتح کیا، تو مسلمان تاجر ایران کی بحری تجارت پر بھی قابض ہوگئے، اور عرب جہازرانون کے بیڑے بحر ہند مین روان نظر آنے لگے،

ہندوستان مین مسلمانون کے آنے کی ابتدا محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے خیال کیجاتی ہے، جو پہلی صدی ہجری کے آخر مین ہوئی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شمالی ہند سے پہلے جنوبی ہند مین مسلمانون کی نوآبادیان قائم ہوئین، اور سب سے پہلے وہ تاجرانہ حیثیت سے جنوبی ہند کے جزائر، اور بعض ساحلی مقامات پر آکر آباد ہوئے، سندھ پر حملہ کے مختلف اسباب تھے، ان مین سے ایک خاص سبب خود اس حقیقت کو آشکارا کرتا ہے کہ جنوبی ہند کے اطراف مین مسلمان پہلے سے آباد تھے، پہلی صدی ہجری کے آخر مین حجاج عراق کا گورنر تھا، اور جزائر ہند کی طرف عراق کی بندرگاہ سے جہاز آتے تھے، لنکا کے راجہ نے مسلمانون سے اظہارِ دوستی کے طور پر منجملہ دوسرے تحائف کے ایک جہاز مین اُن مسلمانون کے اہل وعیال کو بھی عراق روانہ کیا، جو لنکا مین تجارت کے سلسلہ سے آباد تھے، اور وہین انتقال کرگئے تھے، اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ لنکا مین مسلمانون کی آبادی پہلی صدی ہجری مین قائم ہوچکی تھی، جس جہاز پر یہ تحائف اور مسلمانون کی عورتین اور بچے جارہے تھے، اس پر سندھ کی بندرگاہ دیبل کے قریب بحری ڈاکوؤن نے حملہ کرکے تمام سامان اور اُن عورتون اور بچون پر قبضہ کرلیا، حجاج کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے سندھ کے راجہ داہر سے ان گرفتارون کو بحفاظت عراق بھجوا دینے کا مطالبہ کیا، مگر راجہ نے یہ عذر کیا کہ ڈاکوؤن پر میرا کچھ زور نہین، حجاج نے اس عذر کو قبول نہ کیا، اور اپنے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم کی سرکردگی مین ایک فوج سندھ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کی، جس نے ۹۳ھ مین سندھ پہنچ کر تین برس کے عرصہ مین ملتان سے کچھ تک اور دوسری طرف مالوہ کی سرحد تک قبضہ کرلیا،

لنکا مین مسلمانون کی آمد کا سلسلہ تجارت کے علاوہ ایک مذہبی عقیدت کی بنا پر بھی شروع ہوا،

وہان کے ایک پہاڑ پر ایک نشانِ قدم تھا، جسے مسلمان حضرت آدم علیہ السلام کے قدم کا نشان سمجھتے تھے، اور اُس کی زیارت کو آیا کرتے تھے، انہی کے ذریعہ سے لنکا کے راجہ کو اسلام کا حال معلوم ہوا، اور فرشتہ کی روایت کے مطابق ۵ ہجری یعنی ساتوین صدی عیسوی ہی مین مسلمان ہوگیا، بزرگ بن شہریار نے بھی اپنی کتاب عجائب الہند مین جو ۳۰۰ھ کے قریب کی تصنیف ہے مسلمانون کے ساتھ لنکا والون کے محبت اور میلان" رکھنے کا ذکر کیا ہے،[1]

ان اطراف مین مسلمانون کا دوسرا مرکز مالدیپ کا جزیرہ تھا، مالدیپ کے مفصل حالات ابن بطوطہ نے لکھے ہین، اُس کے زمانہ یعنی سلطان محمد تغلق کے عہد مین پورا جزیرہ مسلمان تھا، اور اس مین عربون اور دیسی مسلمانون کی آبادی تھی، اور سلطان خدیجہ نام ایک بنگالی خاتون وہان کی فرمانروا تھی، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ یہان کے لوگ پہلے بت پرست تھے، لیکن مراکو کے ایک شیخ ابو البرکات بربری مغربی کی ایک کرامت دیکھ کر راجہ شنورزاہ اور اُس کی تمام رعایا مسلمان ہوگئی، وہ لکھتا ہے کہ مالدیپ کی اس مسجد کی محراب پر جسے نومسلم راجا نے تعمیر کرایا تھا مین نے یہ کتبہ دیکھا:-

"سلطان احمد شنورازہ ابو البرکات مغربی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا،"[2]

قریب قریب اسی زمانہ مین مسلمانون کی ایک جماعت نے عرب سے آکر ملیبار کے ساحل پر بود و باش اختیار کی، رونلڈسن (RONALDSON) تحفۃ المجاہدین کے دیباچہ مین لکھتا ہے کہ "مسلم عرب ساحل ملیبار پر اوّل اوّل ساتوین صدی عیسوی کے آخر کے قریب آباد ہوئے" اسٹروک (STURROCK) کا بیان ہو کہ یہ بخوبی معلوم ہو کہ ساتوین صدی کے بعد سے ایرانی او عرب تاجر ہندوستان کی مختلف بندرگاہون مین کثرت سے آباد ہوگئے، اور اس علاقہ کی عورتون سے شادی کرلی، اور یہ آبادیان خصوصیت کے ساتھ ملیبار مین بڑی، اور اہم تھین، جہان بہت قدیم زمانہ سے

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات:- از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۲۶۲ [2] ایضاً ص ۲۶۵-۲۶۶

یہ پالیسی نظر آتی ہے، کہ بندرگاہوں میں تاجروں کی ہر طرح حوصلہ افزائی کیجائے"، ملیبار میں مسلمانوں کی آمد اور اشاعت اسلام کے تفصیلی حالات شیخ زین الدین نے اپنی مشہور کتاب تحفۃ المجاہدین[۲] میں لکھے ہیں، جو ملیبار کے مسلمانوں کی سب سے قدیم تاریخ ہے، وہاں کے راجہ چیرامن پیرومال کے قبول اسلام کا واقعہ جس طرح اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے، ممکن ہے روایتی حیثیت رکھتا ہو، لیکن جیسا کہ ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے" ملیبار میں چیرامن پیرومال کا خاندان نویں صدی عیسوی کے شروع ہی میں اس کے آخری فرمانروا کی تخت سے دست برداری کے ساتھ ختم ہو گیا تھا، جو غالبًا مسلمان ہو گیا تھا، چنانچہ راجہ کے مسلمان ہونے کی یادگار ملیبار میں اب تک اس طرح منائی جاتی ہے، کہ تخت نشینی کے وقت ٹراونکور کے راجہ زمورن (سامری) کو مسلمانوں کا سا لباس پہنایا جاتا ہے، اور ایک مسلمان ماپلا اس کے سر پر تاج رکھتا ہے، پھر راجہ کو تلوار ہاتھ میں لے کر یہ کہنا پڑتا ہے، کہ"میں یہ تلوار اس وقت تک رکھونگا، جب تک میرا چچا جو مکہ گیا ہے، واپس نہیں آتا،" (کہا جاتا ہے کہ زمورن اس راجہ کا جو عرب چلا گیا تھا نائب ہے) ان مراسم کے بعد راجہ ذات باہر سمجھا جاتا ہے، اور نائر یا اعلیٰ طبقہ کے ہندو اسے ہاتھ نہیں لگاسکتے،

مسلمانوں نے شروع ہی سے ملیبار میں ہر دلعزیزی اور اہمیت حاصل کر لی تھی، وہ ماپلا کے نام سے پکارے جاتے تھے، جس کے معنی ہیں بزرگ کا بچہ یا دولہا، یہ لقب ملیبار میں عیسائیوں کو بھی دیا گیا تھا، مگر دونوں فرقوں میں امتیاز کی غرض سے عیسائیوں کو نصرانی ماپلا کہتے تھے، مسلمانوں کو اور مراعات بھی حاصل تھیں، مثلاً ایک مسلمان نمبوتری برہمن کے ساتھ بیٹھ سکتا تھا، حالانکہ ایک نائر کو اس کی اجازت نہ تھی، اسی طرح ماپلا کے سردار تھنگل کو زمورن (سامری) کے ساتھ ساتھ پالکی میں جانے

---

[۱] ہندوستانی تہذیب پر اسلام کا اثر (انگریزی) از ڈاکٹر تاراچند، مطبوعہ انڈین پریس، الہ آباد، ص ۳۲،

[۲] تحفۃ المجاہدین مترجمہ حکیم سید شمس اللہ قادری، شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڈھ،

کی اجازت تھی، زمورن کی سرپرستی مین عرب تاجرون کی ایک بڑی تعداد اوس کے علاقون مین آباد ہو گئی، اور انھون نے اپنی تجارت سے نہ صرف ملک کی دولت مین بہت کچھ اضافہ کیا بلکہ راجہ کی فوجی مہمون مین بھی اس کی مدد کی، زمورن مسلمانون کی نسبت ایسی اچھی راے رکھتا تھا کہ اوس نے اپنی ہندو رعایا مین اسلام پھیلانے کی حوصلہ افزائی کی، اور چونکہ ہندو جہازرانی سے مذہباً اجتناب کرتے تھے، یہ حکم دیا کہ ماہی گیرون کے ہر خاندان مین سے کم سے کم ایک لڑکے کو مسلمانون کی سی تعلیم و تربیت دیجائے تاکہ عرب جہازرانون کے لئے جن پر وہ اپنی جارحانہ مہمون مین بھروسا کرتا تھا، سپاہی تیار ہوسکین، ان مراعات اور حوصلہ افزائیون کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کا اثر روز بروز بڑھتا گیا، اور مسلمان بڑی تعداد مین جنوبی ہند مین آباد ہو گئے،

مغربی ساحل کی طرح مشرقی ساحل پر بھی عربون کی آمد و رفت تجارت کے سلسلہ سے زمانۂ قبل اسلام سے تھی، عرب تاجر چین جاتے ہوئے خلیج بنگال سے گذرتے تھے، مسلمان عربون نے بھی اس سلسلہ کو جاری رکھا، اور ساحلی مقامات پر اُن کی آبادیان بڑھتی گئین، تجارتی جہاز اس کثرت سے یہان سے آتے جاتے تھے، کہ عربون نے اس ساحل کا نام ہی معبر (گذرگاہ) رکھدیا، ملیبار کی طرح معبر کے مسلمانون کو بھی مقامی راجاؤن کی طرف سے ہر قسم کی رعایتین ملین، اور وہ آزادی کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کرنے لگے،

مسلمانون اور ہندو راجاؤن کے تعلقات کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۷۱۰ھ (سنہ ۱۳۱۰ء) مین جب سلطان علاء الدین کی فوج نے کاردمنڈل پر حملہ کیا، تو اس کے راجہ کی طرف سے مسلمان عراقیون اور مسلمان عربون نے مسلمان ترکون کا مقابلہ کیا اور گو راجہ کو شکست ہوئی، اور ملک کافور نے ملک پر قبضہ کرلیا، لیکن کاردمنڈل کے مسلمان اپنے عہد و پیمان کی بنا پر اور رعایتون کی حق شناسی مین جو انھین راجہ کی طرف سے حاصل تھین، مسلمان حملہ آورون سے نہایت جانبازی کے ساتھ لڑے

اور امیر خسرو کی روایت کے مطابق محض کلمہ اور قرآن پڑھ کر اور اس طرح اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیکر ملک کافور کے شدید انتقام سے اپنی جان بچا سکے،[۱]

چودہوین صدی عیسوی مین ملک کافور کے حملہ کے بعد جب ابن بطوطہ نے معبر کا سفر کیا، تو جس علاقہ مین اب میسور کی ریاست ہے، وہان اس وقت ہوسیالا خاندان کی حکومت تھی، اور پایۂ تخت کا نام دوار سمندر تھا، حکمران راجہ بلال دیو تھا، ابن بطوطہ نے اس کی فوج کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے، جس مین بیس ہزار کے قریب مسلمان تھے،[۲]

ڈاکٹر تارا چند اپنے ایک مقالہ مین لکھتے ہین :۔

ان بیانات سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے، کہ ظہور اسلام کے تھوڑے ہی دنون بعد مسلمانون نے ہندوستان مین اپنی تہذیب، مذہب اور خیالات کے پھیلانے کا موقع حاصل کر لیا، ساتوین صدی سے تیرہوین صدی تک ان کا تعلق تجارت کی صورت مین تھا، اور سوداگرون کی حیثیت سے شروع مین اُن کی آؤ بھگت ہوئی، جب ہندو راجہ اُن سے واقف ہوگئے، تو اُن کی وقعت اور بھی بڑھ گئی، وہ بڑے بڑے عہدون پر مقرر ہوئے، اُن مین سے وزیر، بیڑون کے کمانڈر، ایلچی، افسران محاصل اور فوج کے کپتان وغیرہ مقرر ہونے لگے، اُن کو اپنے مذہب کی پابندی کے لئے مسجدین بنانے، اور اپنے مذہبی پیشواؤن، اور فقیرون کو خانقاہون مین رکھنے کی اجازت تھی، صرف یہی نہین، بلکہ وہ کھلم کھلا اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکتے تھے، اور کہین کہین تو راجہ خود اس تبلیغ مین مدد کرتے تھے اور صرف جنوبی ہند تک اس پُرامن اثر کے حدود نہ تھے، بلکہ شمالی ہندوستان مین بھی مسلمانون کا ہندوؤن سے بہت دنون تک اسی طرح کا تعلق رہا، یہ سچ ہے کہ آٹھوین صدی کے اوائل مین عربون نے سندھ پر قبضہ کر لیا، لیکن ملتان اور سندھ کو چھوڑ کر اور کوئی حصہ تین سو برس تک اُن کے قبضہ مین نہین آیا،[۳]

---

[۱] عرب و ہند کے تعلقات، ص ۵، ۷، ۲۷۶ [۲] ایضاً ص ۳۰۰ [۳] مسلمانون کا ہندوستان مین آنا، از ڈاکٹر تارا چند (مطبوعہ رسالہ ہندستانی جولائی ۱۹۳۱ء)

گجرات کاٹھیاوار، کچھ، اور کوکن کا علاقہ عربون کا پانچوان تجارتی مرکز تھا، ان علاقون مین بھی مسلمان بڑی تعداد مین آباد ہوگئے تھے، اور انھون نے اتنی عزت اور اہمیت حاصل کر لی تھی، کہ اُن کے باہمی معاملات کو طے کرنے کے لئے راجہ انہی مین سے کسی معزز آدمی کو ... ہنرمند مقرر کر دیتا تھا ہنرمند کے لفظی معنی تو ہنر والے کے ہین لیکن اصطلاح مین اُس مسلمان قاضی کو کہتے تھے، جو راجہ کی طرف سے مسلمانون کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے مقرر کیا جاتا تھا، چنانچہ مختلف بڑے بڑے شہرون مین ہنرمند مقرر تھے، عرب سوداگرون نے اکثر یہین کی عورتون سے نکاح کر لیا تھا، اُن سے جو اولاد ہوتی تھی اُن کو "بیسر" (بیاسرہ جمع) کہتے تھے،

شمالی ہند مین مسلمانون کا قدم سب سے پہلے سندھ مین آیا، جیسا کہ شروع مین بیان ہوا، محمد بن قاسم نے پہلی صدی ہجری کے آخر مین دیبل سے ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس حملہ سے پہلے ہی، پانچ سو عرب مسلمانون کی ایک جماعت مکران سے بھاگ کر سندھ کے راجہ داہر کے یہان چلی آئی تھی، اور لنکا کے مسلمان تاجرون کی یتیم لڑکیون کے علاوہ ان پناہ گزینون کو واپس نہ کرنا بھی منجملہ ان اسباب کے تھا، جو حجاج کی اس انتقامی مہم کا باعث ہوئی، بہر حال عربون نے سندھ اور ملتان پر قبضہ کرکے ان ریاستون کو اسلامی سلطنت کا باج گذار علاقہ بنا لیا، لیکن یہان اُن کا بڑھتا ہوا قدم رک گیا اور آیندہ تین صدیون تک اُن کی حکومت ہندوستان کے اسی گوشہ تک محدود رہی،

مسلمانون نے ہندوستان مین آکر اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا، جنوبی ہند مین تو اُن کی آمد تاجرانہ تھی، لیکن شمالی ہند مین بھی جہان وہ فاتحانہ حیثیت سے آئے تھے، فاتح اور مفتوح کی مغائرت صرف تھوڑے دنون تک قائم رہی، اس کے بعد ہندو اور مسلمان دونون ہمسایون کی طرح رہنے لگے، اور امتداد زمانہ کے ساتھ ایک دوسرے کو زیادہ سمجھنے لگے، ایک جگہ رہنے سہنے کا نتیجہ یہ ہوا، کہ دونون ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے، اور اس طرح ایک نئی تہذیب وجود مین آئی، جس کو ہندوستانی

تہذیب کہہ سکتے ہین، جو نہ خالص اسلامی تھی، نہ بالکل ہندو، اس مشترک تہذیب کے ظہور مین آنے کی خاص وجہ یہ تھی، کہ ہندوستان کے مسلمانون کی ایک بڑی تعداد نومسلمون کی تھی، انھون نے باہر سے آنے والون کا مذہب تو اختیار کر لیا تھا، مگر تہذیب و تمدن مین بہت کچھ اپنی قدیم روایات کے پابند تھے، یہ اشتراک تہذیب کے مختلف پہلوؤن مین نمودار ہوتا گیا، چنانچہ مذہب، ادب، علوم و فنون، تعمیر و موسیقی، ہر ایک مین ملکی وغیر ملکی عناصر کا امتزاج عمل مین آنے لگا، جنوب مین اسلامی تعلیمات سے جو اثر براہِ راست پڑا، اس کے علاوہ ایک بالواسطہ اثر ہندوؤن پر یہ بھی ہوا کہ اُن کے دلون مین مذہبی احساس از سرِ نو پیدا ہوگیا، اور اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنوبی ہند مین بھگتی کی تحریک جسے رامانج نے تکمیل کو پہنچایا اور ویدانت کی تحریک جو شنکر اچاریہ کے ہاتھون پایۂ کمال کو پہنچی، ایک حد تک اُس عام مذہبی بیداری کا نتیجہ تھی، جو اسلام کے اثر سے پیدا ہوگئی تھی، چودھوین صدی عیسوی کے بعد مہاراشٹر، گجرات، پنجاب اور بنگال کے مصلحین مذہب اپنے چند قدیم عقائد کو ترک کرکے اسلام کی بعض تعلیمات قبول کر لیتے ہین اور اس طرح دونون مذہبون کی آمیزش سے ایک نیا مذہب پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہین، چنانچہ کبیر داس اور گرونانک کی تعلیمات مین اسلامی تعلیمات کا اثر صاف ظاہر ہے،

ایسی ہی تبدیلی ادب کے میدان مین نظر آتی ہے، ہندوستان کا علمی سرمایہ عوام کی ضروریات کے لئے سنسکرت سے منتقل ہو کر ہندی، مرہٹی، اور بنگالی مین آجاتا ہے، اور ہندو اور مسلمان دونون ان زبانون کے ادب کو فروغ دینے مین حصہ لیتے ہین، علم و ادب کا یہی اشتراک ایک نئی زبان کے پیدا ہونے کا سبب بنجاتا ہے، مسلمان اپنی عربی، فارسی، اور ترکی چھوڑ کر اس ملک کے باشندون کی زبان اختیار کر لیتے ہین، اور اس طرح ایک مشترک زبان وجود مین آتی ہے، یہ زبان ہندو مسلمانون کے صدیون کے میل جول کا نتیجہ تھی، دونون نے اس کو اپنا مشترک سرمایہ سمجھا، اور اسے ترقی دینے مین یکسان کوشش کرتے رہے،

مسلمانون نے جب ہندوستان مین قدم رکھا، تو یہ ملک سیکڑون چھوٹی چھوٹی مملکتون اور ریاستون مین بٹا ہوا تھا، جو باہم برسرپیکار رہا کرتی تھین، زبان کے لحاظ سے بھی تفرق وانتشار کا یہی عالم تھا، ہر ریاست کی زبان الگ تھی، اور لڑائیون مین کسی ریاست کے حدود کے بڑھنے یا گھٹنے کے ساتھ اُس کی زبان کا دائرہ بھی بڑا یا چھوٹا ہوتا رہتا تھا مسلمانون کی آمد سے جس طرح اس ملک مین سیاسی وحدت پیدا ہوئی، اسی طرح لسانی وحدت کا سامان بھی فراہم ہوا، یہان مسلمان بادشاہون کی دفتری زبان تو فارسی تھی، لیکن عام بول چال کے لئے جیسے ہندو مسلمان دونون سمجھتے، یہ زبان کام نہین دے سکتی تھی، اور نہ یہ ممکن تھا، کہ ہندوستان کے کسی ایک صوبہ کی زبان کو تمام ملک مین جاری کر دیا جائے نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جس صوبہ مین گئے، وہان کی زبان اختیار کرکے مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی اور علمی ضرورتون سے اپنی زبان کے سیکڑون الفاظ اس مین داخل کر دیئے، اور چونکہ یہ الفاظ ضرورت کی بنا پر داخل کئے گئے تھے، اس لئے اس زبان کا جزبن کر مقبول عام ہو گئے، اس طرح ایک مخلوط زبان کا پیکر تیار ہوا، جو سندھ مین سندھی، گجرات مین گجراتی، دکن مین دکنی، پنجاب مین پنجابی، اور دہلی مین دہلوی کہلائی، دہلی کی یہی زبان اپنے ارتقار کی منزلین طے کرتی ہوئی جب شاہجہان کے اردوے معلیٰ مین پہونچی تو زبان اردو کے نام سے موسوم ہوئی، موجودہ اردو دراصل دہلی اور اطراف دہلی کی پرانی ہندی ہے، جس مین زمانہ کے تقاضے سے تبدیلیان رونما ہوتی گئین، اور جو عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی زبان کی شکل مین ظاہر ہوئی، اس زبان کے فعل اور حرف سب دہلوی ہندی کے ہین، اسمار مین البتہ نصف دہلوی ہندی کے ہین، اور باقی عربی، فارسی، اور ترکی ہین، یا کچھ پرتگالی، اور انگریزی الفاظ ہین، یہ بیرونی اسمار وہ ہین، جن کے مسمی اکثر باہر سے آئے تھے، مسلمانون نے جو الفاظ اور مصطلحات صوبون کی زبانون مین داخل کئے، اُن کی ایک طویل اور دلچسپ فہرست مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تحقیقی مقالہ "ہندوستان مین ہندوستانی" مین دی ہے[۱]

---

[۱] مطبوعہ نقوش سلیمانی" ص ۲۶-۳۰،

اس مشترک زبان کی تشکیل مین مسلمان درویشون اور صوفیون نے بڑا حصہ لیا، وہ مسلمان تاجرون اور سپاہیون کے ساتھ ہندوستان آئے تھے، اور اُن کی روحانی فتوحات کا دائرہ سلاطین کی ملکی فتوحات سے کم وسیع نہ تھا، جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہین، "اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے ملک کو غزنین اور غور کے بادشاہون نے فتح کیا، تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خانوادۂ چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا" صوفیہ چونکہ انسان کے باطن سے سروکار رکھتے ہین، اور تزکیہ نفس ہی اُن کی سرگرمیون کا مقصود ہوتا ہے، اس لئے ان کے دروازے کافر و مومن دونون کے لئے یکسان طور پر کھلے رہتے ہین، انسانی ہمدردی، خلوص و محبت اُن کے اصلی جوہر ہین، اور یہی چیزین اُن کی روحانی فتوحات کی ضامن ہوتی ہین، ہندوستان مین جو درویش آئے اُن کا حلقۂ اثر بھی انہی چیزون کی وجہ سے روز بروز زیادہ وسیع ہوتا گیا، اُن کا سابقہ چونکہ بیشتر عوام سے تھا، اس لئے دلون کو ہاتھ مین لانے کے لئے ہم زبانی ضروری تھی، چنانچہ اپنے خیالات کی تبلیغ کے لئے وہ ملک کے جس حصہ میں پہنچے وہان کی زبان اختیار کر لی، اور عوام کو انہی کی زبان مین تعلیم دی، لیکن چونکہ بعض مذہبی اصطلاحون کا استعمال ناگزیر تھا، اور یہ عربی یا فارسی مین ہوتی تھین، اس لئے عربی اور فارسی الفاظ بھی ان بولیون مین قدرتی طور پر شامل ہوگئے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مقالۂ ہندوستان مین ہندوستانی اور مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے رسالہ "اردو کی ابتدائی نشو و نما مین صوفیاے کرام کا کام" مین دکھایا ہے کہ اس مشترک زبان کے پیدا کرنے مین حضرات صوفیہ کا حصّہ کتنا زیادہ ہے، اب تک اس مخلوط زبان کے جتنے قدیم فقرے ملے ہین، یا جو قدیم کتابین دستیاب ہوئی ہین، خواہ دکھنی زبان مین ہون یا گجراتی مین سب حضرات صوفیہ کے ملفوظات یا انہی کی تصنیفات ہین،

یہ خیال صحیح نہین کہ ہندوستان کی یہ مشترک زبان صرف مسلمانون کی زبان ہے، اس زبان کی تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی اس نظریہ کی تردید کے لئے کافی ہے، غیر مسلمون بالخصوص

ہندوؤن نے اس زبان کی تشکیل، ترقی، اور اشاعت مین جتنا زیادہ حصہ لیا ہے، اس کا بیان ایک مستقل تالیف چاہتا ہے، پیش نظر مقالہ مین صرف ان کتابون کا ذکر کیا گیا ہے، جو غیر مسلمون نے اپنے مذاہب اور مذہبی اخلاق سے متعلق اردو مین لکھ کر شائع کی ہین، ایسی کتابون کی تعداد کئی سو ہے، انڈیا آفس کے کیٹلاگ مین جس میں صرف انیسوین صدی کے آخر تک کی کتابین درج ہین، ان کی تعداد (۱۳۰) ہے، ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانون کی فہرستون میں بھی ایسی کتابون کی کثیر تعداد ملتی ہے، مجھے پٹنہ، صوبہ جات متحدہ، دہلی اور لاہور کے پندرہ سولہ کتب خانون کی سیر مین اردو کی کم و بیش چار سو غیر اسلامی مذہبی اور اخلاقی کتابون کے دیکھنے، اور اُن کی یادداشتین قلمبند کرنے کا موقع ملا، ان مین سے بعض کے اقتباسات اس مقالہ مین درج کئے گئے ہین، ان اقتباسات سے مختلف غیر اسلامی مذاہب کی تعلیمات بھی معلوم ہوتی ہین، اور اس مشترک زبان کے نمونے بھی سامنے آجاتے ہین، جو اس ملک کے رہنے والون کے صدیون کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے، اگر یہ زبان صرف مسلمانون کی ہوتی، تو غیر مسلم خصوصاً ہندو اپنی مذہبی کتابیں اس کثرت سے اس مین کیون شائع کرتے، ہندو، عیسائی، سکھ، جین اور بہائی مذہب، اور ہندوؤن کے متعدد اصلاحی فرقے مثلاً آریہ سماج، برہمو سماج، دیو سماج، رادھا سوامی مت، تھیوسوفیکل سوسائٹی وغیرہ، ان سب کا اپنے مذہب و اخلاق کی نہ صرف مستند اور چوٹی کی کتابون کو اردو مین ترجمہ کرکے شائع کرنا، بلکہ سیکڑون چھوٹی بڑی کتابون کو ترجمہ اور تالیف کرکے اردو کے ذریعہ عوام تک پہنچانا اس حقیقت کا ناقابل انکار ثبوت ہو کہ یہ مشترک زبان ہندوستان کے بڑے حصہ کی عام زبان کی حیثیت رکھتی ہے، غیر اسلامی مذاہب کی یہ سیکڑون کتابین اردو مین اُن لوگون کے لئے نہین شائع کی گئی ہین، جو نہ ان مذاہب سے تعلق رکھتے ہین، اور نہ اُردو جن کی مادری زبان ہے، اس زبان کے ہندوستان کی عام زبان ہونے کا اعتراف خود ہندوؤن کی مذہبی کتابون کے بعض مصنفین نے بھی کیا ہے، مثلاً لالہ لاجپت رائے

مشہور آریہ لیڈر، اپنی کتاب مہاراج سری کرشن، اور اُن کی تعلیم" (مطبوعہ ہندوستانی برقی پریس لاہور ۱۹۰۰ء) کے دیباچہ مین لکھتے ہین :-

"اُردو حقیقت مین ہندوستانیون کی زبان کا نام ہے، بلکہ اکثر موقعون پر اُردو اور ہندوستانی ایک ہی معنون مین مستعمل ہوتے ہین"،

پنڈت جنیشور پرشاد مائل دہلوی نے حُسن اوّل[۱] کے نام سے ایک نہایت دلچسپ کتاب لکھی ہے، جس مین جین، بودھ، اور ہندو مذہب کے فلسفہ، اخلاق، ادب اور علوم و فنون کا گلدستہ نہایت پاکیزہ زبان مین پیش کیا ہے، اُس کے دیباچہ مین فرماتے ہین :-

"جب سے سرکار انگلشیہ کی حکومت ہم پر ہوئی، اور عدالتی دفاتر کی زبان اردو ٹھہری تو اس کی کچھ قدر ہوئی، لوگون کے شوق اور خیالات نئے نئے پہلو بدلنے لگے، رفتہ رفتہ تہذیب پھیلی، اور ہماری رفتار و گفتار کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف نے بھی انگریزیت کا جامہ پہننا شروع کیا، چنانچہ تھوڑے عرصہ مین وہ نمایان ترقی کر لی کہ آج اُردو زبان بچے سے جوان ہوگئی، اگرچہ اردو کا جنم خاص دلی مین ہوا، اور اوس نے اسی خطہ مین پرورش پائی، مگر تھوڑی سی مدت مین اتنی بڑھی چڑھی کہ تمام ہندوستان کی زبان یہی ہوگئی، بلکہ اردو سے ہندوستانی زبان کہلانے لگی،......... مین اگرچہ ناثر نہین ہون، ناظم نہین ہون، انگریزی مجھے بالکل نہین آتی، دنیا کی اور بہت سی زبانون سے بے بہرہ ہون، علوم فنون مین بھی کچھ دستگاہ نہین رکھتا، سنسکرت اور فارسی مین بھی اپنے آپ کو کسی قابل نہین سمجھتا، ہان اردو میری مادری زبان ہے، اس کی ترقی اور بہبودی کی کوشش کرنا ایک سعادتمند اولاد کی طرح میرا فرض ہے، لہذا بائین ہیچمدانی جرأت کرتا ہون، "

---

[۱] مطبوعہ انڈین پریس، الہ آباد،

چاہتا ہون کہ پرانے رشیون اور مہاتماؤن کے باغ سے عمدہ عمدہ پھول چن کر لاؤن، ان سے اردو کا ایوان سجاؤن، اب اس مین برکت دینا اور میری محنت کو ٹھکانے لگانا اسی کا کام ہے،

ورنہ من آنم کہ من دانم،

کسے بخاک فگند وکسے نواخت مرا بقدرِ ہمتِ خود ہر کسے شناخت مرا"

یہ صحیح ہے کہ ہندوؤن کی مذہبی کتابون مین جو اردو مین لکھی گئی ہین، سنسکرت اصطلاحات بھی بکثرت ملتی ہین، یہ بالکل ایک فطری امر ہے، جس طرح مسلمان صوفیہ کو اپنی تعلیم کی اشاعت کے لئے دیسی بولیون مین عربی اور فارسی کی مصطلحات ضرورۃً داخل کرنی پڑین، اسی طرح ہندوؤن نے بھی جب اپنے مذہب واخلاق کا خزانہ اس ملکی زبان (اردو) مین منتقل کرنا شروع کیا تو ان کو بھی سنسکرت مصطلحات کے استعمال کے بغیر چارہ نہ تھا، لالہ لاجپت رائے نے اپنی مذکورۂ بالا کتاب کے دیباچہ مین اس مجبوری کو بہت صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہین :-

"اصل تو یہ ہو کہ ہندو خیالات کو ظاہر کرتے ہوئے ہندی الفاظ کا استعمال لازمی ہے، (دیکھو مولانا مولوی الطاف حسین حالی کی مناجاتِ بیوہ) بلکہ بعض استاد تو اصل اردو اسی کو کہتے ہین جس مین فارسی واردو کے الفاظ نہایت کم ہون، یا بالکل نہ ہون، اردو مین سے فارسی کے الفاظ نکال دیئے جائین، تو خالص ہندی رہ جاتی ہے، صرف اتنا فرق ہے، کہ جو الفاظ ہندی کے معمولی طور پر مستعمل نہین وہ مسلمان صاحبان کو برے معلوم ہوتے ہین، اور وہ ان کو اردو نہین سمجھتے، مگر جو لفظ معمولی طور پر مستعمل ہین، وہ ان کو اردو سمجھتے ہین، بہرحال جو ہندو اپنے ہم قوم بھائیون کے لئے ایسی کتابین لکھتے ہین جن مین ان کے مذہبی یا قومی خیالات یا حالات کا تذکرہ ہوتا ہے، ان مین ہندی یا سنسکرت کے الفاظ بیجا یا نامناسب نہین، کس طرح سے ممکن ہے کہ کوئی ہندو ہندوؤن کے لئے کتاب لکھتا ہوا

کرشن وارجن ویدھشٹر کی تقریرون کا ترجمہ اردوے معلّی مین کرے، اور خاص مشکل مذہبی خیالات کے لئے فارسی وعربی کی فرہنگ تلاش کرے، ہندو عورتون کی تقریرون کا ترجمہ کرتے ہوئے، فارسی وعربی کے لفظون کا استعمال تو بہت ہی بیہودہ معلوم ہوتا ہے، پس وجوہاتِ بالا سے ہمارے خیال مین ہماری زبان پر جو اعتراض کیا جاتا ہے، وہ ہمارے نزدیک کچھ بہت منزلت نہین رکھتا،......"

اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اپنے مذہبی یا قومی خیالات یا حالات کے تذکرہ کی غرض سے ہندوؤن نے "اپنے ہم قوم بھائیون کے لئے" اسی مشترک زبان مین کتابین لکھی ہین، گو ان کتابون کی عبارتون مین ہندی یا سنسکرت کے جو الفاظ آئے ہین، وہ بیجا یا نامناسب نہین، البتہ لالہ لاجپت رائے کا یہ ارشاد کہ کس طرح ممکن ہے، کہ کوئی ہندو ہندوؤن کے لئے کتاب لکھتا ہوا کرشن وارجن ویدھشٹر کی تقریرون کا ترجمہ اردوے معلّی مین کرے اور خاص مشکل مذہبی خیالات کے لئے فارسی وعربی کی فرہنگ تلاش کرے، نیز یہ کہ "ہندو عورتون کی تقریرون کا ترجمہ کرتے ہوئے فارسی وعربی کے لفظون کا استعمال تو بہت ہی بیہودہ معلوم ہوتا ہے،" محلِ نظر ہے بعض ہندو مترجمین نے کرشن ارجن اور یدھشٹر کی تقریرون کا ترجمہ بھی اردوے معلّی مین کیا ہے، مشکل مذہبی خیالات کے لئے فارسی وعربی کی فرہنگ بھی تلاش کی ہے، اور ہندو عورتون کی تقریرون کا ترجمہ کرتے ہوئے فارسی وعربی الفاظ بھی استعمال کئے ہین، جو ذرا بھی بُرے نہین معلوم ہوتے، چند مثالین ملاحظہ ہون :-

شریمن بھگوت گیتا کا سب سے قدیم ترجمہ جو مجھے دستیاب ہوا، منشی کنھیا لال عرف الکھ دھاری کا ہے، اس اردو ترجمہ کا نام گیان پرکاش ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۸۶۳ء مین گیان پریس آگرہ مین چھپا تھا، اس مین سے چوتھی ادھیا کے چند اشلوک حسب ذیل ہین :-

سری کرشن کہتے ہین :- "اے ارجن کرم جوگ یعنی تہذیب اخلاق عمدہ چیز ہے، اور یہی

لازوال ہے مین نے سب سے پہلے یہ علم آفتاب کو سکھایا تھا، اور آفتاب نے بیوست مُن کو اور اس نے اچھواک کو، اس علم کے جاننے سے راجے فضیلت پاتے ہین، کیونکہ درویش صفت ہو جاتے ہین لیکن انقلاب سے زمانہ کے یہ علم معدوم ہو گیا ہے یہ جوگ قدیم اور نہایت شریف ہے، تجھے اپنا عزیز سمجھ کے بتاتا ہون، ارجن نے کہا:- اے کرشن تم اب پیدا ہوئے ہو اور آفتاب مدت مدید کو، پس مین کیونکر باور کرون کہ تم نے یہ علم آفتاب کو سکھایا" کرشن نے جواب دیا:- اے ارجن میں اور تو قدیم ہین لیکن اس کی حقیقت تو نہین جانتا ہے، مین جانتا ہون، مین وہ ہون جس کا نہ کوئی باپ ہے، اور نہ کوئی بیٹا، اور صاحب تمام عالم کا ہے، مگر طبیعت سے تناسخ مین پھنسا ہون، جب اخلاقِ حمیدہ کم ہو جاتے ہین، اور شر و فساد زیادہ ہو جاتا ہے تو اعتدال دینے کو ایک صورت پیدا ہوتی ہے، مین وہ صورت ہون واسطے مدد دینے نیکون کے اور استیصال بدون کے اور قائم کرنے بنیاد عقل کے اور اکھاڑنے دیوار ظلم کے مین پیدا ہوا ہون تاکہ آئندہ کوئی اپنی حد سے باہر پاؤن نہ دھرے، اور افراط و تفریط ہونے نہ پاوے ..... " (ص ۵۷-۵۸)

پنڈت جانکی ناتھ مدن دہلوی نے بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ فلسفۂ الوہیت کے نام سے کیا ہے، اس کے پہلے ادھیا مین ارجن کی تقریر جو اوس نے کروکشیتر کے میدان مین کرشن کے سامنے کی تھی، اس طرح نقل کی ہے :-

" ارجن نے باپ دادا، گرو، ماموں، بھائی، بیٹے، پوتے، دوست، خُسر اور پیارون کو جو طرفین کی فوج مین اس موقع پر موجود تھے، دیکھا، اور ان سب یگانون کو موجود دیکھ کر وہ پسر کنتی اُن کی غایت الفت کے سبب غمگین ہو کر کہنے لگا، اے کرشن ان اقربا کو جو جنگ آمادہ ہین، دیکھ کر میرے عضو سست ہوئے جاتے ہین، منہ خشک ہوتا ہے، بدن کانپتا اور رونگٹے کھڑے ہوتے ہین، کمان ہاتھ سے گری پڑتی ہے، خون جوش کھاتا ہے، کھڑا

نہین رہا جاتا، اور دل بے قرار ہے، کرشن مجھے آثار مخالفت نظر آتے ہین، اور یگانون کو جنگ مین مار کر کوئی فائدہ نہین دیکھتا، کرشن مین فتح سلطنت اور عیش و آرام کی تمنا نہین دیکھتا، اے گوبند ہمارے نزدیک سلطنت، لذات دنیا، اور حیات ہیچ ہین جن کے لئے ہم نے سلطنت اور عیش و آرام چاہا تھا، وہ تو جان اور مال سے ہاتھ دھو کر اس معرکہ جنگ مین کھڑے ہین یہان پر گرو، باپ بیٹے اور دادا، ماموں خسر، پوتے، سالے اور قرابت مند موجود ہین اے کرشن! ہر چند وہ مجھے قتل کر ڈالین، مین روے زمین کے بلکہ ترلوکی کے راج کی طمع سے بھی ان کا قتل روا نہین رکھتا، دھرت راشٹر کی اولاد کو مار کر ہمین راحت تو کیا حاصل ہوگی، ان بدکردارون کو مار کر ہم بھی آلودہ گناہ ہون گے، پس ہم کو دھرت راشٹر کی اولاد کو جو اپنے عزیز ہین، قتل کرنا لازم نہین ....

.... اگر مقابلہ کئے بغیر مجھ نہتے کو دھرت راشٹر کے بیٹے جن کے ہاتھون مین ہتھیار موجود ہین، مار ڈالین، تو میرے حق مین خوب ہو، یہ کہکر ارجن نے تیر اور کمان ڈال دیئے، اور وہ رنج سے پریشان ہوکر میدان جنگ مین رتھ کے اندر بیٹھ گیا۔ (ص ۳۲، ۳۷)

دوسری ادھیا مین سری کرشن کی تقریر ہے، جو انھون نے ارجن کے جواب مین کی :-

"اے ارجن، تجھ کو یہ بے دلی میدان جنگ مین کہان سے پیدا ہوئی، جو کہ بزرگون کی شان سے بعید اور باعث بدنامی ہے، اور جس کا انجام اچھا نہین، ارجن، مخنث کا طریقہ اختیار نہ کر کہ یہ امر تیرے لئے زیبا نہین ہے، اے فاتح دشمنان پست ہمتی، اور بزدلی کو چھوڑ کر کھڑا ہو۔" (ص ۳۸ - ۳۹)

بھگوت گیتا کے انیس ترجمے نظم و نثر مین ہندوؤن کے کئے ہوئے مین نے دیکھے ہین،

ان میں سے دو ایک کا اقتباس نمونتہً ادرپیش کرتا ہون "غذاے روح" کے نام سے پنڈت برجھو دیال مصر عاشق لکھنوی نے جو منظوم ترجمہ کیا ہے، اس مین ارجن کے اس سوال کا،

گرم یوگی کون ہو بتلایئے اے خوشخصال   اس کا اٹھنا بیٹھنا کیسا ہو کیسی بول چال

سری کرشن یہ جواب دیتے ہین :-

جو دکھی دکھ سے نہ ہو سکھ سو نہ ہو جس کو خوشی   جس نے چھوڑا خوف و غصہ چاہ عارف ہو وہی

جس کو ساری باتین اچھی یا بری ہین ایک سی   جو برائی یا بھلائی سے نہ ہو نالان نہ شاد

جس کو حاصل ہو گئی اس دہر مین آتی سمجھ   چاہیئے کہنا اسے یکسوئی سے ہے بامراد

جس طرح لیتا ہے کچھوا اپنے اعضا کو سکوڑ   بہر یکسوئی یونہی منہ نفس سے لیتے ہین موڑ

ہو گیا پرماتما کا گیان جس کو دہر مین   اس کی فکر و نفس دونون خود بخود زائل ہو گئے

خواہشون کو زیر کرنے کی اگر کوشش کرین   تو بھی جبراً مضطرب کرتی ہین دل کو خواہشین

اس لئے قابو مین رکھنا خواہشون کو لازمی   ہو گئین گر خواہشین قابو مین یکسوئی ہوئی[۱]

نسیم عرفان[۲] کے عنوان سے گیتا کا ایک اور منظوم ترجمہ منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے کیا ہے، اس کی زبان اپنی روانی صفائی اور فصاحت کے لحاظ سے قابل داد ہے، ملاحظہ ہو،

سا تواں ادھیاے

علم معرفت یعنی گیان وگیان کی تعلیم

بھگوان ہین محو خوش بیانی   فرماتے ہین آپ گل فشانی

اے پارتھ، دل اپنا مجھ کو دیکر   زیر دامن پناہ لے کر

شغل ہیم سے جوگ کے پاک   تم جیسے کروگے مجھ کو ادراک

---

[۱] مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۶ء ص ۱۴، [۲] مطبوعہ کارونیشن پرنٹنگ ورکس، دہلی،

اب حال سنو بغور اس کا کیا ڈھنگ ہے کیا ہے طور اس کا
وہ راز نہان عیان کرون گا تفصیل اس کی بیان کرون گا
علم مطلق ہے علم جس کا امرِ برحق ہے علم جس کا
واقف اُس سے بشر جو ہو جائے اک بار اُس پر نظر جو جائے
پھر کوئی نہین ہے امر ایسا رہ جائے جو آگہی سے تشنا
ہونے کو تو لاتعد بشر ہین، ایسے انسان کم مگر ہین،
ہے کسب کمال کام جن کا ہے شغل یہی مدام جن کا
دھن کے پکے جو مردِ شاغل کر لیتے ہین منزلت یہ حاصل
اُن مین بھی ہین ایسے چند انسان جن کو مراد اقعی ہے عرفان
مٹی اور اُس کے بعد پانی پھر آگ کا پردہ نہانی
عالم بعد اُس کے ہے ہوا کا پھر کرۂ محیط ہے خلا کا
پھر ہین دل و عقل سلسلہ وار اُن کے آگے ہے سترِ پندار
ہین یہ آٹھون صفات میری محجوب ہے اُن سے ذاتِ میری
ارجن جو کرو گے ان پہ تم غور ادنیٰ انھین پاؤ گے بہر طور
پہ میری صفت اک اور بھی ہے حاصل جسے خاص برتری ہے
بالاتر ہے مقام جس کا مشہور ہے روح نام جس کا
جو وجہِ قیام دو جہان ہے جو اصل نظام دو جہان ہے
یہ امر ہے جاننے کے قابل یہ بات ہے ماننے کے قابل
ہوتی ہین جب صفات یکجا پڑتی ہے بناے نظم دنیا

ہیں یہ ہر وقت برسرِ کار ہستی ہے تمام انھیں سے بیدار
امکاں مجھی سے ہے بقا کا میں ہی مختار ہوں فنا کا
یہ امر ہے طے شدہ دھنجے مجھ سے بڑھ کر نہیں کوئی شَے
کچھ بھی میرے سوا نہیں ہے میں ایک ہوں دوسرا نہیں ہے
جس طرح سے ہار میں گندھے ہوں موتی اک تار میں گندھے ہوں
اسباب جہاں ہیں نظم مجھ میں یہ کون و مکاں ہیں نظم مجھ میں
خورشید میں نور ماہ میں تاب ہوں اے ارجن میں لذت آب
ہوں زیدہ روزگار میں ہی ویدوں میں ہوں اونکار[1] میں ہی
میں ہی آواز ہوں خلا میں میرا ہی ظہور ہے صدا میں
مردوں میں ہوں مردمی کا جوہر "تابندہ مجھی سے ہے یہ گوہر" (۸-۷-۸)

(باقی)

[1] اسم اعظم

میری محسن کتابیں

دوسرے دور کے رسالہ الندوہ نے ملک کے مشاہیر اصحابِ علم و کمال سے ان کتابوں کے نام دریافت کئے تھے، جن کا ان کی ذہنی تعمیر اور تشکیل سیرت میں خاص حصہ رہا ہے، اس کے جو جوابات موصول ہوئے تھے، وہ الندوہ میں میری محسن کتابوں کے عنوان سے شائع ہوئے تھے، اور ۲ میں ان کو کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا تھا، اس میں نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولینا عبید اللہ سندھی وغیرہ ہندوستان کے بہت سے اکابر اور اصحابِ علم کے مضامین ہیں، جن سے عربی فارسی اور انگریزی کی بہت سی اہم کتابوں کا ذکر اور متفرق معلومات حاصل ہوتے ہیں، قیمت عہ، یکجا سے زیادہ نسخوں کے خریداروں کو معقول کمیشن دیا جائیگا، دار المصنفین اعظم گڈہ سے طلب ف

برمک اور پرمکھ

از

سید سلیمان ندوی

پچھلے معارف مین البرامکہ کے مصنف مولوی عبدالرزاق صاحب مرحوم کی وفات کا حال لکھا ہے، اس سلسلہ مین خیال آیا، کہ "عرب و ہند کے تعلقات" مین مین نے برمکی خاندان کو مذہبًا بودھ اور ان کے لقب برمک کو سنسکرت سے ماخوذ اور ان کے عبادتگاہ نوبہار کو مجوسی معبد کے بجائے بودھ خانقاہ ثابت کیا تھا، جس کی اصل "نوا وہیارہ" ہے، مرحوم نے البرامکہ کے اخیر اڈیشن مین جو اضافے کئے ہین، ان کا اچھا خاصہ حصہ میرے ان تینون نظریون کی تردید مین ہے، میرا جی چاہتا تھا کہ ان کی ان تازہ تحقیقات پر تنقید کرون، مگر ردّ و قدح سے دل کو اب اتنا بعد ہو گیا ہے، کہ جی نہ چاہا، دارالمصنفین کے بعض رفیقون سے خواہش کی، کہ وہ اس کا جواب دین، مگر وہ پرایا بوجھ کیون اپنے سر اٹھاتے،

ان تینون دعوون کے جو دلائل میری کتاب مین ہین، وہ اب بھی بالکل اپنی جگہ پر قائم ہین، مرحوم نے جو کچھ ان کے رد مین لکھا ہے، وہ تمامتر مزعومات ہین، چنانچہ اس وقت ایک خاص تعلق سے اس فرسودہ موضوع پر چند سطرون کے لکھنے کا خیال آیا،

۱۔ **برمک**: اس لفظ کو مین نے سنسکرت بتایا تھا، جس کے معنی رئیس کے ہین، لیکن اس لفظ کی پوری توجیہ نہین کی تھی، میرے فاضل عزیز مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی نے جب میری اس کتاب کو پڑھا، تو چونکہ وہ گجرات مین کافی رہ چکے ہین، اور اب بھی وہین ہین، ان کی نظر اس لفظ کی اصلیت پر

فوراً پڑ گئی، اور پنسل سے اس کے حاشیہ پر لکھ دیا، کہ اصل لفظ پرمکھ ہے، یہ نسخہ دارالمصنفین کے کتب خانہ مین موجود ہی اب ایک لائق شاستری سے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ پرمکھ پر اور مکھ سے بنا ہے، مکھ کے معنی منھ کے ہین اور پر ایک سابقہ ہے، جو بعض لفظون کے شروع مین بڑھا دیتے ہین جس سے معنی مین تغیر ہو جاتا ہی مکھ کے پہلے پر لگانے سے صدر اور رئیس کے معنی ہون گے، چنانچہ ہندوستانی ریاستون کی جو نئی تنظیم ہوئی ہی ہے، اس سلسلہ مین گجرات اور بھرت پور کی متحدہ ریاستون کا صدر اعلیٰ کا نام بھی پرمکھ رکھا گیا ہے،

۲- نوبہار کا نوا دہیار "ہونا تو اتنا کھلا ہے، کہ اس پر کچھ دوبارہ لکھنا تحصیل حاصل ہے، نوبہار کو فارسی موسم بہار سے منسوب کرنا، سراسر لفظ پرکھیلنا ہے، اور فیلالوجی کا مذاق اڑانا ہے،

۳- اس دعویٰ کے ثبوت مین کہ نوبہار بودھ معبد تھا، مجوسی نہین، میری کتاب مین بہت سے دلائل ہین، مرحوم مؤلف البرامکہ نے اُن کے مقابلہ مین اپنے سابقہ دعویٰ کے اعادہ میں کہ یہ مجوسی معبد تھا، اپنی کتاب کے نئے اڈیشن مین بہت سی تاریخی عبارتین نقل کی ہین، جو خود میری کتاب مین ہین، لیکن اس طول فضول سے کوئی فائدہ نہین، صرف یہ دیکھنا کافی تھا، کہ ان تاریخی وجغرافی کتابون مین اس معبد کے اندر آگ کا ہونا مذکور ہے، یا مورتون کا، اگر اس کے اندر آگ کا ثبوت ہو تو وہ بے شبہہ آتشکدہ تھا، اور اگر مورتون کا ذکر ہو تو وہ بودھ کا معبد تھا، بس اتنی سی بات پر سارا فیصلہ ہے، جن صاحب کو اس موضوع سے دلچسپی ہو تو وہ میرے اور ان کے دلائل پر غور کرین، حقیقت خود بخود سامنے آجائے گی،

تصوّفِ اسلام

(طبع جدید)

مُدیر صدق مولانا دریابادی کی مشہور کتاب تصوفِ اسلام کا نیا اڈیشن تیار ہو گیا ہے جس مین بتایا گیا ہو کہ صحیح اسلامی تصوف کیا ہی، اور اس مین اور موجودہ رواجی تصوف مین کتنا فرق ہے، اس نئے اڈیشن کے لئے پوری کتاب کے مضامین پر نظر کر کے کتاب کو بالکل نئی حیثیت دیدی گئی ہو قیمت:- عہ "منیجر"

ادبیات

گاندھی

از جناب مولوی اقبال احمد خان صاحب سہیل

وہ حدیثِ روحِ پیامِ جاں، جسے ہم نے سن کے بھلا دیا
وہ حریمِ غیب کا ارمغاں، جسے پا کے ہم نے گنوا دیا

وہی ملک و ملتِ جاں بلب، جسے اُس نے آبِ بقا دیا
اسی ناسپاس نے ہائے اب اُسے جامِ مرگ پلا دیا

ہمیں جس نے فتح دلائی تھی اُسے خاک و خوں میں ملا دیا
ہمیں جس نے راہ دکھائی تھی، اسے راستے سے ہٹا دیا

اسے اتباعِ مسیح نے وہ عجیب دستِ شفا دیا
جو گرے تھے اُن کو اٹھا دیا، جو مرے تھے اُن کو جلا دیا

جو اٹھا تھا شعلۂ شور و شر اسے اپنے خون سے بجھا دیا
جو پڑا تھا پردہ نگاہوں پر اُسے آپ اُٹھ کے اٹھا دیا

وہ خمیدہ قدِ خمِ ماہِ نو وہ نظر فروزِ خنک سی ضو
وہ نگاہِ برقِ عمل کی رو کہ دلوں کو جس نے ہلا دیا

وہ فروغ بخشِ ہر انجمن کہ زمانے بھر میں تھا ضوفگن
وہ چراغِ بزم گہِ وطن، کسی تیرہ دل نے بجھا دیا

وہ کتابِ صلح کا سر ورق کہ مٹائی کشمکشِ فرق
وہ قتیلِ خنجرِ صبر و حق کہ وطن پہ خود کو مٹا دیا

وہ بدھ اور کرشن کا جانشین ہمہ تن عمل ہمہ تن یقین
وہ تبسمِ سحر آفریں کہ چمن لبوں سے کھلا دیا

وہ برنگ آئینہ صاف دل، وہ فروغ فطرتِ آب و گل
کہ جہادِ نفس نے مستقل اسے اور حسن جلا دیا

وہ جلالِ شیوۂ سادگی، وہ جمالِ صورتِ زندگی
وہ زلالِ چشمۂ آگہی کہ زمانے بھر کو جگا دیا

وہ شرارہ برقِ حیات کا، وہ ستارہ راہِ نجات کا
وہ منارہ عزم و ثبات کا، جسے فتنہ ساز نے ڈھا دیا

اثر اس کا اب ہے وسیع تر کہ ہر ایک دل میں ہے اس کا گھر
یہ سمجھ کے خوش نہ ہوں فتنہ گر کہ اسے پیامِ فنا دیا

تری شان کون گھٹا سکے اسے خود خدا نے بڑھا دیا
کہ تجھے بقائے دوام دی تجھے منصبِ شہدا دیا

تری خامشی وہ زباں تھی کہ دلوں کو جوشِ نوا دیا
تنِ فاقہ کش میں وہ جان تھی کہ حصارِ کبر ہلا دیا

وطنِ عزیز کو شان دی اُسے قیدِ غم سے چھڑا دیا
رہِ اتحاد میں جان دی جو کہا وہ کر کے دکھا دیا

جنھیں زیر کر نہ سکا ستم، ہوئے صیدِ سلسلۂ کرم
تری نیکیوں نے تری قسم سرِ خود سری کو جھکا دیا

یہ عروسِ کشورِ ہند تھی، ہمہ بیکسی ہمہ بیدلی
اسے تو نے غازۂ خرمی، ترے خون نے رنگِ حنا دیا

تجھے مندروں نے صدائیں دیں کہ ترے کرم سے اماں ملی
تجھے مسجدوں نے دعائیں دیں کہ تباہیوں سے بچا دیا

یہ کمالِ پیروئ علی، یہ فراخ حوصلگی تری
کہ خود اپنے دشمنِ جان کو بھی وہی ارمغانِ دعا دیا

تجھے بیکسی نے سپاہ دی، تجھے مشکلات نے راہ دی
تجھے بیکسوں نے پناہ دی، تجھے تلخیوں نے مزا دیا

یہی دھرم ہے یہی اصلِ دیں کہ ہو قول سچ تو عمل حسن
حق و اہلِ حق پہ رہے یقیں یہ پیام سب کو سنا دیا

ہمہ روشنی تری ذات تھی، ہمہ سوز تیری حیات تھی
تری روح شمع تھی گل ہوئی ترے تن کو پھول بنا دیا

ترا فیض دہر میں عام ہو، یہ غبار اٹھ کے غمام ہو
تری خاک تیرا پیام ہو، یہ سمجھ کے اس کو بہا دیا

خود آگہی

از جناب اکرام لدھیانوی

گذر گئے جو خرد سے وہی ہیں فرزانے!
یقیں کے راز کو عقل و شعور کیا جانے

کسے خبر کہ وہ کیا تھا جمالِ آتشناک
سلگ رہے ہیں ابھی تک دلوں کے کاشانے

ہر ایک رنگ سے خالی ہے جلوہ گاہِ وجود!
تری نظر نے تراشے ہیں یہ صنم خانے!

یہ کس طرح کا ہوتا ہے اہتمامِ بہار!
شکستہ جام و سبو ہیں، اداس میخانے

غمِ حیات نے چھوڑا تھا نا تمام جنھیں
تری نظر سے مکمل ہوئے وہ افسانے

رہی نہ گرمیٔ رنگِ حیات محفل میں
خموش شمع ہے، اور جل چکے ہیں پروانے

نہ بیخودی نہ شعورِ خود آگہی اکرام
شرابِ شوق سے خالی ہیں تیرے پیمانے

مطبوعات جدیدہ

مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ (انگریزی) مؤلفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، تقطیع متوسط، حجم ۳۵۰ صفحات، قیمت معلوم نہین، ملنے کا پتہ :- شیخ محمد اشرف کشمیری دروازہ لاہور،

کسی کتاب کو ڈاکٹر حمید اللہ کی تالیف بتانا اس کی تعریف کے لئے کافی ہے، جن لوگون نے ان کی تالیفات پڑھی ہین، وہ ان کے مطالعہ کی گہرائی، وسعت، نکتہ رسی، قوت استدلال، صحت استنباط، اور متانت بیان کے معترف ہون گے، زیر نظر کتاب انگریزی زبان مین انہی کی تصنیف ہے، اس کتاب کا موضوع مسلمان بادشاہون کا ۔۔۔ آئین معاملت اقوام ہے، اس کی تالیف مین مؤلف نے جس وسیع مطالعہ سے کام لیا ہے، اس کا اندازہ اس فہرست کتب سے ملتا ہے، جو آخر کتاب مین درج ہے، اس کی معلومات فراہم کرنے کے لئے مؤلف نے ہندوستانی ذخائر علم ہی پر قناعت نہین کی ہے، بلکہ مختلف ممالک اسلامیہ کے علاوہ فرانس، ہالینڈ اور انگلستان کے ذخائر کا بھی جائزہ لیا، ع

تمتع ز ہر گوشۂ یافتند

اس کتاب کو مؤلف نے چار ابواب پر تقسیم کیا ہے، اصل کتاب ۲۵۰ صفحات پر ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد دو ضمیمے ہین، پہلے ضمیمہ مین حضرت رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور خلفائے بنو عباس کے چند فرامین ہین، دوسرے ضمیمہ مین ان عربی، اردو، فارسی، اور ترکی تالیفات پر مختصر تبصرے ہین جن سے مؤلف نے استفادہ کیا ہے،

پہلا باب تعارف کو مؤلف نے گیارہ فصلوں میں تقسیم کیا ہے، ابتدائی سات فصلوں میں بین الاقوامی قانون کی حقیقت، عام قوانین کے درمیان اس کا مقام، اسلامی آئین معاملت اقوام کے موضوع، غرض، اساس اور سرچشموں سے بحث کی ہے، آٹھویں فصل میں یہ دکھایا ہے کہ انسانی معاشرہ کو بین الاقوامی بنانے میں اسلام نے کیا حصہ لیا، نویں فصل میں بین الاقوامی قانون کی تاریخ قبل اسلام سے بحث کی ہے، خلاصہ حسب ذیل ہے،

دنیا کی معلوم تاریخ دوآبہ، دجلہ و فرات کے سمیری تمدن سے شروع ہوتی ہے، اس کے بعد مقام، قرطاجنہ، یونان اور روما میں تہذیب و تمدن نے عروج پایا، بین الاقوامی رابطہ کی قدیم ترین دستاویز جو ہم کو دستیاب ہو سکی ہے، فرعون مصر رعمسیس دوم (۱۲۹۲ تا ۱۲۲۵ ق م) اور ایک حتی بادشاہ کا معاہدہ صلح ہے، جس نے ایک مستقل جنگ کا خاتمہ کر کے، پر امن تجارتی اور سیاسی اختلاط کی بنیاد رکھی، اس دستاویز کے بعد قدامت میں عبرانی لٹریچر کا درجہ ہے، عبرانی قوم جنگ کی حالت میں نہایت سخت تھی، اس کے آئین جنگ میں نہ صرف سورماؤں کا قتل کرنا روا تھا، بلکہ دشمن کے بچوں بوڑھوں اور عورتوں تک کو فنا کر دینا ضروری سمجھا جاتا تھا، یونانیوں نے بین الاقوامی قوانین کی ایک حد تک بنیاد رکھی، مگر ان کے آئین میں جزائر یونان کی شہری حکومتوں کے سوا، تمام غیر یونانی اقوام کو وحشی خیال کیا جاتا تھا، ارسطو کا فلسفہ یہ تھا کہ یہ تمام وحشی لوگ غلامی کے لئے مخلوق ہوئے ہیں، افلاطون نے اپنی قوم کو آپس کے تعلقات میں آشتی اور مدارات کا مشورہ دیا ہے، لیکن اس کے خیال میں کبھی یہ بات نہ آئی، کہ غیر اقوام بھی با دوستانہ لطف یا دشمنانہ مدارا کی حقدار ہیں، رومنوں نے یہ بہتر آئین اور بین الاقوامی نوعیت کا بنایا، جس کی رو سے ان کے حلیف اور ماتحت ملک کے لوگ روما میں قانونی تحفظ حاصل تھا، لیکن جس ریاست کا روما کے ساتھ کوئی دوستانہ معاہدہ نہ ہو اس کے افراد کی جان مال، اور آبرو رومن قلمرو میں محفوظ نہ تھی۔

ظہور اسلام کے وقت عرب کا کچھ حصہ روما کی مشرقی حکومت کے زیر اثر تھا، کچھ ایران کے ماتحت تھا، آزاد عرب متعدد خود مختار قوتون مین بٹا ہوا تھا، بین الاقوامی قانون کے ارتقار کے لئے متعدد خود مختار سیاسی وحدتون کا وجود لازم ہوا، یہ چیز عربون کو قدیم سے میسر تھی جس کی بدولت عربون نے بھی چند دستور ایسے رائج کر رکھے تھے جن کو معاملت اقوام کے آئین کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے، اشہر حرم کی تقدیس، ایلاف عہود، سفارت و منافرت کا دستور، الجیون کے خون کی تحریم، معاہدون کی تعظیم، پناہ گیر کو پناہ دینے کا رواج، اور حلف الفضول، ایام جاہلیت کے مستحسن آئینون مین داخل تھے،

دسوین فصل مین مصنف نے بتایا ہے، کہ بین الاقوامی دستورون کی تاریخ مین اسلام کا مقام کیا ہے، اور گیارہوین فصل مین اسلامی آئین کی اخلاقی اساس بتا کر پہلے باب کو ختم کر دیا ہے، اس کے بعد امن و صلح جنگ و کشاکش اور مجانبت و ناطرفداری کے ان ضوابط پر سیر حاصل بحث کی ہے، جن پر مسلمان سلاطین عموماً کاربند رہا کئے ہین، کتاب میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے، اگر یہ کتاب کسی یوروپین نے لکھی ہوتی، اور موضوع بحث مسلمانون کا نہین، بلکہ کسی آریا قوم کا آئین ہوتا، تو اس کتاب کے ربع سے کم مضمون کو نہایت خوش آیند اور دلکش اطناب کے ساتھ اس کتاب کے چوگنے صفحات مین لکھا گیا ہوتا، مگر ڈاکٹر صاحب نے قدما سلف کے ایجاز کو عہد جدید کے مداحانہ اطناب پر ترجیح دی ہے،

یہ موضوع ایسا ہے جس مین اختلاف رائے کی گنجایش ہے مگر اس مین شبہہ نہین کہ بالعموم مصنف کی رائین صحیح ہین، مسلمانون کے بین الاقوامی آئین پر یہ پہلی کتاب ہے، جو اس زمانہ کی ضرورتون کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے، تنگ و محدود نسلی اور جغرافی قومیت کی پیدا کردہ عالمگیر کشمکش کی وجہ سے اب دنیا کا رجحان بین الاقوامیت کی طرف بڑھ رہا ہے، اور یہ وسعت صرف اسلام ہی مین مل سکتی ہے، اس لئے اسلام کے بین الاقوامی قوانین کو پیش کرنا ایک بڑی مفید خدمت ہے، "ا- ح"

اقبال بحیثیت مفکر کے (انگریزی) ضخامت ... صفحات، قیمت ۵ر، پتہ: شیخ محمد اشرف

کشمیری گیٹ، لاہور،

اقبال کے بعض فلسفیانہ تصورات، مثلاً نظریۂ زمان و مکان، خودی کا پس منظر اور وجود مطلق پر ہندوستان کے مختلف اصحاب علم و قلم نے انگریزی میں جو مضامین لکھے ہیں، اُن کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، ان میں ڈاکٹر رضی الدین صاحب حیدرآباد دکن، پروفیسر ایم ایم اشرف علی گڈھ، خواجہ غلام السیدین صاحب اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مضامین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، جن سے اقبال کے فلسفہ کے بنیادی تصورات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، لیکن کتاب چونکہ ایک ہی شخص کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ مختلف اصحاب علم کے مضامین کا مجموعہ ہے، اس لئے بعض مقامات پر تضاد پیدا ہو گیا ہے، مثلاً وجود مطلق کے بارے میں پروفیسر ایم ایم شریف صاحب نے اقبال کے نظریہ کو جس قدر وضاحت اور عمق کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ لائق تحسین ہے، لیکن کتاب کے آخری مضمون سے پروفیسر صاحب موصوف کے بعض نظریات کی تردید ہوتی ہے، اگر وجود مطلق کے بارہ میں ان کی تشریح صحیح ہے، اور قطعی صحیح ہے، تو پھر کتاب کا آخری مضمون جو کسی اور صاحب کا لکھا ہوا ہے، بالکل بے جوڑ ہو جاتا ہے،

لیکن ایسی کتاب میں جو مختلف الخیال اصحاب قلم کی کوششوں کا نتیجہ ہو، یہ تضاد چنداں تعجب انگیز نہیں، تاہم پبلشر کو چاہئے تھا کہ اس قسم کی کتاب میں صرف ایسے مضامین شائع کئے جائیں، جو ایک دوسرے کو سمجھنے میں معاون اور ان کے موید ہوں، نہ کہ ان میں تضاد پایا جائے، غلام السیدین صاحب کا مضمون جدت خیال کا حامل ہے، اس میں ان تمام اعتراضات کا جواب خوش اسلوبی کے ساتھ دیا گیا ہے، جو اقبال پر تعصب اور کج فہمی کی وجہ سے کئے جاتے ہیں، مجموعی حیثیت سے اقبال کے فلسفہ پر یہ اچھی کتاب ہے،

ابن مسکویہ (انگریزی) از جناب خلیفہ عبدالحامد صاحب ضخامت ۱۳۰ صفحے، قیمت عہ،
پتہ:- شیخ محمد اشرف کشمیری گیٹ لاہور،

ابن مسکویہ ممتاز مسلمان حکما میں ہے، لیکن عام طور پر اس کی شہرت ایک مورخ اور فلسفہ اخلاق کے معلم کی حیثیت سے ہے، اور اسلامی فلسفہ پر یورپین زبانوں میں اب تک جس قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے کسی میں ابن مسکویہ کے اصلی فلسفہ کا پورا جائزہ نہیں لیا گیا ہے، بعض مغربی مصنفین مثلاً ڈی بوئر (De. Boer) نے تو اس قدر اختصار سے کام لیا ہے، کہ یہی سمجھ میں نہیں آتا، کہ تاریخ فلسفۂ اسلام کے ذیل میں اس کا ذکر کیونکر کیا جا سکتا ہے، البتہ سر اقبال مرحوم نے اپنی کتاب (Metaphysics in Persia) میں نسبۃً تفصیل سے کام لیا ہے، مگر بعض مقامات پر وہ بھی محض اشارات کر کے گذر گئے ہیں، اس لحاظ سے خلیفہ عبدالحامد صاحب کی یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے، اس میں ابن مسکویہ کے فلسفہ کے تین پہلوؤں، اثبات وجود مطلق، روح اور نبوت پر جن کی وضاحت ابن مسکویہ نے اپنی کتاب میں کی ہے، روشنی ڈالی گئی ہے، اور فاضل مصنف نے اس کی پوری کوشش کی ہے، کہ وہ ابن مسکویہ کے فلسفہ کو استدلال اور ہمواری کے ساتھ پیش کر دیں، اور اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں، مگر بعض مسائل ایسے ہیں کہ جن کو شاید ابن مسکویہ بھی پورے طور سے حل نہیں کر سکا ہے، اور نہ اس کے شارح عبدالحامد صاحب ہی اس کتاب میں اس کو سلجھا سکے ہیں، مثلاً اثبات وجود مطلق کے ذیل میں حرکت کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی (جو ان دلائل سے کسی طرح ثابت نہیں ہوتی، جو اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں) وجودِ مطلق کا اثبات کیونکر کیا جا سکتا ہے، یا روح کا وجود بھی ان دلائل سے ثابت نہیں ہوتا، جو اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں، تاہم فاضل مصنف نے ابنِ مسکویہ کے بنیادی دلائل کو حتی الامکان پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ کتاب اس حیثیت سے بہت قابلِ قدر ہے، کہ ابن مسکویہ کے فلسفہ پر اب تک اتنا بھی کسی نے نہیں لکھا ہے، اور اسلامی فلسفہ سے ذوق رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

"ع - ا"

گلمپسس آف اسلام، مؤلفہ پرنس آغا خان، ڈاکٹر ذکی علی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۲ صفحے،

قیمت ۸؎، ملنے کا پتہ: شاہ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور،

یہ انگریزی میں مشہور صاحب قلم ڈاکٹر ذکی علی کا مضمون ہے، جس میں انھون نے دکھایا ہے کہ اسلام کو جو لوگ علوم کی ترقی میں حائل بتاتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں، جس کا یورپ کے منصف مزاج مصنفون اور محققون نے اعتراف کیا ہے، آٹھوین صدی مسیحی سے تیرہوین صدی تک علوم و فنون کے تنہا علمبردار مسلمان تھے مسلمانون کی علمی خدمات خصوصاً فن طب میں اُن کے کمال پر مؤلف نے تاریخی شہادتین پیش کی ہین، یہی مضمون کتاب کی جان ہے، کتاب تین فصلون پر مشتمل ہے، پہلی فصل کی سرخی "اسلام کے اصول" ہے، یہ فصل آغا خان کی لکھی ہوئی ہے، اس مین انھون نے اپنی اسماعیلیت کا اعلان کرتے ہوئے لکھا ہے "مگر مین اس بحث مین نہ تو اپنا خاص مسلک پیش کرنا چاہتا ہون، اور نہ سنی یا شیعی مسلک، بلکہ صرف یہ مقصد ہے کہ مغربی قارئین کے سامنے اس وسیع سرچشمہ کو پیش کرون جس کا منبع مدرسہ غزالی کے خیالات ہین" دوسری فصل ڈاکٹر ذکی علی کی لکھی ہوئی ہے، جو اوپر مذکور ہوئی، تیسری فصل بھی آغا خان ہی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، مگر ان کے نام کے نیچے ڈاکٹر ذکی علی کا نام بھی ہے، اس فصل مین باطنی مسلک کے اس عقیدہ کو دہراتے ہوئے کہ قرآن کا ایک باطنی مفہوم بھی ہوتا ہے، سنیون کے مسلک اجماع کی طرف اشارہ کیا ہے، اور مسلمانون کو مشورہ دیا ہے، کہ وہ ازہر مین تمام فرق اسلامیہ کے مجتہدون کا اجتماع کرکے نئے سرے سے ایک نئے اجماع کی بنیاد ڈالین، مشورہ تو خوب ہے مگر اس مشورہ اور فصل اول کے مضمون کا فصل سوم کی بحث سے کوئی جوڑ نہیں، مقدمہ مین مولفین نے لکھا ہے کہ جنگ کے بعد دنیا کی جب ازسر نو تنظیم کی ضرورت ہوگی، اس وقت اسلامی اصول پر لوگون کو غور کرنے کا موقع ملے گا، اس سے خیال تھا، کہ اس کتاب مین اسلام کے ایسے اصول پیش کئے جائین گے، جن کی اس وقت دنیا کو ضرورت ہے، مگر ہمارا یہ خیال غلط نکلا، تاہم اس کتاب کی فصل دوم قابل قدر ہے،

ا - ج

تابعینؒ

مُرتَّبَہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور اُن کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفرؒ صادق، حضرت محمد حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحول شامیؒ، قاضی شریحؒ، وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

ضخامت :- ۵۷۰ صفحے،

قیمت :- چار روپئے،

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے عبادات سے اُن کا مقابلہ و موازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق، فضائل اور آداب کے عنوان اور اس کی ذیلی سرخیوں کے تحت اخلاقی تعلیم کی تفصیل ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول زیر طبع للعہ حصہ دوم تقطیع خورد عہ روپیہ، حصہ سوم تقطیع کلان للعہ تقطیع خورد شے، حصہ چہارم تقطیع کلان باختلاف کاغذ عہ روپیہ و تقطیع خورد ۱عہ، حصہ پنجم تقطیع کلان عہ للعہ و تقطیع خورد عہ روپیہ، حصہ ششم تقطیع کلان عہ للعہ و تقطیع خورد ۱عہ و عہ

(پرنٹر و پبلشر شفیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۱ — مئی ۱۹۴۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت:- چھ ۶ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

دارالمصنفین کی نئی کتاب

تاریخِ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈہ

ہندوستان مین مسلمانون کا پہلا قافلہ سندھ مین اترا تھا، اور اُن کی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی، اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہان حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے اُن کے آثار نمایان ہین، لیکن اس کے باوجود اُردو مین اسلامی سندھ کی کوئی مفصل و محققانہ تاریخ موجود نہین تھی، دارالمصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ اور ان تمام دورون کے نظامِ حکومت، علمی و تمدنی حالات، اور رفاہِ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت مین شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہان ایک نئی حکومت کی بنیادین استوار ہو رہی ہین،

ضخامت :- ۴۰۰ صفحے،

قیمت :- چھ روپیے،

"منیجر"

جلد ۶۱ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۴۸ء عیسوی عدد ۵

مضامین

شذرات

ہم نے بار بار لکھا کہ ہندوستان مین اردو کو یکسر نظر انداز کر دینا کسی حیثیت سے بھی مناسب نہین، اور اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہین نکل سکتا، ممکن ہو کار فرمایان حکومت وقتی حالات و جذبات سے مغلوب ہو کر اردو کو نظر انداز کر دین لیکن آیندہ وہ اس غلطی کو محسوس کرین گے، خوشی کا مقام ہو کہ کانگریس نے جلد اس کو محسوس کر لیا، اور آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے دہلی کے جلسہ مین ہندوستانی کو ہندوستان کی زبان قرار دیا ہے لیکن رسم الخط کا مسئلہ پوری طرح صاف نہین کیا گیا ہو، حالانکہ بڑا اختلافی مسئلہ یہی ہے، اس کے بغیر یہ قرار داد ناقص ہے، ہندوستانی کی تعبیر تو ہر جماعت اپنے اپنے نقطۂ نظر سے کر سکتی ہے، اور اس کا صحیح فیصلہ رسم الخط ہی سے ہو سکتا ہی، اس سے زیادہ واضح بیان پنڈت جواہر لال نہرو کا ہے جس مین انھون نے تصریح کے ساتھ کہا ہے کہ "ہندوستان کی زبان عوام کی زبان ہونی چاہئے، اور اس مین وہ تمام الفاظ استعمال کئے جائین، جو عام طور سے بولے اور سمجھے جاتے ہون، اور ہماری زبان ہندی اور اردو دونون رسم الخط مین لکھی جانی چاہئے" اردو کے حامی اس سے زیادہ اور کچھ نہین چاہتے،

جب کانگریس ہندوستانی ہی کو ہندوستان کی زبان مانتی ہے تو پھر اس کے عملی نفاذ اور اس کے رسم الخط کے متعلق صاف و صریح فیصلہ مین کیا تامل ہی، محض زبانی فیصلہ بے کار ہوگا، اس لئے کہ حکومتین کانگریس کے بہتیرے اصولون اور قرار دادون کی عملی پابندی ضروری نہین سمجھتین، زبان کا مسئلہ کانگریس کے دعوی جمہوریت کا پہلا امتحان ہے، اس لئے ہم کو توقع ہے، کہ وہ دستور ساز اسمبلی سے بھی اس کو منوائے گی، اور اس کو عملاً بھی نافذ

کرگئی، ابھی حال مین بعض ذمہ دار سوشلسٹ لیڈرون نے اپنے بیانات مین ہندوستانی کو ہندوستان کی زبان اور دونون رسم الخط کو تسلیم کیا ہے، معلوم نہین آیندہ حکومت کی کرسی پر پہنچنے کے بعد بھی یہ بیان یاد رہین گے یا طاق نسیان کے حوالہ ہو جائین گے، ع تا بدولت برسی مست نگردی مردی"

ایران اور ہندوستان کے درمیان صدیون تک گوناگون تعلقات رہ چکے ہین، اور تیموریون کے زمانہ مین تو ایران کے بڑے بڑے علما، اور اصحاب کمال ہندوستان کھنچ آئے تھے جن سے یہان کی علمی و ادبی رونق بہت بڑھ گئی تھی، اور ہندوستان، شیراز اور اصفہان کا خطہ معلوم ہوتا تھا، لیکن تیموری حکومت کے خاتمہ اور ایران کے سیاسی زوال کے بعد دونون ملکون مین بہت کم رابطہ رہ گیا تھا، تاہم وقتاً فوقتاً ان مین علمی و ادبی تعلقات کے قیام کی کوششیں ہوتی رہین، اس سلسلہ مین ۱۹۳۲ء مین کلکتہ کے چند اصحاب علم نے جن مین ہندو مسلمان دونون بلکہ غالباً وہان کے مقیم ایرانی بھی شامل ہین، "بزم ایران" کے نام سے ایک علمی مجلس قائم کی ہے، اس کے موجودہ صدر ڈاکٹر بی ام بروا ڈی لٹ اور سکریٹری ڈاکٹر محمد اسحاق پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی ہین،

ڈاکٹر محمد اسحاق کو ایرانی ادبیات سے خاص ذوق ہے، انھون نے جدید فارسی شاعری پر ایک ضخیم کتاب بھی لکھی ہے، جو کئی سال ہوئے شائع ہو چکی ہے، بزم ایران کی جانب سے انگریزی مین ایک سہ ماہی رسالہ "انڈو ایرانیکا" نکلتا ہے، اس مین فارسی ادبیات اور ایران سے متعلق دوسرے پہلوؤن پر مفید مضامین ہوتے ہین، بزم مذکور والہ داغستانی کا مشہور تذکرہ ریاض الشعرا بھی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، اور آیندہ دسمبر مین مشہور حکیم ابوریحان بیرونی خوارزمی کی ہزار سالہ برسی منانے والی ہے، حکیم مذکور گو نسل و وطن کے اعتبار سے عجمی تھا، لیکن اوس نے برسون ہندوستان مین رہ کر سنسکرت زبان اور ہندوستانی علوم کی تحصیل اور ان مین بڑی دستگاہ پیدا کی، جس کی شاہد اس کی مشہور تصنیف کتاب الہند ہے، اسکی

نظیر سنسکرت زبان میں بھی مشکل سے ملیگی، اس لئے ہندوستان پر اس کا حق ہے اور یہاں کے اصحابِ علم کو چاہئے کہ وہ اس یادگار کو علمی حیثیت سے کامیاب بنانے کی پوری کوشش کریں، اور بیرونی کے سوانح اور اس کے علمی کمالات پر تحقیقی مقالات لکھیں کہ اس کے شایانِ شان اس کے حالات میں ایک مجموعہ مرتب ہوجائے،

پاکستان میں ایک اسلامی اکیڈمی کا قیام زیرِ تجویز ہے اور اس کی تشکیل کے لئے کمیٹی بھی بن گئی ہے جس میں ہندوستان کے اسلامی علوم کے ماہرین کے نام بھی ہیں، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کو خصوصیت کے ساتھ اس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے، گو ابھی اس کی تفصیل نہیں معلوم ہوئی ہے لیکن پاکستان کیلئے اس قسم کی اکیڈمی ضروری ہے، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایسا گہرا رابطہ ہے کہ وہ سیاسی تقسیم سے نہیں ٹوٹ سکتا، اور اُن کے بہت سے مفاد و مصالح ایسے مشترک ہیں جن میں وہ اشتراکِ عمل اور ایک دوسرے کی مدد لینے پر مجبور ہیں، خصوصاً علم و ادب کی بزمِ صفا کو سیاست کی مکدر فضا سے دور رکھنا چاہئے، اور پاکستان و ہندوستان کے علمی اداروں اور اصحابِ علم کو بلا تفریق مذہب و ملت ایک دوسرے سے افادہ و استفادہ میں تامل نہ کرنا چاہئے،

کانگریس سے سوشلسٹ کی علحدگی، ہندوستان کی سیاست میں ایک اہم تغیر ہے جس کے نتائج بڑی دور رس ہیں، جہانتک قوم اور ملک کی خیرخواہی اور خدمت کا تعلق ہے، دونوں کا مقصد ایک ہے، لیکن اس کے حصول کے وسائل اور طریقہ کار دونوں کے جدا ہیں، اور آیندہ وہی جماعت عوام میں مقبول اور کامیاب ہوگی، جس کا طریق عمل ان کے لئے زیادہ مفید ہوگا، کانگریس عوام میں مقبولیت اور ان کی تائید ہی کی بدولت اس درجہ کو پہنچی ہے، لیکن اس کا مقابلہ ایک غیرملکی اور مستبد حکومت سے تھا، سارے ہندوستانی اس کے ساتھ تھے، اور آیندہ مقابلہ جمہور کی خدمت، اُن کے مفاد کی حفاظت اور اُن کے ساتھ عدل و مساوات میں ہوگا، اور اس مقابلہ میں وہی جماعت کامیاب ہوگی جو عوام کے مطالبات پوری اور اس کو مطمئن کرےگی، اور اس کا فیصلہ خود اُن کے طرزِ عمل پر موقوف ہے، حکومت کا بقا و استحکام خود اس کی قوت پر نہیں بلکہ عوام میں مقبولیت اور ان کی تائید پر منحصر ہے،

مقالات

تجدید تعلیم

از

جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی

(۳)

مدارس کی اصلاح یہ تو علماء کے فرائض و مشاغل کے متعلق اصلاحات تھین، اس کے بعد جہان علماء بنتے ہین، یعنی مدارس کی بعض اصلاحات کا بیان ہے، ان مدارس کی مجددانہ نگاہ مین اتنی اہمیت ہے کہ فرماتے ہین :-

"اس مین ذرا شبہہ نہین کہ اس وقت علوم دینیہ کے مدارس کا وجود مسلمانون کے لیے ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے فوق متصور نہین، دنیا مین اگر اس وقت اسلام کے بقا کی کوئی صورت ہے، تو یہ مدارس ہین، کیونکہ اسلام نام ہے خاص عقائد و اعمال کا جس مین دیانات، معاملات، و معاشرات، اور اخلاق سب داخل ہین، اور ظاہر ہے کہ عمل موقوف ہے علم پر، اور علوم دینیہ کا بقا ہر چند کہ فی نفسہ مدارس پر موقوف نہین، مگر حالات وقت کے اعتبار سے ضرور مدارس پر موقوف ہے"،

لیکن ساتھ ہی ان مدارس مین ہم جیسے خدام و عمال کی سوء تدبیر سے متعدد ایسے امور

پائے جاتے ہیں، جن کی اصلاح بہت ضروری ہے، اور یہ اصلاح نہ ہونے سے اہل علم کی جماعت ہدفِ ملامت بھی بنتی ہے، اور ان مدارس کے قائم کرنے کی خود جو روح وغایت ہے یعنی عمل بالدین، وہ بھی ضعیف ہو جاتی ہے، اور لوگ علوم دینیہ سے متوحش و نفور ہو جاتے ہیں، تو اس طرح یہ جماعتِ علم گویا یصدون عن سبیل اللہ کا سبب بن جاتی ہے"

چندہ کے متعلق خاص واہم تجدیدی اصلاح

ایک بہت ضروری اصلاح جس کی طرف جابجا متوجہ فرمایا گیا ہے، اور جو حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کی خاص تجدیدی اصلاحات میں داخل ہے اور جس میں عوام و خواص علماء و غیر علماء، لیڈر و مشرب ہی مبتلا ہیں، اور یہ کہ اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ وَّلَا یَقبلُ الّا الطیّب اور لا یحل مال المرءِ الا بطیبِ نفسہ کی صریح نصوص ہوتے ہوئے مدارس کے چندوں میں مال کے حلال وطیب پر کہنا چاہئے، کہ بالکل نظر ہی نہیں ہوتی، مثلاً چندہ لینے میں دینے والے کے طیبِ نفس کی بالکل ہی پروا نہیں کی جاتی، بلکہ طرح طرح کے اثرات اور دباؤ سے کام لے کر زیادہ سے زیادہ وصول کر لینا ہی بڑی حُسنِ تدبیر اور کمال خیال کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ

بعض جگہ دوامی چندہ کا وعدہ کرنے والے کی موت کے بعد وارث اس چندہ کو جاری رکھتے ہیں، اور اہلِ مدارس اس کی تحقیق نہیں کرتے، کہ ان لوگوں نے اپنی ملک خاص سے جاری رکھا ہے، یا ترکۂ مشترکہ سے اور اس ترکۂ مشترکہ میں کوئی یتیم یا غائب یا غیر راضی کی ملک تو نہیں شریک ہے، اسی طرح میت کے کپڑوں کو مدرسہ میں لیتے وقت میت کے ورثہ اور اُن کے بلوغ ورضا کی تحقیق نہیں کیجاتی"

جو خود حضرت کے زمانہ میں تھا

دوامی چندہ میں جو آخر سال بقایا واجب رہ جاتا ہے، اس بقایا کا طلب کرنا (جس کا عام رواج ہے) امر منکر معلوم ہوتا ہے اس سے صاحبِ چندہ کی ناد ہندی اور خلاف وعدگی کا اظہار ہے، مدرسۂ کانپور میں اس کی اصلاح اسی طرح کی گئی تھی کہ

روئداد مین صرف وصول شدہ چندہ لکھا جاتا، اور بقایا کو مدرسہ کے خاص رجسٹر مین رکھکر بذریعہ خط یاد دہانی کر دیجاتی تھی، اور یاد دہانی مین بھی میرے نزدیک ضروری ہے، کہ لزوم و تاکید کے الفاظ نہون بلکہ تصریح کر دی جائے، کہ اطلاع دیجاتی ہے، اگر رغبت ہو تو بھیجدیجئے ورنہ آپ آزاد ہین، اور یہ کبھی نہ خیال کیا جائے کہ اس طرح کون دیتا ہے، یہ خیال غلط ہے، جتنا آنا ہوتا ہے آتا ہے، اس کا کامل تجربہ ہو چکا ہے، ہرگز وسوسہ نہ کیا جائے"

جب خود مدرسہ چلانے والے علما و رؤسا کا بر مین استغنا و توکل بھی نہین ہوتا، تو وہان کے پڑھنے والون مین خدا اور دین سے کسی خاص تعلق کی توقع کہان تک ہو سکتی ہے،

"بعض لوگ چندہ کی رقمون مین اس طرح بیجا اخراجات اور خلاف اذن تصرفات کرتے ہین جیسے گویا ان کی ملک ہے اس مین بہت احتیاط کرنا چاہئے"

لیکن اس کی احتیاط بہت کم کیجاتی ہے، ایک مشہور مدرسہ مین تو مسجد تک کا روپیہ بے تکلف دوسری مدون مین صرف کیا جاتا رہا، جو نہین معلوم مسجد بنتے وقت پھر کس کس طرح ادا کیا، اور کرایا گیا، بھلا ایسی جگہون مین ظاہری تدابیر و انتظام کے باوجود اگر تقوی و تدین نہ پیدا ہو تو کیا تعجب ہے،

طلباے دین کی ذلت سے حفاظت اکثر جگہ جہان طلبہ کو لوگ ذلیل و حقیر سمجھتے ہون، طلبہ کسی کے گھر کھانا لینے نہ جائین، اس مین علم اور اہل علم کی سخت اہانت ہے، نیز ایک اخلاقی خرابی یہ ہے، کہ اس عادت کی بدولت دوسرون سے مانگنے مین طبعی انقباض یعنی جھجک نہین رہتی، اور یہی طبعی انقباض حیا کی ایک بڑی فرد ہے، جو ذلت کے سوال سے انسان کو روکتی ہے، جب یہ نہ رہی تو رکنا طبعاً نہ ہوگا، عقلاً ہوگا، اور عقل ایسی چیز ہے، جو عقلی مانع کو بہت جلد رفع کر دیتی ہے، ایسے وقت طبعی مانع ہی کی ضرورت ہوتی ہے، جب وہ نہ رہا تو اس شخص کو جب موقع ہوگا، ہاتھ پھیلا دے گا، نیز جب دل مین ایسے شخص کی قدر و منزلت

نہ رہی، تو اس کا وعظ کیا نافع ہو گا؟"

اس لئے جو طالب علم کو کھانا دینا چاہے مدرسہ میں بھیج دے، اسی طرح دعوت میں بھی طلبہ کو نہ بھیجا جائے، جس کو کھلانا ہو مدرسہ میں لاکر کھلائے، اور ہر چند کہ پہلے بزرگوں نے اس کو جائز رکھا تھا، لیکن اس وقت کے دنیا دار عوام اہلِ علم کو ذلیل نہ سمجھتے تھے، بلکہ اُن کے آنے کو اپنے گھر کے لئے موجب برکت سمجھتے تھے، تو یہ مفسدہ نہ تھا، اور خود طلبہ کے کبر کا معالجہ بھی اس میں ہوتا تھا"

اور اسی کی ایک صورت طلبہ کو چندہ کی فراہمی کے لئے بھیجنا ہے، اس کے بھی وہی آثار و مفاسد ہیں، جو کھانا لینے کے لئے گھروں پر جانے کے "

طلبہ کی وضع و لباس | "بعض مدرسوں میں طلبہ کے اعمال اور وضع و لباس پر روک ٹوک نہیں ہوتی، اس سے جو اثر عوام وخود طلبہ پر ہوتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں"

لیکن اس حسن فہم کو کیا کہئے کہ جس چیز کی ضرورت حضرت علیہ الرحمہ کے نزدیک محتاج بیان نہیں وہ بعض بڑے مشہور دینی مدارس اور ان کے اکابر کے نزدیک سرے سے یا چندان محتاج توجہ نہیں، حالانکہ اہلِ فہم کے لئے "الناس باللباس" کا اصول دونوں اعتبار سے نہایت حکیمانہ ونفسیاتی ہے، جیسا آدمی ویسا لباس، اور جیسا لباس ویسا آدمی یعنی جس طرح باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے، اور ظاہر کی وضع و لباس باطن کے خیالات ورجحانات کی غماز ہوتی ہے اسی طرح ظاہر کا اثر باطن پر بھی پڑتا ہے، یعنی ظاہر کی وضع و لباس کو باطن کے خیالات ورجحانات کے بنانے بگاڑنے میں دخل ہوتا ہے، موٹی بات ہے کہ ہماری وضع و قطع ہماری اندرونی پسند ونا پسند کے تابع ہوتی ہے جیسے اور جن عادات واخلاق کے لوگوں کو ہم پسند کرتے ہیں، اور جن کی ہماری دل میں کسی اعتبار سے عظمت ومحبت ہوتی ہے، اُنہی کی وضع ولباس اور طور وطریق کو ترجیح دیتے اور اختیار کرتے ہیں، آج کل کے اکثر جوان اور بڈھے تک

جو امرد بنے پھرتے ہیں، ان سے راقم احقر بھی یہی عرض کرتا ہے، کہ یہ داڑھی مونچھ کے چند بالوں یا مرد ہو کر امرد بننے یا نسوانی صورت بنانے کا سوال نہیں، بلکہ درپردہ اس امر کا اظہار و اعلان ہے کہ ہمارے قلب میں "کرزن" اور "کرزنیون" کی وقعت و عظمت معاذ اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور محمدیون کے مقابلہ میں زیادہ ہے، اور کرزن کی شکل و صورت معاذ اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صورت سے زیادہ پسندیدہ و محبوب ہے، کون نہیں جانتا کہ جس کی ہمارے دل میں جتنی زیادہ محبت و عظمت ہوتی ہے، اتنا ہی زیادہ ہم طبعاً اس کی ایک ایک ادا اور نقل و حرکت کی نقالی کرتے ہیں، اور اس کی حرکات و سکنات کے معقول یا نامعقول ضروری اور غیر ضروری ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، نہ فرض و وجوب و استحباب و اباحت کی بحث کی جاتی ہے، صحابہ رضوان اللہ علیہم جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک ایک ادا پر جان دیتے، اور اتباع کا اہتمام فرماتے تھے، اس میں شرعی بحث سے زیادہ طبعی راز یہی ہے، کہ ان کے رگ و ریشہ میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت و محبت پیوستہ تھی،

اب دوسری طرف لیجئے کہ اگر کسی بزدل و نامرد کو بھی پولیس و فوج کی وردی پہنا کر کھڑا کر دیں، تو تھوڑی دیر کے لئے اس کے اندر بھی مردانگی کی ایک جھرجھری پیدا ہو جائے گی، فوج و پولیس کے سپاہی جب گھر لباس اتار کر اپنی وردی یا یونیفارم پہن لیتے ہیں، تو اپنے فرائض و منصب کا شعور قدرۃً تیز و تازہ ہو جاتا ہے، پولیس کا کوئی سپاہی اگر وردی میں خود چوری کرتے پکڑا جائے، تو زیادہ مجرم و محجوب ہوگا، کہ جو وردی چوروں کے پکڑنے کو پہنائی گئی تھی، اس میں خود چوری کرتے پکڑا گیا، کافروں اور فاسقوں کی وضع قطع ہیئت و صورت اختیار کی جائے، تو کفر و فسق ہی کے میلانات کو تقویت ہوگی، اور اگر آدمی مختوم القلب نہ ہو گیا ہو، تو نیکوں و متقیوں کے ریائی لباس میں بھی فسق و فجور کے ارتکاب سے قدرۃً شرم و جھجک ہوگی، ظاہر کے تغیرات کا باطن کے میلانات و جذبات پر اثر پڑنا نفسیات کی مسلّمہ و بدیہی حقیقت ہے،

افسوس کہ فکر و فہم کے قحط اور تقلید و نقالی کی وبا کی بدولت ایسی موٹی باتوں کی بھی اتنی تفصیل کرنی پڑی، جو واقعاً حضرت علیہ الرحمۃ کے بقول سرے سے محتاج بیان ہی نہ تھیں، بہرحال اب یہ دبا اچھے اچھے عربی و دینی مدارس میں پھیل رہی ہے، کہ اپنے بزرگوں اور صلحا و اتقیا کی صورت کے بجائے اغیار اور کفار و فساق کی سج دھج کے کھلے چھپے نقالی ہوتی ہے، داڑھیوں پر اگر استرے کا وار کسی مجبوری یا مصلحت سے نہیں ہوپاتا، تو قینچی کی نوازش اس کو مسنون حد تک تو مشکل ہی سے جانے دیتی ہے، بہت سے طلبہ اور بعض اساتذہ تک کے انگریزی بال ٹوپیوں کے اندر اہتمام کے ساتھ چھپائے جاتے ہیں، محبوب وضع کی حفاظت بہرحال لازم ہے، خواہ اظہار کی بیتابی کے باوجود کسی مجبوری کا سے اخفا کی مصیبت ہی جھیلنا پڑے، پائجاموں کا ٹخنوں سے اوپر رکھنا بھی اکثر بادل ناخواستہ ہوتا ہے، اس لئے ان کی کتر بیونت جدید ہی رہتی ہے، کہ جب موقع ملا، نیچے کھسکایا اوپر چڑھالیا، پھر بھی "مولویت" کی ذلت کو کرتا خصوصاً اگر ذرا لمبا ہو فاش کر دیتا تھا، سو اس کی جگہ قمیص تو گویا اب عربی طلبہ بلکہ اساتذہ تک میں ایک بالکل بے عیب فیشن ہے، اور بعض عربی مدارس جو زیادہ روشن خیال و ترقی یافتہ ہیں، اُن کی ورزشوں اور کھیلوں میں بھی ہاکی فٹ بال وغیرہ ہی مقبول ہیں، اور نام کی اصلاحی انجمن (یونین کی نقالی) کی ترقیوں کے سلسلہ میں فخریہ اخبار میں شائع ہوتا ہے، کہ انعام میں کپ اور شیلڈ تقسیم ہوئے، غرض اب قرآن و حدیث پڑھنے والے یہ طالب علم اپنے نزدیک ٹٹن وسکسپیر پڑھنے برادری کی نگاہ میں زیادہ رسوا نہیں،

خوب یاد رکھنا چاہئے کہ اس روش کی شرعی حیثیت جو بھی ہو، لیکن اس سے کوئی حقیقی عزت غیروں کی نگاہ میں تو کیا ہوتی، خود اپنی نگاہ میں اپنی ذلت اور احساس کمتری کا پکار پکار کرا اور دنیا کی نظر میں دنیا کی عزت بھی طبعاً و عقلاً انہی کی ہوتی ہے، جن کی نظر میں خود اپنی اور اپنی دینی و قومی شعائر کی عزت ہو،

اس کے علاوہ جو مولوی یا مدارس دینیہ کا جو طالب علم "اسکول ماسٹر یا اسٹوڈنٹ" کی وضع قطع مین نظر آتا ہو، اس سے قدرتہً ایک عامی آدمی انگریزی کا خطایا اردی پڑھوانا چاہے گا، نہ کہ کوئی فتوی یا دینی مسئلہ دریافت کرنے کا خیال کرے گا، آخر جن کے بنائے ہوئے سٹرون کی پوزنہ دار تقلید مین ہم دیوانے ہین، اُن کے مولویوں (پادریون) کی بھی کم از کم اب تک تو ایک خاص وضع ہی محمود خیال کیجاتی ہے، بلکہ داڑھی تک وہ بھی ایک مشت سے زائد مقداری کی اُن کے چہرون کو بھی ایک مذہبی و مقدس جماعت کا چہرہ ظاہر کرتی ہے، اس سے بھی بڑھ کر یونیورسٹیاں اپنے طلبہ تک کے لئے خاص خاص یونیفارم مقرر کرتی ہین، لہٰذا اس ذوق تقلید ہی کی دلیل سے سہی اگر ہمارے علماء اور دینی طلبہ کا بھی کوئی یونیفارم ہو تو آخر اس مین کیون ذلت محسوس کرین!

حاصل یہ کہ لباس و وضع کا معاملہ خفیف و حقیر ہرگز نہین اس کے مصالح و مفاسد دونون اشد بھی ہین، اور جنھون نے اپنے دین کو اغیار کے رباؤ سے کچھ آزاد کر لیا ہے، اُن کی نگاہ مین اظہر بھی، اور اتنی تفصیل محض ہماری مغرب زدہ مرعوبیت و غبادت کی بنا پر ضروری ہوئی،

علماے سند مین بے احتیاطی و نقالی

ایک اور بہت بڑا خطرناک مرض تمام مدارس مین نقالی ہی کی راہ سے یہ پھیل گیا ہے، کہ پاس فیل کے کچھ نمبر مقرر کر لئے گئے ہین جس نے ان کو الٹے سیدھے کسی طرح حاصل کر لیا، بس اُس کے ہاتھون مین عالم و فاضل اور مقتداے دین ہونے کی ایک سند پکڑا دی گئی، نہ سند پکڑاتے وقت علم کی استعداد و صلاحیت کو دیکھا جاتا ہے نہ عمل کے صلاح و تقویٰ کو اس کی نسبت ارشاد ہے کہ

"بعض مدارس مین ایسے لوگون کو سند فراغ دیدی جاتی ہے یا دستار بندی کر دی جاتی ہے، جو باعتبار علم یا صلاح و عمل کے اس کے اہل نہیں ہوتے، جب ان لوگون کی علمی و عملی کوتاہیان دوسرون پر ظاہر ہوتی ہیں تو سارے علماء کو ان پر قیاس

کرکے سبب بد ظنی ہوجاتی ہے، تو دین کے معاملات مین پھر کس سے رجوع کرین گے کس کے قول پر عمل کرین گے، پھر دین کا کیا حشر ہوگا، تو ان مفاسد کا سبب وہ بے احتیاط لوگ ہوئے، جو نااہلون کو قوم کے سامنے سند دے کر اہل ظاہر کرتے ہین"

شاید اس رسالہ کی تحریک کے وقت حضرت علیہ الرحمۃ کی نظر مین بعض مدارس ہی ایسے رہے ہون اب تو کوئی استثنار نظر نہین آتا، اگر اس ایک بات ہی کی اصلاح کا پورا اہتمام مدارس دینیہ کرلین تو انشاء اللہ علم و عمل دونون اعتبار سے خدمت دین کے لئے اوسط درجہ کے علماء کا اثر بہت بڑھ جائے،

قواعد کی پابندی مین سستی تعلیم و تعلم وغیرہ کے معاملات میں اب اکثر عربی مدرسون مین طلبہ کی خواہش و مذاق اور کثرت تعداد کے مقابلہ میں اصول و قواعد کی پروا کم کیجاتی ہے، اس سے بھی وہی مذکورہ بالا قسم کے مفاسد پرورش پاتے ہین، "اس لئے ضروری ہے، کہ طلبہ کو قواعد کا پابند بنایا جائے، خواہ اُن کی تعداد کم ہی کیون نہ ہوجائے، کام کے دو چار ناکارہ سو دو سو سے افضل ہین"،

تجوید و اخلاق کی تعلیم سے غفلت اکثر مدارس مین تجوید کا علم و عمل داخل نصاب نہین، اسی طرح اخلاق کی کوئی کتاب درس مین نہین، اوّل کی کمی کا نتیجہ یہ ہے، کہ اکثر طلبہ بلکہ علماء بھی افسوس ہے کہ قرآن مجید اچھا نہین پڑھتے، جس پر عوام بھی ہنستے ہین، کتنا بڑا ظلم ہے کہ امام عالم ہو، اور نماز فقہ کی رو سے درست نہ ہو، لہذا طلبہ پر لازم کیا جاوے کہ تجوید علماً و عملاً حاصل کرین"

اوپر راقم سطور کہین اس معاملہ مین ایک مشہور عربی درسگاہ کا تلخ تجربہ درج کرچکا ہے کہ بچون کے لئے مکتب تو قائم کر دیا گیا، اور اس مین قرآن مجید لازم بھی ہے، لیکن تجوید کیا معمولی تصحیح مخارج تک کا انتظام نہین، اور نیچے سے اوپر تک کے ذمہ دارون سے عرض کرتے کرتے تھک گیا، یہان تک کہ خود اپنے بچے کو وہان سے ہٹا لینے کا ایک بڑا سبب یہی ہوا،

بُرا نہ مانا جائے تو اصل یہ ہے کہ ایسی درسگاہون کے خود اساتذہ و منتظمین اور اکابر کے اندر دین کی

فکر و غلطت دونون کا ایسا زوال ہے کہ سمجھتے ہی نہین کہ کس کوتاہی کا اثر کتنی دور جاتا ہے یہ تو فکر کی کمی ہے، اگر سمجھے بھی تو غلطت کی کمی کی وجہ سے اس کی اصلاح و تدبیرین مستعدی نہین فرماتے،

"دوسری کمی یعنی تعلیم اخلاق کو درس سے خارج کر دینے) کی مضرتین اس قدر کثیر ہین کہ بیان نہین ہو سکتا، خلاصہ یہ کہ علمار کی اس فن سے بے خبری کی بدولت جھوٹے مکار پیر بن گئے ہین، جو خلقت و دنیا کو ذبح کر رہے ہین، اس لئے چاہئے کہ اخلاق کی کتابون کو درس مین داخل کرین، (اور صرف درس اخلاق ہی کافی نہین) بعد فراغ التزاماً طلبہ محققین اہل اللہ کی خدمت مین حسب گنجایش قیام کرین، اور اُن سے عملاً آداب اخلاق سیکھین، اور اُن کی صحبت سے برکت حاصل کرین، اور چندے اُن کی خدمت مین آمد و رفت رکھین جس سے کہ نسبت باطنہ ایک گونہ راسخ ہو جائے، تب خلق اللہ کے ارشاد کو اپنے ہاتھ مین لین، انشار اللہ عموماً عوام اہل اسلام اُن سے وابستہ ہو کر جھوٹون کو چھوڑ دین گے، اور مضمون قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا آنکھون سے نظر آجائے گا،"

بات یہ ہے کہ باطنی اخلاق کی اصلاح و درستی جن کا اصطلاحی نام فقر و درویشی یا تصوف پڑ گیا ہے، یہ دراصل دین کی روح ہے، جس کے بغیر اللہ تعالیٰ سے قلبی و روحانی تعلق پیدا نہین ہوتا، اور دین بے جان یا نیم جان رہتا ہے، لوگون کو سوکھے ساکھے دین مین خدا کی بو نہین محسوس ہوتی، ورنہ انسان کی عام فطرت تو یہ ہے کہ

ہر کجا بُوے خدا می آید خلق را بین بے سرو پا می آید

اس لئے جہان جہل کے باوجود یہ بُو کچھ موجود ہوتی ہے، خواہ زیادہ تر نقلی و نمایشی ہی ہو لوگ پھنس جاتے، اور جہل کی گمراہیون کے ہاتھ تباہ ہوتے ہین، اس لئے علم کے ساتھ تزکیۂ اخلاق کے اجتماع کا اہتمام ضروری ہے،

اس آخر دور مین بھی دہلی کے شاہ ولی اللّٰہی خاندان مین اس اجتماع کے کیسے کیسے عظیم برکات و اثرات کا مشاہدہ ہو چکا ہے، دیوبند کا سلسلۂ خیر و برکت بھی اسی اجتماع کا فیض ہے، وہان کے اکثر اکابر و اساتذہ ظاہر و باطن کے جامع کمالات رہے ہین، فرنگی محل لکھنؤ کے بھی بہت سے اکابر دونون رنگون کے جامع تھے لیکن اب ہر جگہ اس رنگ کے اکابر کی روز بروز کمی بلکہ فقدان ہے، دیوبند و فرنگی محل دونون پر تو مسلمانون کا موروثی حق ہے اس لئے ان دونون کے حضرات کو خصوصاً اور عام مدارس عربیہ کے حضرات کو عموماً اس جامعیت کے رنگ کو پیدا اور قوی کرنے کی طرف پوری توجہ فرمانے کی ضرورت ہے،

اصلاح درس و تدریس قدیم طرز کے مدارس عربیہ کا درس و تدریس بھی بہت کچھ محتاج اصلاح ہو گیا ہے، مولانا عبد اللہ گنگوہی کا بالکل حضرت ہی کے اصول و رنگ کا نامحِ الطلبہ نام ایک مضمون ہے، جسکو خود حضرت نے پسند فرما کر "حقوق العلم" کے آخر مین شریک فرما دیا ہے، اس مین درس و تدریس سے متعلق اصلاح طلب امور کی جو تفصیل ہے، وہ ہمارے تمام قدیم طرز کے مدارس کے اساتذہ و منتظمین کے لئے لفظاً بلفظ پڑھنے اور توجہ فرمانے کے لائق ہے۔

"خلاصہ یہ کہ ایک طرف تو تحصیلِ علم کے سامان پہلے کے مقابلہ مین زیادہ فراہم ہین، کتابون کو لیجئے کہ حضرت شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللّٰہ کے درس مین ۲۲ آدمی بخاری شریف مین شریک تھے، اور صرف ایک نسخہ تھا، سب اس سے نقل کر کے پڑھتے تھے" آج ہر درس کی کتاب بلا اس محنت و مشقت کے ہر طالب علم کے پاس موجود ہے، لیکن دوسری طرف یہ حال کہ کہ نہ کتاب کی طرف توجہ، نہ اساتذہ سے انس، نہ شوق، نہ طلب، نہ مطالعہ، نہ تکرار، دستار فضیلت زیب سر ہو جاتی ہے، اور استعداد کی یہ حالت کہ عبارت صحیح نہین پڑھ سکتے، اعلانک درست نہین (الا ماشاء اللّٰہ)

اس قابلیت کے ثمرات ظاہر ہے کہ درس و تدریس یا افتا وغیرہ کسی اعلیٰ خدمت علم کے قابل نہیں ہوتے کہیں وعظ کو پیشہ بنالیا، کہیں مسجد کے امام بن گئے، کہیں الٹی سیدھی طب پڑھ لی، وہ بھی چلتی نہیں، ان نتائج کو دیکھ کر کم عقلوں نے سمجھ لیا کہ علم دین کا نتیجہ جب یہی ہے، تو اپنی اولاد کو پڑھا کر کیوں برباد و رسوا کریں اس کم عقلی کا جواب تو یہ ہے کہ

"مدارس اسلامیہ میں بیکار پڑے رہنا بھی انگریزی میں مشغول ہونے سے لاکھوں کروڑوں درجے بہتر ہے، اس لئے گو لیاقت اور کمال حاصل نہ ہو لیکن کم از کم عقائد تو خراب نہ ہوں گے اور مسجد کی جاروب کشی اس وکالت و بیرسٹری سے بہتر ہے جس سے ایمان میں تزلزل ہو، اور خدا رسول صحابہ اور بزرگان دین کی شان میں بے ادبی ہو جو انگریزی کا اس زمانہ میں اکثر بلکہ لازمی نتیجہ ہے، ہاں جس کو دین ہی کے جانے کا غم نہیں وہ جو چاہے کہے اور کرے۔

"لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عربی مدارس کی اصلاح نہ ہو، یہ اصلاح بہت ضروری ہے اگر اُن کی اصلاح ہو گئی، تو ایک عالم کی اصلاح ہو گئی، اس میں شک نہیں کہ پرانے طریق تدریس سے بڑے بڑے علما پیدا ہوئے، اور اب بھی کچھ نہ کچھ ذی استعداد نکل آتے ہیں، گو کم ہی سہی لیکن اس زمانہ میں طلبہ کی کم توجہی، اور قوت فہم کی کمزوری کی وجہ سے یہ طریق تدریس کافی نہیں،

اب تک طریقہ یہ ہے کہ پہلے طالب علم عبارت پڑھتا، اور مدرس مطلب بیان کر دیتا ہے اگر کسی کو کچھ شبہہ ہوا دریافت کر لیا، اور آگے چل پڑے، یہ طریق مبتدیوں بلکہ متوسطین کے لئے بھی غیر نافع ہے، صرف ایسے منتہی طلبہ کے لئے نافع ہے، جو فضلانہ استعداد حاصل کر چکے ہیں اور بڑے اساتذہ کے ہاں مستفید ہو رہے ہیں،

اس میں اصلاح کی ضرورت یہ ہے کہ خود طلبہ کی استعداد سے کام لیا جائے بلا ضرورت

اُن کی امداد نہ کیجائے خود اُن ہی سے مطلب کی تقریر کرائی جائے نیز ہر قاعدہ و مسئلہ کی کثرت امثلہ سے مشق کرائی جائے البتہ جو مقام طلبہ کی استعداد سے باہر ہو اُسکی خود تقریر کر دے، یہ طریقہ یون تو سارے درس کے لئے مفید ہے ورنہ ابتدائی کتابون مین تو بہت ضروری ہے، مثلاً میزان منشعب مین ایسا نہ کیا جائے کہ سبق پڑھایا، اور اس کو رٹوا کر سُن لیا، اس سے کچھ نہین ہوتا، بلکہ ہر سبق کی بکثرت مثالون سے مشق کرائی جائے، مثلاً ماضی کی بحث پڑھائی جائے تو کم سے کم اس کے تین چار سو مختلف صیغون کی مشق کرائی جائے اور مصادر دے کر ماضی کے صیغے بنوائے جائین، اور ماضی کے صیغون کی اردو دیجائے، کہ اس کی عربی بنا دین، اگرچہ اس اجرا مین ایک ہی سبق مین کئی روز صرف ہو جائین،

اس طرح جب نحو میر تک پہنچے تو ہر قاعدہ کے متعلق چھوٹے چھوٹے عربی جملے دیکر اردو ترجمہ اور اردو کے جملے دیکر عربی بنوائی جائے، حتی کہ نحو میر کے ختم پر طویل طویل سلیس عبارتین اردو کی دے کر عربی بنوائی جائے، اور سلیس عربی کا ترجمہ کرایا جائے، اس طرح جب نحو میر ختم ہوگی تو شرح مأۃ و ہدایت النحو کی عبارت طالب علم خود صحیح پڑھے گا، اور اگر کہین غلطی کرے تو بتلایا نہ جائے اس سے خود قاعدہ پر جواب طلب کیا جائے"،

اس مین شبہہ نہین کہ اگر قدیم طریق مین اتنی اصلاح کر لیجائے، تو وہ جدید کے بہت قریب آجاتا اور دونون کا نفع بڑی خوبی سے جمع ہو جاتا ہے نحو و صرف کی قواعد دانی پر پرانون کا جو اصرار ہے، اور جو نفع اس کا بتلاتے ہین، وہ بھی قائم رہتا ہے، اور نیون کا نحو و صرف کے بے سمجھے خالی رٹانے اور وقت و ذہن کو خراب کرنے کا اعتراض بھی جاتا رہتا ہے، اور ہدایت النحو تک پہنچکر یقیناً عبارت خوانی کی کافی استعداد حاصل ہو جائے گی، جو رائج الوقت طریقہ مین کافیہ، و شرح جامی تک پڑھ کر بھی حاصل نہین ہوتی،

"آگے چل کر ہر فن کی تعلیم اسی طریقہ پر ہو، مثلاً بلاغت شروع ہو تو ہر قاعدہ کے متعلق قرآن مجید کی آیات اور اشعار جاہلیت دے کر قواعد و بلاغت کو جاری کرایا جائے، اسی طرح فقہ مین ہر کتاب کے موافق چھوٹے چھوٹے مسئلے دئے جائین، کہ بحوالۂ کتب اُن کے جواب لکھین وَقِس علٰی ھٰذا، اس مین گو پہلے مدت زیادہ لگے گی، لیکن چونکہ استعداد پڑھنے سے جی بڑھے گا، اور توجہ زیادہ ہوگی، تو آگے چل کر وقت بھی کم صرف ہوگا، اور ابتدا کی کسر انتہا مین نکل آئے گی"

البتہ اس طریق اصلاح مین اصلی محنت و توجہ استاذ کو کرنا ہوگی، اور ہر مدرس پر اطمینان نہین کیا جا سکتا، اس لئے اس مین آسانی پیدا کرنے کے لئے بھی یہ تجویز فرمائی گئی ہے، کہ ایسی درسی کتابین شائع و مرتب کر دیجائین جن کے حاشیہ پر مشقی مثالین سلیقہ اور حسن ترتیب کے ساتھ جمع ہون، اور جہان ہر چھوٹے بڑے کام کے لئے جو کچھ بھی ضروری ہو چندہ کر کے اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، تو یہ اس اعتبار سے سب سے ضروری کام ہے، کہ لائق و ذی استعداد علمار کے کم ہوتے ہوتے بالآخر علوم دین ہی کے گم ہو جانے کا اندیشہ ہے، جس پر سارے دین کا مدار ہے،

بلکہ اگر ایک دفعہ کچھ سرمایہ فراہم کر کے ایسی درسی کتابون کی اشاعت کا صرف آغاز کر دیا جائے تو بار بار کسی چندہ کی بھی ضرورت نہین ہوگی، انہی کی فروخت سے آگے کا کام انشاء اللہ ہمیشہ چلتا رہے گا،

نیز اس قسم کی اصلاحات سے وحشت و استنکاف کی بھی کوئی وجہ نہین، ایسی ایسی ترمیمات تو ہمیشہ ہوتی رہی ہین، سلف صالحین و محدثین کا یہ طرز تھا، کہ شیخ خود پڑھتے، اور تلامذہ سنتے تھے، اس وقت یہی نافع و کافی تھا، پھر علمار نے اس طرز کو بدل دیا، تلامذہ مین ایک پڑھتا، اور شیخ سنتے، اس کے بعد نمبر مقرر کیا گیا، کہ نمبروار سب پڑھین، اس مین یہ شبہہ ہوا، کہ جس کا نمبر ہوگا، وہی مطالعہ دیکھے گا، باقی نہ دیکھین گے، اس لئے یہ کیا گیا، کہ جس کو استاد کہے وہ پڑھے، غرض حسب ضرورت طریق تدریس مین ترمیم و اصلاح ہمیشہ

سلف سے آج تک ہوتی رہی، تو اب اس سے خواہ مخواہ بھڑکنے کی کیا وجہ؟

اصلاح اعمال و اخلاق یہ تو علمی و تدریسی اصلاحات کے متعلق تھا، عملی و اخلاقی اعتبار سے بھی بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کی اصلاح و تدارک کی طرف بہت خاص توجہ و اہتمام کی ضرورت ہے، ان میں دو باتوں کا خصوصاً ذکر فرمایا گیا ہے،

ایک بے ریش لڑکوں کا فتنہ ہے، اس لئے مدارس میں یہ انتظام ہونا ضروری ہے، کہ دس دس بیس بیس لڑکوں پر ایک معتبر نگران مقرر ہو، جو ان امور کی نگرانی رکھے، کہ کسی بڑے طالب علم سے نہ ملنے دے، نگران سے الگ ہوکر آپس میں باتیں نہ کریں، اُن کے نام جو خطوط آئیں، وہ بھی دیکھ کر دے، اُن کے سر منڈاتا رہے، پان نہ کھانے دے، لباس سادہ ہو، اگرچہ امرا کے بچوں کا قیمتی ہو، نماز و جماعت میں اُن کی حاضری کی فکر رکھے، تفریح یا کسی ضرورت سے بازار وغیرہ جائیں، تو اُن کے ساتھ رہے، ان باتوں کی خلاف ورزی پر مناسب سزا دے،

نئی روشنی کے اثرات دوسری نہایت قابلِ افسوس چیز نئی روشنی یا نیچریت کے اثرات ہیں، جو ہیضہ و طاعون کی طرح پھیل گئے ہیں جس سے بہت کم نفوس محفوظ ہیں، عربی مدرسوں کے طلبہ بھی ان اثرات کو قبول کر رہے ہیں،

الحمدللہ کہ ابھی عقائد پر تو زیادہ اثر نہیں پہنچا ہے لیکن پہلی سی سادگی و بے تکلفی جاتی رہی ہے، وضع قطع سے مسٹر یا نیم مسٹر معلوم ہوتے ہیں، نہ چہرہ پر تقوی کے انوار، نہ بات چیت میں تواضع کے آثار، کتابوں میں جی نہیں لگاتے، نہ مطالعہ سے کام، نہ تکرار سبق سے سروکار، مقرر بننے کی فکر، اخباروں اور پرچوں میں مضمون نگاری کی دھن، تاویل یہ کہ ضرورت زمانہ سے مجبوری ہے، کہ تبلیغ کے لئے تحریر و تقریر نئے رنگ و مذاق کی ہو، اس کی ضرورت مسلم، لیکن اس کے اندر جو خفیہ مفاسد ہیں، اُن پر اطلاع ضروری ہے، تجربہ یہ ہے کہ ایسی تحریر و تقریر بالعموم حُبِّ جاہ

پیدا کرتی، اور اخلاص کے رنگ کو مٹاتی ہے، اور طالبِ علمانہ رنگ و سادگی، قلب سے دور ہو کر صرف عبارت آرائی اور دعوی ہی دعوی رہ جاتے ہین، اس لئے عام طلبہ کو عموماً ایسی تقریر و تحریر اور نئی روشنی والون کے ساتھ افادہ یا استفادہ کی نیت سے ملنے سے قطعاً روکا جائے، کچھ اپنا رنگ چڑھانے کے بجائے خود اُن کے رنگ مین رنگ جاتے ہین، البتہ تبلیغ احکام اور مخالفین کے مضامین کو تحریراً و تقریراً رد کرنے کے لئے ایسے منتہی طلبہ کو منتخب کیا جائے جن کے ظاہر و باطن مین کچھ تو دین کی طرف خاص میلان موجود ہو، اور پھر ان کو حضرات اہل اللہ کی خدمت مین رکھا جائے جس سے اُن کا اخلاص راسخ اور اُن کے اخلاق کی درستی ہو، یہ مطلب نہین کہ خواہ مخواہ عرفی صوفی ہو جائین، اور ضربین لگانے لگین، بلکہ اُن کی صحبت سے انشاء اللہ اخلاص کا کچھ حصہ ضرور مل جائے گا حسب استعداد جب کافی مدت تک اُن کی خدمت سے مستفید ہو لین تب اُن کو تحریری و تقریری تبلیغ کے منصب پر مقرر کیا جائے، اس وقت اُن کی تقریر و تحریر نئے پرانے کسی طرز کی بھی انشاء اللہ مفید ہی ہو گی، مضر نہ ہو گی، باقی جو لوگ بے اس کے آج کل کے مذاق کی تحریر و تقریر کے عادی ہو رہے ہین، وہ یاد رکھین، کہ خود کاتب و مقرر کی بڑائی کا کچھ اثر بے وقوفون پر ہو جاتا ہو ورنہ اصلاح یا تبلیغ جو بتائی جاتی ہے، اس کا اثر برائے نام ہی ہوتا ہے"،

عام مدارس کے ساتھ کاش یہ چند سطرین خاص طور سے اکابر ندوہ کو اپنی جانب متوجہ کر سکین! راقم احقر کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اُن کی تحریر کے وقت اگر علماً، تجربۃً نہین تو کشفاً و الہاماً خصوصیت کے ساتھ ندوہ ہی پیش نظر تھا، بات یہ ہے کہ جب آب و ہوا مین کوئی سمیت سرایت کر گئی ہو، تو جس چیز سے بھی اس کی کچھ اعانت ہو گی، اسی کے اثر کو غائب کر دے گی، اس لئے اکثر عرض کیا گیا کہ ایک مرتبہ ہمت کر کے اس سمیت کے جراثیم کا پورا پورا استیصال کر دیا جائے، پھر انشاء اللہ تقریر و تحریر وغیرہ

کے ان مفاسد کی خود ہی اصلاح ہو جائے گی،

مختصر نصاب علوم دینیہ کے نصاب تعلیم و تدریس مین ایک اور بڑی اہم اصلاح و تجدید کی ضرورت یہ تھی، کہ اس کے لئے کوئی ایسا مختصر راستہ تجویز کیا جائے، جو بقدر ضرورت کافی بھی ہو، اور اتنی مدت نہ صرف ہو، کہ علوم معاش کی تحصیل کا عذر اس کی تحصیل سے لوگون کو مانع ہو، حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کی تجدیدی جامعیت نے اس ضرورت کا بھی پورا احساس فرمایا، اور صرف کوئی نظری خاکہ نہین پیش کیا، بلکہ "مخصصات عشرہ" کے نام سے مروجہ نصاب کا (دیگر ضروری اضافون مثلاً اخلاق و فلسفہ جدیدہ وغیرہ کے ساتھ) ایسا عطر کھینچ دیا ہے، کہ اس بحث کی بھی گنجایش نہین رہی، کہ کون سا علم و فن قدیم نصاب کا تقلیل مدت کی ضرورت سے سرے سے خارج کر دیا جائے، اور لوگون کو یہ وسوسہ و اعتراض باقی رہے کہ فلان چیز کے بالکلیہ نکل جانے سے فلان خاص خامی رہ جائے گی،

اس نصاب مین تمام چیزین تجوید سے لے کر صرف و نحو، معانی و بلاغت، منطق و فلسفہ، عقائد و کلام، مناظرہ و ہیئت، تفسیر و حدیث، اصول فقہ، اخلاق و تصوف سب ہی کا اتنا ضروری حصہ اور ایسا ملخص موجود ہے کہ کہ ضروری ضروری مسائل سب کے آ گئے ہین، اور حضرت کی مقررہ ہدایات کے مطابق اُن کی تعلیم ہو تو انشاء اللہ ہر فن سے اتنی مناسبت حاصل ہو جائے گی، کہ پھر جس مین چاہے آگے تکمیل کر سکتا یا ذاتی مطالعہ سے استعداد بڑھا سکتا ہے، یہ پورا نصاب کم و بیش تین سال کی مدت مین پورا ہو جاتا ہے،

یہی نہین کہ اس کی بدولت اس قلیل مدت مین سارے علوم دینیہ عربیہ سے فی الجملہ واقفیت و مناسبت پیدا ہو جا سکتی ہے، اور ساتھ ہی دینی تربیت کا بھی ان تین سالون مین اگر پورا اہتمام رکھا جائے، تو پھر علوم معاش یا دنیوی علوم مین مشغول ہونے سے بھی انشاء اللہ ایمان و عمل ایسا برباد نہ ہوگا، کہ اسلام کے نام کے سوا اسکا کام کوئی نہ رہ جائے، بلکہ خود ان دنیوی و معاشی علوم کی فہم و قابلیت اور ان مین سرعت ترقی کے لئے ذہن مین ایک مضبوط و مستحکم بنیاد قائم ہو جائے گی، اس پر بھی امرار و غربا اگر سب ہی معاش و معاد دونون کی جامع

منافع کے لئے اس کو لبیک کہین، تو ع

"تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل"

ذیل مین اس تجویز و تجدید کے مقصد و مطلب کو مختصراً خود حضرت مجدد کی زبان سے بھی سُن لینا چاہیے، جو اسی تلخیصات عشر کی تمہید سے ماخوذ ہے، سب سے پہلے اس پر تنبیہ فرمایا گیا ہے، کہ یہ نصاب کوئی ایسی جدت طرازی نہین، جو قدامت پسند حضرات کے لئے موجب وحشت ہو،

"بلکہ نصاب قدیم کی دینیات مقصودہ یعنی تفسیر و حدیث و فقہ و کلام و فرائض کی ضروری کتابون کی تحصیل کو زوائد پر مقدم کر دیا گیا ہے، اور چونکہ یہ علوم بعض فنون آلیہ صرف و نحو و معقول و اصول پر موقوف ہین، لہذا اُن سے پہلے یہ رکھدئیے گئے ہین، اس لئے یہ نصاب قدیم ہی کا ایک جزء ہے"،

اس کے بعد اس تجویز کا اصل مقصد ملاحظہ ہو جس کی دو غرضین بیان فرمائی گئی ہین،

اول، جن لوگون کو تحصیل معاش کی ضرورت یا کسی اور وجہ سے مہلت کم ہے، اور ساتھ ہی علوم دینیہ مین فاضلانہ استعداد حاصل کرنے کی رغبت و شوق ہے، مگر متعارف درسیات کی تطویل دیکھکر ہمت پست ہو جاتی ہے، جس کا نتیجہ ترک محض ہوتا ہے، اُن کی تنگی رفع ہو جاوے گی، دوسرے جو لوگ تحصیل علوم دینیہ کے لئے فارغ بھی ہین، اُن کو بھی اتفاقات زمانہ سے کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ اس کا وقت نہین ملتا، اور درمیان ہی سے چھوڑ دینا پڑتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ جس قدر وقت ملا تھا، وہ علوم آلیہ مین صرف ہوگیا، اور اصل مقصود سے محروم ہی رہے، اس جدید نصاب یا طرز سے اس محرومی کا بھی تدارک ہو جاتا ہے،

لہذا اس مصلحت کے پیش نظر عام اور رائج الوقت طویل نصاب پر ہر حال مین اس مختصر نصاب کو مقدم رکھنا انسب ہے، اس کے پورا کرنے کے بعد

"اگر وقت مساعد ہو تو بقیہ درسیات کو پورا کر لیا جا سکتا ہے، نیز چونکہ اس شخص کی استعداد

مین ایک گونہ قوت زیادہ ہوگی، اس لئے بقیہ درسیات پر سرعت و بصیرت سے عبور کر سکیگا، اور اگر وقت نہ ملا تو اصل مقصد تو حاصل ہی ہو چکا، اگر توجہ کرے گا، تو چونکہ مطالعہ کا ملکہ پیدا ہو چکا ہے، کتب بینی سے اپنی استعداد و تبحر کو جہان تک چاہے ترقی دے سکتا ہے"،

ایسی صورت مین چاہئے تو یہ تھا کہ دیوبند، سہارنپور، نظامیہ، (فرنگی محل) ندوہ وغیرہ سب ہی بڑی بڑی درسگاہین اپنے ہان بطور ایک شاخ بلکہ بطور جڑ اور بنیاد کے اس کا التزام لازماً کرتین تاکہ ایک طرف طالبانِ دنیا پر طلبِ دین کی حجت قائم ہوتی، اور دوسری طرف خود ان درسگاہون کے فیض و افادہ مین وسعت ہوتی، اور جو لوگ تین چار سال سے آگے کی ہمت و فراغت رکھکر پوری تکمیل کرنا چاہتے، ان کے لئے یہ شاخ اسی طرح جڑ کا کام دیتی جس طرح دنیوی تعلیم کا میٹرکولیشن معمولی نوکریون وغیرہ سے زیادہ حوصلہ رکھنے والون کے لئے اعلیٰ تعلیم کی بنیاد کا بھی کام دیتا ہے،

بلکہ اگر اس طرز کے سہ سالہ مدارس مستقلاً جابجا ملک مین کثرت سے قائم ہو سکین، اور دنیوی یا معاشی مدارس مین جانے والے مسلمان بچے پہلے اس کی تکمیل کر لیا کرین، تو انشاء اللہ ایک ہی نسل مین اس یک کرشمہ دو کار کے دینی و دنیوی منافع کا مشاہدہ ہو جائے گا، ان سہ سالہ بنیادی مدرسون مین دینی تعلیم کے ساتھ دینی تربیت کا اہتمام بھی لازم ہو، تو اُن کے طلبہ دین و دنیا جدھر بھی جائین گے، خدا سے اُمید ہے کہ وہی آگے ہون گے،

کاش ہمارے پاکستانی علماء اور دین دوست حضرات حکومتِ پاکستان کو اس کی طرف متوجہ فرما سکتے تو ایک ہی نسل مین پاکستان تمام دینی و دنیوی ناپاکیون سے پاک ہو کر واقعی پاکستان بن جاتا، ذہنی و قلبی انقلاب کا بڑا دارو مدار تعلیم و تربیت ہی پر ہے، اگر مسلمانون کو مسلمان بنانے کا کوئی انقلاب پیدا کرنا ہے تو اس کا راستہ پاکستان و ہندوستان بلکہ ساری دنیا سے اسلام کے لئے اس کے سوا نہین کہ اُن کی تعلیم و تربیت کی اساس اسلام ہو، یہ بنیاد اگر کج ہی، تو "تا ثریا می رود دیوار کج" کے نتیجہ کو کوئی سیاسی

انتظامی طاقت روک نہین سکتی،

لیکن اس محرومی کا کیا علاج کہ ساری دنیا کے مسلمانون کے سر پر مغربیت یا فرنگیت کا جادو ایسا سوار ہے، کہ اسلام کا نام لے کر بھی اُن کی سمجھ مین کام غیرون ہی کا آتا ہے، تجربہ یہ ہے کہ خود اہل دین اور دینی مدارس کے اکابر تک کا دل و دماغ اس درجہ مسحور ہو رہا ہے، کہ دین کی سیدھی بات سمجھنا، اور سیدھی راہ چلنا، ان پر شاق ہو رہا ہے،

بہرحال اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کی ایک صورت اور حضرت جامع المجددین کی زندہ کرامت ہو کہ حضرت ہی کے ایک مستعد جوان صالح خادم اور مجاز خدمت (مولانا ابرار الحق سلمہ اللہ تعالیٰ) نے اللہ کا نام لے کر اس راہ مین قدم اٹھا دیا ہے، اور اپنے وطن ہردوئی کے ضلع کے ایک پرانے علمی قصبہ بلگرام مین اشرف المدارس کے نام سے رہنمائی کا نشان کھڑا دیا ہے[1] جس کا اصل مقصود حضرت مجدد وقت کی اس مذکورۂ بالا مجددانہ تعلیمی تجویز کی تکمیل ہے، بڑی بات یہ ہے کہ تربیت کی طرف تعلیم سے کم نہین زیادہ توجہ ہے، یہ سُنی سنائی نہین بلکہ ذاتی تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر عرض کیا جارہا ہے، اور خود اپنے بچون کی دینی تعلیم و تربیت کے باب مین بڑی بڑی نامی جگہون سے ٹھوکرین کھا کر اور مایوس ہوکر بالآخر حضرت جامع المجددین کی اس زندہ کرامت کے دامن مین پناہ ملی، ورنہ ایک بڑے خاندانی مشائخ زادہ اور خود دیندار صاحب علم و فضل نے تو اس سلسلہ مین ایک مخدوم بزرگ کی مثال پیش کرکے یہان تک تحریر فرمادیا تھا، کہ فلان صاحب دین و دولت بزرگ باوصف غایت دینداری اپنی اولاد کو کالج ہی مین تعلیم دلا رہے ہین، اور متوسط و غریب طبقہ کے لئے اس سے چارہ نہین، کہ موجودہ تعلیم کو اختیار کرے، یا اولاد کو نرا جاہل رکھ کر کارخانون کا مزدور بننے پر مجبور کرے، جہان بے علمی کے ساتھ بے اخلاقی و بداخلاقی کا بھی شکار ہون، باقی ایمان اور اعمال صالحہ کے لئے دعا کرین"،

---

[1] یہ مدرسہ خاص ہردوئی مین قائم ہوا تھا، لیکن اب چند ماہ سے بمصالح بلگرام مین منتقل کر دیا گیا ہو،

مگر یہ نادان اس فتوی پر کیسے عمل کرتا، جب کہ اس کے مشاہدہ و تجربہ مین خود دنیا کے لئے بھی خالی دنیا کے علم سے نرا جہل بہتر، اور دین کے حق مین کمتر ضرر رسان ہے، کیونکہ اس جہل مین کچھ بُرا بھلا ایمان و اعتقاد تو سلامت رہ جاتا ہے، اور اس اعتبار سے کارخانہ کا مزدور بنجانا کونسل کے ممبر بننے سے بدرجہا اچھا ہے، خود حضرت مجدد کے افادات اس بارے مین آگے تعلیم انگریزی کی تحقیق مین آتے ہین،

ہماری عام عربی و دینی تعلیم اور تعلیم گاہون کی بڑی کمزوری غفلت یہی ہے، کہ تعلیم کے ساتھ تربیت و عمل کا بہت کم اہتمام والتزام فرمایا جاتا ہے، بلکہ گویا طالب علمانہ زندگی کو عملی زندگی کی آزادی کا پروانہ (لائسنس) خیال کیا جاتا ہے، یہ تصور بھی زندگی طالب علمی کی برکات مین ہے، اور اگر کوئی اس پر معترض ہو تو غلطی کو غلطی کے لئے حجت بنایا جاتا ہے، کہ "آپ بھی اپنی طالب علمی کو یاد کرین"، حالانکہ موٹی بات ہے، کہ تربیت کی بنیاد کو پختہ کرنے کا زمانہ تو طالب علمی کے سن سے بھی پہلے شروع ہو جاتا ہے، تو عین علم دین کی تحصیل کے زمانہ مین عمل دین کی غفلت و مسامحت کیسے روا ہو سکتی ہے، خود حضرت علیہ الرحمۃ نے تو بے عمل طالبعلمون کو سند فراغ و تکمیل دیدینا موجب مواخذہ قرار دیا ہے، تلخیصات عشر کی تمہید مین اس مختصر نصاب کی تحصیل کا جو دستور العمل تحریر فرمایا ہے، اس کا آخری نمبر (۱۱) بھی یہی ہے، کہ جو کچھ پڑھے اس پر پورا عمل کرتا رہے،

دینی نصاب تعلیم کی مقدار و مدت مین اختصار و تقلیل کی اس مجددانہ تجویز کی جو اہمیت و حاجت حضرت مجدد وقت علیہ الرحمۃ کی نگاہ مین ہے، اس کا مزید اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ بعض چیزون کو حذف فرما کر یا ان کا بدل تجویز فرما کر ارشاد ہے کہ

"اگر کوئی شخص کسی سبب سے اور زیادہ اختصار کا طالب ہو، تو ایسے شخص کے لئے یقیناً تین سال مین سے اور چھ ماہ گھٹ جاوین گے،

پھر آگے ارشاد ہے کہ

"اگر کوئی شخص صرف اپنی اصلاح و نجات آخرت کے لئے کتب دینیہ کو عربی زبان مین پڑھنا چاہے، تحقیق و تدقیق کی ضرورت نہ سمجھے، یا علوم عقلیہ سے دلچسپی نہ ہو، اس کے لئے اس درس کا اور بھی اختصار ہوسکتا ہے، یعنی صرف ونحو کی کتب مندرجہ کے بعد قدوری کامل اور سراجی، اور متن معانی، اور تجوید اور تلخیص البدایہ اور متن عقائد نسفیہ، اور تیسیر یا مشکوۃ اور جلالین کافی ہے"،

لیکن نفس اپنی اصلاح ونجات آخرت کے لئے چونکہ عربی زبان مین پڑھنا بھی لازم نہین اس لئے مزید ارشاد ہے کہ

"جو عربی زبان کی قید بھی ضروری نہ سمجھے، اس کے لئے صرف بہشتی زیور کے پانچ حصے، اور مفتاح الجنۃ اور صفائی معاملات اور تعلیم الدین، اور فروع الایمان اور جزاء الاعمال اور اصلاح الرسوم، اور قیامت نامہ اردو شاہ رفیع الدین اور حقوق الاسلام اور سراج السالکین اور تواریخ حبیب اللہ اور تال تہذیب کے سب حصے،

اور عورتون کے لئے بلکہ کم فرصت مردون کے لئے بھی بہشتی زیور کے سب حصے پڑھ لینا اور ضرورت کے وقت علماء سے رجوع کرتے رہنا کافی ہے"،

بہر نوع دینی تعلیم اختصار نصاب و تقلیل مدت کی یہ اصلاح و تجدید اتنی ضروری ہے، کہ حضرت علیہ الرحمۃ کے نزدیک سارے عربی مدارس، اور ان کے سارے طلبہ کے لئے اس کی تقدیم مناسب ہے، حتی کہ اگر

"کسی وجہ سے سب کے لئے علی الاطلاق تقدیم نہ ہو، تو اقل درجہ حضرات علماء و اہل مدارس اسلامیہ دامت فیوضہم و برکاتہم اس قدر التزام کی تکلیف گوارا فرمائین کہ جن کی حالت اپنی تحقیق یا ان کے استاد سارے اس تجویز کے مصالح مذکورہ بالا کی بنا پر تقدیم کی مقتضی پاوین

توان کے ذریعہ اجتماعت قائم کر دین، تو اس سے اہل حاجت کی رعایت کا ثواب بھی

ملے گا، اور امید ہے کہ مدارس مین طلبہ بالخصوص امیرزادون کی ترقی ہو جاوے، اور

کوئی طالب علم باوجود کمی وقت کے محروم نہ رہے، اور جو اہل وسعت اساتذہ کو

مکان پر بٹھلا کر اس طرز سے تعلیم دلانا چاہین، استاد کو یہ نقشہ دے کر اس کی پابندی

کے لئے فرمایش کر دین"

کاش امراء اور اہل وسعت مین دین کی اتنی حس ہو کہ وہ اس رعایت کو رعایت سمجھین اور دنیا

ترقی کے ساتھ اپنی اور اپنی اولاد کی آخرت کی فلاح ونجات سے اتنی بےفکری نہو، کہ گویا مرنے کے بعد

کچھ ہونا ہی نہین، اگر اس دنیا کی ۶۰، ۷۰ سال کی غیر یقینی زندگی کے لئے (اور اتنی غیر یقینی کہ یقین ایک

سکنڈ کا بھی نہین) ہم اپنی اولاد کو ۲۵، ۳۰ سال تک مسلسل تعلیم مین جوتے رہتے ہین، تو کس منہ سے آخرت

پر ایمان کا دعوی رکھتے ہین، جب کہ آخرت کی یقینی و ابدی زندگی کو سنوارنے والی تعلیم و تربیت کے

ڈھائی تین سال دینے سے بھی گریز کرین!

مشورۂ معاش | ایک مخدوم بزرگ جو خود ماشاء اللہ عالم باعمل ہین، اور ایک معروف بزرگ و شیخ کی

خالص دینی درس گاہ کے ناظم ہین، اور اسی درسگاہ مین خود اپنے ایک بچے کو قرآن حفظ کرا رہے ہین، باو

کے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ

"یہ تو بتاؤ کہ آخر حافظ و عالم ہو کر کھائین گیا!"

اسی طرح ایک اور مخدوم و مخدوم زادہ بزرگ جن کا ہندوستان کے ایک ایسے مشہور مسلم خا

قریب ترین تعلق ہے جس کا فخر و امتیاز نسلاً بعد نسل تک علوم دینیہ ہی کی طلب و خدمت رہا، اور جو ابھی ایک

پشت پہلے کے ایک ایسے صاحب تقوی و توکل مشہور و مسلم شیخ وقت کے صاحب سجادہ ہین جن کے یہان فاقہ ہو جانا

غیر معمولی بات نہ ہوتی، ان مخدوم کے ایک صاحبزادے جب ایم اے ہو کر ملازمت اور اس کے لئے

سفارش مین سرگردان و پریشان تھے، توایک موقع پراحقر نے اپنے ان مخدوم کی خدمت مین عرض کیا کہ حضرت نے آخر اپنے خاندان کے دینی علم و توکل کے راستہ سے اولاد کو ہٹا کر اس دنیوی تعلیم و تذلیل کو کیون پسند فرمایا ! جواب وہی کہ دین اور علم دین کا پوچھنے والا اب کون ہے اور اس کو حاصل کرکے کھاتے کہان سے ! احقر نے عرض کیا، اس سے تو تجارت اور کاروبار کی کوئی راہ اہون واسلم ہوتی ، اس کا جواب واقعی بڑا پُرمعنی اور پُرلطف عطا فرمایا کہ

"میان تجارت بڑی محنت و مشقت، ہوشیاری و بیداری کا کام ہے، ہم تو بس ملازمت ہی کے کام کے رہ گئے ہین، کہ سوتے جاگتے بُری بھلی طرح تیس دن کے بعد کسی پر کچھ واجب ہوجائے"!

اس مین شک نہین کہ ملازمت کا یہ بہترین ترجمہ ہے، مَیمن بوہرے وغیرہ نسلہا نسل کی تجارت پیشہ مسلمان جماعتون کا ذکر نہین ورنہ عام مسلمانون خصوصاً آخون زادون کو دیکھا کہ نوکری تو وہ بُری بھلی طرح نباہ کر اور تیس دن کے بعد کسی پر کچھ واجب کرکے وصول کرلیتے ہین لیکن تجارت مین اکثر ان کا دیوالہ ہی نکلتے دیکھا،

غرض جب خود ایسے ایسے خاندانی مشائخ اور دیندار علماے دین تک اپنی اولاد کو تعلیم دین سے ڈر کر دور رکھتے ہین اکہ علم دین کو حاصل کرکے کھائین گے کہان سے تو پھر مادشما یا امراء کا ذکر ہی کیا جو خاندانی دنیا دار اور دینی تعلیم و روایات سے یکسر محروم ہین !

ایسے دیندار اور دنیا دار دونون قسم کے مسلمانون کی خدمت مین عرض ہے، کہ "کھائین گے کہان سے" کا یہ خوف وہی خشیتِ املاق (خوف افلاس) ہے، جس کی بنا پر جاہلیت کے مشرکین اپنی اولاد کو قتل تک کر ڈالتے تھے، اتنا فرق ہے کہ وہ اس خوف سے اپنی اولاد کی چندروزہ دنیوی زندگی کا خاتمہ کر دیتے تھے، اور ہم ہمیشہ کی اُخروی زندگی کو برباد کر دیتے ہین ! آج بھی جاہلیت جدیدہ مین ضبط تولید کی وجہ

قتل اولاد کی خفی شکل ہے) بڑی دلیل یہی بیان کی جاتی ہے کہ آبادی بڑھتی جاتی ہے، اتنے آدمی آخر کھائیں گے کہاں سے!

اس کا حقیقی جواب نئے اور پرانے سب جاہلوں کو قرآن نے جو دیا ہے، وہ ایسے مسلمانوں کے لئے اور زیادہ حقیقی ہے، جو "خوفِ افلاس" کی بنا پر اپنی اولاد کو تعلیم دین سے محروم رکھ کر دنیا کی غیر یقینی زندگی کو بنانے سے زیادہ آخرت کی یقینی زندگی بگاڑتے ہیں، جواب یہ ہے کہ تمھاری اولاد کو بھی وہی خدا رزق دے گا جس نے تم کو دے رکھا ہے"(نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ) اگر ہم کسی درجہ میں بھی مسلمان ہیں، اور قرآن پر ہمارا کچھ بھی ایمان ہے، تو خوب یاد رکھنا چاہئے، کہ قرآن کے خدا نے انسان کو کھانے کمانے کی فکر میں فنا ہو کر مرنے کے لئے ہرگز نہیں پیدا فرمایا، ہمارا "زیستن برائے خوردن" نہیں، بلکہ "خوردن برائے زیستن" ہے، اور زندگی کا اصل مقصود عبدیت و بندگی کے وظائف کی ادائی ہے، صاف صاف و دو ٹوک ارشاد ہے کہ

مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ہ مَااُرِيْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَّمَااُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ

(الذاریات، ع ۳)

میں نے جن و انس کو محض عبدیت و بندگی کے لئے پیدا کیا ہے، رزق کی فکر کے لئے نہیں پیدا کیا، اور نہ اس لئے کہ مجھکو کھلائیں، رازق تو سب کا صرف اللہ ہی ہے، جو رزق رسانی کی پختہ قوت

باقی اپنی بندگی و عبدیت کو بھلا کر رزاقیت کی تدبیر و قوت کے مدعی انسان کی درماندگی کا تماشہ جو مسلسل ۔۔ سال سے دیکھا دیکھلا یا جارہا ہے، تاریخ نے تو کب دیکھا ہوگا، لیکن آج ہر آنکھ والے کی آنکھ دیکھ رہی ہے کہ ایک طرف تو "زیستن" کا مطلب تمامتر "خوردن" قرار دے لیا گیا ہے، اور حکومت و ریاست سب کا اصل مطلب و مقصود پکار پکار کر نظریہ روٹی کپڑا بتایا جاتا ہے، دوسری طرف عالمگیر جنگ کے سلسلہ میں اور خصوصاً اس کے بعد ساری دنیا جس طرح عالمگیر قحط کے چنگل میں پھنسی ہے، اس کے اندا

کی ہر روز ہر حکومت کی جانب سے طرح طرح کی تدبیرون کا اعلان کیا جاتا ہے، فراہمی غذا کی مستقل وزارتین اور محکمے قائم ہین، ہر دن قومی و بین الاقوامی کانفرنسین منعقد ہوتی رہتی ہین، ساری حکومتون نے راشن بندی کر رکھی ہے، یعنی ناپ تول کر دو وقت کا بُرا بھلا غلہ حوالہ کر دیا جاتا ہے جو اکثر صورتون مین انسان کی معمولی مقدار غذا کا نصف سے زیادہ نہین ہوتا ہے، اس پر بھی وقتاً فوقتاً تخفیف وتقلیل کی دھمکی اور اطلاع شائع ہوتی رہتی ہے، کہ بس ایک مہینہ یا دو مہینہ کا غلہ رہ گیا ہے، اور آیندہ فلان مہینہ بڑا نازک آنے والا ہے، امریکہ جو دنیا کا سب سے دولتمند و خوشحال ملک ہے ابھی (۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے) پانیر مین وہان کے غذا و زراعت کے ڈائرکٹر جنرل کا بیان چھپا ہے، کہ

"اس موسم سرما مین ایسے شدید قحط سے دوچار ہونا ہے، جو دنیا مین کبھی نہ پڑا ہوگا، اور جس کا مقابلہ ہر طرح کی معاشی تدابیر اور قومی و بین الاقوامی اجتماعی جد وجہد ہی سے ممکن ہوگا"

انسان نے جس طرح اپنے خالق سے منہ موڑا ہے، اس کی سمجھ مین تو آنا اب مشکل ہے لیکن راقم ہذا کو یہ روز افزون و عالمگیر قحط نہین، بلکہ عالمگیر عذاب نظر آ رہا ہے، اور قرآن مجید مین جا بجا جو رزق و رزاقیت کا ذمہ بالکلیہ حق تعالیٰ نے خود لے کر صرف یہ کہ انسان کو عبدیت و بندگی کے لئے فارغ و بے فکر فرما جاتا ہے، بلکہ غور کیجئے تو اس دنیا مین اس کی سب سے جامع الصفات صفت ربوبیت کا سب سے بڑا اور نمایان مظہر رزاقیت ہی ہے، اور انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر بالکلیہ اپنے کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر نہ صرف اللہ تعالیٰ کی اس صفت خاصہ مین اپنے کو شریک و سہیم ٹھہرا رہا ہے، بلکہ در اصل خدا کی خدائی چھین کر خود خدا بن بیٹھا ہے، اس کے بعد اگر اسی کا قہر و عذاب اسی قبض رزق کی راہ سے ظاہر ہو، تو عین سنۃ اللہ ہے،

اپنا تجربہ تو اپنے اکثر عزیزون دوستون کے انفرادی واقعات تک مین یہی ہے اور جو بھی ذرا غور کرے گا اسکو تجربہ ہوگا، کہ معاش و رزق کا معاملہ کچھ من حیث لا یحتسب ہی ظاہر ہوتا ہے،

اور مدبر کے تیر بالعموم اپنے نشانہ سے ہٹ کر ہی گرتے ہیں، بار ہا دیکھا کہ انگریزی تعلیم میں بھی طالبعلمی میں جن کو بڑا ہونہار خیال کیا جاتا تھا، وہ کچھ نہ ہوئے، اور جن کو انھوں نے سمجھا گیا، وہ ان ہونہاروں سے میدان معاش میں کہیں آگے نکل گئے، یہی تجارت وغیرہ ہر چیز میں مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، کہ بارہا جس شخص اور جس چیز کی تجارت کے چلنے کے ظاہری اسباب زیادہ ہوتے ہیں، وہ رہ جاتی ہے، اور جس کے ظاہری امکانات کم ہوتے ہیں، وہ چل جاتی ہے، باقی یوں نکات بعد الوقوع تو ہر واقعہ میں نکال لئے جا سکتے ہیں (باقی)

حیاتِ شبلی

حصہ اوّل

مولانا سید سلیمان ندوی

یہ نو سو صفحون کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری ہی نہیں بلکہ درحقیقت مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی ادبی، سیاسی تعلیمی مذہبی اور قومی تحریکات و واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اس سلسلہ میں بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہیں، جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لئے جاننا ضروری تھا اور شروع میں ایک دیباچہ ہے، جس میں جدید علم کلام کی نوعیت اس کی حیثیت اور اس سے متعلق مولانا شبلی مرحوم اور ان کے متقدمین، او معاصر علماء کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، اس کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے، جس میں دیار مشرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے، جو بڑی دیدہ ریزی سے یکجا ہوئی ہے، ضمناً ہر عہد کے مشہور اکابر علماء کے حالات بھی آگئے ہیں، اس کے علاوہ دار المصنفین ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اور شبلی ڈگری کالج کی عمارتوں کے ہاف ٹون بلاک بھی شامل ہیں،

کاغذ، کتابت وطباعت اعلیٰ، ضخامت ۹۲۰ صفحے،

قیمت غیر مجلد ۱۰؎ر، مجلد ۱۲؎ر، علاوہ محصولڈاک۔

"منیجر"

اردو زبان کا غیر اسلامی مذہبی اور اخلاقی ادب

از

جناب مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

(۲)

مذہبی کتابوں سے ہندو عورتوں کی تقریروں کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی ہندو اہلِ قلم نے فارسی عربی کے ان الفاظ جو اردو میں قبولِ عام ہو چکے تھے، بے تکلف استعمال کئے ہیں، راماین کا وہ سین بہت مشہور ہے جس میں برج نراین چکبست نے رام چندر جی کا اپنی ماں سے رخصت ہونا دکھایا ہے، اس کے چند بند جن میں ماں کی گفتگو ہے، ملاحظہ ہوں،

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں   میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں   لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بَن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سفید   اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی اُمید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید   سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید
لکھی ہے کیا حیاتِ ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر مین اگر جنم ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھو شوکت وحشم تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت کا کم

مین خوش ہون پھونک دے کوئی اس تخت تاج کو
تم ہی نہین تو آگ لگاؤن گی راج کو

کن کن ریاضتون سے گذاری ہین ماہ و سال دیکھی تمھاری شکل جب اے میری نونہال
لائی دلھن بیاہ کے شادی ہوئی کمال آفت یہ آئی مجھ پہ ہوے جب سفید بال

چھٹتی ہون اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا مین نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئین گے نظر گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر یہ جاے صبر تھی کہ دعا مین نہین اثر

لیکن یہان تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اجڑ گیا

سرزد ہوے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ منجدھار مین جو یون مری کشتی ہوئی تباہ
آئی نظر نہین کوئی امن و امان کی راہ اب یان سے کوچ ہو تو عدم مین ملے پناہ

تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے"

رام چندر جی سے مشکل بن باس مین ساتھ چلنے کی اجازت حاصل کر کے سیتا جی اپنی خوشدامن رانی کوسلیا سے رخصت ہونے جاتی ہین، اور وہ اُن کو عزمِ سفر سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہین، اس منظر کو منشی شنکر دیال فرحت نے اپنے منظوم ترجمہ راماین مین بڑی خوبی سے دکھایا ہے، (مطبوعہ نولکشور ۱۸۹۶ء)

یہان پیچ پیچیدہ گیسوے سخن ہے | جبین صفحہ پر شاید شکن ہے
ورق ہے صورت مسطر کشیدہ | دوات آسا قلم ہے آبدیدہ
بیان رخصت و عزم سفر پر | حروف تازہ خاک افشان ہیں سر پر
جناب جانکی نے جب سُنا حال | تو جوش گریہ سے آنکھیں ہوئین لال
ہوئی آسایش خاطر فراموش | اڑا اوج ہوا پر طائر ہوش
نہ تھا ضبط شکیبائی کا یارا | ہوئی شوہر کی فرقت ناگوارا
حیا نے آکے دامن کو لیا تھام | مگر جوش محبت نے کیا کام
خیال آیا کہ ہمراہی مین رہئے | صبا بن کر ہوا خواہی مین رہئے
پئے پا بوسی خوشدامن خاص | ہوئین حاضر براہ لطف و اخلاص
کہا مجھ کو بھی ارشاد سفر ہو | کہ تسکین دل و جان و جگر ہو
سُنی جس دم یہ خوشدامن نے گفتار | کئے دامن کے پرزے جیب کے تار
کہا رو کر کہ اے سرمایۂ عیش | نباہے نازکی پیرایۂ عیش
تمھین سے قالب خاکی مین ہے جان | تمھین سے مشکل لاحل ہے آسان
تمھین ہو رونق کاشانۂ دل | تمھین نور چراغ خانۂ دل
مکان با دشاہی مین کرو عیش | رہو دل مین مثال مردم عین
متاع ننگ و ناموس شہنشاہ | کرو غارت نہ بن مین جا کے ہمراہ
حقیقت مین سفر شکل سقر ہے | سفر مین اصل بیم و ضرر ہے
کہاں پائے حنائی رشک گلزار | کہاں نشتر صفت نوک سر خار
کہاں یہ چہرہ پر نور کا نور | کہاں وہ ظلمت شبہائے دیجور

رگِ گل پائے نازک میں جو گڑ جائے　　　جبین پر چین شکن ابرو پہ پڑ جائے" (صفحہ ۲۱)

آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کی مشہور کتاب "رگ وید آدی بھاشیہ بھومکا" یعنی رگوید کی تفسیر کا اردو ترجمہ منشی رام جگیاسو نے کیا ہے، جس کی پہلی جلد ۱۹۳۸ء میں مطبع ست دھرم پرچارک جالندھر سے شائع ہوئی تھی، اس کے بعض حصے سوال و جواب کے پیرایہ میں ہیں، ایک مقام کا اقتباس حسب ذیل ہے، توسین کی عبارتیں خود مترجم کی ہیں :-

"وید کے ظاہر کرنے میں پرمیشور کی کیا غرض تھی،

سوال :- یہ فرمائیے کہ وید کے پیدا کرنے میں ایشور کی کیا غرض تھی،

جواب : ویدوں کے نہ پیدا کرنے میں اس کی (پرمیشور کی) کیا غرض (ہو سکتی تھی)، اگر تم یہ کہو کہ اس کا جواب تم نہیں جان سکتے تو بالکل ٹھیک ہے، اب ویدوں کے ظہور کی جو غرض ہے وہ سنئے :-

سوال : ایشور میں کیا انت ودیا (لا محدود علم) ہے یا نہیں ؟

جواب : ہے،

سوال : اس کی وہ ودیا کس مطلب کے لئے ہے ؟

جواب : اپنے ہی مطلب کے لئے (جس سے کہ جہان کے پیدا کرنے اور قائم رکھنے کا کام ہوتا ہے،)

سوال : اچھا یہ بتلائیے کہ آیا ایشور پراوپکار کرتا ہے یا نہیں،

جواب : (پراوپکار) کرتا ہے، پھر اس سے کیا مطلب،

(نتیجہ) اس سے یہ مطلب ہے کہ علم اپنی اور دوسروں کی مطلب برآری کے لئے ہوتا ہے کیونکہ علم کا یہی وصف ہے، اگر ہم لوگوں کے لئے پرمیشور ودیا (علم) کا اپدیش نہ کرے تو

ودیا کے دونوں وصفوں میں سے ایک وصف (یعنی پرُ دپکار) بے معنی ہو جائے گا۔ اس لئے پرمیشور نے اپنی ودیا وید کے اپدیش سے یہ مطلب (یعنی پرُ دپکار) سدھ کیا ہے۔ پرمیشور باپ کی طرح ہم لوگوں پر بڑی عنایت رکھتا ہے۔ جس طرح پر کہ باپ اپنی اولاد پر ہمیشہ مہربان رہتا ہے، اسی طرح پر پرمیشور نے بھی بے غایت مہربانی سے سب انسانوں کے لئے وید کا اُپدیش کیا ہے، اگر پرمیشور ایسا نہ کرتا تو انسان دھرم، ارتھ، کام، اور موکش کے بغیر پرم آنند (یعنی راحت حقیقی) سے بھی محروم رہتا ......" (ص ۲۴، ۲۵)

پنڈت جنیشور پرشاد مائل دہلوی کی کتاب حسن اوّل کا ذکر اوپر آچکا ہے، موصوف جین مذہب کے پیرو معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ یہ کتاب سنٹرل جین پبلشنگ ہاوس، آرہ سے شائع ہوئی ہے، اس میں جین، بودھ اور ہندو مذہب کے فلسفہ اور علم اخلاق کا نچوڑ ہے، اس کے پہلے باب کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو "وقت" کے زیر عنوان لکھا ہے، یہ عبارت اُس شخص کے قلم کی ہے، جو مسلمان نہیں ہے لیکن اُردو کو اپنی "مادری زبان" کہتا ہے، اور اُس کی ترقی اور بہبودی کی کوشش کرنا ایک سعادتمند اولاد کی طرح "اپنا فرض" سمجھتا ہے :-

"غرض اس تغیرات کے سمندر میں کیا جانذار کیا بیجان ایک صورت پر کسی کو بھی قرار نہیں، شکل وضع اور حال و خیال ایک ایک لمحے اولتے بدلتے رہتے ہیں، وقت ایک پرندہ ہے کہ برابر اڑا چلا جاتا ہے، اور اس سرعت سے اُڑتا ہے کہ نگاہیں دیکھ نہیں سکتیں، کان اس کے پرون کی سرسراہٹ سن نہیں سکتے ہاں اس کی گردن میں ایک گھنٹی بندھی ہے جس کی آواز سے اپنی رفتار کا امتیاز اہلِ دنیا کو کراتا جاتا ہے، اور سامانِ دنیا کو نئے سے پرانا اور پرانے سے نیا بناتا جاتا ہے، اس کے پنجوں میں ان گنت دھاگے الجھے ہوئے ہیں، یہ جاندارون کے رشتہ حیات ہیں، جو پرواز کے ساتھ کھنچے چلے جاتے ہیں، اس میں جس کی صدا آجاتی ہے وہ

ٹوٹ جاتا ہے، اسی کو موت کہتے ہین جس پر کسی کو اختیار نہین ہے ؎

رو مین ہے رخشِ عمر کہان دیکھیے تھمے ‏ ‏ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب مین

یہ بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے، اور لفظِ انتقال کے معنی نقل وحرکت کرنا ہے، حاصل کلام یہ کہ دنیا ایک پر شور سمندر ہے جس مین ہوا کے زور سے کہین مینڈھا اچھل رہا ہے، کہین بھنور پڑ رہا ہے کہین پانی پہاڑون سے ٹکراتا ہے، اور کہین یک رُخا بہا چلا جاتا ہے، کسی جگہ فطرتی دلچسپیون نے منظر کو حد سے زیادہ دل آویز بنا دیا ہے، اور کسی جگہ ناگہانی حادثون نے وہ ڈراونا اور ہولناک سین دکھایا ہے، کہ جی دہلا جاتا ہے، دم بھر مین قطرے سے بھاپ، بھاپ سے بادل، بادل سے پانی، اور پانی سے دریا بن جاتا ہے، کھیتیان سیراب ہوتی ہین چمن شاداب ہوتے ہین، سبزے لہکتے ہین، پھول کھلتے ہین، جو نگاہون کو مسرور اور دلون کو تازہ کر دیتے ہین یہی نیچر کی دلچسپیان ہین، جو ایک آن واحد مین اپنے حسن کے جلوے دکھا کر اسی عالم مین محو ہو جاتی ہین، یعنی چشم زدن مین اُن کی ہیئت بدل جاتی ہے" (ص ۶-۷)

مذہبی اخلاق پر جو کتابین ہندو وُدوان نے لکھی ہین، اُن مین تو سنسکرت کے الفاظ بہت ہی کم ملتے ہین، اور بعض تو بالکل اردوے معلی کی زبان مین لکھی گئی ہین، مثلاً "اخلاق برجباشی" جو راے برجباشی لعل نے ۱۸۷۵ء مین لکھی تھی، اور مطبع رفاہ عام، سیالکوٹ مین چھپی تھی، اس کتاب کو مصنف نے یون شروع کیا ہے

"هوالغنی

شکر اور احسان ہے اس بادشاہ کا جس کا حکم کل زمین و آسمان اور جہان و جہانیان پر ظاہر ہے اور جس کی سلطنت کی حد و انتہا کا بیان زبان انسان اور قلم و زبان سے باہر ہے، آبادی باین تمادی کہ تمام خلائق جن و ملائک اور انسان و حیوان کا شمار نہین، اور جانوران درند و گزند اور چرند و پرند کا حصار نہین، انتظام باین خوبی و انصرام کہ بحر و بر اور کوہ و شجر سب اپنی

اپنی جگہ برقرار ہین، اور شمس و قمر اور کواکب و اختر سب زیر و زبر روشنی کے آثار ہین، عدل و انصاف نہایت صاف کہ گوناگون صورت اور سیرت آدمیون کے دیدار اور کردار سے درجہ بدرجہ دکھلائی دیتی ہین، اور بوقلمون شکل و شمائل جانورون کی گفتار اور رفتار سے علٰحدہ علٰحدہ معلوم ہوتی ہین، قدرت بایں ندرت کہ کوئی حاکم کوئی محکوم، کوئی خادم، کوئی مخدوم، کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ ہے، اور بعض پاک بعض مذموم بعض فیاض بعض شوم بعض پست ہمت اور بعض بالا ہمت" (ص)

تیسرے باب مین والدین کی خدمت گذاری کا حق بیان کرتے ہین :-

چونکہ ماں باپ کے فرائض تمام عمر اُن کی خدمت کرنے سے بھی ادا نہیں ہو سکتے، لہٰذا اولاً پر فرض ہے، کہ ماں باپ کی تمام عمر خدمت کیا کرے، اور یہی عمدہ عبادت سمجھا کرے، کیونکہ ماں باپ کی خدمت جملہ عبادات سے افضل تر عبادت ہے، اور ان کی رضا جوئی سے سعادت اور خدمت گذاری سے جنت ہے، مناسب ہے کہ والدین کو اپنی خوش گفتار اور نیک کردار سے خوش کرو، اور مال و متاع وزر و نقد جو کچھ اُن کو ضرورت ہو، بے طلب موجود اور مہیا کردو، اور سچے دل سے خدمت مین مستعد رہو،......" (ص ۲۵)

"اخلاقِ ہندی" کے نام سے ایک مثنوی منشی کنھیا لال ہندی تخلص نے لکھی تھی، جو ۱۸۷۶ء مین لاہور مین چھپی، اس کی زبان کی روانی و سلاست قابلِ داد ہے، شروع مین حمد کے اکتیس شعر ہین، پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر حمد شروع کرتے ہین، نمونہ یہ ہے :-

بنامِ خداوند ملکِ جہان خبر گیر احوال خرد و کلان
بنا نور سے جس کے شام و پگاہ ہوا جلوہ گر جلوۂ مہر و ماہ
اُسی سے ہوا نیستی کا وجود بنا بود سے اس کے ہستی کا بود
اُسی سے ہے ارض و سما کا ظہور اسی سے ہے صبح و مسا کا ظہور

اکیلا ہے وہ وحدہٗ لاشریک نہیں دوسرا کوئی جس کا شریک
وہ خالق کہ ہے جس کی خلقت تمام وہ حاکم کہ محکوم تیں خاص و عام
وہ ستار جو ساتر عیب ہے وہ علام جو عالم الغیب ہے
وہ فتاح مشکل کشائے جہان وہ مشکل کشا حامیِ بندگان
یہ وحدت کہ ثانی نہیں دوسرا یہ کثرت کہ ہے سب میں جلوہ نما
میں کیونکر لکھوں وصف ایزد تعال میں مخلوق وہ خالق لایزال
میں محتاج وہ شاہِ شاہنشہان میں عاجز وہ پروردگارِ جہان
وہ خورشید پر نور اوجِ کمال میں ہوں زار و ناقص بشکلِ ہلال
میں ہوں بندہ زار و کم اقتدار سراپا خطا ہندی خاکسار (ص ۳)

اس کے بعد رام چندر جی اور سری کرشن جی کی مدح ہے، پھر نعتیہ اشعار اس طرح لکھے ہیں:-

"در نعت سرور کائنات خلاصۂ موجودات جناب محمد علیہ السلام"

شفیع جہان رہبر خاص و عام جنابِ محمد علیہ السلام
جنابِ محمد رسولِ امین عیان جس سے ہے علم عین الیقین
جنابِ محمد رسولِ خدا باطوار نیکو قبولِ خدا
محمد رحیم و محمد کریم محمد علیم و محمد سلیم
نبی الوری شاہِ شاہنشہان امین الہدیٰ رہبرِ گمرہان
ہوئی پست فرمان جس کی زمین نگوں ہے اطاعت میں چرخِ برین
سراپا عرب جن کے فرمان گذار عجم سر بسر بندۂ خاکسار

.... (ص ۸)

تیرھوین باب مین تواضع کا بیان ہے :-

تواضع کرے جو کوئی آدمی ہے انسان مین انسان ہی آدمی

تواضع سے عزت ہے تکریم ہے تواضع سے حرمت ہے تکریم ہے

تواضع سے ملک دل آباد ہو تواضع سے اندوہگیں شاد ہو

تواضع سے بدخواہ ہو نیک خواہ تواضع سے گمراہ ہو اہل راہ

تواضع سے ہو سرد نار غضب فرو اس سے ہووے شرار غضب

تواضع سے حاصل ہے حق کی رضا تواضع سے ہو دور رنج و بلا

(ص ۱۰۵) ....

سکھون نے بھی اپنی مذہبی کتابین جو اُردو مین ترجمہ یا تالیف کی ہین، اُن کی زبان بھی رہی ہے، جسے آج صرف مسلمانون کی زبان کہا جاتا ہے، سکھ مذہب کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب ہے، اس کا پورا ترجمہ تو اردو مین ابتک نہین ہوا ہے (غالباً ضخامت کی دشواری سے) لیکن اس کے اہم حصون کے متعدد ترجمے شائع ہو چکے ہین، منجملہ اُن کے "سری جپ جی صاحب" ہے، مجھے لاہور مین گرنتھ صاحب کا ایک قدیم ترجمہ ملا جو گیان پریس گوجرانوالہ کا مطبوعہ ہے[۱] اور جس مین کتاب کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ بڑی تقطیع کے (۱۴۴) صفحات پر چھپا ہے، ممکن ہے اس سلسلہ کی دوسری جلدین بھی طبع ہوئی ہون، مگر وہ دستیاب نہین ہوئین، اس مین جپ جی کا جو گرو نانک کی تصنیف ہے، ترجمہ اس طرح کیا ہے :-

"سری آدگرنتھ صاحب سری جپ جی صاحب

ایک اونکار ست نام کرتا رپورکھ

نربھو نربیر اکال مورت اجونی سے بھن

گور پرشاد

۱- واحد مطلق یا مظہر صفات ثلاثہ یا محض حق یا فاعل کل وہی ذات پاک ہے، جو خوف اور عداوت اور موت اور حدوث سے پاک اور جنم اور مرن یعنی تناسخ اور آواگون سے آزاد اور مظہر رحمت مرشد ہی ہے،

جپ - آدیح جوگ آدیح ہے بھی

سچ نانک ہوسی بھی پہ سچ

ورد کرکہ ازل مین بھی حق تھا، اور عالم سفلی سے پہلے بھی حق تھا، اور اب بھی وہی حق ہے، اور اے نانک آیندہ بھی وہی حق ہوگا،

پوڑی اوّل

۱- سوچے سوچ نہ ہوئے جے سوچے لکھ بار

- - - - - - - - - - - - - - - -

۲- حکم رضا مین چلنا نانک لکھیا نال

(۱) خواہ کتنی ہی سوچ کرے تو بھی آپ نہین سوچ سکتا، جو سوچنے کا حق ہے، خواہ لاکھون بار سوچا کرے،

(۲) خواہ کیسی ہی خاموشی اختیار کرے تو بھی آپ چپ نہین ہوسکتا، خواہ کیسی ہی خاموشی کی حالت پیدا کرے،

(۳) اگر بھوکا ہو اور کوشش سے بے شمار اغذیہ و اطعمہ کو جمع کرے، تو بھی اپنی بھوک کو رفع نہیں کرسکتا، اور دوسرے معنی اس کے یہ بھی ہوسکتے ہین کہ کوئی اپنی احتیاج کو آپ رفع نہین کرسکتا گو بڑے بڑے سامان حاجت روائی کے جمع کرے،

(۴) ہزاروں دانائیان ہون اور لاکھون علوم کے ماہر ہون تو بھی کوئی دانائی کارگر نہین ہوسکتی، مراد یہ کہ کوئی حکمت قدرت کا مقابلہ نہین کرسکتی،

(۵) اگر کوئی پوچھے کہ عارف راست باز کیونکر ہون اور جہل کا ذبہ کی قید کیونکر ٹوٹے،

(۶) تو اس کا جواب سری نانک جی دیتے ہین، کہ رضا و تسلیم کو اختیار کرے اور ملائم و غیر ملائم کو حکم الٰہی سے جانے،

به درد و صاف ترا حکم نیست دم درکش — که هر چه ساقی ما ریخت عین الطاف است

رضا بداده بده وز جبین گره بگشا — که بر من و تو در اختیار نه کشا داست (ص)

گرنتھ صاحب کے ایک اور مشہور حصہ سکھ منی صاحب کا ترجمہ[۱]

"سرور روحانی" کے نام سے بھائی دیا رام عاکف نے کیا ہے، جو "پنج گرنتھی" اور گرو نانک کی مشہور ضخیم سوانحعمری "جنم ساکھی بھائی بالا والی" کے بھی مترجم ہین، اس کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے،

"سلوک اول - ایک اونکار ست گور پرشاد

ایک ہی اونکار ہے جو مرشد حقیقی کی رہنمائی اور نظر عنایت سے حاصل ہو سکتا ہے، جو لاتعین سے تعینات مین آیا، اور نرگن سے سرگن ہوا، اور عقل کل اور ہرن گربھ پرجاپت وغیرہ اسی کے موسوم ہوا، وہ اونکار ہے، برہما، وشنو، شیو، ست، رج، تم، شہوت، غضب، تمیز، جسم کل، نفس کل، عقل کل، ناسوت، ملکوت، جبروت، جاگرت، سپن، سکھوپت، دوزخ، بہشت، اعراف، مرت لوک، تر لوک، سرگ لوک، غرض کہ جتنی اشکال گوناگون نمایان اور ظاہر ہین اور جو حواس خمسۂ ظاہری سے محسوس ہوتا اور روپ رس گندھ شبد سپرش مین آتا ہے، سب اونکار ہے، سب کا مبدا اونکار ہے، سب اونکار سے پیدا ہو کر اس مین رہتے، اور اس مین محو ہو جاتے ہین، اونکار اصل مین اوم کا تھا، اوم کا تلفظ سنسکرت سے متعلق ہے، گو بظاہر اس مین تین حرف ہین، الف واو میم، لیکن

---

[۱] مطبوعہ گیان پریس گوجرانولہ، طباعت کا سنہ اس پر بھی درج نہین ہے، لیکن دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ ۱۹۱۳ء مین کیا گیا تھا،

ایک نون غُنہ بھی ہے، جو باہمہ اور بے ہمہ ہے، اور اسکا نام سنسکرت مین اردہ ماترا ہے، یہ نون غنہ وہی ہے جس کو نقطہ، مفروضہ اور جزِ لایتجزیٰ کہتے ہین، اور اس کی کچھ مقدار نہین، مگر سب مقدارین اسی سے پیدا ہوئی ہین، جتنی مقدارین اور مفروضات ہین، سب کو فنا لازم ہے، مگر وہ مفروض ذہنی جو صورت و شکل سے منزہ اور نام و ذات سے پاک ہے لازوال اور باقی ہے، جملہ اشکال محسوسات کو اونکار یعنی ایزد لایزال سے وہ نسبت ہے جو ادم یعنی آکار اور کار مکار کو نون غنہ سے ہے،" (ص ۱۹-۲۰)

مسیحی مشنریون نے ہندوستان آکر اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے جس زبان کو وسیلہ بنایا وہ یہی مشترکہ زبان تھی، جس کو پہلے ہندوستانی اور اب اُردو کہتے ہین، اُن کی اُردو مطبوعات کی کثرت سے اس زبان کے پڑھنے والون کی کثرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، انڈیا آفس کی فہرست کتب اُردو مین جو ۱۹۰۰ء مین چھپی تھی، مسیحی مطبوعات کی تعداد (۴۰۶) ہے، اور پنجاب ٹیکسٹ بک سوسائٹی لاہور کی فہرست مین جو ۱۹۲۶ء مین مرتب ہوئی ہے، سوسائٹی اور بعض دیگر مسیحی ادارون کی کتابون کا شمار (۵۱۵) ہے، اس مین زیادہ تر خود سوسائٹی کی کتابین ہین، ہندوستان کی دوسری زبانون مین عیسائیون نے بہت تھوڑی کتابین شائع کی ہین، اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اُردو کو ملک کے بڑے حصہ کی زبان سمجھتے تھے، اور اسی کے ذریعہ یہان کے باشندون کی اکثریت کو اپنا پیغام پہنچا سکتے تھے،

اس مقالہ کی ترتیب کے سلسلہ مین مجھے عیسائی مذہب کی سوا سو سے زیادہ کتابین دیکھنے کا موقع ملا، زبان کے لحاظ سے یہ سب نہایت سلیس اور صاف عبارت مین لکھی گئی ہین، ہندو، جین، اور سکھ مذہب کی کتابون مین تو مذہبی مصطلحات کے لئے سنسکرت کے الفاظ اکثر ناگزیر طور پر استعمال کئے گئے ہین، گو بعض مؤلفین اور مترجمین نے اُن کے ترجمے بھی عربی یا فارسی اصطلاحات مین ساتھ ساتھ دیدئے ہین لیکن عیسائیون کی اردو کتابون مین مذہبی مصطلحات کے لئے بھی عربی یا فارسی کے علاوہ مجھے کسی دوسری زبان کا لفظ نہین ملا، معلوم نہین گارسان دتاسی نے کس بنا پر لکھا ہے کہ مسیحی تصانیف مین انگریزی کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے جاتے ہین، وہ اپنے چوتھے دن

خطبہ میں لکھتا ہے:-

"اہلِ ہند نے اپنے ہاں انگریزی زبان کے بہت سے لفظ رائج کرئے ہیں بعض اوقات تو اُن کی زبان میں لفظ موجود ہوتا ہے، جب بھی وہ ہم معنی انگریزی لفظ کو ترجیح دیتے ہیں،........ ا ہہت سارے انگریزی الفاظ پیش کئے جا سکتے ہیں جنھیں اہلِ ہند خود اپنے لفظوں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اور بہتر سمجھتے ہیں، چنانچہ مرزاپور کا اخبار "خیر خواہ ہند" اس قسم کی ہندوستانی میں ہوتا ہے جس میں انگریزی الفاظ کثرت سے کھپائے جاتے ہیں، مشنریوں کی بیشتر تصانیف جو مسیحی مذہب کی نشر و اشاعت کے لئے شائع ہوتی ہیں، اسی طرز کی زبان میں ہوتی ہیں"[۱]

اُردو میں عیسائی مذہب کی سب سے قدیم کتاب جو مجھے ملی، وہ "صلوٰۃ الجماعت" کی کتاب ہے، یہ چرچ مشن پریس، کلکتہ میں سنہ ۱۸۴۸ء میں چھپی تھی، قدیم نستعلیق ٹائپ میں ہے، جیسا کہ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کا ہوتا تھا، اس میں مختلف دنوں اور مختلف موقعوں اور وقتوں کی دعائیں تفصیل کے ساتھ درج ہیں، اس کے علاوہ کلیسا کے رسوم و دستور کی تفصیل بھی دی ہے، شروع کا ایک اقتباس حسبِ ذیل ہے:-

"نمازِ صبح کے احکام

برس کے ہر دن

"صبح کی نماز کے آغاز میں خادمِ دین بلند آواز سے کتاب کی ان آیتوں میں سے ایک یا کئی آیت پڑھے، پس پیچھے اُس عبارت کو جو اس کے بعد مندرج ہے۔

جب بد آدمی اپنی بدی سے جو کہ اُس نے کی ہو، باز آوے اور اعمال فرض و مستحب کو بجا لائے تب وہ اپنی جان جیتا بچائے گا، (حزقیال - ۱۸ - ۲۷)

میں اپنے گناہوں کا مقر ہوں، اور میرا گناہ ہمیشہ میرے سامنے ہے، (مزمور ۵۱ - ۳)

میرے گناہ سے چشم پوشی کر اور میری ساری بدیوں کو محو کر، (آیت - ۹)

[۱] لفظ ... زبانی ... انجمن ... ص ...

"خدا کی قربانیاں آشفتہ حالی ہے، اے خدا تو دل شکستہ اور تائب کو حقیر نہ جانے گا"، (۵۱-آیت)

اپنے دل کو چاک کر اور نہ اپنے گریبان کو اور اپنے خداوند کی طرف متوجہ ہو، کیونکہ وہ رؤف اور حلیم اور رحیم ہے، اور رنج پہنچانے سے ملول ہوتا ہے، (یوئیل ۲-۱۳)

رحمتیں اور آمرزشیں ہمارے خداوند خدا ہی کی ہیں، گو کہ ہم اُس سے باغی ہوئے ہیں، اور نہ ہم نے اپنے خداوند خدا کے فرمان کو مانا، اور نہ ہم اُس کے شرائع پر جو کہ اُس نے ہمارے لئے دیا گئے ہیں، چلے ہیں، (دانیال ۹-۹-۱۰)

اے خداوند مؤدب کر مجھے نہ ساتھ عدل کے اور نہ از راہ خشم کے مبادا تو ہمیں معدوم کر ڈالے، (یرمیاہ ۱۰-۲۴)

توبہ کرو، کیونکہ آسمان کی سلطنت آن پہنچی، (متی ۳-۲)

میں اٹھ کر اپنے باپ کے پاس جاؤں گا، اور اُسے کہوں گا کہ اے باپ میں آسمان کا اور تیرا گنہگار ہوں اور اب میں اس قابل نہیں کہ تیرا بیٹا کہلاؤں" (لوقا ۱۵-۱۸-۱۹)

اے خداوند اپنے بندے سے محاسبہ ساتھ عدل کے نہ لے، کیونکہ تیرے حضور کوئی بشر بے گناہ نہیں ہو سکتا، (زبور ۱۴۳)

اگر ہم کہیں کہ ہم بے گناہ ہیں، تو ہم اپنے تئیں فریب دیتے ہیں، اور صداقت نہیں رکھتے، لیکن اگر ہم اپنے گناہوں کا اقرار کریں تو وہ اپنے صدق اور عدل سے ہمارے گناہوں کو معاف کرے گا، اور ہر نوع کی ناراستی سے پاک کرے گا" (۱-۸-۹)

اے پیارے بھائیو، کتاب کے کئی مقام سے ہمیں نصیحت ہے، کہ ہم اپنے بے شمار گناہوں اور بدیوں کا اعتراف اور اقرار کریں، اور ہم خدا ے تعالیٰ کے حضور جو ہمارا آسمانی باپ ہے ریا اور اخفا کے ساتھ درپیش نہ آئیں، بلکہ عجز و انکسار اور توبہ اور اطاعت دلی سے مقر ہوں تاکہ اس کی خوبی و رحمت غیر متناہی سے ہم عفو پائیں، اور اگرچہ ہم پر لازم ہے، کہ ہر وقت

بعجز و انکسار ہم خدا کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار کریں، مگر خصوصاً اس وقت زیادہ تر لازم ہے جب کہ ان بڑی نعمتوں کی شکرگزاری کے لئے جو کہ ہم نے اس کے ہاتھوں سے پائیں، اور اس کے لائق کی مدح کرنے کے لئے اور اس کے کلام اقدس کے سننے کے لئے اور ان چیزوں کے مانگنے کے لئے جو کہ ہمارے جسم و روح کے لئے مطلوب اور ضروری ہیں، ہم باہم اکٹھے ہوں، پس میں تم سب کی جو یہاں حاضر ہو منتی اور سماجت کرتا ہوں کہ میرے ساتھ صدق دل اور عجز کی آواز سے آسمانی فضل کے تخت کے حضور میرے پیچھے کہو،

اعتراف عام،

ساری جماعت جاثیاً خادم دین کے پیچھے پیچھے کہے،

"اے قادر مطلق اور رحیم باپ ہم مثل گم شدہ بھیڑ کے تیری راہ سے بہکے اور بھٹکے ہیں، اور ہم نے دلوں کی ہوا و ہوس کی طرف بہت ہی متوجہ ہوئے ہیں اور ہم تیری شرع مقدس کے مخالف ہوئے ہیں اور ہم ان چیزوں کو نہ بجا لائے جن کی ادا ہم پر فرض تھی اور ہم نے ان چیزوں کو کیا جن کا ذکر کرنا ہمیں مناسب تھا اور ہمارے پاس کچھ عافیت نہیں ہے، مگر تو اے خداوند ہم سے شکستہ حال گنہگاروں پر رحم کر، معاف رکھ انھیں اے خداوند جو اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں، اور پھر مقبول کر انھیں جو کہ توبہ کرتے ہیں، موافق اُس عہد و پیمان کے جو تو نے بوسیلہ ہمارے خداوند مسیح عیسیٰ کے انسان سے کیا ہے اور اے بڑے ہی رحیم باپ اس کے طفیل سے بخش کہ آئندے کو ہم پرہیزگاری اور نیکوکاری اور پاک دامنی کے ساتھ زندگی بسر کریں، تاکہ تیرے اسم اقدس کا جلال ظاہر ہو۔ آمین

گناہوں کا عفو قسیس کھڑا ہو کر پڑھے اور جماعت جاثی رہے" (ص ۱-۵)

انجیل اور توریت کے متعدد ترجمے دیکھنے میں آئے، ان میں سب سے قدیم ترجمہ جو میری نظر سے گذرا، وہ ۱۸۳۹ء کا ہے، اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے :-

"کتاب مقدس کا آخری حصہ یعنی خداوند یسوع مسیح کی انجیل جو متی، مارک، لوک، اور یوحنا سے لکھی گئی تھی، اور رسولون کے اعمال اور نصیحت اور نبوت کے خطوط، یونانی زبان سے اردو زبان مین ترجمہ کیا گیا، کلکتہ، انگریزی، اور امریکے کی دینی مجلس کی مدد سے باپتیست مشن چھاپا خانے مین چھاپا گیا، ۱۸۳۹ء یسوعی"

یہ ترجمہ ٹائپ مین چھپا ہے، اور (۸۲۲) صفحات پر مشتمل ہے، عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

"پھر وہ وہان سے اٹھ کر یردن کے پار یہودیہ کی سرحد مین آیا، اور جماعتین آس پاس پھر جمع ہوئین، اور وہ اپنے طور پر پھر انھین نصیحت کرنے لگا، اور فروسیون نے آس پاس آکے امتحان کی راہ سے اس سے پوچھا کیا عورت کو مرد کا چھوڑنا روا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ موسیٰ نے تمھین کیا حکم دیا، وے بولے، کہ موسیٰ نے طلاق نامہ لکھ کے طلاق دینے کی اجازت دی، تب یسوع نے جواب دیا، کہ اوس نے تمھاری سخت دلی کے سبب سے تمھارے لئے وہ بات لکھی، لیکن خلقت کی ابتدا سے تو خدا نے انھیں ایک نر اور ایک مادہ بنایا، اس سبب سے آدمی اپنے ماں باپ کو چھوڑ کے اپنی جورو سے ملا رہے گا، اور وے دونون ایک تن ہون گے، سو وے اب دو تن نہین، ایک تن ہین، اس لئے جسے خدا نے جوڑا کیا ہے، آدمی جدا نہ کرے، گھر مین اس کے شاگردون نے اس کے حق مین پھر اُس سے پوچھا، اُس نے انھین کہا، جو کوئی اپنی جورو کو چھوڑے، اور دوسری سے بیاہ کرے، تو اپنی جورو کے برخلاف زنا کرتا ہے، اور اگر جورو اپنے شوہر کو چھوڑ دے، اور دوسرے سے بیاہ کرے، تو وہ بھی زنا کرتی ہے"، (ص ۱۴۲)

اس کے بعد ۱۸۴۱ء کا بائبل پریس کلکتہ کا چھپا ہوا "ہمارے خداوند یسوع مسیح کا نیا وثیقہ" ہے، یہ بھی ٹائپ مین ہے، اور چھوٹی تقطیع کے (۵۵۳) صفحات پر مشتمل ہے، پھر اسی پریس سے "کتاب القدس" کی پہلی جلد ۱۸۴۲ء مین اور دوسری ۱۸۴۳ء مین ایشیاٹک پریس کلکتہ سے شائع ہوئی، پہلی جلد مین جس کے صفحات کی تعداد

(۱۰۱۲) ہے، پیدایش سے آستر تک کا ترجمہ ہے، اور دوسری جلد مین جو (۷۴۴) صفحات کی ہے، ایوب سے ملاکی تک کا، سرورق پر لکھا ہے " ترجمہ عبرانی زبان سے زبان ہندی مین"، مگر اس زبان ہندی کا نمونہ یہ ہے:

" ابتدا مین خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، اور زمین ویران اور سنسان تھی، اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا، اور خدا کی روح پانی پر جنبش کرتی تھی، اور خدا نے کہا کہ اُجالا ہو اور اُجالا ہو گیا، اور خدا نے اُجالے کو دیکھا کہ اچھا ہے، اور خدا نے اُجالے کو اندھیرے سے جدا کیا، اور خدا نے اجالے کو دن کہا اور اندھیرے کو رات کہا، سو شام اور صبح پہلا دن ہوا، اور خدا نے کہا کہ فضا پانیون کے بیچ فاصل ہووے، اور پانیون کو پانیون سے جدا کرے، تب خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانیون کو فضا کے اوپر کے پانیون سے جدا کیا، اور ایسا ہی ہو گیا، اور خدا نے فضا کو آسمان کہا، سو شام اور صبح دوسرا دن ہوا، اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کے پانی ایک جگہ جمع ہو دین، کہ خشکی نظر آوے، اور ایسا ہی ہو گیا، اور خدا نے خشکی کو زمین کہا، اور جمع ہوئے پانیون کو سمندر کہا، اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے ...." (ص ۱)

انجیل کا ایک اور ترجمہ ۱۸۳۹ء مین باپٹسٹ مشن پریس کلکتہ مین چھپا تھا، اُس کے سرنامہ پر اُردو اور انگریزی مین یہ عبارتین درج ہین:-

" کتاب مقدس یعنی خداوند یسوع مسیح کی انجیل جو متھی، مارک، لوک، اور یوحنا سے لکھی گئی تھی، اور رسولون کے اعمال اردو زبان مین"

"The Four Gospels and The acts in Hindu-stani. Translated from The greek."

اس سے ظاہر ہے کہ مترجم اردو اور ہندوستانی کو ایک ہی زبان سمجھتا ہے، اب اس زبان کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

رسولون کے اعمال

پہلا باب

یسوع کا مریدون کو دکھائی دینا اور حکم دیکے آسمان پر جانا،

۱۔ اے تھیوفلس مین پہلی کتاب مین بیان کر چکا ان سب کامون اور نصیحتون کو جو یسوع کرتا رہا۔

۲۔ اس وقت تک کہ وہ روح قدس سے اپنے برگزیدہ رسولون کو حکم دیکے اوپر اٹھایا گیا:

۳۔ جن کے نزدیک اُس نے بعد اپنے مرنے کے اپنے تئین بہت سی دلیلون سے زندہ ثابت کیا کہ وہ چالیس دن تک انھین دکھائی دیکے خدا کی بادشاہت کی باتین کہتا رہا:

۴۔ اور انھین اکٹھا کرکے یہ حکم کیا، کہ یروشلم سے باہر نہ جاؤ، بلکہ جو وعدہ کہ باپ نے کیا جس کا ذکر تم مجھ سے سُن چکے ہو، اس کا انتظار کرو؛

۵۔ کہ یحیٰ نے تو پانی مین غوطہ دلایا، پر تم تھوڑے دنون کے بعد روح قدس مین غوطہ دلائے جاؤگے،" (ص ۳۱۹)

اس کے بعد مرزا پور آرفن پریس کا چھپا ہوا "مقدس کتاب کا احوال" ہے، جسے ڈاکٹر بارتھ (Dr. Barth) کے جرمن نسخہ سے ریورنڈ ٹی ہوئرنلے (J. Hoernle) نے اردو مین ترجمہ کیا ہے، مجھے اس کتاب کا تیسرا اڈیشن ملا جو ۱۸۵۹ء کا مطبوعہ ہے، پھر اسی پریس کا ۱۸۶۱ء کا چھپا ہوا ترجمہ مزامیر با شرح و تفسیر تالیف پادری یوسف آون (Owen) ہے، ان دونون کی عبارت کا طرز بھی وہی ہے، جو مندرجۂ بالا اقتباسات کا ہے،

عیسائیون کی مذہبی کتابون مین سے ان چند کتابون کے حوالے صرف اس وجہ سے دیئے گئے ہین، کہ یہ سب گارسان دتاسی کے اس خطبہ سے پہلے شائع ہو چکی تھین، جس مین اس نے یہ بیان کیا ہے کہ مشنریون کی بیشتر تصانیف مین جو مسیحی مذہب کی نشر و اشاعت کے لئے شائع ہوتی ہین، انگریزی الفاظ

ثرت سے استعمال کئے جاتے ہین، یہ خطبہ ۵ ر دسمبر ۱۸۶۳ء کا ہے، ۲ ر دسمبر ۱۸۶۱ء کے خطبہ مین وہ خود انجیل
، ایک دلپذیر اردو ترجمہ کا ذکر ان الفاظ مین کرتا ہے،

"جیسا کہ مین اپنے پچھلے خطبہ مین کہہ چکا ہون کہ برطانیہ اور ممالک غیر کی انجمن انجیل نے انجیل کا جو دلپذیر ترجمہ گزشتہ سال شائع کیا، اُسے یقیناً اردو زبان کی چوٹی کی کتابون مین سمجھنا چاہئے، یہ ترجمہ اس لئے اور بھی عمدہ اور معتبر ہے، کہ ایک مشہور ہندوستانی فاضل نے اس کام مین ہاتھ بٹایا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس ہندوستانی فاضل کو اپنی زبان اردو کے علاوہ انجیل مقدس پر پورا عبور حاصل تھا،"[1]

تعجب ہے کہ فاضل خطبہ نگار کی نظر سے انجیل کے مذکورۂ بالا ترجمے نہین گذرے، ان ترجمون مین مجھے انگریزی کا کوئی لفظ نہین ملا، چہ جائے کہ کثرت سے ان کا استعمال ۱۸۶۱ء کے بعد کے بھی متعدد ترجمے نجیل اور توریت کے مین نے دیکھے، نیز اُنیسوین صدی کے رُبع آخر اور بیسوین صدی کے موجودہ زمانہ لک کی ایک بڑی تعداد مسیحی مذہبی کتابون کی جو اردو مین شائع ہوئی ہین، مطالعہ مین آئی لیکن زبان سب کی شستہ اور فصیح ملی، اور انگریزی الفاظ کا استعمال بکثرت یا بقلت کہین نظر نہین آیا، ممکن ہے دتاسی کی مراد مشنریون کی "بیشتر تصانیف" سے "خیر خواہ ہند" کے قسم کے مذہبی اخبار اور رسالے رہے ہون، جو انگریزی آمیز اُردو لکھتے تھے،

اردو کے مسیحی مترجمین اور مولفین مین وہ بھی ہین، جو اصلاً ہندو تھے، اور بعد کو عیسائی ہو گئے تھے لیکن اُن کی زبان بھی وہی ہے جو ان پادریون کی کتابون مین ملتی ہے، جو مسلمان سے عیسائی ہوئے مثلاً "ہینا اسمتھ" کی کتاب کا ترجمہ "مسیحی کی خوش وقت زندگی" کے عنوان سے بابو یونس سنگھ نے کیا تھا جو مشن پریس الہ آباد مین ۱۸۸۵ء مین چھپا تھا، اس کے سترہوین باب "مین مسیح کے ساتھ یکتائی حاصل

---

[1] خطبات گارسان دتاسی ص ۳۱۳،

کرنے کا بیان" اس طرح لکھا ہے :۔

"ایماندارون کی روح کے ساتھ خدا کے جتنے سلوک ہین، اُن کا یہی مطلب ہی کہ اُن کو اپنے ساتھ ایک کرلے، کہ ہمارے خداوند کی وہ دعا پوری ہو، کہ وہ سب ایک ہون جیسا کہ تو اے باپ مجھ مین ہے، اور مین تجھ مین ہون، کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ایک ہون"...... "مین اُن مین اور تو مجھ مین تاکہ وہ ایک مین کامل ہون، اور تاکہ دنیا جانے کہ تو نے مجھے بھیجا ہے، اور انھین پیار کیا ہے، جیسا کہ تو نے مجھے پیار کیا ہے"

خدا نے دنیا کے پہلے ہی یہ جلالی ارادہ کیا کہ ایماندارون کی روحون کو اپنے ساتھ ایک کرلے، یہ وہ بھید ہے کہ جو زمانہ دراز اور پشت در پشت بنی آدم کی نظر سے چھپا ہوا تھا، اور مسیح کے مجسم ہونے کے باعث سے پورا ہو گیا، یہ کلام مین کھول دیا گیا ہے، اور اس کی سچائی کا یقین بہتیرے ایماندارون نے اپنے تجربہ سے حاصل کیا ہے.......!" (ص ۳۰۱)

منشی کدارناتھ منت نے ایک مثنوی بعنوان "ستم ہامان یعنی فریب شیطان" لکھی ہے، جو واشنگٹن پرنٹنگ پریس لاہور سے ۱۹۲۹ء مین شائع ہوئی ہے، اس کے ابتدائی اشعار حسب ذیل ہین :۔

بسم الاب والابن والروح

اگر طاقتِ آسمانی ملے — مجھے روح سے کامرانی ملے

تو لکھون مین تمجید تثلیث پاک — نمایان ہو توحید کا اشتراک

وہی ایک مین تین معبود ہے — وہی تین مین ایک مقصود ہے

ازل سے جو تھا ساتھ اس کے کلام — اُسی سے کیا خلق اُس نے تمام

بنے حکم سے اُس کے ارض و سما — مبارک خداوند سم کا خدا

ادا کب ہو حمد خدا اے جہان — ہے تقدیس مین اوس کی قاصر زبان

عجائب خدا کے غرائب ہیں کام — محبت سے معمور سب لا کلام
محبت سے آدم کو پیدا کیا — محبت سے سب کچھ ہویدا کیا
کیا بے گنہ خلق و پاکیزہ راست — محبت کی مینڈل سے بیش و کاست
مگر بو البشر نے اُسے کھو دیا — گناہ و ہلاکت کو سر پر لیا
تھا ذوردن پر اُس وقت غوغائے عدل — سزا چاہتا تھا تقاضائے عدل
محبت سے لیکن خدا نے وہین — کی تدبیر ظاہر عجائب ترین
کہ عورت جو مصدر ہوئی موت کی — وہین سے نمایان ہوئی زندگی
ہوا نسلِ زن سے مسیحا نمود — کیا نیست اُوس نے گنہ کا وجود
ہوا بطنِ مریم سے وہ آشکار — کہ جس نے کیا کوفتہ فرقِ مار
سہی ابنِ حق نے صلیبی قضا — کیا قرض یون عاصیون کا ادا
اسی طرح وقتاً فوقتاً مدام — رہائی کے دکھلائے اعجوبہ کام
اُنھین مین یہ اک قصّہ دلپسند — مصیبت زدون کو ہے تعلیم و پند
کہ کیونکر خداوند نے ناگہان — بچائی تمام اپنے لوگون کی جان
یہ ہامان و استر کا مذکور ہے — طرب بخش دلہائے رنجور ہے (ص ۳۲)

مندرجۂ بالا تصریحات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ غیر اسلامی مذاہب اور اُن کے اخلاق کے مقبول عام [...]ین اردو کو کتنا دخل رہا ہے، ہندوستان کے مختلف مذہبون اور فرقون کی مذہبی اور اخلاقی کتابون کے [...]سات بکثرت پیش کئے جاسکتے ہین لیکن چونکہ یہ مضمون محض ایک اجمالی خاکہ ہے اصل مقالہ کا اس لئے [...]رشالین بھی کافی ہون گی،

[...]ط یہ مضمون جیسا کہ پہلے نمبر مین لکھا گیا تھا، ڈاکٹر ٹیٹ کے مقالہ کا ٹکڑا نہین بلکہ اس کا خلاصہ ہے،

اشتراکی مابعد الطبیعاتی افکار

اسلام کی روشنی مین

از

جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی اے

(۲)

یہان تک ہم نے مارکسیت کے بنیادی فلسفہ کی توضیح کی ہے، اب ہمین یہ دیکھنا ہے، کہ یہ فلسفہ واقعاتِ عالم کے لحاظ سے کہان تک صحیح ہے، اور اسلام کے بنیادی تصورات وعقائد سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے، اس نقطۂ نظر سے جب ہم اسلام اور مارکسیت کا موازنہ کرتے ہین، تو ہمین ان نظامات کے درمیان مشابہت کے دو پہلو نظر آتے ہین، اوّلاً جیسا کہ ہم نے اس مضمون کے آغاز مین بتایا ہے، مارکسیت صرف کائنات کے واقعات ومظاہر کی توجیہ وتعبیر کا فلسفہ نہین ہے، بلکہ وہ اس کائنات مین جہان تک انسان سے اس کا تعلق ہے، تغیر اور تبدیلی پیدا کرنے کا ایک مخصوص طریقہ ہے، بعینہ یہی بات اسلام کے متعلق صحیح ہے، یعنی اسلام بھی محض ایک کائناتی نظریہ نہین ہے، جو واقعات عالم کی توجیہ وتشریح پر اکتفا کرتا ہو، بلکہ وہ انسان کی حیاتِ انفرادی اور حیاتِ اجتماعی کی تعمیر وتاسیس کا ایک عملی پروگرام ہے، مذہب اور فلسفہ میں بنیادی فرق بھی ہے، فلسفہ صرف کائنات کو سمجھنا چاہتا ہے، مذہب اسے بدلنا بھی چاہتا ہے، مارکسیون کو یہ بات کتنی ہی حیرت انگیز معلوم ہو مگر اس حقیقت سے انکار نہین کیا جا سکتا، کہ مذہب کا سارا دارومدار عمل پر ہے، اور عملی زندگی کو اگر اس کے دائرہ سے خارج کر دیا جائے تو پھر اس کے اندر کوئی معنویت باقی

نہیں رہتی ہے، یون تو ہر مذہب انسانی زندگی کو ایک مخصوص اخلاقی سانچہ مین ڈھالتا ہے، اور افراد انسانی سے مطالبہ کرتا ہے، کہ وہ اپنا اخلاقی رویہ تبدیل کرین لیکن اسلام اس بارے مین دیگر ادیان و مذاہب پر نمایان فوقیت رکھتا ہے، کیونکہ اُس نے کردار و عمل کی اس تبدیلی کو جس کا مطالبہ ہر مذہب مین موجود ہے انسان کی عائلی اور معاشرتی زندگی کے محدود دائرہ سے وسیع کرکے ساری انسانی زندگی پر پھیلا کر دیا، نیز اوس نے اخلاق اور نیک عمل کے اصولون، اور مذہبی اقدار و غایات کو انسان کی حیاتِ اجتماعی پر بھی پھیلا دیا، جس مین اس کی سیاسی اور معاشی زندگی بھی شامل ہے، اس کے مقابلہ مین دوسرے مذاہب نے نیکی اور حسن عمل کا صرف انفرادی اور معاشرتی تصور پیش کیا، اور اخلاقی اصولون کو زیادہ سے زیادہ سماجی اور عائلی زندگی تک وسعت حاصل کرنے کا موقع دیا، اس کے برعکس اسلام اپنے پیرودن سے صرف خدا کی ذات و صفات کے اقرار کا مطالبہ نہین کرتا، بلکہ انھین عالمِ انسانیت کی اجتماعی فلاح و صلاح کا ذمہ دار بھی قرار دیتا ہے، اور اُن سے تقاضا کرتا ہے، کہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہیئت اجتماعی مین وہ بنیادی تبدیلیان عمل مین لائین، جن سے یہ ثابت ہوجائے، کہ وہ اپنے اقرار مین صادق ہین، جس حد تک انسان اپنی انفرادی عائلی اور اجتماعی زندگی مین یہ تبدیلیان پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے، اس حد تک اسکا ایمان ناقص ہوتا ہے، غرضکہ اسلام صرف ایک طرز فکر نہیں ہے، جو انسان کی اجتماعی فلاح اور اس کے نظام اجتماعی کی صلاح و فساد سے بالکل بے تعلق ہو، بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک طریق عمل ہے، جس کے مطابق انسان اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتا ہے، اس انقلاب و تبدیلی کی کوشش کو مذہبی اصطلاح مین جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جہادِ اسلامی زندگی کا اصل اصول اور ایمان و عمل کا حقیقی جوہر ہے، اگر فریضۂ جہاد کو اسلامی زندگی سے خارج کردیا جائے تو اسلام بھی کائنات کا ایک بے جان فلسفہ رہ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ایمان والون کی ایک ضروری صفت یہ قرار دیتا ہے، کہ وہ راہِ خدا مین اپنے اموال اور اپنی جانون سے جہاد کرتے ہین :-

انما المؤمنون الذین آمنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابو وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ اولٰئک ھم الصادقون،

مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انھوں نے اس بارے میں کوئی شک نہیں کیا، اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کرتے رہے، وہی لوگ سچے ہیں،

یا ایھا الذین آمنوا ھل ادلکم علیٰ تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم، تومنون باللہ ورسولہ و تجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم،

اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو! کیا میں تمکو ایک ایسی تجارت بتاؤں، جو تمھیں سخت عذاب سے بچا سکے، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کرو،

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ کانھم بنیان مرصوص

اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے، جو اس کی راہ میں اس طرح لڑتے ہیں جیسے کہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو،

اب ظاہر ہے کہ اگر اسلام حیات اجتماعی میں بنیادی انقلاب و تبدیلی کا مطالبہ نہ کرتا اور محض انفرادی زندگی میں عمل صالح اور تزکیۂ اخلاق کو کافی خیال کرتا تو وہ مزاحمت اور کشمکش پیدا کیسے ہوتی جس کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں سے نفس و مال کی قربانی کا مطالبہ کیا گیا بلکہ محض انفرادی اور معاشرتی اصلاح کی کوشش سے وہ منظم مخالفت کبھی رونما نہ ہوتی جس کے لئے مسلمانوں کو عسکری زندگی اختیار کرنی پڑی، غرضکہ مذہب کا اسلامی تصور اس راہبانہ طرز فکر کے بالکل مغائر ہے جس میں محض عبادات و ریاضات اور کشف و مراقبہ سے انسان اپنی شخصی نجات حاصل کرنا چاہتا ہے، کیونکہ شخصی نجات کے حصول کا

یہ طریقہ انسان کو کائنات خارجی میں تبدیلی کرنے کی جدوجہد سے بے نیاز کر دیتا ہے، حالانکہ اسلام انفس و آفاق دونوں کو مرضی الٰہی کے مطابق بدلنا چاہتا ہے، کیونکہ ظاہر و باطن کائنات خارجی اور نفس انسانی دونوں ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اور جب کبھی انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کیجاتی ہے، تو نتیجہ ہمیشہ مہلک ہوتا ہے، انسان کے اخلاقی امراض اس کے نفس اور خارجی ماحول کے تعامل سے پیدا ہوتے ہیں، نہ کہ ان میں کے کسی ایک سے، اس لئے صرف ایک کو چھیڑنے اور دوسرے سے تغافل برتنے سے اسباب مرض کبھی دفع نہیں ہو سکتے ہیں، جب کبھی انسان عبادات و ریاضات میں مشغول ہو کر خارجی ماحول میں تبدیلی کی ضرورت سے بے خبر ہو جاتا ہے تو اس کی سوسائٹی میں بداخلاقی اور بدعملی کی وبا پھوٹ پڑتی ہے، جس سے بالآخر وہ خود اپنا دامن محفوظ نہیں رکھ سکتا ہے، خواہ راہبانہ اتقاء اور زاہدانہ پارسائی کے لحاظ سے وہ کتنا ہی بلند ہو، اسی طرح جب وہ بیرونی دنیا پر نظر جما کر محض خارجی ماحول کی تبدیلیوں میں معاشرتی امراض کی دوا ڈھونڈتا ہے، اور اپنی باطنی اخلاقی زندگی سے غفلت برتتا ہے، تو بدی کی قوتیں بالکل غیر محسوس طور پر اس کے نفس میں پرورش پاتی رہتی ہیں، اور بالآخر اپنے پورے زور و طاقت کے ساتھ خارج پر حملہ آور ہوتی ہیں، یہاں تک کہ اس کی معاشرت، اس کی سیاست اور اس کی معیشت کا گوشہ گوشہ اُن کے اثرات سے مغلوب ہو جاتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے صرف عبادات و ریاضات اور دعاؤں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اصلاح نفوس اور تزکیۂ قلوب کے ساتھ ساتھ حضور نے کل نظام زندگی میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی، اور جب کفار و مشرکین کی جانب سے اُن کی منظم مخالفت کی گئی، تو حضور نے وعظ و پند سے کام لینے کے ساتھ اپنی اجتماعی قوت سے بھی اُنکا مقابلہ کیا، اور اس طرح اپنے عمل سے ثابت کر دیا، کہ اسلام صرف ایک نظری عقیدہ یا فلسفہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک عظیم الشان انقلابی قوت ہے، جو اگر ایک طرف باطن میں نفس انسانی کی شرارتوں اور انسانی خواہشات کی بے قیدیوں کا مقابلہ

کرتی ہے، تو دوسری طرف ظاہر میں اپنے خارجی ماحول اور اپنی معاشرتی سیاسی ماحول اور عمرانی زندگی کے امراض و مفسدات سے آمادۂ پیکار رہتی ہے، مارکسیت اور اسلام میں مشابہت کا ایک پہلو اور بھی نظر آتا ہے، اگر مارکسیت کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے، کہ وہ نتائجیت سے قریب تر ہے، تو اس لحاظ سے بھی یہ تحریک اسلامی انداز فکر سے مماثلت رکھتی ہے، کیونکہ اسلام نتائجیت کے اس نظریہ کو تسلیم کرتا ہے کہ افکار و تصورات کی صداقت کا ایک معیار یہ بھی ہے، کہ وہ عملی دنیا کے واقعات پر موثر اور انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے سودمند ہوں، اینگلس کا یہ خیال ایک پہلو سے اسلامی نظریۂ زندگی سے قریب تر ہے کہ اس مادی دنیا کے واقعات سے ہٹ کر انسانی فکر کی حقیقت رسی کی بحث محض لایعنی ہے، اسی وجہ سے اسلام ایسی نظریہ سازی اور فلسفہ آرائی کو پسند نہیں کرتا ہے، جو عملی دنیا کے واقعات پر موثر نہ ہو، اور انسان کو عالم خیال میں الجھائے رکھے، جو اعمال و افکار انسان کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کیلئے بے قیمت ہوں، اسلام کی نظر میں وہ بالکل لاحاصل ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ راہبانہ طریق زندگی اور طرز فکر کا مخالف ہے، اور غیر مسنون عبادات و ریاضات اور مراقبات اس کے مزاج کے منافی ہیں، نیز وہ اپنے تمام عبادات و احکام کے نتائجی (Pragmatic) پہلو پر خاص زور دیتا ہے، نماز جو ہر مسلمان کے لئے فرض عبادت ہے اس کے معاشرتی فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے،

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ — نماز انسان کو فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے،

شراب کی ممانعت کرتے ہوئے قرآن اس امر کو ظاہر کر دیتا ہے، کہ اس کی تحریم میں انسانوں کا اجتماعی فائدہ بھی پیش نظر ہے،

اِثْمُھُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا — ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے،

اسی طرح قرآن کا یہ ایک عام اصول ہے، کہ وہ مسلمانوں کو بیشتر اپنے احکام کی معاشرتی

اور اجتماعی مصالح سے آگاہ کر دیتا ہے تاکہ ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ اللہ کی شریعت کوئی ایسا حکم نہین دیتی جس سے بالواسطہ یا بلا واسطہ انسانی زندگی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے، خود خدا اور آخرت کے دونون تصورات جن پر اسلام کا کل عملی اور فکری نظام قائم ہے، اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لئے سود مند ہین، اگرچہ اس کے یہ معنی نہین ہین، کہ خدا اور آخرت کا اقرار محض اس لئے کیا جائے کہ ان کے اثرات سوسائٹی کے لئے سودمند ہین، بلکہ خدا کا حکم سمجھ کر ان پر ایمان لایا جائے لیکن اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ خدا اور آخرت کے تصورات انسانی زندگی پر بھی بہت قوی اور فائدہ مند اثرات مترتب کرتے ہین اور جب کبھی تاریخ کے کسی دور مین انسان نے ان دونون تصورات کو اُن کے صحیح مفہوم کے ساتھ مخلصانہ طور پر قبول کیا، اور ان کے مقتضیات کو پورا کرنے کی کوشش کی، اس کی زندگی مین ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہو گیا، مارکسیت تاریخ کے ان شواہد کو نہین مٹا سکتی، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ درحقیقت یہی تصورات انسان کی عملی اور علمی ترقیون کا سبب ہین، اور اگر وہ اپنے اس اصول پر قائم رہے، کہ کسی تصور کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت اس کے عملی نتائج ہین، تو اسے تسلیم کرنا پڑے گا، کہ خدا اور آخرت کے تصورات غلط اور بے حقیقت نہین ہین، اگر اس کی تردید مین مارکس کے پیرو تاریخ کے ان ادوار کا حوالہ دیتے ہین، جن مین خدا اور آخرت کے تصورات نے انسان کو بے عمل اور گمراہ بنا دیا تھا تو اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ ہے، کہ ان تمام ادوار مین جن مین کورہ بالا تصورات نے انسان کو باعمل بنانے کے بجائے اسے شکست آمادہ، اپاہج اور کمزور بنا دیا، ان تصورات کو یا تو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے مانا گیا گویا کائنات کی ابتدا و انتہا، اور خلق آدم کا واقعہ محض ایک فلسفیانہ اور مابعد الطبیعاتی نظریہ، اور ایک خانگی اور شخصی رائے ہے، جو انسان کی عملی و اجتماعی زندگی مین کسی تبدیلی اور انقلاب کا تقاضا نہین کرتی ہے، یا یہ کہ خدا اور آخرت کے تصورات کو انھون نے مسخ کر دیا تھا، اور ان کو ان کی اصلی صورت مین نہین، بلکہ بگڑی ہوئی شکل مین مانتے تھے، اس سے خود ان تصورات کی عملی حیثیت اور انقلاب آفرینی

پر کوئی اثر نہین پڑ سکتا، خدا کا یقین اس کا نام نہین ہے، کہ دنیا مین جو کچھ ہو رہا ہے، وہی اس کی مین مرضی ہے، اس لئے رائج الوقت تصورات اور نظامات کے خلاف آواز نہین اٹھانی چاہئے، بلکہ اس کا یقین ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے، کہ ہم دنیا کی ان قوتون کے خلاف صف آرا ہو جائین، جو کائنات کے مادی اور انسانی وسائل کو اس کے بنانے والے کی مرضی اور منشار کے خلاف استعمال کر رہی ہین، اسی طرح آخرت کا یہ تصور نہین ہے، کہ یہ دنیا بے حقیقت ہے، اس لئے یہان جیسے بھی گذرتی ہو، گذر جانے دو، بلکہ آخرت کا حقیقی نظریہ یہ ہو کہ کائنات عالم کو خدا کے حکم کے مطابق چلانے مین مخالف قوتون کے خلاف جو جد و جہد کرنی پڑے، اور اس مین جو مصائب اور تکالیف اور آزمائشین پیش آئین اُن کے سامنے سپر نہ ڈالی جائے، اُن کا صلہ و انعام دوسرے عالم مین ملے گا، جن کے مقابلہ مین یہ تمام تکالیف و مصائب و جانکاہیان اور مایوسیان کوئی وزن نہین رکھتی ہین، جس کو خدا نے ان انسانون کے لئے خاص کر دیا ہے، جو دنیا مین اس کے احکام کی تعمیل اور اس کے منشار کو پورا کرنے کے لئے اپنی جان و مال کی بازی لگاتے ہین،

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ	ہم تمھین خوف بھوک اور مال و دولت کے
وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ	نقصانات مین مبتلا کر کے تمھاری آزمائش
وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ	کرین گے، اس کے بعد اُن لوگون کے لئے
الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ	خوشخبری ہے، جو صبر کرین، اور جب اُن پر
مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ	کوئی مصیبت آئے، تو کہین کہ ہم اللہ
رَاجِعُونَ ۝ (بقرہ)	کے لئے ہین، اور اسی کی طرف ہمین واپس

ظاہر ہے کہ قرآن نے ان آیات مین جس ابتلا و آزمائش کا ذکر کیا ہے، وہ اس جماعت کے لئے تھی، جو منشائے الٰہی کے مطابق کارگاہِ عالم کو بدلنے کی سعی و کوشش مین نقصانات و خطرات برداشت

کر رہی تھی، قرآن نے یہ کبھی نہیں کہا کہ یہ دنیا بالکل بے حقیقت ہے، البتہ اوس نے اس بات پر یقیناً زور دیا ہے کہ آخرت کے مقابلہ مین یہ دنیا ہیچ ہے،

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ	تم لوگ دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہو
الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ؕ	حالانکہ آخرت زیادہ بہتر ہے، اور زیادہ باقی رہنے والی ہے،

یعنی جس طرح ایک اعلیٰ تر حقیقت کے سامنے ادنیٰ حقیقت کوئی وقعت نہین رکھتی، اسی طرح آخرت کے مقابلہ مین بھی یہ دنیا بے قیمت ہے لیکن اس کے معنی یہ نہین ہین، کہ وہ مطلقاً بے حقیقت ہے کیونکہ انسان ادنیٰ حقیقت ہی سے گذر کر اعلیٰ حقیقت تک پہنچ سکتا ہے، اسی طرح آخرت اگرچہ اس دنیا سے بلند و برتر اور زیادہ حقیقی ہے، مگر انسان اسی دنیا کی زندگی مین حصہ لے کر اپنی آخرت سنوار سکتا ہے، نہ کہ دنیا سے الگ اور بے تعلق ہو کر،

مارکسیت کا یہ دعویٰ کہ وہ انسانی افکار کو اُن کے عملی نتائج کے معیار پر پرکھتی ہے، اس نے اس کا اندازِ فکر فلسفۂ نتائجیت سے قریب تر ہے، کچھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہین کہ مارکس اور اس کے تمام متبعین تاریخ کی مذہبی، سیاسی اور معاشی تحریکات کے حسن و قبح اور صداقت کا فیصلہ کرتے وقت اُن کی ابتدا اور آغاز کو خصوصیت کیساتھ پیش نظر رکھتے ہین، اور ان کی صحت و عدم صحت کو ان حالات و اسباب پر منحصر قرار دیتے ہین، جن مین ایسی تحریکات رونما ہوتی ہین، حالانکہ یہ طرزِ فکر نتائجیت کے بالکل مغائر ہے، نتائجیت کسی شے کی ابتدا اور اس کے اسباب پیدائش سے بحث نہین کرتی ہے، بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ وہ شے عملی زندگی کے لئے کیا قدر و قیمت رکھتی ہے، اس کا مقصد اور مآل کار کیا ہے، اور وہ کن غایات کی طرف بڑھنا چاہتی ہے، یہ طرز فکر ماضی پر نہین مستقبل پر نظر کرتا ہے، اور مارکسیت کسی فکری یا عملی تحریک کے مستقبل کے بجائے اس کے ماضی سے بحث کرتی ہے، ان اسباب

کا تجزیہ کرتی ہے، جو اس کی آفرینش اور نشو و نما کا باعث ہوئے، اور پھر اس تجزیہ پر اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے، مثلاً مذہب کے متعلق مارکسیت کا انداز بحث یہ ہے کہ وہ فلان فلان اسباب و حالات سے پیدا ہوا، فلان فلان عوامل اس کی نشو و نما کا باعث ہوئے، اور اب چونکہ وہ اسباب و عوامل ناپید ہیں، اس لئے وہ قابلِ ترک ہے وہ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتی، کہ مذہب کا مقصد کیا ہے، وہ کن غایات کی طرف انسان کو لیجانا چاہتا ہے، اور عملی زندگی پر اس کے کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں، مارکسیت کہتی ہے کہ مذہب انسان کے جذبۂ خوف سے پیدا ہوا، اور انسان کے احساس بے بسی نے اس کو تقویت پہنچائی، اور اب چونکہ فطرت خارجی پر انسان نے ایک حد تک قابو حاصل کر لیا ہے، اس لئے خوف[1] و دہشت کا وہ سبب باقی نہیں ہے، جس نے مذہب کو پیدا کیا تھا، اور نہ انسان اب قدرت کے سامنے اتنا عاجز اور بے بس ہے، کہ اُسے مذہب کے سہارے کی ضرورت ہو، حالانکہ اصل سوال

---

[1] اس نقطۂ نظر سے بھی مذہب ابھی بیکار نہیں ہوا ہے، کیونکہ انسان اپنی تمام ترقیوں کے بعد بھی عجز و بیچارگی کے احساس سے خالی نہیں ہے، سائنس کے حیرت انگیز انکشافات و ایجادات کے باوجود انسان کو نہ تو اپنی تخلیق و پیدائش پر قدرت حاصل ہو سکی ہے اور نہ موت کے خوف سے آزاد ہوا ہے، اور نہ اُسے جذبات و شہوات پر قابو حاصل کرنے میں کامیابی ہو سکی ہے، بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ جیسے جیسے انسان قوائے فطرت کی تسخیر میں کامیاب ہوتا جاتا ہے، اسی نسبت سے وہ اپنے شخصی اور قومی جذبات و خواہشات سے مغلوب ہو رہا ہے، جس سے اس امر کی مزید تصدیق ہوتی ہے، کہ انسان کائناتِ خارجی پر تو حکومت کر سکتا ہے، لیکن اپنے نفس و باطن کا فرمانروا نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے میلانات اور خواہشات اور اس کے جذبات و داعیات کی باگ ڈور کسی بالاتر ہستی کے ہاتھ میں ہے، بقول شاپن ہار انسان جو چاہے کر سکتا ہے، مگر جو کچھ وہ چاہتا ہے، اس کے انتخاب و تعیین میں اس کی اپنی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے،

وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَن یَّشَاءَ اللّٰہ

نہین ہے کہ مذہب کس طرح اور کن اسباب سے پیدا ہوا، بلکہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہ چاہتا کیا ہے، حیاتِ انسانی کے لئے کیا عملی پروگرام رکھتا ہے، اور اس کے مقاصد صحیح ہین یا غلط، مارکسیت تحلیل وتجزیہ کے جس طریقہ سے مذہب کو باطل کرنا چاہتی ہے، وہی طریقہ اسے باطل قرار دینے کے لئے اختیار کیا جاسکتا ہے، مثلاً ہم کہہ سکتے ہین، کہ خود اشتمالی تحریک خوف کی پیداوار ہے، وہ معاشی بے اطمینانی کے خوف سے پیدا ہوئی، اور معاشی بےبسی کا احساس اس کی ترقی اور اشاعت مین معاون ہوا، لیکن یہ اصولِ فکر صحیح نہین ہے، مارکسیت یا مذہب کی صحت اور عدم صحت کا تعلق، اس کی ابتدا اور اسباب پیدائش سے نہین ہے، بلکہ دونون کی صداقت جس معیار پر جانچی جائے گی وہ یہ ہے کہ ان کا عملی پروگرام انسان کے لئے کہان تک مفید ہے، جن مقاصد کی یہ دونون دعوت دیتے ہین، وہ انسان کو بحیثیت انسان کے کہان تک مطلوب ہین، اور ان مقاصد کی تکمیل کے لئے جو ذرائع استعمال کرتے ہین، آیا وہ ذرائع مناسب ہین یا نہین، صداقت کی جستجو کا تحلیلی طریقہ (Analytical method) علوم طبعی کے دائرہ مین کیسا ہی مفید ثابت ہوا ہو، لیکن تمدنی اور معاشرتی علوم مین جہان انسان کی فطرت اور اس کے اقدار زندگی پر بحث ہوتی ہے، یہ طریقہ بالکل مہمل نتائج پر منتہی ہوتا ہے، مثلاً کسی عمارت کو اگر اس لئے بیکار اور بے فائدہ ٹھہرایا جائے، کہ وہ چونے گارے اینٹون اور پتھرون سے بنی ہے، تو یہ بات بالکل خلافِ عقل ہوگی، کیونکہ عمارت کی قدر وقیمت کا مدار اس کے ترکیبی عناصر پر نہین ہے، جن سے وہ وجود مین آتی ہے، وہ چونے گارے مٹی اور پتھر سے ضرور بنی ہے، لیکن باعتبار قدر وقیمت اور فوائد، مراتب وجود مین وہ ان اشیا سے اعلیٰ اور بہتر ہے، اسی طرح اگر کارل مارکس اور انجلس کے بارہ مین رائے قائم کرنے کے لیے اس کی پیدایش اور ابتدائی زندگی کے حالات سے بحث کیجائے، اور اس کے فلسفیانہ افکار کو محض اس لئے

باطل قرار دیا جائے کہ وہ دونون ایک حقیر قطرۂ خون سے پیدا ہوئے، یا اُن کے دماغی اورجسمانی اعضا، اسی گوشت پوست کے بنے ہوتے تھے، جس سے ایک دہقانی کا جسم و دماغ ترکیب پاتا ہے؛ تو کیا یہ اندازِ فکر صحیح ہوگا، ظاہر ہے کہ اُن کے اسباب پیدائش اور اعضاے جسمانی و دماغی کی ترکیب سے اُن کی فلسفیانہ صداقت یا عدم صداقت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، کسی شے کی حقیقت اس کے آغازِ پیدائش کے حالات اور اُس کے عناصرِ ترکیبی سے ظاہر نہین ہوتی، بلکہ اس کے مزاج و میلان اس کی تعمیری ہیئت اور اس کے قابلِ حصول امکانات مین پوشیدہ ہوتی ہے؛ لیکن مادیت کے اور تمام اقسام کی طرح مارکسیت ماضی کی پرستار اور تحلیلی طریقہ کی پابند ہو؛ جہان تک مارکسیت کے فلسفۂ اضداد کا تعلق ہے، جو ہیگل کے فلسفہ سے ماخوذ ہے، اس کی نسبت اطالوی فلسفی کروس (Croce) کی حسب ذیل راے نہایت معقول معلوم ہوتی ہے،

"ہیگل کی ایک بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے اشیاء اور تصورات کے باہمی فرق کو اُن کی ضد سے تعبیر کیا، حالانکہ جو اشیاء اور تصورات باہم مختلف ہون، وہ لازماً ایک دوسرے کے ضد نہین ہوتے، کون کہہ سکتا ہو کہ مذہب آرٹ کی ضد ہے، یا فلسفہ مین مذہب اور آرٹ کا اجتماع اضداد ہوگیا ہے، یا یہ کہ قوتِ نظری، قوتِ عملی کی عقل، وجدان کی اور تمدنی زندگی، خانگی زندگی کی نفی ہین، اسی طرح جس طرح وجود و عدم کی نفی ہے، واقعہ یہ ہے کہ جن تصورات کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیا جاتا ہے، وہ اکثر ایک ہی اصل کے فروع ہوتے ہین، اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہین، نہ کہ نفی، مارکس نے ہیگل کے فلسفۂ اضداد کو جون کا تون لے لیا، البتہ اوس نے کائنات، فطرت اور انسانی تاریخ سے ہیگل کی روحانیت کو خارج

کرکے ان کا خدوخال جدلیاتی مادیت سے تیار کیا، وہ مادہ کو کائنات کی بنیادی حقیقت قرار دیتا ہے، لیکن مادہ کا جو تصور پیش کرتا ہے، وہ بنیادی طور پر ہیگل کے اس تصور کا چربہ ہے، جو اس نے روح عالم کی بابت قائم کیا تھا، اور کم وبیش انہی صفات سے آراستہ ہے، یعنی جس طرح ہیگل کے فلسفہ مین، روح عالم اپنی ذات سے متحرک ہے، اور ایک مخصوص منطقی ترتیب کے ساتھ درجہ بدرجہ ایک متعین اور پہلے سے بنے بنائے مقصد کی جانب سفر ارتقاء طے کرتی ہے، اسی طرح مارکس کے نظریہ کی رو سے مادہ بھی اپنی ذات سے متحرک ہے، اور اپنی باطنی فطرت کے لحاظ سے ایک منطقی نظم وترتیب کا پابند ہے، جس کے مطابق وہ ایک مخصوص اور پہلے سے متعین کردہ مقصد کی جانب حرکت کر رہا ہے، اس میں شک نہین کہ ہیگل کا مقصد روحانی ہے، اور مارکس نے جس مقصد کا تعین کیا، وہ مادی ہے، لیکن کائنات کی فطرت اور اس کے قوانین حرکت کے متعلق دونون کے نظریات مین کوئی فرق نہین ہے،" (باقی)

استفسار وجواب

شرح شمائل ترمذی کا ایک قلمی نسخہ

جناب عبد الشکور صاحب
پور بندر کاٹھیاوار

مکرمی السلام علیکم

گذشتہ وزن معارف مین کتب خانہ ٹونک کے قلمی مخطوطات کے سلسلہ مین اسفرائینی اور ہیثمی کی شرح شمائل ترمذی کا تذکرہ دیکھا، خاکسار کے پاس شرح شمائل کا ایک قلمی نسخہ ہے، مجھے معلوم نہین ہے کہ یہ نسخہ کبھی طبع ہوا ہے یا نہین، نہ ہی اس کے اول وآخر سے تصنیف کا پتہ چلتا ہے، کتاب کے خاتمہ کی عبارت مین جو نام درج ہے، وہ کاتب کا ہے یا شارح کا، مین تو کم از کم اپنی نااہلی کے باعث اس کو متعین کرنے سے قاصر ہون، کتاب کی ابتدائی تمہید سے اندازہ ہوتا ہے، کہ مصنف نے اسفرائینی اور ہیثمی کی شرحون پر تعلیق کے طور پر یہ کتاب لکھی ہے، ابتدائی کتاب حسب ذیل ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم (کرم خوردہ ہے) علی سیدنا محمد وآلہ الخ وکان ممن تصدی لشرحہ افضل المدققین اوحد المحققین مولانا عصام الدین الاسفرائینی الشافعی الخ وتلاہ العالم النحریر الفقیہ الشہاب بن حجر الهیثمی نزیل مکۃ الخ فسألنی بعض الافاضل ان املی تعلیقاً عن (؟) التطویل والاخلال مراعیاً للانصاف متجنباً للاعتساف فاجبتہ لذالک مع الاعتراف للقصور عن الخوض فی هذہ المسالک ولخصت ما فی هذین الشرحین ضاماً الیهما من فوائد الفوائد لمشرح الصدر وتقربہ العین

اس کے بعد شرح شروع ہوتی ہے، خاتمۂ کتاب کے الفاظ حسب ذیل ہیں :-

تم شرح الشمائل علی ید العبد الفقیر محمد مومن ابن محمد ا مین (آگے کرم خوردہ ہے) بمکۃ المشرفہ یوم السبت، سابع یوم من شہر شعبان المبارک سنہ واحد وثمانین والف ۱۰۸۱"

اگر ممکن ہو تو جناب کرم اس کتاب پر اپنے معزز ماہنامہ میں مزید معلومات بہم پہنچائیں تو بڑی عنایت ہو گی،

اگر کسی صاحب ذوق کو اس کتاب کو اپنے کتب خانہ کے لئے ضرورت ہو تو مناسب قیمت پر میں فروخت کر سکوں گا، والسلام

معارف:- آپکے پاس شرح شمائل کا جو قلمی نسخہ ہے، وہ حافظ زین الدین المعروف بہ عبد الرؤف ابن تاج العارفین مناوی المتوفی ۱۰۳۱ھ کی شرح ہے، یہ شرح جیسا کہ اس کے مقدمہ میں تصریح ہے مولانا عصام الدین ابراہیم بن محمد اسفرائنی المتوفی ۹۴۳ھ اور حافظ ابن حجر مکی المتوفی ۹۷۳ھ کی شرحوں[۱] کا خلاصہ ہے، اور کچھ مزید تعلیقات اور اضافے بھی ہیں، محمد مومن اس کے شارح نہیں بلکہ کاتب ہیں، آپنے اپنے نسخہ کے شروع کی جو عبارت نقل کی ہے، وہی مناوی کی شرح کے مقدمہ کی عبارت ہے آپنے اس کو پورا نقل نہیں کیا ہے، بلکہ بعض فقرے الخ لکھ کر چھوڑ دیئے ہیں، ورنہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، مناوی کے مقدمہ کی پوری عبارت یہ ہے[۲]

---

[۱] مولانا عصام الدین کی شرح کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر اور پٹنہ لائبریری میں ہیں، ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ خدیویہ ج اول ص ۲۴۲ و مفتاح کنوز الخفیہ ج اول ص ۲۷۱، اور ابن حجر مکی کی شرح اشرف الوسائل فی شرح الشمائل کے نسخے دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہیں، فہرست کتب خانہ خدیویہ جلد ۲ ص ۲۵۹ و فہرست کتب عربی کتب خانہ رامپور ص ۲۰۲، [۲] کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶

"انّ ممن تصدیٰ لشرحهما و حلّ الدّ قیقین مولانا عصام الدین الاسفرائینی فاتی بما لم یسبق الیہ من کشف النقاب عن اسرارها، لکنہ من الاحتمالات العقلیۃ فی هذا الفن الذی هو من الفنون النقلیۃ، مع ما هو علیہ من الاوهام حتی علیٰ ذالک من سقطات الاوهام وتلاه عالم الحرمین الفقیہ الشهیر الشهاب بن حجر الهیثمی نزیل مکۃ المکرمۃ فاطال واطاب لکن بعد الانتهاب من ذالک الکتاب وازال لہ رونق المتن باقتصاره علیٰ ما زعم انّہ المهم من الفاظ الباب مع ما هو علیہ من التشفی بالرد والتعصب ممالیس بکبیر امر تارۃ اخری فسالنی بعض الافاضل ان اُملی علیها تعلیقاً مختصراً منصفاً فاجبتہ ولخصت مافی هذین الشرحین ضامًا الیهما من الفوائد مالا بد منہ الخ"

ان دونون کے موازنہ سے ظاہر ہے کہ دونون ایک ہی کتاب کے مقدمہ کی عبارتین ہین، خط کشیدہ عبارتین وہ ہین جن کو آپنے الخ لکھ کر چھوڑ دیا ہے، کشف الظنون کی عبارت مین بعض الفاظ اور فقرے مختلف ہین لیکن اس قسم کے خفیف اختلافات قلمی نسخون مین اکثر ہوا کرتے ہین، اور آپنے بعض الفاظ غلط نقل بھی کئے ہین۔

خواجہ اسحاق آفندی المتوفی ۱۱۲۲ھ نے اس شرح کا ترکی مین ترجمہ کیا تھا، اور مصطفیٰ بن حسن المعروف بہ مظلوم زادہ نے اس کو ترکی مین نظم کیا،[1] اس کے قلمی نسخے مصر اور بانکی پور کے کتب خانون مین موجود ہین،[2] اور یہ شرح ملا علی قاری کی شرح شمائل ترمذی جمع الوسائل کے ساتھ مصر اور قسطنطنیہ کے مطبوعون مین چھپ چکی ہے[3]

"م"

---

[1] کشف الظنون جلد ۲ ص ۶۰ [2] فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر جلد اول ص ۳۶۰ و مفتاح الکنوز الخفیۃ جلد اول ص ۱۶۴ [3] معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۱۹۹

وفیات

مولانا ثناء اللہ امرتسری

۱۵ راگست ۴۷ء کے بعد مشرقی پنجاب کے مسلمانون پر جو قیامت گذری، اس کی تاریخ قیامت تک ناقابلِ فراموش رہے گی، مسلمانون کے لئے یہ سانحہ کتنا حسرتناک ہے کہ اب امرتسر سے لے کر دلی کے کنارون تک ساری مسجدین بے چراغ، خانقاہین سونی، مدرسے بے نشان اور کتبخانے ویران ہوگئے، اسی ہادثہ مین مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے صاحبزادہ عطاء اللہ ثنائی بحالت نماز شہید ہوئے، اُن کا کتب خانہ لُٹ گیا، اور وہ خود مع خاندان بہزار خرابی گوجرانوالہ پہنچے، اور اب خبر آئی ہے کہ انھون نے ۱۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو بعارضۂ فالج وفات پائی، انا للہ وانا الیہ راجعون،

مولانا ہندوستان کے مشاہیر علماء مین تھے، فنِ مناظرہ کے امام تھے، خوش بیان مقرر تھے، متعدد تصانیف کے مُصنف تھے، مذہباً اہلحدیث تھے، اور اخبار اہلحدیث کے اڈیٹر تھے، قومی سیاسیات کی مجلسون مین کبھی کبھی شریک ہوتے تھے،

مرحوم سے مجھے نیاز زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا، وہ سال مین ایک دو دفعہ ہندوستان کے مختلف شہرون مین آتے جاتے لکھنؤ آتے تھے، اور دار العلوم ندوہ مین تشریف لاکر احباب سے ملتے تھے، اسی سلسلہ مین مجھے بھی نیاز حاصل ہوا، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مرحوم مدرسہ مین تشریف لائے، مین درس مین تھا، اُن کو آتا دیکھ کر اُن کی طرف لپکا، مگر مرحوم نے میرے بجائے سبقت استاذی شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف کی اور حدیث کا یہ ٹکڑا پڑھا: کبّر الکبر، یعنی بڑے کو بڑائی دو،

مرحوم ندوہ کے رکن بھی اکثر رہے، بلکہ خود اُن کے بقول ندوہ کا پور مین اُن کی دستار بندی ہی کے جلسہ میں پیدا ہوا، مرحوم نے ابتدائی تعلیم کے بعد کچھ دنون مدرسہ دیوبند مین پڑھا، پھر وہ کانپور آکر مدرسہ فیض عام مین داخل ہوئے، اور یہین ۱۳۱۲ھ مین فراغت پائی،

یہ زمانہ وہ تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوون سے پنجاب مین فتنہ پیدا تھا، انھون نے مرزا کے خلاف صف آرائی کی، اور اس وقت سے لیکر آخر دم تک اس تحریک اور اس کے امام کی تردید مین پوری قوت صرف کردی، یہان تک کہ طرفین مین مباہلہ بھی ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صادق کے سامنے کاذب نے وفات پائی، یہ پرانے قصے ہین جن کو دہرانے کی چندان ضرورت نہین،

موجودہ سیاسی تحریکات سے پہلے جب شہرون مین اسلامی انجمنیں قائم تھین، اور مسلمانون اور قادیانیون اور آریون، اور عیسائیون مین مناظرے ہوا کرتے تھے، تو مرحوم مسلمانون کی طرف سے عموماً نمایندہ ہوتے تھے اور اس سلسلہ سے وہ ہمالیہ سے لیکر خلیج بنگال تک ہمیشہ دوان اور روان رہتے تھے،

اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس نے بھی زبان کھولی، اور قلم اٹھایا، اس کے حملہ کو روکنے کیلئے ان کا قلم شمشیر بے نیام ہوتا تھا، اور اسی مجاہدانہ خدمت مین انھون نے عمر بسر کردی، فجزاہ اللہ عن الاسلام خیر الجزاء،

وہ مصنف بھی تھے، مخالفین اسلام کے اعتراضون کے جواب مین اُن کے اکثر رسالے ہین، ان کی تصنیفات مین دو تفسیرین خاص ذکر کے قابل ہین، تفسیر ثنائی اردو مین اور تفسیر القرآن بالقرآن عربی مین، مرحوم کو خود بھی یہ تفسیرین پسند تھین، مرحوم چونکہ مناظر تھے، اس لئے پہلی تفسیر مین آیات صفات کے باب مین سلفی عقائد کے بجائے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی پیروی مین تاویل کی راہ اختیار کی تھی، اس سے امرتسر کے غزنوی علماے اہلِ حدیث نے ان کی بشدت مخالفت کی، ۱۹۲۶ء مین جب حج کی تقریب سے خاکسار اور مرحوم اور دیگر علماے اہلحدیث کا حجاز جانا ہوا تو یہ نزاع سلطان ابن سعود کے سامنے بھی پیش ہوئی، اور سلطان نے کوشش کرکے فریقین مین صلح کرادی، مرحوم وہین مجھ سے فرماتے تھے کہ افسوس ہے

کہ نجد کے علما حضرت شاہ ولی اللہ کی قدر و قیمت سے واقف نہیں اور مجھ سے چاہتے تھے کہ مین اس باب مین سلطان سے کچھ عرض کرون،

مرحوم کبھی کبھی قومی جلسون مین بھی شرکت کرتے تھے، ۱۹۱۳ء مین ندوہ کی تحریک اصلاح کے سلسلہ مین جب حکیم اجمل خان مرحوم کی دعوت پر دہلی مین ایک عظیم الشان اجلاس ہوا، جس مین سارے ہندوستان کے مسلمان نمایندے شریک تھے، تو مولانا شبلی کی تحریک پر مرحوم ہی صدر مجلس قرار پائے تھے، ۱۹۱۹ء مین جب تحریک خلافت کا پہلا ابتدائی جلسہ لکھنؤ مین ہوا، جس مین سارے ملک کے اکابر اور نمایندے جمع تھے اس مین بھی مرحوم شریک تھے، ۱۹۲۵ء کی جمعیۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ مین جس مین اس خاکسار کی صدارت تھی، مرحوم موجود تھے، اور خاص طور سے اس لئے آئے تھے کہ جمعیۃ کے اس اجلاس مین دار الحرب مین سود کے مسئلہ پر بحث کرنے والے تھے، حضرت مولانا انور شاہ صاحب اور دوسرے علماء دیوبند بھی تشریف فرما تھے، انھون نے مجھ سے کہا کہ اگر حضرات علماء دیوبند حنفیہ کے مشہور مسلک لا ربوا بین الحربی والمسلم فی دار الحرب پر متفق ہون تو مین بھی تائید کرون گا، مگر علماء مین نجی گفتگو ہو کر رہ گئی، کھلے عا مین کوئی بحث نہیں ہوئی،

مرحوم ۱۹۲۶ء مین حجاز کے موتمر اسلامی مین نمایندہ اہل حدیث کی حیثیت سے شریک تھے، اور عربی مین ایک دو مختصر تقریرین بھی اپنے طرز کی موتمر مین کی تھین، مدینہ منورہ بھی حاضر ہوئے تھے، کہتے تھے، کہ جو اہل حدیث یہان نہ آئے وہ محبت سے خالی ہے، (ان کا اصل فقرہ اس وقت پوری طرح یاد نہین)

مرحوم کو ایک دفعہ مجھ سے شکایت بھی پیدا ہوئی، اس کی صورت یہ ہوئی کہ دس پندرہ برس ہوئے، مرحوم اور اُن کے حنفی حریف مولانا عبد العزیز صاحب خطیب گوجرانوالہ مصنف اطراف بخاری کے درمیان حدیث اذا قرء الامام فانصتوا کے صحیح مسلم مین موجود ہونے یا نہونے پر اخبارات مین تحریری مناظرہ ہو رہا تھا، فریقین نے اس باب مین مجھے حکم مانا، مین نے مولانا مرحوم سے کچھ پوچھے بغیر صرف دونون کی تحریرون

کو دیکھ کر فیصلہ مرحوم کے خلاف اور مولانا عبد العزیز صاحب کے موافق کیا، جس پر مرحوم نے مجھ کو لکھا جمع سمع
من کلا آخر کی بنا پر طرف ثانی کا بیان سُنے بغیر آپ نے فیصلہ کیسے کر دیا، مگر ان کی یہ شکایت محض مناظرانہ تھی
ورنہ اس کے بعد بھی ان کی شفقت میرے حال پر ویسی ہی رہی، ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد جب
میرا لاہور جانا ہوا، اور اُن کو خبر ہوئی تو مجھے پیغام بھیجا کہ واپسی میں اُن سے ملے بغیر نہ جاؤں، چنانچہ واپسی میں
امرتسر اترا، اور اُن کے پاس دو دن ٹھہرا، اور بہت سی باتیں ہوئیں، جن میں سے ایک جیسا کہ خیال آتا ہے
اہل حدیث کے انتشار اور پراگندگی کی گفتگو تھی، میں مرحوم کو لکھتا رہتا تھا کہ آپ آمین اور رفع یدین وغیرہ
مسائل فقہ پر جن کا ہر پہلو جائز اور ثابت ہے، مناظرانہ تحریروں میں وقت ضائع نہ کریں مگر وہ اُن کی اہمیت پر بھی مصر تھے،
ان کی عمر میرے خیال میں اسّی سے کچھ متجاوز ہوگی ابھی چند سال ہوئے وہ گر پڑے تھے، جس سے کولھے کی
ہڈی پر چوٹ لگی تھی جس کے سبب سے وہ چلنے پھرنے سے معذور سے ہوگئے تھے، پنجاب کے گذشتہ حادثہ میں جوان
بیٹے کی مفارقت کا اثر یقیناً پڑا ہوگا لیکن اُس کے بعد پاکستان و ہندوستان کے درمیان جو دیوار قائم ہوگئی
اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھ کو مرحوم کی وفات کی اطلاع بھی اس سے پہلے نہیں ہوئی، اور یہ اطلاع بھی جمعیۃ العلماء دہلی کے
تازہ جلسہ میں تعزیت کی تجویز سے ہوئی، انا للہ، اگر کوئی صاحب اُن کی وفات کی تاریخ روز و وقت
مقام سے مطلع کریں تو ممنون ہوں گا،

مرحوم اسلام کے بڑے مجاہد سپاہی تھے، زبان اور قلم سے اسلام پر جس نے بھی حملہ کیا، اس کی مدافعت
میں جو سپاہی سب سے آگے بڑھتا، وہ وہی ہوتے، اللہ تعالیٰ اس غازی اسلام کو شہادت کے درجات و مراتب عطا فرمائے،

مولانا ابو البرکات عبد الرؤف دانا پوری

مہینوں سے اخبار نہیں پڑھتا، کہ ان کو پڑھکر ایک ایسے شخص کو جو ملک میں ہر طرح امن و
امان اور مہر و محبت کا طالب ہو دلی صدمہ پہنچتا ہے، اسی لئے مولانا کی وفات کی خبر اُن کے صاحبزادوں
کے خطوط سے ہوئی، میں نے اُن کے صاحبزادوں کو لکھا کہ مرحوم کے کچھ ابتدائی تعلیمی حالات مجھ کو لکھکر بھیجیں،

لیکن ان کا پھر کوئی جواب نہیں آیا، البتہ اخبارات کے چند تراشے ملے، جن میں وفات کی خبر کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

مرحوم کا وطن صوبہ بہار میں شہر داناپور متصل پٹنہ تھا، مگر وہ ایک عرصہ سے کلکتہ میں طبیب کی حیثیت سے مقیم تھے، اور گویا اب وہی اُن کا گھر ہو گیا تھا، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ انھوں نے تعلیم و تربیت کن اساتذہ سے حاصل کی، مگر گفتگو اور تحریر سے پتہ چلتا تھا کہ ان کو علوم دینیہ میں پوری دستگاہ حاصل تھی، پھر کلکتہ میں رہکر اور سیاسی مجلسوں میں شرکت کے سبب سے وہ زمانہ کے ضروریات اور عصری خیالات و افکار سے پوری طرح آگاہ تھے، اور ان علما میں تھے، جو قدیم علوم و اعتقادات فقہ کو جدید خیالات و افکار سے تطبیق دینے کی قدرت رکھتے ہیں،

میری اُن کی پہلی جان پہچان اس وقت ہوئی، جب میں ۱۹۱۲ء میں الہلال کلکتہ کی ادارت میں شرکت کے لئے کلکتہ پہنچا، اور اس تقریب سے کئی مہینہ کلکتہ رہنے کا اتفاق ہوا تو مختلف جلسوں میں ان سے گفتگو، بات چیت اور میل جول کی نوبت آئی، پھر ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء میں مجلس علمائے بنگالہ کی صدر کی حیثیت سے جب میرا کلکتہ جانا ہوا، اور یہ وہ وقت تھا، جب اسی کے ساتھ لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس بھی وہاں ہو رہے تھے، اور ہندو اور مسلمان تمام ملک کے نمایندے وہاں جمع تھے، اور بیت المقدس کی انگریزی فتح کا حادثہ تازہ تھا، اور طبائع میں بڑا ہیجان تھا، مرحوم سے ملنے کا موقع ہاتھ آیا، اور خیال آتا ہے کہ اُن کے قیامگاہ پر بھی جانے کا اتفاق ہوا، جو چونا گلی میں تھی، اور جہاں مرحوم نے وفات پائی،

۱۹۱۶ء میں ہندوستان میں ایک مسئلہ زیر بحث تھا، اور وہ یہ کہ پنجاب کی ایک مسلمان عورت نے جو اپنے شوہر کے مظالم اور عدم نفقہ سے تنگ آچکی تھی، اس سے چھٹکارے کے لئے علماء سے استفتاء کیا تھا، مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی نے حنفیہ کے مسلک کے مطابق اس کو جواب دیا کہ اسلام میں اس کے لئے کوئی مخلص نہیں، اس پر آریہ اخباروں نے اسلام کو اس کی تنگ دامانی کا طعنہ دیا، اس کو پڑھ کر مولانا ابوالکلام نے بعض فقہائے تابعین اور ائمہ فقہ کے مسلک کے مطابق مولانا ٹونکی کے فتووں کی تردید کی

اور لکھا کہ تین ماہ کے انتظار کے بعد بھی اگر شوہر اپنی بیوی کے نان ونفقہ کا انتظام نہ کرے اور بیوی مطالبہ کرے تو قاضی زوجین میں تفریق کر سکتا ہے، مولانا داناپوری نے مولانا ابوالکلام کے فتوی کی تغلیط کی اور کلکتہ کے اخبارات میں ایک مفصل مضمون اس کے جواب میں لکھا، یہ معارف کی اشاعت کا پہلا سال تھا، خاکسار نے ان تینوں صاحبوں کے فتووں پر ایک محاکمہ لکھا، جو معارف کی پہلی جلد میں زوجہ غیر منفق علیہا کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اور جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ نہ تو مطلقاً مولانا ابوالکلام کا فتوی صحیح ہے اور نہ مولانا عبدالرؤف صاحب کا، اور نہ تو مولانا ابوالکلام کی وسعت صحیح ہے اور نہ مولانا داناپوری کی تنگی، بلکہ یہ سب فتوے الگ الگ مختص حالات سے مخصوص ہیں، کسی کہنے والے نے مجھ سے نقل کیا، کہ مولانا داناپوری نے میرے اس مضمون کو پڑھ کر فرمایا کہ ہاں! یہ مضمون ایک پڑھے لکھے شخص کا ہے،

پھر مرحوم سے جمعیۃ العلماء کے کلکتہ کے اجلاس کے موقع پر ملاقات ہوئی، اور آخری ملاقات آٹھ دس برس ہوئے اس وقت ہوئی جب مسلم تعلیمی کانفرنس علی گڈھ کا اجلاس کلکتہ میں ہوا جس میں کمال یار جنگ تعلیمی تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی تھی، یہ وقت ملکی سیاسیات کے ایک نئے پہلو کا تھا،

مرحوم سیاسیات میں جمعیۃ العلماء کے ساتھ تھے، اور اس کے بعض جلسوں کی صدارت بھی کر چکے تھے، لیکن آخر میں وہ اس سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں منسلک ہو گئے تھے اور جمعیۃ علمائے اسلام میں داخل ہو گئے تھے، اور اس حیثیت سے وہ بنگال کی اسلامی سیاست پر بہت اثر انداز تھے،

مرحوم علوم دینیہ کے علاوہ زمانۂ حال کے حالات وخیالات سے بھی پوری طرح باخبر تھے جس کا ثبوت ان کے وہ مختلف خطبات ہیں جو انھوں نے مختلف مجلسوں میں پڑھے، ان کا جمعیۃ العلماء کا خطبہ صدارت ان کی سیاسی بصیرت کا آئینہ ہے، چند سال ہوئے جامعہ ملیہ دہلی میں اسلام کے سیاسی ومعاشی اور دوسرے عصری مشکلات پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اہل بصیرت نے اس کی بیحد قدر کی، ان کی زندگی کا سب سے آخری کارنامہ ابھی چند ماہ ہوئے مشرقی بنگال کے ایک مذہبی وتبلیغی جلسہ میں ان کا حکیمانہ خطبہ

جس مین پاکستان کی سیاسی حیثیت اور سیاسی مجبوریوں کی بنا پر اصول خلافت کی بنیاد پر حکومت کی تاسیس کی معذوریون کا بیان تھا، یہ خطبہ بھی ان کی سیاسی فہم وتدبر کا نمونہ ہے،

مرحوم ایک ممتاز طبیب، ایک مشہور عالم، ایک خوش بیان خطیب اور ایک مفکر ہونے کے ساتھ مصنف بھی تھے، چنانچہ ان کی تصنیفات میں سب سے اہم کتاب اصح السیر ہے، جو افسوس ہے کہ ان کی وفات سے ناتمام رہی،

مولانا اونچا سنتے تھے، اس لیے ہمیشہ ایک آلہ ساتھ رکھتے تھے جس کو لگا کر دوسروں کی بات سنتے تھے، تاہم ان سے ملنے جلنے والون کا بڑا حلقہ تھا، اور کلکتہ میں ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اہل علم اور اہل سیاست دونوں میں ان کا خیر مقدم تھا، وہ متواضع، سادہ مزاج اور خلیق تھے، چھوٹے بڑے سب سے یکسان ملتے تھے،

مرحوم کی عمر اس وقت ۸۰ سال کی تھی، جس کے معنی یہ ہیں ۱۸۶۷ء مین انکی ولادت ہوئی ہوگی ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کی صبح کو جمعرات کے دن ۸ بجے کے قریب ان کی علالت کی ابتدا ہوئی، فرمایا کہ بخار معلوم ہوتا ہے تھوڑی دیر کے بعد جاڑا معلوم ہوا، دن بھر کچھ بخار رہا، مغرب کی نماز تک کوئی خاص بات نہ تھی، ساڑھے سات بجے شام سے حالت بگڑی، یہان تک کہ رات کو ایک بجے داعی اجل کو لبیک کہا، مرحوم کی وفات سے کلکتہ کی سرزمین علم وعرفان کے نور سے محروم ہوگئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو روشن کرے، "س"

یعقوب بخش راغب قادری بدایونی

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی (لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڈہ) کے خط سے یہ معلوم کرکے دل کو بڑا رنج ہوا کہ میرے پرانے دوست مولوی یعقوب بخش صاحب راغب بدایونی نے ۱۲ فروری ۱۹۴۸ء کو علی گڈہ مین جہان وہ دینیات کے استاد تھے، اچانک قلب کی حرکت بند ہوجانے سے وفات پائی، جنازہ

علی گڈھ سے بدایون لے جایا گیا، اور درگاہ قادریہ میں وہ سپرد خاک ہوئے، عمر غالباً ساٹھ سال کے قریب ہوگی،

مرحوم بدایون کے ایک نامور اور صاحب علم گھرانے سے تھے، ان کے پرنانا مولوی علی بخش صاحب صدر الصدور تھے، جن سے سرسید کے تحریری مناظرے رہے ہیں، کیا عجیب بات ہے کہ اس کا پرنانی جس کا پرنانا سرسید سے ایسا مذہبی اختلاف رکھتا تھا جس میں کفر و اسلام تک کا تفرقہ تھا وہ سرسید کی تعلیم گاہ میں دینیات کا مدرس ہو کر رہا،

مرحوم سے میرے تعلقات بڑے پرانے تھے، ان کا آغاز شعر و سخن سے ہوا، مرحوم اردو کے اچھے شاعر تھے، انھوں نے اپنا کلام مجھے میری رائے معلوم کرنے کو بھیجا، میں نے اس کی بڑی داد دی، اور اس طرح مکاتبت کا سلسلہ جاری ہوا، پھر تحریک خلافت کے زمانہ میں محب عزیز (جن کا نام اب بھی محبت کے ساتھ زبان پر آتا ہے) مولانا عبد الماجد صاحب مرحوم بدایونی کے توسط سے معرفت اور شناسائی کا تعلق دوستی سے بدل گیا، ملاقات کا اتفاق بدایوں کے ایک جلسۂ خلافت کے سلسلہ میں ہوا، جس میں مولوی عبد الماجد صاحب بدایونی مجھے صدر بنا کر لے گئے تھے، اور کئی روز ان کے مکان پر ٹھہرنا پڑا،

مرحوم عربی کے بڑے عالم، ادب و لغت کے فاضل اور ہیئت و نجوم کے استاد تھے، عربی میں قصیدے بہت لکھے اور بہت اچھے لکھے، بدایون کے سلسلۂ قادریہ میں حب رسول کی بنا پر سیادت سے بے انتہا شیفتگی ہوتی ہے، اس سلسلہ میں مرحوم کو مجھ "بدنام کنندۂ نکونامے چند" سے بھی محبت کی عقیدت تھی، چنانچہ اپنے عربی قصیدوں کو میری طرف نسبت دیکر میری عزت بڑھائی،

ہیئت و نجوم سے ان کو خاص ذوق تھا، ان کے گھر میں بزرگوں کا اندوختہ بڑا اچھا کتبخانہ تھا، جس میں بعض نادر قلمی کتابیں تھیں، انھیں میں محقق طوسی اور دوسرے قدیم مسلمان علماء کے ہیئت کے قدیم رسالے تھے، مرحوم نے اپنے ذوق سے ان کو پڑھ کر اور صحیح کرکے النجم الطوالع

نام سے شائع کیا، سر شاہ سلیمان مرحوم کے اشارہ سے علامہ بیرونی کی قانون مسعودی کے کچھ جزاء کا اردو میں ترجمہ کیا تھا،

حدیث میں ان کا سلسلۂ تلمذ مولانا سید یونس علی صاحب بدایونی کے واسطے سے خاندان ولی اللّٰہی تک اور معقول میں مولانا محب احمد صاحب بدایونی کے توسط سے خانوادہ خیرآباد تک منتہی ہوتا ہے، شعرا میں شیخ احمد علی شوق لکھنوی کے شاگرد تھے، اور بیعت سلسلۂ قادریہ میں مولانا عبدالقادر صاحب بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ سے حاصل تھی، عقیدہ میں سخت حنفی سنی قادری تھے، تاہم اس سختی میں لچک آتی تھی، کہ مجھ جیسے نرم و گرم سے بھی نباہ کر لیتے تھے،

پہلے گھر پر بدایوں میں پڑھنے پڑھانے کا شغل رکھتے تھے، ۱۹۳۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں مقرر ہو کر علی گڈھ منتقل ہو گئے تھے،

مرحوم کی دوستی کا ایک نادر تحفہ یہ تھا کہ جب ان کا جی چاہتا بدایوں کے پیڑے ڈاک سے اعظم گڈھ بھیجتے اور اس کے معاوضہ میں صرف ایک تشکر کا ہدیہ کافی سمجھتے، ان کا سب سے آخری خط مجھے بھوپال میں ملا جس میں اپنے ہونہار صاحبزادہ کا تعارف مجھ سے کرایا تھا، اللہ تعالیٰ ان صاحبزادہ کو علم دنیا کے ساتھ علم دین کا حصہ بھی عنایت کریں، اور اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر قائم رکھیں "س"

سیر انصار حصہ اول

اس میں انصار کرام کے حالات و سوانح اور ان کے علمی مذہبی، اخلاقی، اور سیاسی کارناموں کی پوری تفصیل کی گئی ہے، اس سے پہلے ایک بسیط مقدمہ میں انصار قبل از اسلام کی مفصل تاریخ، اُن کے نسب نامے، آداب و تمدن، اور معاشرت و اخلاق کو نمایاں کیا گیا ہے، اس طرح یہ حصہ انصار کی تاریخ قبل الاسلام اور بعد الاسلام کا ایک بہترین مجموعہ بن گیا ہے، طبع دوم ضخامت ۴۱۶ صفحے، قیمت حصہ دوم سے،

"منیجر"

ادبیات

خلیفۂ اول کا کفن

از جناب محمود اسرائیلی

وقتِ وصال احمدِ مرسلؐ کا یارِ غار ——— کہتا تھا عائشہؓ سے کہ نورِ نگاہِ من

جب تین چادروں میں پیمبرؐ ہوئے تھے دفن ——— اتنا ہی میرے واسطے کافی ہے بس کفن

اک چادر اور ہو مری میت کے واسطے ——— موجود میرے تن پہ ہیں دو چادریں کہن

کی عرض عائشہؓ نے کہ اے محترم پدر ——— اے مایہ دارِ خلقِ نبیؐ، نازشِ وطن

اے آسمانِ صدق کے تابندہ ماہتاب ——— اے محفلِ رسولؐ کے فانوسِ ضوفگن

اے بعد انبیاء کے جہاں افضل البشر ——— شاداب جس کے دم سے نبوت کا ہے چمن

اے منبعِ سخاوت و احسان و علم و زہد ——— اے معدنِ تدبر و دانائے علم و فن

اے وہ کہ جس کی ذات ہے بیکس کی پردہ دار ——— لیتا ہے جس سے جامۂ نو ہر برہنہ تن

یہ امر اقربا کو گوارا ہو کس طرح ——— اس کے کفن کے واسطے ہو چادرِ کہن

توفیق دی ہے ہم کو یہ ربِ کریم نے ——— تکفین کی غرض سے خریدیں نیا کفن

دختر کی التجا کا پدر نے دیا جواب ——— جو تھا فدائے شیوۂ سرکارِ ذوالمنن

اے نورِ دیدہ تجھ کو یہ اب تک خبر نہیں ——— ہوتا ہے ریم و خون ہی کی خاطر فقط کفن

زیبا ہیں جسم زندہ ہی کو جامہ ہائے نو ——— شایاں ہیں مردہ تن کے لئے جامۂ کہن

مطبوعات جدیدہ

حکومتِ الٰہیہ:- مترجمہٗ جناب رئیس احمد صاحب جعفری ندوی تقطیع اوسط ضخامت ۲۵۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ہے سکہ عثمانیہ عہ کلدار، پتہ:- نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدرآباد دکن،

حکومتِ الٰہیہ یعنی اسلامی نظام حکومت پر اردو مین بکثرت مضامین لکھے جا چکے ہین، اور بہت سی کتابین تالیف وترجمہ ہو چکی ہین، مذکورۂ بالا کتاب مصر کے ایک صاحب قلم عبد الوہاب خلاف انسپکٹر محاکم شرعیہ کی کی تالیف السیاستہ الشرعیۃ کا ترجمہ ہے، اس مین حسب ذیل ابواب ومباحث ہین، سخنہائے گفتنی اسلام اور سیاست عادلہ، اسلامی حکومت کا دستور وآئین، اسلام مین تدار واختیار، خلافت، حکومت، اسلام کا محکمۂ خارجہ یعنی غیر اقوام کے تعلقات کے قوانین، جنگی احکام، صلح وامن کے احکام، مالی نظام، حکومت کے مالی ذرائع اس کے مصارف، اس کا آمد وخرچ، جیسا کہ ان ابواب سے ظاہر ہے اس مین اسلامی نظام حکومت کے ان تمام شعبون پر جو کسی حکومت کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہین، بحث کی گئی ہے، یہ مباحث عالمانہ اور مبصرانہ ہین، خصوصاً پہلے دو باب جن مین اسلامی تعلیمات اور اسلامی نظام حکومت کے متعلق اصولی مباحث ہین، زیادہ اہم ہین، سخنہائے گفتنی مین بتایا گیا ہے، کہ اسلام کا قانون چونکہ دائمی اور ہر زمانہ کے لئے ہے اور ہر زمانہ کی ضروریات بدلتی رہتی ہین، اس لئے قرآن مجید اور احادیث نبوی مین جو اسلامی تعلیمات کا اصل ماخذ ہین، انسانی زندگی مختلف شعبون کے متعلق صرف بنیادی اور اصولی تعلیمات ہین، اور اس کی تفصیل مجتہدین کی راے پر چھوڑ دی گئی ہے، کہ وہ اپنے زمانہ کے حالات وضروریات کے لحاظ سے ان بنیادون

پر نئے مسائل کی تفریع اور ان کا استنباط کرتے رہیں، اور خلفاے راشدین صحابۂ کرام اور قرن اول کے ائمہ و مجتہدین کے عمل سے اس کی مثالیں دی گئی ہیں، اور اجتہاد کا دروازہ بند کر دینے کے اسباب اور اس کی خرابیان ظاہر کی گئی ہیں، دوسرے باب میں حکومت کے بارہ میں اسلام کے اصولی اور کلی قوانین کو بیان کیا گیا ہے باقی ابواب میں دوسرے اہم شعبون کی تفصیل ہے، ان میں دورِ جدید کے نقطہاے نظر اور ان کے نظامون اور دستورون کو خاص طور سے پیش نظر رکھا گیا ہے، اور بڑی حد تک صحیح اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے، لیکن اجتہاد و حق تشریع، اسلام میں اقتدار و اختیار شخصی حریت و آزادی، اور اس قبیل کے بعض دوسرے مسائل میں کہین کہین جدید اثرات نمایان ہوگئے ہیں، گو اُن کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی گئی ہے لیکن جس زور و قوت کے ساتھ مذکورۂ بالا امور کی حمایت کی گئی ہے، اس کے مقابلہ میں دفع دخل مقدر کا پلہ ہلکا ہے، اس پہلو سے قطع نظر اور تمام حیثیتون سے اردو میں اس موضوع پر جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں، ان سب میں یہ کتاب امتیازی حیثیت رکھتی ہے، لائق مترجم ایک مشاق صاحبِ قلم ہیں، اس لئے ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ ہے،

مسلم سماج از فاطمہ ثریا صاحبہ حمیدی تقطیع اوسط ضخامت ۲۳۰، صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد سے پتہ: حمایت نگر، بنگلہ نواب نثار یار جنگ بہادر حیدر آباد دکن،

آج کل تربیت کی خرابی اور غیر اسلامی ماحول کے اثر سے نوجوان تعلیم یافتہ لڑکون اور لڑکیون کو عموماً اپنے مذہب، روایات سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا، اُن کی روشن خیالی کی معراج مذہب سے آزادی، اور ان کی تعلیمی استعداد کا منظر ترقی پسند ادب اور حسن و عشق کی داستان سرائی ہوتی ہے، زندگی کی سنجیدہ پہلوؤن اور دینی و اخلاقی فرائض کی جانب ان کی نظر نہیں جاتی، لیکن ہر کلیہ میں مستثنیات ہوتے ہیں، مصنفہ بھی انہی مستثنیات میں ہیں، انھون نے مسلم سماج میں دنیوی اور دینی دونون پہلوون سے ایک مسلمان کی معیاری زندگی کو افسانہ کی شکل میں پیش کیا ہے، اور مذہب کا احترام، اس کی پابندی، جدید تعلیم کے ساتھ اسلامی

تربیت، اخلاق وسیرت کی اصلاح، مذہبی حقوق و فرائض کی ادائگی، دنیاوی ترقی کے اسلامی اصولوں جدوعمل، اور موجودہ دور کی محنت وسرمایہ کی کشمکش اور اس کے حل کو خوبی کے ساتھ دکھایا ہے یہ کتاب ہونہار مصنفہ کی پہلی قلمی کوشش، اور ایک اصلاحی افسانہ ہے، اس لیے اس کو ناول نگاری کے فنی معیار سے نہ دیکھنا چاہیئے، اس حیثیت سے وہ خامیوں سے خالی نہیں، لیکن جس مقصد سے لکھی گئی ہے، اس مین پوری طرح کامیاب ہے، امید ہے کہ مشق و مہارت سے انکی خامیان دور ہو جائین گی، اور ہونہار مصنفہ کی یہ کوشش قدر کی نگاہون سے دیکھی جائے گی،

بہار اور اردو شاعری از جناب محمد معین الدین صاحب دردائی ایم اے علیگ تقطیع چھوٹی، ضخامت :- ۱۶۵ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت اوسط، قیمت ۱۲؍ پتہ طیب حسن اینڈ برادرس اسلامیہ بک ڈپو آرہ،

دہلی اور لکھنو کے بعد اردو شاعری کا تیسرا مرکز عظیم آباد تھا، اور ہر دور مین یہان بڑے بڑے شعرا پیدا ہوئے، اور آج بھی بہار خوش گو شاعرون سے خالی نہیں ہے، مصنف نے اس کتاب مین بہار مین اردو زبان کی مختصر تاریخ بیان کی ہے، اور مرزا بیدل سے لے کر اس زمانہ تک ہر دور کے شعرا کا مختصر تذکرہ کیا ہے، اور ان کے کلام کا نمونہ دیا ہے، جس سے بہار مین اردو شاعری کی تاریخ کا سرسری اندازہ ہو جاتا ہے، کتاب مین طباعت و کتابت کے اغلاط کے علاوہ جس کا اعتراف خود مصنف کو ہے، اور بھی بعض غلطیان نظر آئین، مثلاً سطر کا سطر اڑا دیا گیا ہے" وہ بھی میرے شناسا نہ تھے اپنا پیام نجات کو" اس قسم کی فروگذاشتین اور بھی ہین،

عطر الوردین مرتبہ جناب حکیم سید محمد شعیب صاحب رضوی دعون احمد صاحب قادری تقطیع بڑی ضخامت ۴۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معتبر قیمت ۱۲؍ پتہ مولوی محبوب عالم صاحب خانقاہ مجیبی پھلواری شریف پٹنہ،

حضرت مولانا شاہ بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ امیر شریعت صوبہ بہار اور اُن کے جانشین مولانا شاہ محمد محی الدینؒ پھلواروی، علم و عمل اور شریعت و طریقت کی جامعیت کے ساتھ شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے، اور فارسی مین فکر وسخن فرماتے تھے، عطر اور دین ان کے کلام کا مجموعہ ہے لیکن شاعری کو انھون نے مشغلہ نہین بنایا، بلکہ تفنن طبع کے طور پر کبھی ادھر بھی توجہ ہو جاتی تھی، اس لئے ان کا کلام مختصر ہے، مگر جس قدر ہے، توحید و معرفت، اور حُبّ رسول کے جذبات سے لبریز ہے، اس لحاظ سے یہ مجموعہ اس بادہ کے لذت شناسون کے لئے صحیح معنون مین عطر اور دین کی حیثیت رکھتا ہے، امید ہے کہ وہ اس کی نکہت سے لطف اندوز ہون گے،

نمونۃ المعرب از پروفیسر سیف بن حسین القطبی ایم اے، پروفیسر احمد بن ناصر العیسری استاذ عربی عثمانیہ ٹرینگ کالج حیدرآباد دکن،

عربی زبان کے طلبہ کے لئے عرصہ سے ایک مستند "عربی اردو" اور "اردو عربی" لغت کی ضرورت محسوس ہورہی ہے، اوّل الذکر لغت کی ترتیب کا کام عرصہ ہوا دار المصنفین نے شروع کیا تھا، اور اس کا ایک حصہ لکھا بھی جا چکا ہے، لیکن ابھی پورا نہین ہوسکا ہے، خوشی کا مقام ہے، کہ "اردو عربی" لغت کی تدوین حیدرآباد دکن کے دو فاضلون نے جو غالبًا وہان کے متوطن عرب ہین، اور جن کو عربی زبان کے ساتھ اردو پر بھی پورا عبور ہے شروع کی ہے، اور اس کا مطبوعہ نمونہ اظہار راے کے لئے ہمارے پاس بھیجا ہے، اس مین الف، ب، پ اور گ کے اردو کے مفرد مرکب الفاظ، مصطلحات اور اُن کے عربی مترادفات کے نمونے ہین، جو محض ترجمہ نہیں بلکہ اہل زبان کی فصیح عربی ہے، اس لغت سے ایک بڑی کمی پوری ہوگی، اور اردو مین ایک مستند اور قابل اعتماد، اردو عربی لغت کا اضافہ ہوگا، جس سے عربی کے طلبہ کو بڑی سہولت ہو جائیگی، اس لحاظ سے فاضل مولفین کی علمی خدمت بڑی قابل قدر ہے،

"م"

تابعینؒ

مُرتّبہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور اُن کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمرؒ بن عبد العزیز، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمدؒ حنفیہ، حضرت سعیدؒ بن مسیب، حضرت سعیدؒ بن جبیر، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابنؒ شہاب زہری، امام ربیعۃؒ رائی، امام مکحولؒ شامی، قاضی شریحؒ، وغیرہ چھیانوے ۹۶ اکابر تابعینؒ کے سوانح، اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے۔

ضخامت:- ۵۶۰ صفحے،

قیمت:- چار روپیے،

"منیجر"

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہی مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہین پہلے مین ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہین اور ابتدا مین ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہی جس مین فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ مین تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات، اعمال وعبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہی تیسرے حصہ مین آپ کے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہی اس مین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثین کی گئی ہین، پھر ان معجزات کی تفصیل ہی جو بروایات صحیحہ ثابت ہین، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہی، چوتھے حصہ مین ان اسلامی عقائد کی تشریح ہی جو آپ کے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہین، کوشش کی گئی ہی کہ اس مین قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائین، پانچوین حصہ مین عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہی، اور دوسرے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے، چھٹے حصہ مین حقوق، فضائل اور آداب کے عنوانون اور اس کی ذیلی سرخیون کے تحت اخلاقی تعلیم کی تفصیل ہی،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول زیر طبع، حصہ دوم تقطیع خورد صہ وعہ، حصہ سوم تقطیع کلان للعہ، تقطیع خورد عہ، حصہ چہارم تقطیع کلان باختلاف کاغذ عہ و عہ، تقطیع خورد عہ، حصہ پنجم تقطیع کلان صہ وللعہ، تقطیع خورد صہ و عہ، حصہ ششم تقطیع کلان عہ، للعہ، تقطیع خورد عہ و عہ،

(پرنٹر و پبلشر صدیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۱ جون سنہ ۱۹۴۸ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت :- چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

دارالمصنفین کی نئی کتاب

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈہ

ہندوستان مین مسلمانون کا پہلا قافلہ سندھ مین اترا تھا، اوران کی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہان حکمران رہے، آج بھی سندھ کے درودیوار سے اُن کے آثار نمایان ہین، لیکن اس کے باوجود اُردو مین اسلامی سندھ کی کوئی مفصّل ومحققانہ تاریخ موجود نہین تھی، دارالمصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین یہ جامع ومحققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ اور ان تمام دورون کے نظام حکومت، علمی وتمدنی حالات، اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت مین شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہان ایک نئی حکومت کی بنیادین استوار ہو رہی ہین،

ضخامت :- ۴۰۰ صفحے،

قیمت :- چھ روپیے،

"منیجر"

جلد ۶۱ ماہ رجب المرجب سنہ ۱۹۴۸ء مطابق ماہ جون سنہ ۱۹۴۸ء عدد ۶

مضامین

شذرات

انگریز فلسطین سے اپنا دامن چھڑا کر الگ ہو گئے، لیکن انھون نے آج سے تیس سال پہلے فساد کا جو بیج بویا تھا، وہ رنگ لا کر رہا، اور اس مقدس سرزمین مین عرب اور یہود کی جنگ شروع ہو گئی، اگر امریکہ اور یورپ کی حکومتون کا قدم درمیان مین نہ ہوتا، تو عرب تنہا اس کا فیصلہ کر لینے کے لئے کافی تھے، لیکن ان تمام حکومتون کے سیاسی اور اقتصادی مفاد فلسطین سے وابستہ ہین، اس لئے وہ غیر جانبدار نہین رہ سکتین، امریکہ مشرقِ وسطیٰ مین انگریزون کی جگہ لینا چاہتا ہے، اور اس کی حکومت و سیاست پر یہودی ساہوکارون کا بڑا اثر ہے، اس لئے وہ ان سے الگ نہین ہو سکتا، لیکن عربون کی علانیہ مخالفت بھی اس کے مصالح کے خلاف ہے، اور اس کی زیادہ مداخلت یورپ کی حکومتین بھی برداشت نہین کر سکتین، اس لئے نہ وہ کھل کر میدان مین آسکتا ہے، اور نہ یہودیون کی حمایت سے دست کش ہو سکتا ہے، اس کا حریف روس بھی اس میدان مین اس سے پیچھے نہین رہنا چاہتا، اسی لئے قومون کی آزادی کے دعوی اور سرمایہ دشمنی ہونے کے باوجود وہ سرمایہ دار صیہونی حکومت کی حمایت پر مجبور ہے، صرف ایک برطانیہ کا رویہ اس کے مصالح کی بنا پر عربون کے خلاف نہین ہے، ان سطور کی تحریر کے وقت تک عربون کا پلہ بھاری ہے، اور عرب حکومتین جس اتحاد و یکجہتی اور جانفروشی سے لڑ رہی ہین اور جس طرح بڑھ رہی ہین، اگر حفاظتی کونسل اور امریکہ اور یورپ کی حکومتین مداخلت نہ کرین تو یہودیون کی شکست یقینی ہے، لیکن حفاظتی کونسل مختلف بہانون سے مداخلت کر رہی ہے، اور جب تک اس کا اور دوسری قوتون کا رویہ واضح نہ ہو جائے، اس وقت تک آخری نتیجہ کے متعلق کوئی صحیح پیشینگوئی نہین کی جا سکتی،

فلسطین اسلام کے پہلے داعی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا مدفن اور مسلمانون کا پہلا قبلہ ہے، مسجد حرام اور مسجد نبوی کے بعد اُن کی تیسری مقدس مسجد مسجد اقصیٰ جہان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی یہین ہے، اس کے بہت سے صحابۂ کرام، تابعین و تبع تابعین اور دوسرے اکابر و ائمۂ اسلام اس سرزمین مین آسودۂ خواب ہین، اس لئے مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کے بعد ان کا تیسرا مقدس شہر بیت المقدس ہے، اس کی سیاسی حیثیت بھی کم اہم نہین، مسلمان صدیون تک اس سرزمین کے حکمران رہے، اور اس زمانہ مین جب یہودیون کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، اور وہ ساری دنیا مین بے خانمان پھر رہے تھے، مسلمانون نے اس کی حفاظت و پاسبانی کا فرض انجام دیا، اس کے ایک جانب بحر روم

تین سمتون مین عرب حکومتین ہین، اوراب یہودی اپنی دولت کے بل پر اور امریکہ کی مدد کے سہارے فلسطین کے عربون کی جن مین مسلمان اور عیسائی دونون شامل ہین، آزادی چھیننا چاہتے ہین، اگر یہان صیہونی حکومت قائم ہوگئی تو نہ صرف فلسطین کے عرب اور عیسائی محکوم ہو جائین گے، بلکہ اس کی ہم سرحد عرب حکومتون کے لئے بھی دائمی خطرہ پیدا ہو جائے گا، اس لئے فلسطین کا مسئلہ مذہبی اور سیاسی دونون حیثیتون سے مسلمانون کے لئے نہایت اہم ہے،

انگریزی حکومت کے زمانہ مین جب کہ ہندوستانیون کو بیرونی معاملات مین مداخلت کی پوری آزادی نہ تھی، یہان کے مسلمانون نے اسلامی حکومتون سے متعلق اپنے فرض کی ادائگی مین کبھی کوتاہی نہین کی، اور اب جب کہ وہ آزاد ہین، عربون کی ہر ممکن مدد کرنا ان کا فرض ہے، ایک حیثیت سے ہندوستان سے بھی اس کا تعلق ہو جاتا ہے، فلسطین مین صیہونی حکومت کے قیام کے معنی شرق وسطیٰ مین جو مشرق و مغرب کا درمیانی دروازہ ہے، بالواسطہ امریکہ اور یورپ کے اقتدار کے ہین، اور یہودیون اور عربون کی جنگ صیہونی آمریت اور عرب جمہوریت کی جنگ ہے، اس لئے بحیثیت جمہوری اور ایشیائی حکومت کے عربون کی حمایت کرنا انڈین یونین کا بھی اخلاقی فرض ہے،

ایک طرف کانگریس ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی اور باہمی رواداری اور فیاضی کا دعا کہتی ہے، دوسری طرف اس کے ذمہ دار اشخاص فتنہ انگیزی مین مشغول ہین، حال مین صوبائی اسمبلی اور کانگریس کے صدر ٹنڈن جی نے جو تقریرین کی ہین، وہ نہ صرف کانگریس کے اصولون اور ملکی مصالح کے خلاف بلکہ حد درجہ شر انگیز ہین، ان تقریرون مین انھون نے ہندوستان و پاکستان کی تقسیم اور اس سلسلہ کے خونین واقعات کو نہایت اشتعال انگیز طریقہ سے دہرایا ہے، اور مسلمانون سے ہندی زبان کے ساتھ ہندو کلچر کے جبری قبول کرنے کا مطالبہ کیا ہے، اور اردو زبان کو پیدائش کے علاوہ ہر حیثیت سے غیر ملکی، دو کلچرون کی تفریق اور ہندوستان و پاکستان کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے، اور تنہا ہندی کو ہندوستان کی مشترک زبان اور ہندوستانی کلچر کی نمائندہ قرار دیا ہے، ان کو ہندوستان مین ہندی زبان اور ہندو کلچر کے علاوہ اور کسی زبان اور کلچر کو دیکھنا گوارا نہین،

اس سے قطع نظر کہ کانگریس کے ایک ذمہ دار کی زبان سے اس قسم کی تقریرین کہان تک مناسب ہین، یہ حقیقت واقعہ کے علم و تحقیق اور منطق و استدلال کے لحاظ سے بھی نہایت مہمل ہین، اچھا برا جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، اب اس کو عوام کے سامنے بار بار دہرانے سے ان مین اشتعال انگیزی اور منافرت پھیلانے کے سوا کچھ حاصل نہین، اردو کو غیر ملکی زبان کہنا

اس سے ناواقفیت کا ثبوت ہے، یا صریح جھوٹ ہے اس کی تردید میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، خود مصنف مزاج ہند تک اس کے جوابات دیکھ چکے ہیں، اس لئے اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں، اردو پر دو کلچروں کی تفریق اور ہندوستان کی تقسیم کا الزام لگانا اس سے بھی زیادہ مضحکہ انگیز ہے، اب تک تو اس کو مسلمہ طور پر دونوں کلچروں کے اختلاط کی پیداوار اس کا زندہ نمونہ اور ہندو مسلم اتحاد کی سب سے بڑی نشانی سمجھا جاتا تھا، ٹنڈن جی کا یہ انکشاف بالکل نیا اور یہ دعویٰ بالکل نرالا ہے،

خرد کا نام جنون پڑ گیا جنون کا خرد   جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

پھر ہندوستان میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں، مرہٹی، گجراتی، سندھی، پنجابی، بنگالی، تامل، تلگو، کنڑی، ملیالم وغیرہ اور آخر الذکر زبانیں تو اردو سے کہیں زیادہ ہندی سے دور اور اس سے مختلف ہیں، اور اس کے بولنے والے ہندو انھیں چھوڑ کر ہندی کو اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہیں، اور اس کی مخالفت میں جیل تک جا چکے ہیں، ایسی حالت میں تنہا ہندی ہندوستان کی مشترک زبان اور ہندو کلچر کی نمایندہ کس طرح ہو سکتی ہے،

رہا ہندوستانی اور بیرونی کلچر کا سوال تو ہندوستانی مسلمانوں کا کلچر خالص اسلامی کب ہے، وہ تو ہندو مسلم کلچر کا مرکب ہے، مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کا کون سا شعبہ ہندو کلچر کے اثر سے خالی ہے، اس کا تو خود یہ حال ہے:-

ع قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

لیکن اگر ٹنڈن جی کو بیرونی اثرات سے ایسی ہی چھوت ہے، تو وہ اُن کو کس کس چیز سے مٹائیں گے، ہندو مذہب تک اس سے پاک نہیں ہے، یہ مورتی پوجا کی مخالفت، آریہ سماج اور برہمو سماج کی تحریکیں، اچھوت ادھار، مساوات کی تعلیم، طلاق اور لڑکیوں کی وراثت کے قوانین اور اس قسم کی دوسری اصلاحات کس شاستر میں ہیں، اور کس کے اثرات ہیں؟

ع دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ۔ ٹنڈن جی اس زمانہ میں تو ہندوستان کے قدیم طریقہ کے مطابق کھانا تک نہیں کھا سکتے تو اور چیزوں کا کیا ذکر ہے پھر ساری بیرونی اثرات کو مٹانے کے بعد ہندوستانی تہذیب کیا باقی رہ جائیگی، اور ہندوستان کا حشر کیا ہوگا، یہ طعن و طنز نہیں ہے بلکہ مختلف قوموں اور تہذیبوں کے اختلاط سے ایک دوسرے کا متاثر ہونا بالکل طبعی ہے جس سے کوئی قوم بھی مستثنیٰ نہیں، خود مسلمانوں میں کتنے ہندوانہ رسوم رائج ہیں، دوسری تمدنوں کے صالح اجزاء کو قبول کئے بغیر کوئی تمدن ترقی نہیں کر سکتا،

ہندو مسلمانوں کا مشترک تمدن تو ایک ہزار سال پرانا ہے، اور بہر حال مشرقی ہے جس کے بہت سے عناصر خالص ہندی ہیں، ٹنڈن جی تو مغربی تمدن کے اثرات کو بھی جو خالص بدیسی ہے جس کو ہندوستانی کلچر سے کوئی علاقہ نہیں اور اس کی عمر بھی ہندوستان میں نسبۃً بہت کم ہے نہیں مٹا سکتے انڈین یونین کا سارا کارخانہ اسی پر قائم ہے ایسی حالت میں اس تمدن کو مٹانے کا تصور جو صدیوں سے ہندوستان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے خیال خام سے زیادہ نہیں ٹنڈن جی کو ان اوہام کو چھوڑ کر ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی بھلائی کا صحیح راستہ اختیار کرنا چاہئے، وہ زجر خوانی تو بہت کر چکے، اب ذرا مہر و محبت کے زمزمہ کا بھی تجربہ کر لیں،

مقالات

تجدید تعلیم

از جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی

(۴)

الغرض کوئی اور سمجھے نہ سمجھے، مگر مسلمان کو اس کے سوا سمجھنے کا حق ہی کیا ہے، کہ رزق یا معاش کی تنگی و فراخی قبض و بسط، عطا و منع بالکلیہ مشیتِ الٰہیہ پر منحصر ہے، انَّ ربّکَ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر، اَوَلَمْ یعلموا انّ اللہ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر، وغیرہ کثیر آیات نے اس باب میں کوئی شک و شبہہ کی گنجایش نہیں چھوڑی ہے، کہ رزق کے ظاہری اسباب بس ظاہری سے زیادہ نہیں، اس نے غیروں کی طرح ان میں اتنا غلو دنا کہ گویا اسباب و تدابیر ہی حقیقی رازق ہیں، نہ اسلام ہے نہ اسلام کے خدا پر ایمان، اور نہ حقیقی اسلام اور نہ حقیقی مسلمانوں کی تاریخ و زندگی ہی سے اس کی شہادت ملتی ہے، یہ تو دراصل زبان سے خدا کا اقرار اور عمل سے اپنی خدائی کا اعلان ہے، اس قسم کے تصورات کو جب تک دماغ بدر نہ کیا جائے، اس وقت تک اسلام کی دینی و دنیوی برکات انفرادی و اجتماعی ثمرات کی توقع کا حق ہی کیا حاصل ہے،

یہ تو اس سوال کی کہ عربی یا دینی تعلیم حاصل کرکے کھائیں گے کیا؟ بڑی خطرناک ایمانی و اعتقادی غلطی تھی، ایک دوسری بڑی خود فریبی اور مغالطہ یہ ہے کہ کھانے سے مراد ضروریاتِ زندگی سے زیادہ فضولیاتِ زندگی ہوتی ہیں، یعنی ہم نے کھانے پینے، رہنے سہنے، شادی بیاہ، مکان و سامانِ زندگی کے تمام جاری و وقتی مصارف کا ایک خود ساختہ معیار مقرر کر رکھا ہے، جب تک وہ پورا نہ ہو اس وقت تک ہم سمجھتے، اور کہتے ہیں، کہ کھانے ہی کو نہیں مل رہا ہے، حد یہ کہ امراء تک سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ آخر آپ کو اس کی

کیا حاجت ہی کہ دینی تعلیم سے محروم رکھ کر اولاد کو بھی ڈاکٹری کے لئے دنیاوی تعلیم دلاتے ہیں، تو جواب یہی ملتا ہے، کہ اگر ہماری آمدنی زیادہ ہے، تو ہماری حیثیت و مصارف بھی تو ویسے ہی ہیں یعنی اس حیثیت جاہ و مال کو موجودہ آمدنی میں اضافہ اور جاہی مناصب حاصل کئے بغیر کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے!! یہ ایسی منطق ہے کہ جاہ و مال کے کسی اونچے سے اونچے مقام پر پہنچ کر بھی لاجواب نہیں ہو سکتی!

ورنہ ابھی عالمگیر حب جاہ و مال کی اس عالمگیر جنگ سے پہلے اسی ہندوستان میں زندگی کی نفس ضروریات پانچ سات روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھیں، یعنی چھوٹے بڑے چار پانچ آدمیوں کے گھر کے لئے بیس تیس ماہوار نفس ضروریات کی حد تک بلا کسی تکلیف و تنگی کے کافی ہوتے تھے، اور بہتیرے مولوی بلکہ اچھے اچھے علما اس سے بھی کم میں گذر فرماتے تھے، خود حضرت علیہ الرحمہ کی تنخواہ کانپور میں پچیس ۲۵ روپیہ ماہوار تھی، جو حضرت کے علم و عمل کے کمالات کے لحاظ سے کیا تھی، پھر بھی حضرت نے اس کو بہت بڑی تنخواہ سمجھا تھا، اور فرماتے کہ

"میں طالب علمی میں سوچا کرتا تھا، تو زیادہ سے زیادہ دس روپیہ ماہوار کی رقم اپنی ضروریات معاشی کے لئے کافی سمجھتا تھا، (اس میں بھی) پانچ روپیہ اپنے خرچ کے لئے اور پانچ گھر کے خرچ کے لئے، اس سے زیادہ کی تنخواہ پر کبھی نظر ہی نہ جاتی، نہ اس سے زیادہ کا اپنے کو مستحق سمجھتا" (اشرف السوانح حصہ اول ص ۴۷)

خود راقم ہذا کو اپنے گھر کا تجربہ ہے کہ والد مرحوم دیہاتی وہ بھی نہایت قانع و متوکل طبیعت کے واقع تھے، خرچ اوسطاً ۱۰۔ ۱۲ آدمیوں کا، اندر باہر ایک آدھ نوکر چاکر بھی، کھانے پینے رہنے سہنے، شادی بیاہ سب کا معیار اوسط درجہ کے شرفا اور اہل برادری کا، مگر آمدنی کا اوسط شاید ہی کبھی ۳۰۔ ۴۰ سے بڑھا ہو، نہ آمدنی میں ترقی کی کبھی کوئی فکر فرمائی، البتہ اللہ اور اللہ والوں سے تعلق میں ترقی کی فکر آخر دم تک رہی حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و اجازت کے باوجود اُن کی وفات کے بعد

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے آخر تک برابر اصلاح و استفادہ کا تعلق جاری رہا، زیادہ عبرت و سبق کی بات یہ کہ گھر بھر مین چھوٹے بڑے سب کو قلب کی جو راحت و طمانیت یا دل کا جو سکون چین نصیب تھا، وہ اس نالائق نام لیوا اور اُس کے متعلقین کو سیکڑون ہزارون کی آمدنی اور کوٹھی و موٹر مین بھی میسر نہ ہوا، ہان گھر بھر مین والد علیہ الرحمہ کے اس رنگ و برکت کا وارث والدہ مدظلہا کا دم رہ گیا ہے (رب ارحمہما کما ربیانی صغیرا) برکت کی حقیقت بھی ان اللہ والے والدین ہی کی زندگی و آمدنی کو دیکھ کر سمجھ مین آئی،

باقی اپنی سیکڑون ہزارون کی آمدنی کوٹھی موٹر نوکر چاکر سب کے چوتھائی صدی کے تجربات کی میزان اپنے ایک حکیم و حکیم طبع استاد (مولانا شیر علی صاحب مرحوم) کے ایک بڑے ہی حکیمانہ نقرہ کے سوا کچھ نہ نکلی، مولانا ندوہ مین جب راقم الحروف آخری جماعت مین تھا، صدر مدرس و مہتمم تھے، پھر جامعہ عثمانیہ مین شعبۂ دینیات مین علم کلام کے استاد مقرر ہوگئے تھے، مشاہرہ چھ سو ماہوار تھا، ابھی تک موٹرون کے بجائے گھوڑا گاڑی ہی کا چلن وہان زیادہ تھا، اکثر عہدہ دار اپنی گھوڑا گاڑی رکھتے تھے، مولانا کے پاس بھی تھی جس پر یونیورسٹی تشریف لاتے تھے، کچھ دن بعد دیکھا کہ ایک کرایہ کی گاڑی پر تشریف لانے لگے، عرض کیا کہ حضرت گھر کی گاڑی کیا ہوئی ؟ فرمایا نکال دیا، دو گھنٹے مین اس پر سوار ہوتا تھا، چوبیس گھنٹے وہ میرے اوپر سوار رہتی تھی "!

اس وقت تو یہ حکیمانہ بات سمجھ مین نہ آئی، اور مولانا کی پیرانہ سالی اور کم ہمتی کا تقاضا معلوم ہوئی، لیکن اس کے بعد خود گھوڑا گاڑی بھی رکھی، موٹر بھی رکھا، سو ماہوار تک کی کوٹھی بنگلہ کا بھی مزا چکھا، لکھنؤ مین ایکڑ بھر زمین مین خود اپنی دو منزلہ لمبی چوڑی کوٹھی بنائی لان اور پھلواری، نوکر چاکر، سامان اور فرنیچر سب ہی کا ٹھاٹ اپنی حیثیت و حوصلہ سے بڑھ کر دیکھا دکھلایا، مگر خدا کو گواہ کرکے گواہی دیتا ہون کہ جیسا جیسا حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی جوتیون کے تعلق سے کچھ عقل ٹھکانے لگی ویسا ویسا

اس سارے فخر و نمایش کے ساز و سامان کو راحت و آسایش سے زیادہ خود اپنے دل و دماغ پر سوار پانے لگا، اور بالآخر کچھ عرصہ بعد حیدرآباد ہی میں جب ایک محب و محسن کی ہمت و احسان سے جامعہ کے قریب ایک نو تعمیر مسجد کے احاطہ ہی میں خاص راقم الحروف احقر کے لئے دو حجرے تیار ہو کر ان میں قیام نصیب ہوا، تو بلا مبالغہ ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ دل و دماغ قید کی کوئی بڑی سزا جھیل کر باہر آگیا ہے، اور آج بھی لکھنؤ کی ذاتی طویل و عریض کوٹھی میں بیٹھ کر حیدرآباد کی کوئی چیز یاد آتی ہے، تو شہر و شہرت سے دور مسجد اقصیٰ[1] کے یہی دو حجرے اور اسی زاویہ کے دو چار انے گنے عنایت فرما، لکھنؤ کی اپنی کوٹھی کا معاملہ بھی دارم چراغ چشم کا ہو رہا ہے، ورنہ اب کوٹھی کے بجائے کوٹھری ہی کو دل ڈھونڈتا ہے، یہ تو آپ بیتی تھی، جگ بیتی بھی جو کچھ وطن و دکن ہر جگہ دیکھی، اور بیتی، وہ یہی کہ بڑے بڑے عہدہ دار اور بلند مناصب وزرا، و امرا بظاہر جاہ و مال سب کچھ رکھ کر بھی رہتے سینہ کے اندر مزید جاہ و مال کے مقابلہ و مسابقت کی بھٹی دہکتی رہتی ہے اور بالعموم اسی کے انگاروں میں لوٹتے لوٹتے دم نکل جاتا ہے،

یہ اپنی پرانی بظاہر طویل داستان اپنے مقصد و مفاد کے اعتبار سے طویل نہیں قصیر ہی ہے، اس لئے کہ دنیا کی جس طلب میں دین و آخرت کا ہوش نہ رہے، جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ جاتے، دوزخ و جنت کا خوف و شوق دل سے نکل جائے، خدا کی رضا و ناراضی کا غم نہ ہو تو یہ تو (معاذ اللہ) مومن و ایمان کے منافی، کافر و کفر کی دنیا کے سوا کیا ہے، اور یہ دنیا کی طلب نہیں، دنیا کا عشق بلکہ جنون ہے، بقول حضرت علیہ الرحمۃ کے کہ کسب دنیا یا دنیا کے کمانے کا مضائقہ نہیں، مگر یہ نہو کہ اس میں بالکل کھپ جائے کہ گویا خدا تعالیٰ سے بالکل واسطہ ہی نہیں، یہ تو کافر ہی کی زندگی کی خاص شان ہے، کہ گویا خدا سے

---

[1] یہ مسجد شہر کے بالکل کنارے دور (جو لفظ اقصیٰ کے معنی ہیں) واقع ہے، جہاں اب جامعہ کی بدولت کچھ آبادی ہو چلی ہے، مولانا گیلانی احقر کے سالہا سال کے رفیق قیام و طعام بھی اسی مسجد کے جوار میں تشریف فرما ہیں اور اس مسجد کا "مسجد اقصیٰ" نام تو ایک اور دوست نے تجویز کیا تھا، مگر اس کا تاریخی نام ثابت ہونا مولانا ہی کی یادگار ہے۔

کوئی واسطہ نہیں،

اور مومن کی زندگی کی خاص شان یہ ہے کہ وہ اس دنیا سے بس مسافر اور سرائے کا سا تعلق رکھتا ہے، باقی فکر و عمل جد وجہد کا اصل تعلق خدا و آخرت سے ہوتا ہے، اور دنیا میں جو ہم یہ چاہتے ہیں، کہ یہ بھی ہو جائے وہ بھی ہو جائے، یہ حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں،

"ایسا ہی ہے، جیسے کوئی سرائے میں یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ فانوس سب لگا دئے جائیں اور پھر اپنی کمائی سے خرید کر لگا بھی دئے، تو ظاہر ہے کہ کتنی بڑی حماقت ہے، خاص کر جب یہ بھی حکم ہو، مثلاً اس سرائے میں چار دن سے زیادہ کوئی قیام نہیں کر سکے گا، اس وقت تو اپنی کمائی وہاں کی زمین میں لگانا پورا خلل دماغ ہے۔ اور دنیا ایسی ہی محدود قیام کی سرائے ہے کہ اس حد کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا، تو اول تو سرائے میں قیام اگر اختیاری بھی ہو، تب بھی یہی ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے، اور جب اختیاری بھی نہیں تب تو ہرگز بھی اس میں دل نہ لگانا چاہیے،

اور یہی معنی ہیں میرے نزدیک الدنیا سجن المومن کے، لوگوں نے اس حدیث کے مختلف معنی لئے ہیں، اگر میں کہتا ہوں کہ جیل خانہ تکلیف وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا، بلکہ اسلئے کہ جیل خانہ میں جی کبھی نہیں لگا کرتا، خواہ کیسا ہی عیش ہو، تو مسلمان کی شان ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے، اگرچہ بظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو، کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے اور دنیا گھر نہیں، پھر جب جی نہ لگے گا، تو کیوں ہوس ہوں گی، اور کیوں سوچیگا کہ یوں ہو اور یہ ہو، اور وہ ہو، بلکہ اب یوں سوچے گا کہ دنیا تو پردیس ہے، یہاں جس طرح بھی گذر جائے اور دنیا کی بجائے آخرت کی سوچ ہونی چاہئے، اور یہ سوچے گا کہ اگر یہ سامان ہو گیا، تو پھر وہاں یوں بہار ہو گی، یوں عیش ہو گا، ورنہ یوں پریشانی ہو گی، یوں مصیبت ہو گی،

(انفاس عیسیٰ)

لیکن ہماری زندگی اس کے برتاؤ اور معاملات سے (اِلّا ماشاء اللہ) بس ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ

"جیسے کوئی منکر آخرت ہو، کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے، آخرت کی نہین، نہ اس کا اتنا شوق ہے، چنانچہ دلون کو ٹٹول کر دیکھ لین کہ دنیا مین قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہین، کہ یون رہین گے، یون کرین گے، جائداد ہوگی، ملازم ہون گے، ڈپٹی کلکٹر ہون گے، وغیرہ وغیرہ؛

"اب انصاف سے دیکھو کہ آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی امنگین ہوتی ہین، کہ مرجائین گے تو خدا کے سامنے جائین گے، یون جنت ہوگی، اس مین باغات ہون گے، مکانات ہونگے حورین ہون گی، نعاذاً کبھی یہ امنگین نہین ہوتین، بلکہ خیال بھی بہت کم آتا ہے"،

"بعض ایسے ہین جن کے پاس دنیا کی خوشی کا کوئی سامان نہین، اور وہ یون کہیں گے کہ صاحب ہم تو دنیا کی خوشیان نہین مناتے، بلکہ ہم تو سوچا کرتے ہین، کہ کوئی والی وارث نہین، زندگی کیسے کٹے گی، تو اُن سے یہ شکایت ہے کہ جیسے تم نے دنیا دی زندگی کو سوچا کبھی آخرت کو بھی سوچا، اور وہان کی مصیبت کا بھی خیال کیا کہ وہ زندگی کیسے کٹے گی، دوزخ مین جانا پڑا، تو وہ مصیبت کیسے سہی جائے گی، پھر جیسے یہان تکلیف کو سوچکر تدبیر سوچتے ہو، کہ شاید فلان تدبیر سے یہ تکلیف کٹ جائے، یا فلان تدبیر سے مشکل آسان ہوجائے، ایسے کبھی آخرت کی مصیبت کے لئے بھی سوچا،

"حالانکہ دنیا کے مصائب بعض ایسے ہین، جن کی کوئی تدبیر ہی نہین، اور اس لئے اس کو سوچنا ہی عبث ہے، مگر پھر سوچتے ہو، اور آخرت کی کوئی مصیبت بھی ایسی نہین جو لاعلاج ہو، بلکہ ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے، لیکن پھر اس کا ذکر نہ فکر، (الرفیق ص ۴۳و۴۴)

خدا و آخرت سے بے تعلقی و بے فکری کا یہ حال صرف عام دنیا دارون ہی کا نہین، جو لوگ اپنے کو دیندار سمجھتے اور سمجھے جاتے ہین، اُن کا حال بھی اس معاملہ مین کچھ بہتر نہین، ارشاد ہے کہ

"دنیادار تو الگ رہے، دینداروں کو بھی آخرت کے متعلق نہ اُمنگین پیدا ہوتی ہین، نہ اندیشے" حالانکہ خدا تعالیٰ صاف صاف فرماتے ہین، یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ و لتنظر نفس ما قدمت لغد،

پھر جو لوگ علم بھی دنیا کا نہین دین ہی کا حاصل کرتے ہین، ان کو بھی اگر دین و آخرت کی اُمنگون اور اندیشون کے بجائے اس کی فکر دامنگیر رہے، کہ کھائین گے کہان سے تو یہ کیسے ظلم و حسرت کی بات ہے، اُن کی زندگی تو اُمت کے لئے مثالی اُسوہ ہونا چاہئے، اور ان کا اُسوہ حسنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہونا چاہئے، کہ حضور کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے کیسی زندگی پسند و مامور تھی، اس کا اندازہ اس سے کرو کہ لوگون کی آسودہ حالی سے متاثر ہو کر ازواج مطہرات کو بھی کچھ طبعًا اس طرف میلان ہوا، اور حضور سے کچھ مزید نان و نفقہ اور سامان کی درخواست کی، جو حضور کے قلب مبارک پر اتنی گران گذری کہ ایک مہینہ گھر مین نہ جانے کی قسم کھالی، بالآخر یہ آیت اُتری:

یا ایہا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیوۃ الدنیا و زینتہا فتعالین امتعکن واسرحکن سراحا جمیلا وان کنتن تردن اللہ ورسولہ والدار الآخرۃ فان اللہ اعد للمحسنات منکن اجرا عظیما

(احزاب ع ۴)

(خلاصہ یہ کہ حضور کو امر ہوا کہ صاف صاف اپنی بی بیون سے فرما دین کہ اگر تم کو دنیا اور اس کا ساز و سامان مطلوب ہے تو میرا تمھارا نباہ نہین ہو سکتا، اور اگر تم خدا و رسول کی رضا و خوشنودی اور آخرت کے مراتب و انعامات کی طالب ہو تو ایسی نیک بی بیون کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخرت مین عظیم الشان اجر و

ازواجِ مطہرات تا آخر ازواجِ مطہرات تھیں، سب کی آنکھیں اتنی تنبیہ ہی سے کھل گئیں، اور پھر مدت العمر حضورؐ کے ساتھ خوشی خوشی فقر و فاقہ میں گذار دی، کیونکہ حضور کے ہاں بار ہا فاقہ ہو جاتا تھا، قرض لینے کی نوبت آجاتی تھی، اور حضورؐ کا یہ فقر و فاقہ اضطراری نہیں بالکل اختیاری تھا، جس کو حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ نے فقر صادق سے تعبیر فرمایا ہے:۔

"جس کی علامت یہ ہے کہ اس کے ساتھ دلچسپی ہو، اور دلچسپی اس کو کہتے ہیں، کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فقر محبوب تھا، حتیٰ کہ اپنی اولاد کے لئے بھی اس کو قولاً وعملاً اختیار کرکے دکھلایا، قولاً تو یہ کہ خدا سے تعالیٰ سے دعا کی،

"اللّٰھم اجعل رزق آل محمد قوتاً، اے اللہ محمد کی اولاد کو رزق بس بقدر گذر اوقات عطا فرما،"

اور عملاً یہ کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو سب خاندان سے زیادہ محبوب تھیں لیکن اس مرتبہ جب اُن کے ہاتھوں میں چکی چلانے سے چھالے پڑ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمانے سے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کسی لونڈی غلام کی .... درخواست کی، تاکہ کچھ مدد ملے، آپ نے فرمایا کہو تو لونڈی غلام دوں، کہو تو اس سے بھی اچھی چیز دوں، یہ سُن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پھر نہ پوچھا کہ وہ اچھی چیز کیا ہے، بلکہ فوراً عرض کیا کہ اچھی چیز ہی دیدیجئے، آپ نے فرمایا سوتے وقت سبحان اللہ تینتیس بار، الحمد للہ تینتیس بار اور اللہ اکبر چونتیس بار پڑھ لیا کرو، بس یہ لونڈی غلام سے بہتر ہے، اس خدا کی بندی نے خوشی خوشی قبول کر لیا، تو دیکھئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فقر محبوب تھا، تو اپنی اولاد کے لئے اس کو تجویز کرکے دکھلا دیا،

(المرفیق ص ۳ و ۴)

اور جواولاد کے لئے محبوب تھا، محبوب اصل میں وہی امت کے لئے بھی تھا، جیسا کہ اس عمومی ارشاد سے ظاہر ہے کہ

مَنْ اصبح منکم معافی فی جسمہ	یعنی جس کو جسم کی صحت وعافیت، اور
وامنا فی سربہ عندہ قوت	دل کا امن وچین نصیب ہو، اور ایک
یومہ فکانما حیزت لہ الدنیا بحذافیرھا	دن کا کھانا پاس ہو تو گویا ساری دنیا جمع ہو گئی،

البتہ یہ ضعفائے اُمت کے حال پر ارحم الراحمین ورحمۃ للعالمین کی شان رحمت تھی، کہ جائز حد تک دنیا کے کسب و طلب کی اجازت واباحت فرمادی، لیکن دنیا کا ایسا عشق وجنون کہ جیسے کوئی منکر آخرت ہو، یا جیسے خدا سے کوئی واسطہ ہی نہیں، اس کی اگر اجازت ہو تو پھر دین ودنیا کا فرد مومن کا جھگڑا ہی کیا رہا،

(۱) الغرض اسلامی دینی زندگی کے لئے سب سے مقدم یہ ہو کہ ہر کام میں یوم دین اور مالک یوم دین سے معاملہ دواسطہ پیش نظر ہو، اس کے بعد دنیا دی زندگی کے سارے مسائل ومشکلات از خود حل وسہل ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ ان کی قدر وقیمت وزن واہمیت ہی مستقل مسائل ومقاصد کی نہیں رہجاتی، نہ اپنی سعی وعمل کا سارا زور کوئی ہوشمند اس دنیا کے کھانے پینے، عیش وآرام پر اس طرح لگا دینے کو راضی ہو سکتا ہے، کہ ساری جدوجہد اسی ادنیٰ یا خسیس وحقیر زندگی میں گم ہو کر رہ جائے، اور پھر حُسن فہم یہ کہ ہم بڑا کارنمایاں انجام دے رہے ہیں ضل سَعْیُھُمْ فی الحیوٰۃ الدُّنیا وھُمْ یحسبُون انھُمْ یحسنون صنعًا، یہ تو بقول حضرت علیہ الرحمہ کے ویسا ہی خلل دماغ ہوگا، جیسا کوئی شخص کسی منزل مقصود کو بھلا کر ڈرائنگ روم اور ہوٹل یا مسافرخانہ اور سرائے کے چند ساعت یا چند دن کے قیام کے لئے اپنے فکر وعمل کی ساری قوت اس کی زینت وراحت پر خرچ کر ڈالے، سرائے وسفر میں تو آدمی کو اگر دو ایک وقت کھانا بھی نہ ملے، اور فاقہ ہو جائے، تو بھی زیادہ

پروا نہین کرتا، چہ جائیکہ کسی ایسی سرائے مین مستقل جی لگا بیٹھے، جہان سے نکالدیا جانا یقینی ہے، یہ رَضُوا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنیا وَاطْمَانُّوا بِھَا "توخاص کافرو منکر آخرت ہی کا شیوہ ہے، اور انہی کو مبارک ہو،

(۲) دوسری بات جو منکر کے مقابلہ مین مومن بالخصوص اہل علم مومن کے پیش نظر رہنے کی ہے، وہ ہمارا یہ ایمان و اعتقاد ہے، کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کی طرح رزق اور اس کا قبض و بسط، یا فراخی و تنگی بھی بالکلیہ حق تعالےٰ ہی کے ہاتھ مین ہے، اور پہلے ہی سے اس کا سارا پروگرام یا نظام عمل متعین و مقدر ہو چکا ہے، اسی طرح اصل نظر اسباب کے بجائے مسبب الاسباب اور تدبیر کے بجائے تقدیر پر رہنا عین ایمان ہے جس کے بغیر ایمان ہی صحیح اور پورا نہین ہوتا، "جو کچھ خدا دینا چاہے، اوس کو کوئی روک نہین سکتا، اور جو دہی نہ دینا چاہے گا، تو کوئی دے نہین سکتا" (لامُعطی لمَا منعت ولا مانع لمَا اعطیت) حدیث مین تو صاف صاف ہے کہ کوئی بندہ بلا ان چار باتون پر ایمان لائے مومن نہین ہو سکتا، ایک توحید (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ) دوسرے رسالت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تیسرے آخرت یا بعث بعد الموت، اور چوتھے تقدیر[۱]

(۳) تیسرے جو ان دونون مقدمات کا لازمی نتیجہ ہے، کہ اس دنیا کی زندگی مین مومن بس زیادہ سے زیادہ اپنی سعی و طلب کو ضروریات زندگی تک محدود رکھے، اور فضولیات زندگی کی فکر و سعی قطعی وقت عزیز کو گنوانا ہے اور طفلانہ لہو و لعب سے زیادہ نہین، البتہ بلا اضاعت وقت اور بلا ابتلاء لہو و لعب کچھ راحت کا سامان بھی میسر ہو جائے، تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ ہی کا اس طرح ایک انعام و احسان جان کر متمتع ہو، جس سے خدا و آخرت کا تعلق اور بیدار و پائدار ہو، البتہ راحت بھی یاد رہے، کہ اصل مین قلب کی راحت کا نام ہے، اور یہ بات کان کھول کر دین دارون ہی کو نہین دنیا دارون کو بھی سُن اور سمجھ لینی چاہئے، جیسا اوپر اپنے اور پرائے سب کے تجربات سے واضح کیا جا چکا، کہ قلب کی راحت یا دل کے سکھ چین کا راز مادی ساز و سامان

---

[۱] الفاظ یہ ہین، قَالَ رَسُولُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُوْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُؤْمِنَ بِاَرْبَعٍ یَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَ اِنِّی رَسُولُ اللہِ بَعَثَنِی بِالْحَقِّ وَیُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَیُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ

یا فضولیات کی بہتات میں نہیں بلکہ ضروریاتِ زندگی پر قناعت ہی میں پوشیدہ ہے، اور ساتھ ہی اگر ایمان و عمل صالح یا دینداری کی زندگی بھی نصیب ہو، تو "حیوٰۃ طیبۃ" کی موعودہ زندگی کا تجربہ اسی دنیا میں ہو جاتا ہے، جس کا جی چاہے آزما کر دیکھ لے،

سو آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا، کہ مومن کامل کے اس سوال کا کہ کھائیں گے کہاں سے" کیسا کامل وسہل حل موجود ہے، بلکہ جس کو معاش کی فکر و پریشانی کہا جاتا ہے، ایمانی زندگی سے جسم و جان کو گھلانے والی یہ فکرِ معاش دراصل سرے سے خارج ہو جاتی ہے، اور یہ سوال سرے سے بے معنی ہو جاتا ہے، کہ دینی یا عربی تعلیم حاصل کر کے کھائیں گے کیا، خصوصاً علم دین کی تحصیل و تعلیم کی ہمت وسعادت رکھنے والوں کا یہ سوال تو اور بھی بے معنی ہے، اس کے معنی تو صرف یہ ہیں، کہ ابھی علم دین کی ابجد بھی نہیں سمجھی، اور دستار فضیلت باندھ لی اس لئے جیسا کہ اوپر تصریح و تاکید کے ساتھ عرض کیا گیا ہے، زندگی میں دین پیدا کرنے کے لئے تعلیم دین کے ساتھ ساتھ تربیتِ دین لازم بلکہ الزم ہے، کیونکہ تربیت بلا تعلیم تو دیندار بنا دیتی ہے لیکن تعلیم بلا تربیت کو شاذ و نادر ہی دین پیدا ہو سکتا ہے،

تاہم انسان ایک تو بالطبع اس عالم اسباب میں اسباب و تدابیر کا سہارا ڈھونڈتا ہے، اور اس سے تسلی پاتا ہے، دوسرے وقت کے حالات، جبکہ ہر طرف پیٹ ہی پیٹ کی پکار ہے، اور پھر ہمارے عام ایمانی و اعتقادی ضعف و اضمحلال کی بنا پر حضرت مجدد وقت نے تعلیم دین کے ساتھ بقدرِ ضرورت تحصیل معاش کے ظاہری اسباب کا بھی جابجا مشورہ دیا ہے، اگرچہ ایسے غیر مستطیع علماے دین کی جو اپنا سارا وقت خدمتِ دین میں صرف فرماتے ہوں معاشی کفالت اسلامی حکومت یا بیت المال اور اغنیائے امت کے ذمہ ہے، جیسا کہ اوپر خود حضرت علیہ الرحمہ "للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللّٰہ" کی تفسیر سے بتفصیل واضح و ثابت فرما چکے ہیں، لیکن جب نہ ایسی اسلامی حکومت نہ بیت المال، نہ اغنیائے امت کو اس کا ادراک نہ ہمت،

لہ باب ہذا ص ۳،

تو علماے اُمّت کی مزید سعادت اسی مین ہو کہ گذر اوقات کے بقدر تدبیر معاش کی خود ہی ہمت فرمائین، اس ہمت افزائی کی مثالین اسلاف اُمّت کے اکابر ائمہ مین بے شمار موجود ہین اور تعلیمات عشر کی تمہید کو بھی حضرت نے اسی مشورہ پر ختم فرمایا کہ

جو لوگ صرف اردو کتب دینیات کے ذریعہ احکام دین حاصل کرنے کے بجائے اور علوم دین حاصل کرنا چاہین،

(۱) تو صنعت و حرفت یعنی دستکاری و پیشہ سے معاش حاصل کرنے مین بہت آسانی و سلامتی ہو،

(۲) اور عربی تکمیل کرنے والون کے لئے چند صورتین معاش کی مناسب ہین، اسکول مین نوکری کر لینا، مطب کرنا، مفید رسالے یا حواشی تصنیف کر کے یا درسی کتابین چھپوا کر اُن کی تجارت کرنا، کاپی نویسی کرنا، کسی مطبع مین تصحیح کی نوکری کرنا، اور ان سب صورتون مین اوقات فراغ مین مطالعہ و تدریس کا شغل رکھنا، یا کسی اسلامی مدرسہ مین مدرسی کرنا بشرطیکہ چندہ کی درآمد و برآمد سے ..!

باقی اصل راہ علم دین حاصل کرنے والون کی وہی ہے، کہ

"اگر غناے ظاہری و باطنی یعنی ثروت یا قوت توکل حاصل ہو، تو محض حسبۃً للّٰہ اپنے کو دینی خدمات تدریس و تالیف، وعظ و افتار وغیرہ کے لئے وقف کر دین" (ص ۴)

اس مشورہ کے پیشِ نظر اور اس مین آسانی و سہولت پیدا کرنے کے لئے راقم ہذا کے خیال مین مدت سے یہ بات ہے کہ خود عربی و دینی مدارس ہی مین اور زمانۂ تعلیم و تعلم ہی مین طلبہ مین صنعت و حرفت اور تجارت کی مختلف و مناسب صورتون سے مناسبت و ذوق پیدا کر دیا جائے، جس کی تدبیر یہ ہے کہ کم از کم ہر بڑے مدرسہ مین ساتھ ساتھ ایک مطبع بھی ہو، جس مین مفید درسی و غیر درسی دینی کتابین شائع ہون، جس کے ذیل مین طلبہ کو کاپی نویسی، تصحیح، جلد سازی وغیرہ طباعت و اشاعت کے مختلف متعلقات سے گنجائش وقت کے بقدر واقفیت کا موقع دیا جائے،

اسی طرح ایسی ضروریاتِ زندگی نہ کہ فضولیاتِ زندگی جن کی صنعت کا با سانی انتظام ہو سکتا ہو، مثلاً کفش سازی، اُن کی صنعت کا بھی انتظام ہو، اور کھانے پینے کپڑے وغیرہ دیگر ضروریاتِ زندگی کی

بڑی چھوٹی حسب موقع دمحل دوکان ہو جس سے بیرونی خریداروں کے علاوہ خود طلبہ واساتذہ وغیرہ تمام متعلقین مدرسہ کی ضروریات بھی فراہم ہون، اور باری باری طلبہ اس مین تھوڑا تھوڑا وقت دے کر اس قسم کی صنعت وتجارت سے مناسبت پیدا کرین، تاکہ حسب مناسبت آیندہ زندگی مین اس سے ذریعۂ معاش کا کام لے سکین،

اگر کچھ زمین دستیاب ہوسکے تو باغبانی اور غلہ اور ترکاریون وغیرہ کی کاشت کا بھی کچھ ضرور انتظام ہو جس سے معاشی مشغلہ کے علاوہ ورزشی وتفریحی مشغلہ کا کام بھی لیا جاسکتا ہے،

اگر طالب علمی ہی کے زمانہ سے اس قسم کی چیزون کا مذاق پیدا کرادیا گیا، تو انشاء اللہ بظاہری اسباب کی حد تک دین کے طلبہ وعلماء کے متعلق ضروریات زندگی کے بقدر نہ یہ سوال ہوگا کہ کھائین گے کہان سے اور نہ انشاء اللہ مخلوق کی بندگی، اور ملازمت کی ذلت سے اُن کو دوچار ہونا پڑے گا،

ایک تنبیہ | نہایت ضروری اس معاملہ مین یہ ہو کہ ایک درس گاہ نے دوکان وغیرہ کی قسم کی چیزین کچھ جاری بھی کین جن مین احقر کے مشورہ کو بھی مصالح مذکور کی بناپر بہت کچھ دخل تھا، لیکن ہوا یہ کہ نظر طلبہ کی معاشی تربیت کے بجائے زیادہ تر مالی منفعت پر رہنے لگی، اور آگے چل کر عربی ودینی مدرسہ کے مناسب مطبع ومکتبہ وغیرہ کی کچھ مزید مفید تر تجاویز جو پیدا ہوئین، اُن کے نقشے مین بھی مالی منفعت کا رنگ زیادہ بھرا تھا اس کے علاوہ مزید نقص یہ تھا، کہ اصل مقصد یعنی درس وتدریس کے فرائض مین خلل واقع ہونے کا قوی اندیشہ تھا، لہذا جس طرح ایک طرف وقت کے تقاضون کی بناپر دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ معاشی تربیت کا خیال رکھنا ضروری ہے، اُسی طرح یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے، کہ مقصود بالذات دین کے طلبہ وعلماء کو ملک التجار بنانا نہین ہے، بلکہ وہی گذر اوقات کے بقدر ضروریات زندگی کے لئے حیلہ فراہم کردینا ہے، تاکہ خدمت دین استغناء کے ساتھ کرسکین، نہ یہ کہ تاجرانہ منفعت کی فکر وتدبیر مین دینی تعلیم وتعلم کے اصل مقصد ہی مین خلل وتہاون واقع ہونے لگے، ماحصل یہ کہ اہل دین خصوصاً علمائے دین کی دنیا کا زندگی کے

ہر شعبہ میں دین اور مقاصدِ دین کے تابع رہنا مقدم ہے،

واعظ و افتاء و تصنیف کے متعلق اصلاحات

علما سے متعلق تین خدمات اور ہیں، وعظ، افتاء اور تصنیف، ان میں بھی جو ضروری ضروری باتیں اصلاح طلب ہیں، ان کی طرف بھی حقوق العلم کی ایک خاص فصل میں متوجہ فرمایا گیا ہے:-

"وعظ میں ایک کوتاہی تو وعظ نہ کہنے کی ہے، اکثر اہلِ علم کو دیکھا کہ وعظ کے صرف تارک ہی نہیں، بلکہ اس کی تحقیر کرتے، اور علم کی شان میں خلاف سمجھتے ہیں، حالانکہ تعلیم دین کا اصلی طریقہ جس کے لئے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، یہی وعظ و ارشاد ہے، جس کے ذریعہ تبلیغ دین فرماتے تھے، باقی تدریس و تالیف وغیرہ تو اس کے تابع ہیں، سلف میں قوتِ حفظ و تدین کی بنا پر زبانی روایات اور خطبات عام پر قناعت و وثوق تھا، بعد میں علوم کی حفاظت کے لئے تدریس و تالیف کی ضرورت ہوئی، اس سے بھی اصل مقصود تبلیغ ہی ہے جس کی خطابِ عام کی صورت کو وعظ کہا جاتا ہے،

باقی جو کوتاہیاں خود وعظ کہنے کے متعلق ہیں وہ یہ ہیں (۱) وعظ پر نذرانہ لینا یا پہلے سے ٹھہرانا جس کی بدولت وعظ کا اثر نہیں ہوتا، دوسرے واعظ قوتِ مال کے خوف سے اظہارِ حق سے رُکتا ہے تنخواہ لے کر وعظ کہنا اس سے مستثنیٰ ہے جس کا اوپر مبسوط بیان ہو چکا (۲) وعظ میں غیر ضروری یا عوام کے حق میں مضر مضامین، مثلاً دقائقِ تصوّف وغیرہ بیان کرنا (۳) متعلق تقریر کرنا (۴) کسی خاص شخص پر وعظ میں تعریض کرنا جس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے (۵) وعظ میں کسی کی فرمایش کے تابع بنجانا" ظاہر ہے کہ وعظ وہی ہے جو ان شرائط کے ساتھ ہو، ورنہ وعظ کی نقالی بلکہ اس کا تمسخر ہے،

افتاء میں یہ کوتاہیاں ہیں، حصولِ زر کا اس کو آلہ بنانا، البتہ اگر اس کی تکمیل و انتظام میں

کچھ خرچ ہوتا ہو تو اس کے بقدر وہ بھی اہل استطاعت پر کچھ بطور فیس لگا دینے مین مضائقہ نہین، ہر سوال کے جواب مین کوشش کرنا، نہ بھی معلوم ہو تو یہ نہ کہنا کہ نہین جانتا، بلکہ کھینچ تان کر کچھ لکھ دینا، اسی طرح معلوم ہونے پر بھی ہر سائل کے سوال کا جواب دیدینا ضروری نہین، اس کا اثر عوام پر بُرا پڑتا ہے، علماء کو اپنا تابع بنانے کی کوشش کرتے ہین، لہذا جو سوال فی نفسہ یا کسی سائل کے اعتبار سے غیر ضروری ہو، صاف کہدیا جائے کہ یہ سوال غیر ضروری ہے یا جو سائل دلیل سمجھنے کی لیاقت نہ رکھتا ہو، اور دلیل معلوم کرنا چاہے، اس کو بھی صاف جواب دیدینا چاہئے، سمجھانے کی کوشش نہ کرنے لگے، جب دلیل انی کے متعلق یہ مشورہ ہے، تو دلیل لمی یعنی علت دریافت کرنے کی عوام کو گنجایش ہی نہ دے، کہ اس کا علم تو خود علماء کو پورا نہین، الا ماشاء اللہ، مثلاً نماز کے پانچ وقت فرض ہونے کی دلیل انی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، اور لمی اس کی وہ حکمتین ہین جن کی بنا پر نماز فرض کی گئی،

بعضے فرمایش کرتے ہین، کہ قرآن مجید سے پانچ وقت کی نماز کا ثبوت لاؤ، اب مجیب صاحب ہین کہ قرآن مجید مین اس کی تلاش کرتے، اور دوسرون سے مدد لیتے پھرتے ہین، حالانکہ حکم شرعی کے لئے مطلق دلیل شرعی کافی ہے، خاص دلیل کی حاجت نہین، اور ادلہ شرعیہ چار ہین، کتاب، وسنت اور اجماع و قیاس مجتہد، ان مین سے کسی ایک دلیل سے بھی جو حکم ثابت ہوجائے، وہ ثابت ہے البتہ حسب تفاوت ادلہ ثبوت احکام کا درجہ متفاوت ہوگا،

بعضے استفتاء کرنے والے حیلے پوچھا کرتے ہین، جو ہرگز نہ بتلانا چاہئے، بعض اوقات سوال مہمل یا مبہم ہوتا اور دو صورتون کو محتمل ہوتا ہے، وہان اکثر اہل علم تشقیق سے جواب دیدیتے ہین، کہ یہ صورت ہو، تو یہ حکم اور وہ صورت ہو، تو وہ حکم، اس سے تجربہ کارون نے منع فرمایا ہے، کیونکہ ناخدا ترس لوگون کو اپنی مرضی کے مطابق سوال تراش لینے کی گنجایش

ملتی ہے، کہ وہ مفید مطلب ہی شق کے مدعی بنجاتے ہین، اور اصل واقعہ ملتبس ہو جاتا ہے "

"تصنیف مین بھی چند کوتاہیان ہوتی ہین، غیر مفید فنون مین تصنیف کرنا، رد و قدح اور مجادلہ تصنیف کا بڑا مقصود بنا لینا، ایسے مباحث لکھنا جن کی ضرورت عوام کو نہ ہو یا جن سے وہ تشویش مین پڑ جائین، مثلاً تصوف و کلام کے نازک مسائل اور اگر خواص کی نفع رسانی کے لئے ایسی ہی ضرورت ہو، تو خاص زبان مثلاً عربی مین لکھے، کہ عوام کی نظر تک نہ پہنچے محض تجارت کے لئے عوام کے مذاق کی کتابین لکھ کر اس سے روپیہ کمانا یا حقِ تصنیف کو بیع کرنا"،

یہ تصنیف و تالیف کی وہ موٹی موٹی خرابیان یا کوتاہیان ہین جو دینی کتابون تک مین سرایت کر گئی ہین، اور جن سے اس زمانہ مین بس اللہ کا کوئی خاص بندہ ہی محفوظ ہوگا،

متفرق اصلاحات

سب سے آخر فصل مین کچھ متفرق اصلاحات بیان فرمائی گئی ہین :-

"مثلاً بعض اہلِ علم اپنے کو خوب بناؤ سنگار سے رکھتے ہین، جو شانِ علم کے خلاف اور ضروری خدماتِ علم سے بیفکری کی علامت ہے، کیونکہ اس فکر کے ساتھ لباس و طعام وغیرہ کے تکلفات کی طرف التفات نہیں ہوتا، اسی طرح مجلس مین صدر یا ممتاز جگہ پر بیٹھنے کا شوق چلنے مین تقدم کی فکر مجمع مین امام ہونے کا خیال، یہ سب ریا و کبر کے شعبے ہین، تواضع و بے تکلفی اور سادگی ہی مین علم و دین کی شان ہے، حدیث مین ہے، البذاذۃ من الایمان، اس سے مساکین کو بعد و توحش نہین ہوتا، اور یہی لوگ دین کے زیادہ قبول کرنے والے ہین، البتہ سادگی کے ساتھ طہارت و نظافت ضروری ہے،

"اور مثلاً دوسرے مولویون کو بُرا کہنا جس مین بعض اوقات معصیت کے علاوہ عوام پر بُرا اثر ہوتا ہے، وہ سب سے بدگمان ہو جاتے ہین، اگر کسی صاحبِ باطل کے شر سے بچانا ہی

ضروری ہو تو تہذیب کے ساتھ اصلاح کر دینا کافی ہے، اسی طرح دوسرون سے مولویون کی بلکہ غیر مولویون کی برائی سننا بھی گو کسی حالت مین جائز بھی ہو مگر علماء کی شان کے مناسب نہین، بعض دفعہ اس کے مفاسد سے خود اپنے دین مین حرج ہونے لگتا ہے،

اور مثلاً کسی کے فیصلہ مین پڑنا گو فی نفسہٖ طاعت ہے لیکن حسب ارشاد نبوی کہ حضرت ابو ذر غفاری کو فرمایا کہ لا تقضین بین اثنین، ان علماء کو جو حکام نہین اس مین پڑنا مناسب نہین، طرفداری کا شبہہ اور بدنامی ہوتی ہے، اور جو دینی نفع مسلمانون کے ساتھ یکسان تعلق رکھنے سے ہوتا وہ فوت ہو جاتا ہے، البتہ ایک صورت اسلم ہے، کہ اگر فریقین درخواست کرین تو اُن سے کہے کہ دونون سوال لکھکر اپنے اپنے دستخط کر دو، پھر بطور جواب کے اس پر حکم شرعی لکھ کر حوالہ کر دے کہ اس پر دونون عمل کر لو، یا کسی ثالث کو مقرر کر کے اس سے نافذ کرا لو،

اور اسی مصلحت سے مناسب ہے کہ کسی شخص کے دنیوی معاملہ مین دخل نہ دے اور مالی معاملات سے بھی الگ رہے، مثلاً چندہ وصول کرنا اس کا تحویلدار بننا یا اس کے صرف کا اہتمام لینا یہ سب صورتین بدگمانی اور تہمت کی ہین، ایسے کام متدین رؤسا کے متعلق ہون، البتہ ان کو چاہئے کہ جو کام کرین، علماء سے شرعی حکم دریافت کر کے کرین "

اہلِ دنیا اور علما کے تعلقات سب سے آخر مین خاتمہ کے تحت ان باہمی تعلقات کا بیان ہے جو اہلِ دنیا اور علماء مین ہونے چاہئین، جو مختصراً یہ ہین، کہ

" دنیا دار علماء کو مخدوم سمجھین، وہ جو کام دین کا کر رہے ہون بدون اُن کی استدعا کے اس مین اعانت کرین، مالی بھی (اور غیر مالی بھی)، جو بات پوچھین ادب سے پوچھین، دلائل نہ دریافت کرین، اگر کوئی شبہہ رہے معاندانہ سوال نہ کرین مستفیدانہ پوچھین، اُن سے کوئی لغزش ہو جائے تو اُن کی مذمت نہ کرین، آخر وہ بھی بشر ہین اور اس حال مین بھی تمھارے نفع

وہدایت کے لئے کافی ہین تم اُن کے اقوال پر عمل کرو افعال کو مت دیکھو تمھارا شبہہ ایک سے نہ حل ہو تو دوسرے سے حل کرو، مگر ایک کا قول دوسرے کے روبرو مت نقل کرو،

اور علماء کو چاہئے کہ دنیا دارون کو اپنا برابر کا بھائی سمجھیں ان سے تعظیم وخدمت کے متوقع نہ ہون، اگر بلا توقع کچھ کردین تو سمجھین کہ علم دین کی خدمت تو ہمارے ذمہ تھی ہی انھون نے احسان کیا کہ ہماری اعانت کی، اس مین قیل وقال نہ کرے، جیسے بعض کی عادت ہی کہ کہین تنخواہ پر تکرار ہے کہین ترقی کا تقاضا کہین نذرانہ پر بحث، اگر کسی سے کچھ بے تمیزی ہو جائے، صبر کرین کہ جب اُن کو ہمارے برابر علم نہین، تو ہمارے برابر تمیز کیسے ہوگی، اگر کسی کو قولاً یا فعلاً شرع کے خلاف دیکھین تو جس پر قدرت وحکومت نہ ہو، اس پر تشدد نہ کرین، نرمی سے بہت اصلاح ہوتی ہے، اگر عامی کوئی حق بات کہے قبول سے عار نہ کرین، اگر کسی مسئلہ مین اپنی غلطی ظاہر ہو اعلان کردین"

(مختوم رجب ۱۳۳۰ھ ہجری)

معلم ومتعلم وشرکاے علم کے باہمی حقوق

اس رسالہ حقوق العلم مین چونکہ معلم ومتعلم اور شریک تعلیم کے حقوق کا ذکر نہین فرمایا گیا تھا اسلئے بعد مین اصلاح انقلاب حصہ اول کے آخر مین اس کی تفصیل فرمائی گئی ہی کیونکہ "علوم دینیہ کی جس طرح تعلیم وتعلم ضروری ہے، اسی طرح اس تعلیم وتعلم کے سبب جن لوگون کے ساتھ تعلقات ہوتے ہین، ان تعلقات کے حقوق کا اداکرنا بھی ضروری ہے"

اور یہ تمام حقوق وآیات واحادیث سے ثابت ومستنبط ہین:۔

حقوق معلم

لَقَدْ مَنَّ اللہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ الی قولہ تعالیٰ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ،

اس آیت مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے نعمت ومنت ہونے کی علت تعلیم کتاب وحکمت کو قرار دیا گیا ہی جو اس امر کی صاف دلیل ہے کہ جو شخص کسی کو دین کی تعلیم دے، وہ اس کے حق مین نعمت الٰہی ہے، اور اس کی قدر وتعظیم لازم ہے، اور اس تعلیم مین نہ صرف باقاعدہ سبق پڑھانا

بلکہ مسئلہ وغیرہ بتلانا سب داخل ہیں حتیٰ کہ کسی کی تصنیف سے انتفاع یہ بھی مصنف کے شاگردوں میں داخل ہو جاتا ہے،

"حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا جو قصہ قرآن میں مذکور ہے، اس میں بھی استاد کے کئی آداب و حقوق ثابت ہوتے ہیں، اول یہ کہ استاد کی خدمت میں خود شاگرد جایا کرے، دوم اگر استاد کسی اعتبار سے مرتبہ میں شاگرد سے کم ہو تب بھی اس کا اتباع کرے، سوم جس بات کے پوچھنے کو استاد منع کرے نہ پوچھے، چہارم اگر غلطی سے استاد کے خلاف مزاج کوئی بات ہو جائے تو معذرت کرلے، پنجم اس کے تنگ ہونے یا مرض وغیرہ کی وجہ سے کسلمند ہونے کے وقت سبق بند کر دے"

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص تم پر احسان کرے، اگر اس کی مکافات کر سکتے ہو تو مکافات کرو، ورنہ دعا کرو، تعلیم دین کے احسان ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے، لہذا اس کے مکافات میں ہر قسم کی جانی و مالی خدمت سے سعی کرنا چاہئے، اور جب کسی قسم کی استطاعت نہ ہو یا استاد سے جدائی کے بعد نہ رہے تو کم از کم دعا ہی سے یاد رکھنا چاہئے،

بعض طلبہ کی عادت ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ احتمالات نکال کر استاد کے سامنے بطور اعتراض پیش کیا کرتے ہیں، حالانکہ خود بھی اس کو مہمل سمجھتے ہیں، مگر محض اپنی ذہانت جتلانے اور استاد کا امتحان کرنے کے لئے ایسی نامعقول باتیں کرتے ہیں، جو ظاہر ہے کہ مغالطہ ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور سے منع فرمایا ہے، کہ (نھی عن الاغلوطات) پھر جائے کہ استاد کو مغالطہ دینا،

نیز اس سے شاگرد ... یہ بھی ایک حق ثابت ہو گیا کہ بعض مدرسین کی عادت ہے کہ کسی مقام پر خود بھی شبہہ ہو، مگر شاگرد پر ظاہر نہیں کرتے، کچھ گڑھ مڑھ کے تقریر کر دیتے ہیں، گویا اس کو مغالطہ میں ڈالتے ہیں،

ایک حدیث میں انس ابن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

جانتے ہو، سب سے زیادہ سخی کون ہے، انھون نے عرض کیا کہ اللہ اور اللہ کا رسول زیادہ داناے حال ہے، تو آپ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ سخی اللہ تعالیٰ ہے، پھر تمام بنی آدم میں سب سے زیادہ مین، اور پھر وہ جس نے علم دین سکھلایا، اور اس کو پھیلایا، یہ شخص قیامت مین تنہا بمنزلہ ایک امیر کے آوے گا،

"اس حدیث مین تمام وہ لوگ داخل ہین، جو تدریس وتبلیغ وعظ وتصنیف کسی طرح بھی دین کی تعلیم واشاعت کرتے ہون، اور ظاہر ہے کہ جو شخص کسی کے ساتھ سخاوت وجود کرے اس کا کتنا حق ہوتا ہے،

حجۃ الوداع کے خطبہ کے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جریر سے فرمایا کہ لوگون کو چپ کردو جس سے معلوم ہوا کہ استاد کی تقریر کے وقت بالکل خاموش ومتوجہ رہنا چاہیے کسی سے بات یا کسی کی طرف التفات نہ کرے"،

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ توراۃ کا ایک نسخہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین لائے، اور اس کو پڑھنا شروع کیا، جس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اے عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روے انور کو تو دیکھو کہ ناخوشی کے آثار پائے جاتے ہین، حضرت عمرؓ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے غصہ سے پناہ مانگتا ہون"،

اس سے ثابت ہوا کہ اگر استاد کسی بات پر غصہ کرے تو شاگرد کو معذرت کرنا چاہیے، دوسرا حق شاگرد کا یہ ثابت ہوا کہ اس سے کوئی امر نامناسب صادر ہو تو اس کو تنبیہ کرنا ضرور ہے، تاکہ اس کی اصلاح ہو، اور تیسرا حق شریک علم یا رفیق سبق کا یہ ثابت ہوا کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہو، جس پر وہ خود مطلع نہ ہو تو خیر خواہی کے ساتھ اس کو مطلع کردے

تاکہ تدارک کر لے"،

راقم ہذا کے نزدیک ایک ضروری امر اور بھی اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے، کہ اگر کسی کتاب کے متعلق شاگرد کو معلوم ہو جائے، کہ استاد کسی وجہ سے اس کے لئے اس کا پڑھنا پسند نہین کرتا، خواہ کم استعدادی یا اور کسی مضرت و مصلحت کی وجہ سے تو اس سے باز رہنا چاہئے،

ایک اور حدیث مین استاد کا یہ ادب صراحۃً مذکور ہے، کہ علم سیکھو اور اس کے لئے سکینہ و وقار اختیار کرو، اور جس سے علم سیکھو اس کے ساتھ تواضع و ادب سے پیش آؤ"

آگے طلبہ کی ان مختلف موٹی موٹی کوتاہیوں پر یکجا تنبیہ فرمایا گیا ہے، جو محتاج اصلاح ہین، مثلاً استاد کے ظاہری ادب و تعظیم وسلام کا لحاظ نہ رکھنا، اس کی پوری اطاعت نہ کرنا کوئی بات مان لی تو کسی کو بلا عذر ٹال دیا، خلوص مین کمی، بدنی یا مالی خدمت مین کمی، بلکہ بدنی خدمت پنکھا وغیرہ جھلنے کو تو اب بہت سے شاگرد عار و ذلت سمجھنے لگے ہین"

خاص طالب علمانہ کوتاہیان	یہ ہیں کہ

مثلاً مطالعہ نہ دیکھنا، یا کم دیکھنا جس سے سبق سمجھنے مین دقت ہوتی ہے، اور استاد کو بار بار تقریر کرنا پڑتی ہے، یا اس کم سمجھنے کی بدولت فضول سوال کرنے سے استاد کو تنگی و پریشانی ہوتی ہے، اور مثلاً استاد کی تقریر کے وقت دوسری طرف التفات کرنا کہ استاد تو اس کی طرف متوجہ ہے، اور وہ دوسری طرف جس سے استاد کو بہت کوفت ہوتی ہے یا بعض اپنی جہالت جتلانے یا استاد کا امتحان کرنے کے لئے فضول سوالات کرنا، یا مقدار سبق و کتاب وغیرہ کے معاملہ مین استاد کی رائے نہ ماننا کہ ہم تو اتنا ہی سبق پڑھین گے، یا فلان ہی کتاب شروع کرین گے،

یہ تو زمانہ طالبعلمی کی بعض کوتاہیون کا بیان تھا، بہت سے لوگ طالب علمی کے بعد یا

یا استاذ سے جدائی کے بعد کوئی حق نہین سمجھتے، یا سمجھتے ہین مگر ادا کرنے کا اہتمام نہین کرتے، کبھی خط تک نہین بھیجتے کہ استاد کی خیریت ہی معلوم کرلین، حالانکہ چاہیئے کہ استاد کی وفات کے بعد بھی اس کے حقوق ملحوظ رکھے، جس کا خلاصہ دو باتین ہین، ایک اس کے لئے دعائے مغفرت ہمیشہ کرتے رہنا، دوسرے اس کے اقارب واحباب اور معاصرین کی تعظیم وخدمت کا خیال رکھنا، جیسا کہ والدین کے اس قسم کے حقوق کی حدیث مین تاکید ہے،

کچھ بدنصیب ایسے ہین جو کسی نفسانی غرض سے استاد کے مخالف ہوجاتے ہین، اور تحریراً یا تقریراً ان کی شان مین گستاخی کرتے ہین، حالانکہ استاد وہ چیز ہے، کہ اگر دینی ضرورت سے بھی اس کے خلاف کرنا پڑے تو بھی کافر باپ کی طرح دین مین مخالفت کرنے کے باوجود ادب واحترام ترک نہ کرے،

جو استاذ کسی مدرسہ سے تنخواہ پاتے ہین، ان کے حقوق اور بھی ضعیف سمجھے جاتے ہین اتنا نہین سمجھتے کہ ان حقوق کی جو بنیاد ہے وہ تنخواہ پانے سے معدوم نہین ہوگئی، کیا تنخواہ تعلیم دین جیسے احسان کا بدل ہوسکتی ہے، اگر اس نے محض تنخواہ یا دنیا کی نیت سے بھی تعلیم دی تو بھی گو اس کا ثواب کم ہو جائے، مگر احسان تو ویسا ہی ہے،

بعض شاگرد استاد کی تعظیم وتکریم اس کی کسی دنیوی وجاہت وعظمت کی وجہ سے کرتے ہین، وہ بھی شاگردی کی خوبی نہین چنانچہ اگر استاذ جاہ وشہرت مین شاگرد سے کم ہو تو بعض ناخلف اپنے کو اس کی طرف منسوب کرنے مین بھی عار کرتے ہین، مبارک وہ ہو جو ایسے استاد کا بھی حق استادی ادا کرے،

متعلم کے حقوق اس کے بعد اب کچھ متعلم وشاگرد کے حقوق معلم واستاذ بھی اپنے اوپر سن لین۔

"ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی

هِیَ اَحْسَنُ، اس آیت سے نصاً معلوم ہوا، کہ مستفیدین کے ساتھ اگرچہ وہ طالب نہ ہون (کیونکہ آیت مین مدعوین ایسے ہی لوگ ہین) ان کے مذاق و استعداد اور رفق و ملاطفت کی رعایت ضروری ہے، ابتدائی خطاب (مثلاً کتاب کی تقریر) مین بھی جیسا کہ اُدع سے مراد ہے، اور سوالات کے جواب مین بھی جیسا کہ "جَادِلْهُم" سے یہی مقاولت مراد ہے،

اور حدیث مین تو صاف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ ہمارے پاس دور دراز ملکون سے علم دین سیکھنے آوین گے، اُن کے بارے مین میری وصیت ہے کہ بھلائی سے پیش آنا،

"اسی طرح حدیث مین ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری طرف سے کوئی بات بیان کرے اور جانتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے، تو وہ بھی جھوٹا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ سبق مین غلط سلط یا مستفتی کو غلط فتوی بتلا دینا حرام ہے، جیسا کہ بعضون کی عادت ہو کہ اپنا جہل چھپانے کے لئے غلط سلط ہانک دیتے ہین، اتنا کہنے کی توفیق نہین ہوتی کہ یہ بات ہماری سمجھ مین نہین آتی، سوچ کے بتاوین گے، یا دوسرے سے پوچھ لین، یا طالب علم ہی کو پوچھنے کی اجازت دیدین، اس سے عار آتی ہے، حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون عالم ہوگا، آپ بارہا کسی سوال کے جواب مین فرما دیتے کہ نہین معلوم اور جب وحی نازل ہوتی اُس وقت بتلا دیتے، اور حدیث ہی مین ہے کہ اگر کسی نے بلا علم کے مسئلہ بتادیا تو اس کا وبال بتانے والے پر ہوگا"،

"اس مین کئی خرابیان ہین، اگر طالب علم کو پتہ لگ گیا کہ استاد نے غلط سلط بتلا دیا، تو اس سے نفرت اور دل مین حقارت پیدا ہو گی، جس کے ساتھ استادی کے حقوق ادا کرنا دشوار ہو گا، اور اگر نہ پتہ لگا تو طالب علم بیچارہ عمر بھر جہل مین مبتلا رہا جس کا سلسلہ

آگے معلوم نہین کہان تک جائے، پھر استاد کے اخلاق اکثر شاگردون مین سرایت کرتے ہین، تو یہ ہٹ دھرمی اور سخن پروری کا عیب شاگردون مین بھی پیدا ہوگا،

حضرت عبد اللہ بن مسعود ہر جمعرات کو وعظ فرمایا کرتے تھے، کسی نے عرض کیا کہ حضرت روزانہ فرمایا کرین تو فرمایا کہ مین تم کو تھکانا نہین چاہتا اور مین تمھارا ایسا ہی خیال رکھنا چاہتا ہون جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا خیال فرماتے تھے، کہ ہم تھک نہ جائین،

"اس حدیث سے مستفیدین علم کا یہ حق بھی معلوم ہوا کہ ان کے شوق و نشاط کو باقی رکھنے کا بھی خیال رکھے، مثلاً اتنا سبق نہ پڑھاوے یا اتنی کتابین نہ شروع کرادے، کہ طالب علم اکتا جائین، بعضے تعطیل مین بھی طالب علمون کی جان مارتے اور اس کو اپنی بڑی کارگذاری جانتے ہین،"

حضرت عبد اللہ بن عمر فرماتے ہین، کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر مین ہم سے پیچھے رہ گئے اور ایسے وقت آکر ملے کہ نماز کا وقت آگیا تھا، اور ہم وضو کر رہے تھے، جلدی مین کسی وجہ سے پاؤن دھونے مین کچھ سوکھا رہ گیا، تو آپنے دو تین مرتبہ زور سے فرمایا کہ خبردار عذاب ہے ان ایڑیون کے لئے جو سوکھی رہ جائین،

اس سے تین حق شاگردون کے ثابت ہوئے ایک تو یہ کہ صرف تعلیم ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان اعمال کی بھی نگرانی رکھے، جس کی طرف اب بالکل ہی توجہ نہین کیجاتی، اساتذہ صرف سبق پڑھا دینے کو ضروری سمجھتے ہین، دوسرا حق یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے اس کا احتمال ہو کہ بدون آواز بلند کئے آواز نہ پہنچے گی، مثلاً حلقۂ درس بڑا ہو تو تقریر بلند آواز سے کرے تیسرے اگر احتمال ہو کہ ایک بار کی تقریر سے طلبہ نے نہ سمجھا ہوگا تو دوسری تیسری بار بھی تقریر کردینا مناسب ہے، اور یہ تو حضور کی عام عادت تھی، کہ جب کوئی بات مہتم بالشان ہوتی تو تین بار

فرماتے تاکہ لوگ خوب سمجھ لیں۔"

"بعض اہل علم کو ضرورتًا بلا ضرورت اپنے علم کے اظہار کا عارضہ ہوتا ہے جس سے بعض جماعتوں کو ضرر بھی ہوتا ہے، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا کہ جو شخص مرے اور خدا سے اس حال میں ملے، کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو، تو وہ جنت میں داخل ہوگا، تو حضرت معاذؓ نے عرض کیا، کہ کیا لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤں؟ آپ نے فرمایا نہ سناؤ کیونکہ میں ڈرتا ہوں، کہ اس پر تکیہ کر لیں۔"

"دیکھو یہ مضمون اپنی جگہ صحیح اور شریعت کے مقاصد عظیمہ میں سے تھا، پھر بھی آپ نے لوگوں کے ضرر کے خیال سے اس کی اشاعت ناپسند فرمائی، جس سے معلوم ہوا کہ جو مسئلہ یا کتاب کسی طالب علم کے لئے مضر یا نامناسب معلوم ہو، اس سے روک دینا بھی استاذ کے ذمہ ہے، اور طالب علم کو اس میں استاذ کی اطاعت لازم ہے،

"حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ خواب میں مجھے دودھ کا ایک پیالہ دیا گیا، میں نے خوب سیر ہو کر پیا کہ ناخن تک سیرابی کا اثر محسوس ہوا، پھر بچا ہوا دودھ عمرؓ کو دیدیا، لوگوں نے عرض کیا حضور اس کی تعبیر کیا ہوئی؟ فرمایا دودھ سے مراد علم ہے،

"اس سے دو امر معلوم ہوئے ایک باعتبار صورت لین کے، اور ایک معنی لین کے، اول یہ کہ شاگرد کو گاہ گاہ اپنے کھانے پینے میں شریک کر لیا کرے جس سے اس کا دل بڑھتا، اور محبت زائد ہوتی ہے، اور جس قدر استاذ سے محبت ہوگی، اسی قدر علم میں برکت ہوگی، دوسرا یہ کہ اگر حق تعالیٰ کسی کو کوئی باطنی برکت عطا فرمائے، تو شاگرد سے دریغ نہ کرے، غرض ظاہری و باطنی غذا کا کچھ حصہ اس کو بھی دے،

"ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فلان شخص کی نماز اتنی طویل ہوتی ہے کہ مجھکو اندیشہ ہے کہ نہ پاسکون (یعنی بددل ہوکر جماعت چھوڑ دون) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِس قدر آتنا برا فروختہ ہوے، کہ کبھی اتنا برا فروختہ ہوتے نہ دیکھا تھا، پھر آپ نے فرمایا کہ تم لوگون کو متنفر کرتے ہو، جو نماز مین امامت کرے، اس کو چاہئے کہ (قرأت) مین تخفیف سے کام لے، کیونکہ نماز مین مریض ضعیف و حاجتمند سب قسم کے لوگ ہوتے ہین،

"اس سے بھی دو امر ثابت ہوئے ہین کہ اگر کچھ اسباق اپنے شاگرد یا ماتحت مدرس کے سپرد کئے جائین اور اس کی شکایت ہو تو شکایت سننا اور تحقیق کے بعد انتظام کرنا چاہئے، یہ نہین کہ شکایت کرنے والے کو محض طالب علم سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاے، دوسرا یہ کہ اگر کسی شاگرد یا طالب علم سے کوئی نامناسب حرکت ہو، اور معلوم ہو، کہ غصہ ہوکر کہنے سے زیادہ نفع ہوگا تو اس کی صلحت سے غصہ ہی کرنا افضل ہے،

عورتون نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم پر مرد غالب آگئے ہین، کہ آپ کا وعظ سننے کا موقع ہم کو نہین ملتا، ہمارا بھی ایک دن مقرر کر دیا جاے، آپنے مقرر فرما دیا، اس سے اوقات کی تعیین و تقسیم اور طلبہ کی جماعت بندی کا مصلحت ہونا معلوم ہوا، ایک عظیم مصلحت یہی ہے، کہ جن کے لئے جدا سبق مناسب ہے، وہ ایک ہی مین کیسے شریک ہون،

اس قسم کی خاص خاص باتون کے ساتھ شاگردون کا ایک عام اور بڑا حق یہ ہو کہ اُن کے حق مین علم کی دعا بھی کیا کرے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہین، کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو سینہ سے لگا لیا اور فرمایا کہ یا اللہ اس کو قرآن کا علم عطا فرمائیے"

شرکاے علم کے حقوق | آگے شرکاے علم کے حقوق کا بقدر ضرورت بیان فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک حدیث مین ہے کہ

"حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی عوالی مدینہ میں کچھ فاصلہ پر رہا کرتے تھے اور باری باری جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، جس دن میں جاتا، جو کچھ سن کر آتا، اُن سے بیان کر دیتا، جس دن وہ جاتے، مجھ سے بیان کر دیتے"

"اس سے معلوم ہوا کہ اپنا شریک تعلیم اگر کسی سبق میں حاضر نہ ہو تو ناغہ شدہ سبق اس کو تکرار کرادیا جائے، اور یہ اس کا حق ہے، نیز مدرسوں میں باری باری سے پڑھنے کی بھی اس سے اصل نکلتی ہے"

باقی خود کلام مجید میں والجار الجنب اور والصاحب بالجنب یعنی ہمسایہ وہم صحبت یا ساتھ بیٹھنے اٹھنے والوں کے ساتھ احسان کا جو حکم ہے، وہ حسب موقع شرکائے تعلّم کا بھی ایک دوسرے پر حق ہے، جیسا کہ مفسرین نے شریک تعلیم کے ساتھ اس کی تفسیر کی بھی ہے، اس کے علاوہ شرکائے تعلّم کے باہمی حقوق کی پوری پوری تفصیل وتکمیل کے لئے حضرات صحابہ کی باہمی معاشرت وطرز عمل کا پیش نظر رکھنا کافی ہوگا، اس لئے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم سب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد ہی تھے،

ضروری تنبیہات آخر میں تین ضروری تنبیہات فرمائی گئی ہیں۔

"ایک یہ کہ گو متعلّم کے مفہوم میں متعارف استاد کی طرح پیر، واعظ اور مصنف جس سے بھی افادہ واستفادہ کا تعلق ہو، سب داخل ہیں لیکن حقوق سب کے مساوی نہیں، بلکہ متعارف معنی میں جس کو استاد کہا جاتا ہے، اس کا حق زیادہ ہے، اوّلاً تو اس لئے کہ یہ استاد شاگردوں کے لئے جتنی مشقت برداشت کرتا ہے، دوسرے اہل افادہ نہیں کرتے بعض طرق افادہ میں تو چنداں مشقت ہی نہیں اور بعض میں اگرچہ مشقت ہے مگر وہ کسی خاص مستفید کے لئے برداشت نہیں کرتا، حالانکہ ووصینا الانسان بوالدیہ حملته امه کرھا ووضعته کرھا کی نص قطعی سے مشقت کی بناء

حق کا عظیم ہونا ثابت ہو،ثانیاً شاگرد استاد کی تابعیت کا التزام کرتا ہے، اور التزام ایک وعدہ ہو اور وفاے عہد لازم ہے،

عام لوگ اس مین یہ غلطی کرتے ہین، کہ پیر کی تعظیم اور خدمت و اطاعت مین تو حدود شرعیہ سے بھی تجاوز کر جاتے ہین لیکن استاذ کے حقوق ادا کرنے مین حدِ شرعی کے قریب بھی نہین پہنچے، اور یہ شریعت کی تغییر کے سوا اور کیا ہے،!

دوسری قابلِ تنبیہ بات یہ ہو کہ استاد اور پیر کا حق زیادہ ہے یا باپ کا اُس مین بھی لوگ یہ سمجھتے ہین کہ پیر اور استاد روحانی مربی ہین، اور باپ جسمانی اور روحانی مربی کا درجہ جسمانی سے بڑا ہے، اس دعویٰ کی غلطی اجمالاً اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ نصوص مین جس شد و مد سے باپ کے حقوق بتلائے گئے ہین استاد اور پیر کے نہین بتلائے گئے،

دوسرا مغالطہ یہ ہو کہ باپ نرا جسمانی مربی ہو حالانکہ اس کے ذمہ روحانی تربیت بھی ہے، خود نہ کر سکے تو کسی دُور استاد کے پاس یا مدرسہ مین بھیجے، جیسا بہت سے کرتے ہین، اتنا بھی نہ کرے، تو قابلِ مواخذہ ہے، جیسے کوئی باپ جسمانی تربیت یا کھلانے پلانے میں کوتاہی کرے، بہرحال باپ باپ ہی ہو، جہل کی اور بات ہو، ورنہ اس کی برابر جسمانی و روحانی اعتبار سے خیرخواہ کون ہو سکتا ہو،

پھر سب سے بڑے روحانی مربی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہین اور حق تعالیٰ تو جسم و روح دونون کے مربی ہین اور جب خدا و رسول ہی نے باپ کا حق زیادہ فرما دیا، تو اُن کی اطاعت بڑے مربی کی چھوٹے مربی کے حق پر تقدیم ہو گی، البتہ واجباتِ شرعیہ کی مخالفت مین نہ باپ کی اطاعت ہو گی نہ استاد و پیر کی اور مباحات مین باپ کا حق مقدم ہو گا

تیسری تنبیہ یہ ہو کہ آیا معقولات، فارسی اور حساب وغیرہ کے استاد بھی حقوق مذکورہ کے حقدار ہین یا نہین، اسی طرح کافر استاد بھی، اس مین قواعد سے تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو چیزین مضر ہین ان کا استاد تو خود مضر و مضل ہے، اور استاد کا جو کچھ حق تھا، وہ بوجہ مفید و محسن ہونے کے اور جو چیزین

مضر نہیں ہیں، ان مین تفصیل ہے، کہ اگر علوم دینیہ مین نافع و معین ہین تو جز کہ مقدمہ کا حکم
مقصود کا ہوتا ہے، اس لئے ایسے اساتذہ حقوق مذکورہ کے مستحق ہون گے، گو اساتذہ مقاصد
کے درجہ مین نہ سہی، جس طرح اقارب کے حقوق مین قوتِ قرابت کے تفاوت سے حقوق مین
تفاوت ہوجاتا ہے، اور اگر نہ مضر ہین نہ مفید، تب بھی ایک دنیاوی احسان ہے، اور دنیوی احسان
پر شکر گذاری نصوصِ عامہ سے ثابت ہے، اس لئے اس کا بھی حق ثابت ہوگا، گو دینی احسان کے برابر نہ سہی،

اقتباساتِ بالا مین صریح نصوص سے جو استنباطات فرمائے گئے ہین، اور اُن سے طلبہ و اساتذہ کو تعلیم
تعلم کے جن حقوق و آداب کی طرف متوجہ اور جن کوتاہیون پر متنبہ فرمایا ہے، دنیوی درسگاہون یا انگریزی
اسکولون اور کالجون کے اکابر و اصاغر کی خدمت مین تو اس سلسلہ مین کچھ عرض کرنا ہی عبث ہے، ان کی تو
دنیا ہی الگ ہے، البتہ عربی و دینی مدارس کے اساتذہ و تلامذہ کی اُن سے غفلت بلکہ الٹے انگریزی اسکولون اور
کالجون ہی کے استادون اور شاگردون کی نقالی کو فخر جاننے کی جو وبا ان مین بھی پھیل گئی ہے، اس کی بنا پر حضرت
مجدد کی اس باب مین تجدیدات و اصلاحات بالا کی کچھ مزید تفصیل و تشریح کا جی چاہتا تھا، مگر کس کس چیز کی
کہان کہان تک شرح کیجائے، ع

"تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

باقی مدارس دینیہ کے مخلص و اہلِ فکر حضرات کے لئے جن کو دل سے کچھ اصلاح کی فکر ہے حضرت کے
یہ اجمالی اشارات و ارشادات بھی رہنمائی کے لئے کافی ہین، ورنہ اکثرون سے اندیشہ تو ان باتون کو محقراتِ امور
کنکر ٹالدینے کا ہے، کہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی اور ان کی اصلاح سے بیفکری کا یہ بھی ایک چلتا ہوا بہانہ
بنا لیا گیا ہے، کہ یہ چھوٹی اور حقیر باتین ہین جس کا جواب وہی ہے، جو حضرت ایسے مواقع پر فرمایا کرتے تھے
کہ "اچھا تو ایک چھوٹی سی چنگاری اپنے کپڑون کے صندوق مین رکھ دو"

"باقی"

اشتراکی مابعد الطبیعاتی افکار
اسلام کی روشنی مین

از جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی اے

(۳)

جیسا کہ ابتدا مین بیان کیا جا چکا ہے مادہ کے متعلق مارکسیت کے بنیادی تصورات دو ہین، ایک یہ کہ مادہ ازلی ہے، اور اس کا وجود ہمارے ذہن و وقوف پر منحصر نہین ہے یعنی وہ بالذات موجود ہے، خواہ کوئی ذہن اس کا شعور کرنے کے لئے موجود ہو یا نہ ہو، دوسرے یہ کہ مادہ اپنی ذات سے متحرک ہے اور کائنات کے جملہ مظاہر خواہ وہ مادی ہون یا ذہنی مادہ کی اسی حرکت و ترقی سے وجود مین آئے ہین یہ نظریہ درحقیقت اس دعوی کی تردید کرتا ہے کہ کائنات عالم کی تخلیق اور مظاہر عالم کی توجیہ کے لئے کسی خلاق ذہن (Creative mind) کے فرض کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ مادہ کی ذاتی حرکت اور اس کے عام قوانین ارتقاء سے جملہ واقعات و مظاہر کی توجیہ کی جا سکتی ہے، اس لحاظ سے مارکسیت تمام مذاہب عالم اور بالخصوص اسلام کی نفی ہے کیونکہ مذہب کا سارا دار و مدار اس تصور پر ہے، کہ مادہ مخلوق اور حادث ہے، اور یہ کائنات اور اس کے جملہ مظاہر ایک ماورائی طاقت کے تخلیقی عمل کا نتیجہ ہین، جو شعور و ارادہ اور حکمت کی صفات سے متصف ہے، مارکسیت کے ان دو بنیادی تصورات پر پہلا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے، کہ اگر مادہ ازلی ہے یعنی ہمیشہ سے تھا، اور اس کا وجود ہمارے ذہن و وقوف پر منحصر نہیں ہے، تو ان دونون حقیقتون کا ادراک ہمین کس طرح ہوا، ظاہر ہے کہ انسان نے مادہ کو اس وقت محسوس کیا، جب وہ خود عالم وجود مین آیا،

یعنی جب ذہن پیدا ہوا اسی وقت مادہ کا شعور و ادراک بھی ممکن ہوا، انسانی ذہن و شعور کے وجود سے قبل اس دنیا میں کیا تھا، اور کیا نہیں تھا، اس کا علم و وقوف حاصل کرنے والا کون تھا، ممکن ہو کہ انسان سے قبل کائنات میں مادہ موجود ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسان سے پہلے اس دنیا میں کوئی شے موجود نہ ہو، لیکن یہ سب امکانات یا زیادہ سے زیادہ احتمالات ہیں، لیکن اصل حقیقت کا پتہ کیسے چلے جب کہ حقیقت کا مشاہدہ اور تجربہ کرنے والا کوئی ذہن نہ ہو، اگر مارکسیت کو خدا سے اس لئے انکار ہے کہ ہمارے مشاہدات و تجربات سے اس کا وجود ثابت نہیں ہوتا ہے، یا یہ کہ وہ انسان کے حواس و مدرکات سے بالاتر ہے، تو یہی اعتراض مادہ کے ازلی وجود پر بھی ہو سکتا ہے، آج ہم مادہ کو محسوس کرتے ہیں، اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، وہ ہمارے تجربہ میں آتا ہے، اس لئے ہم اس کے وجود کا اقرار کرتے ہیں لیکن جب ہم نہ تھے، نہ ہمارا ذہن تھا، نہ کوئی تجربہ و مشاہدہ کرنے والی ہستی تھی، اس وقت مادہ تھا یا نہیں اس کا علم کیسے ممکن ہو جس شے کا وجود تجربات اور مشاہدات سے ثابت نہ ہو بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جس شے کے وجود کا تجربہ اور مشاہدہ ممکن ہی نہ ہو کیونکہ انسان سے قبل مادہ کو تجربہ میں لانے والی کوئی ہستی نہ تھی) اسکی حقیقت کا دعویٰ ان لوگوں کو کہاں تک زیب دیتا ہے جو حواس و تجربات کے علاوہ اور کسی ذریعہ علم کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں پیروان مارکس ان حجری آثار (Geological remains) اور بحر و بر کی ان بے شمار نشانیوں سے استشہاد کریں گے جن سے انسان نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے، کہ اس سے قبل کائنات میں مادہ اور حیات دونوں موجود تھے، لیکن اس کے معنی تو یہ ہوئے، کہ حصول علم کا صرف یہی ایک ذریعہ نہیں ہے، کہ انسان براہِ راست اپنے حواس و تجربات و مشاہدات سے کسی وجود کا ادراک کرے بلکہ علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے، کہ کسی شے کی نشانیوں اور اس کے آثار و آیات کے مشاہدہ سے اس کے وجود کا یقین حاصل کیا جائے، خواہ وہ شے بالذات ہمارے حواس و تجربات کی رسائی سے باہر ہو، پھر اگر اسی طرح حاصل کئے ہوئے علم پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، اور اس سے یقین پیدا ہو سکتا ہے، تو خدا کے وجود سے انکار کیونکر جائز ہے، جب کہ زمین و آسمان کی بے شمار نشانیاں اپنے خالق کے وجود

پر گواہی دے رہی ہیں،

اور کائنات کی نظم و ترتیب، مقصدیت اور معنیٰ آفرینی اس امر کی دلیل ہو کہ وہ کسی ایسی قوت تخلیقی عمل ہے، جو ارادہ حکمت اور غایت پسندی کی صفات سے متصف ہے، ظاہر ہے کہ خدا کا اقرار اس بنا پر نہیں کیا جاتا ہے، کہ اس کا وجود براہ راست ہمارے تجربہ حواس کی رسائی میں ہے، بلکہ اس کی ہستی کا اثبات ہم اس لئے کرتے ہیں، کہ کائنات کی بے شمار نشانیاں اور لاتعداد آثار و آیات وجود حقیقی کی طرف اشارہ کرتی ہیں' دوسرا اعتراض اس نظریہ پر یہ وارد ہوتا ہے، کہ مادہ اپنے ذات سے کیونکر موجود ہوا، کیا مارکس کے متبعین کسی ایسے تجربہ یا مشاہدہ کی نشاندہی کر سکتے ہیں جس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہو جائے، کہ مادہ اپنی ذات سے ابتدائے کائنات میں موجود تھا، یا یہ کہ اس میں اپنی ذات سے موجود اور قائم رہنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، یہ دعویٰ کہ ابتدائے آفرینش سے مادہ بالذات موجود تھا، ایک نرا مفروضہ ہے، جس کی صداقت کا ثبوت تجربہ و مشاہدہ سے نہیں ملتا ہے، اور نہ مل سکتا ہے، اس لئے کہ ہر تجربہ کے لئے کسی ذہن کا موجود ہونا ضروری ہے، اور یہاں بحث یہ ہے کہ ذہن کے وجود سے قبل مادہ تھا یا نہیں، پھر اگر کسی دلیل کے بغیر محض احتمالات عقلی کی بنا پر ہم مادہ کے متعلق یہ یقین کر سکتے ہیں، کہ وہ بالذات ازل سے موجود تھا، اور اپنی ہستی کے لئے کسی اور وجود کا محتاج نہیں ہے، تو خدا کے متعلق یہ یقین کرنے میں، کونسا استحالہ عقلی لازم آتا ہے، کہ اس کی ذات ازلی ہے، اور وہ اپنے وجود کے لئے کسی اور خالق کا محتاج نہیں ہے، یہ ظاہر ہے کہ کائنات کا معمہ حل کرنے کے لئے ہمیں کسی نہ کسی ذات کو ازلی اور واجب الوجود (Self-existent) قرار دینا پڑے گا، اور اس ذات کو ان تمام صفات سے متصف کرنا پڑے گا جن سے تخلیق کائنات کی توجیہ ہو سکے، مثلاً حرکت، آئین پسندی اور مقصدیت؛ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ذات مادے کی ہے، یا خدا کی یعنی اس میں شعور و ارادہ کی صفت پہلے ہی سے موجود تھی، یا نہیں، مادیین اور خدا پرستوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ مادہ پرست ذات واجب الوجود اور ہستی ازلی کو شعور و ارادہ

کی صفات سے معرّیٰ قرار دیتا ہے، اور خدا پرست اوس ہستی ازلی مین ان صفات کا اثبات کرتا ہے، دونون اپنے دعوی کا کوئی ایسا قطعی ثبوت نہین رکھتے، جو ٹھوس تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہو، ہر گروہ احتمالات عقلی سے کام لیتا ہے، اور انہی پر اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ احتمالات کس کی طرف زیادہ ہین، مادیین کی طرف یا اہل مذہب کی طرف اس نقطۂ نظر سے جب ہم غور کرتے ہین، تو ہمین مادیین کا موقف بہت کمزور نظر آتا ہے، اس مین شک نہین کہ مادہ کو انسان کے مقابلہ مین تقدم زمانی (priority in time) حاصل ہے یعنی احتمال اس کا ہے کہ مادہ انسان سے قبل موجود تھا لیکن اگر اس احتمال کا قطعی ثبوت بھی حاصل ہو جائے، اور یہ معلوم ہو جائے کہ مادہ زمانی حیثیت سے انسان پر متقدم ہے، تب بھی یہ اس امر کا ثبوت نہین ہو سکتا کہ کائنات کے جملہ مظاہر جس مین انسان بھی شامل ہے مادہ کی تخلیقی حرکت و قوت کی پیداوار ہین، کیونکہ تخلیقی قوت کے اعتبار سے انسان مادہ پر تقدم اور فضیلت رکھتا ہے، نہ کہ مادہ انسان پر، غور سے دیکھئے تو مادہ انسان کی قوت تخلیق کا محتاج ہے، اگر یہ سوال کیا جائے کہ مادہ انسان پر حکمران ہے، یا انسان مادہ پر تو مشاہدات اور تجربات اور روزانہ زندگی کے بے شمار واقعات سے اس کا جواب یہی ملتا ہے کہ انسان مادہ پر فرمانروا اور حاکم ہے، اُسے اپنے اغراض کے لئے استعمال کرتا ہے، اور جس شکل مین چاہتا ہے، اُسے ڈھالتا ہے، اس لحاظ سے یہ امر قطعی الدلالہ ہے، کہ تخلیقی صفت مین انسان مادہ پر فضیلت رکھتا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے، کہ وہ مادہ کی صفت تخلیق سے وجود مین آیا ہو، اگر مادہ خالق ہے اور انسان مخلوق تو یہ عجب خالق ہے، جو اپنی مخلوق کا تابع فرمان، اس کے خواہشات و اغراض کا آلۂ کار، اور اس کی قوت تخلیق کے آگے عاجز اور بے بس ہے،

درحقیقت مادیین صرف تقدم زمانی (priority in time.) کی صفت کو دیکھکر یہ حکم لگاتے ہین، کہ جو وجود زمانی حیثیت سے متقدم ہوگا، وہی صفت تخلیق کے اعتبار سے بھی متقدم ہوگا، حالانکہ یہ امر عام مشاہدات و تجربات کے بالکل خلاف ہے، دریا، پہاڑ، جنگل، اور حیوانات کی

ہے شبہ اقسام طوالت عمر اور مدت حیات کے لحاظ سے انسان سے بہت قدیم ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا وجود انسانی وجود سے زیادہ حقیقی ہے، یا انسان انہی کی تخلیقی پیداوار ہے، کیونکہ حقیقی وجود عبارت ہے وجود مؤثر (Effective existence) سے اور بہ لحاظ تاثیر و اثر انسان موجودات عالم میں سب سے زیادہ برتر اور فائق ہے یعنی دیگر اشیائے مادی کے مقابلہ میں سب سے زیادہ موثر وجود انسان کا ہے اس لئے اس کا وجود زیادہ حقیقی بھی ہے، اگر ایک جاہل کسان ایک سو بیس سال کی زندگی پاتا ہے، اور ایک مصلح شاعر یا انقلابی لیڈر صرف پچاس سال زندہ رہتا ہے، تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ کسان کا وجود اس مصلح، شاعر، یا انقلابی لیڈر کے وجود سے زیادہ حقیقی ہے، اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے، کیونکہ وجود دراصل نام ہے تاثیر و اثر آفرینی کا، نہ کہ مدت حیات کی کمی و زیادتی کا، اس لئے محض تقدم زمانی سے مادہ کو خالقیت کا مرتبہ نہیں حاصل ہو سکتا، اب اگر عالم اور اس کے واقعات و مظاہر مادہ کی حرکت و تخلیق سے وجود میں نہیں آئے، تو پھر خدا کو خالق تسلیم کرنے کے سوا، اور کوئی چارہ نہیں ہے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مادیین نے مادہ کا جو جدید تصور پیش کیا ہے یعنی یہ کہ وہ ایک قائم بالذات متحرک اور ازلی ہے، جو اپنے باطنی قوانین کا پابند ہے اور خدا کے اس عام تصور میں کہ وہ قائم بالذات ہے، ازلی ہے، فاعل ہے، متحرک ہے اور اپنی مقررہ سنتوں میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا ہے، فرق صرف اتنا ہے، کہ مادیین ہستی ازلی کو، ارادہ، شعور، غایت پسندی اور حکمت یعنی فی الجملہ ان صفات سے عاری کر دیتے ہیں، جن سے شخصیت (Personality.) کا تار و پود تیار ہوتا ہے، اور خدا پرست اسی وجود ازلی میں تشخص کا اثبات کرتے ہیں یعنی اسے ارادہ شعور اور حکمت کی صفات سے متصف قرار دیتے ہیں لیکن درحقیقت ان دونوں تصورات کے عملی مضمرات میں زمین و آسمان کا فرق ہے، پہلا تصور صرف ہستی ازلی کے اقرار پر ختم ہو جاتا ہے، اور انسان پر اوس کے اقرار سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، دوسرا تصور صرف زبانی اقرار کا مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ زندگی میں عملی تغیرات و انقلابات یعنی تکمیل عبودیت چاہتا ہے، یہاں یہ شبہ ضرور پیدا ہوتا ہے، کہ اگر خدا خالق کائنات ہے اور اسی کا وجود وجود حقیقی ہے تو

پھر وہ ہمارے حواس و مدرکات اور تجربات و مشاہدات کی رسائی سے کیونکر باہر ہے، اس شبہہ کا جواب بھی ہمیں روزمرہ زندگی کے تجربات سے حاصل ہو سکتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ مراتب وجود میں جو شے جتنی زیادہ ارفع اور بلند ہے، اسی نسبت سے وہ زیادہ لطیف اور حواس و تجربات کی رسائی سے بعید بھی ہے، انسان کی ظاہری وجاہت، اس کے اعضاء کا موزون تناسب یا اس کی جسمانی قوت ایسی صفات ہیں، جو دیکھنے والے کو ایک نظر میں محسوس ہوتی ہیں، اور اس پر فوراً اپنا اثر مترتب کرتی ہیں، ہم ایک طاقتور یا حسین شخص کو دیکھتے ہیں تو اس کی جسمانی قوت یا حسن صورت سے متاثر ہو جاتے ہیں لیکن کسی شخص کی دماغی صلاحیتوں، اور ذہنی قوتوں کا علم و احساس ہمیں اس وقت تک نہیں ہوتا ہے، جب تک کہ ہم کچھ دیر اس کی صحبت میں نہ بیٹھ لیں، اور روزمرہ کی عام گفتگو کے علاوہ کسی سیاسی، مذہبی یا علمی مسئلہ پر اُسے اظہار خیال کرتے ہوئے نہ دیکھ لیں، ظاہر ہے کہ انسان کی ذہنی قوتیں اس کی جسمانی قوتوں کے مقابلہ میں زیادہ موثر اور زیادہ حقیقی ہیں، اور مرتبۂ وجود میں، انسان کا ذہن اس کے جسم سے اعلیٰ تر مقام رکھتا ہے، اس کے باوجود ہم جسمانی صفات کو فوراً محسوس کر لیتے ہیں، اور ذہنی صفات کے احساس میں اوّل تو کچھ وقت لگتا ہے، دوسرے چند مخصوص حالات و شرائط کی تکمیل کے بغیر انسان کی صفات ذہنی کا اظہار نہیں ہوتا، ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے، جو نہ تو جسمانی حیثیت سے ممتاز ہے، اور نہ عقل و ذہن کی جودت کے اعتبار سے لیکن اعلیٰ ترین صفاتِ اخلاقی سے متصف اور سیرت و کردار کے بہترین فضائل سے آراستہ ہے، کیا ایسے شخص کی اخلاقی قوت اوّل نظر میں ہم پر منکشف ہو سکتی ہے، یا محض دو ایک صحبتوں میں ہم اس کی سیرت کا کوئی صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایک طویل عرصہ تک اس کی صحبت میں رہنے کے بعد ہی ہم مختلف حیثیات سے اس کے کردار کا مطالعہ کر سکتے ہیں، اور اس گہرے مطالعہ کے بعد ہی اس کے حسن اخلاق اور جمال سیرت کا حال ہم پر منکشف ہو سکتا ہے، اس کے معنی یہ ہوئے، کہ اخلاقی قوت جو مرتبہ وجود میں جسمانی اور ذہنی قوتوں سے بلند ہے، اتنی آسانی سے احساس و ادراک کے دائرہ میں نہیں آسکتی، کیونکہ مدارج ہستی میں اس کا مرتبہ جتنا زیادہ بلند ہے، اسی نسبت سے اتنی

لطافت بھی زیادہ پائی جاتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وجود جتنا زیادہ حقیقی ہوگا، اتنا ہی زیادہ لطیف بھی ہوگا، اور حقیقت جتنی زیادہ بلند و ارفع ہوگی، اسی نسبت سے وہ حواس و تجربات کی رسائی سے دور ہوتی جائے گی، اسی پر قیاس کر لیجئے کہ اللہ تعالیٰ جو مراتب وجود میں سب سے زیادہ بلند اور کائنات کی اعلیٰ ترین حقیقت ہے اپنی لطافت ذات کے باعث عام احساس و ادراک کی رسائی سے کس قدر باہر ہوگا،

سخنِ ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر

نہ شود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی حال میں ذاتِ الٰہی کا عرفان و ادراک نہیں ہو سکتا البتہ وجودِ حقیقی کے ادراک کے لئے چند مخصوص حالات و شرائط ضروری ہیں، اسی طرح جس طرح انسان کی صفاتِ ذہنی و اخلاقی کا علم و احساس چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے،

وحی والہام کی حقیقت اور ابدی صداقتوں کا مسئلہ

مارکسیت وحی و الہام کی حقیقت سے اس بنا پر انکار کرتی ہے، کہ خارجی تجربات کے علاوہ انسان کے معلومات و تصورات کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے لیکن اگر بالفرض ہم یہ مان لیں کہ انسان کو اپنے معلومات و افکار کا سارا ذخیرہ کائناتِ خارجی سے حاصل ہوتا ہے، تب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تجربہ کرنے والا ذہن اس ذخیرۂ معلومات کی تشکیل و ترتیب میں کوئی حصہ نہیں لیتا، کہ بالفاظ دیگر ذہنِ انسانی کو خارج سے جو موادِ علم ملتا ہے، کیا وہ اُسے بلا تبدیلی صورت اور تغیر ہیئت جوں کا توں قبول کر لیتا ہے، یعنی اصل مسئلہ یہ ہو کہ خارج سے موادِ علم حاصل کرنے میں ذہن کا حصہ محض انفعالی ہے، یا وہ فاعلانہ حیثیت سے اس موادِ علم کی صورت گری کرتا ہے اگر ذہن کی حیثیت محض ایک آلہ موصولہ (Receiving agent.) کی ہے، جو سرتاسر انفعال و تاثر ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ایک ہی وقت اور ایک ہی ماحول میں جتنے انسان پرورش پائیں ان سب کے افکار و نظریات یکساں ہوں کیونکہ سب کے تجربات بھی یکساں ہیں، حالانکہ ایک ہی ماحول ایک ہی عمر اور ایک ہی خاندان کے افراد اکثر اوقات بالکل جداگانہ

بلکہ متضاد نظریات و مقاصد رکھتے ہیں، کیا اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ ہے، کہ ہمارا ذہن ایک قائم بالذات ([illegible]) تشکیلی قوت ہے، جو خارج سے مواد علم تو وہی حاصل کرتا ہے، جو ہماری عمر اور ہمارے ماحول کے دوسرے اشخاص کرتے ہیں لیکن اس مواد کی تشکیل و صورت گری اپنے طور پر کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان کے افکار و تصورات اور اس کے نظریات و مقاصد کا اطلاق مواد علمی کی اس پختہ حالت پر کیا جاتا ہے، جب ذہن فاعلانہ حیثیت سے مواد خارجی کی ترکیب و تشکیل کر چکتا ہے، نہ کہ اس مواد خام پر جو خارج کا فراہم کردہ ہوتا ہے، اس لحاظ سے انسان کے افکار و تصورات کا خالق درحقیقت اس کا ذہن ہے نہ کہ تجرباتِ خارجی، کیونکہ خارجی تجربات بغیر عمل ذہنی (Mental Processes) کے مدرکات کا ایک بے معنی طومار ہیں اس میں جو شے معنی پیدا کرتی ہے، وہ وہی انسان کا فاعلانہ ذہن ہے، اس لئے کسی فرد کی دماغی ساخت اور اس کے ذہن کی فاعلانہ قوت ایک مستقل قدر ہے، اب وحی و الہام کی حقیقت پر غور کیجئے، ایک پیغمبر کا دماغ جو اپنی مخصوص ساخت اور لطافت ذہنی اور [illegible] کی بنا پر فلسفیوں مفکروں و سائنسدانوں سے کہیں زیادہ بالغ نظر ہے، اسی موادِ خام کو جو وہ تجرباتِ خارجی سے حاصل کرتا ہے، اپنے ذہن کی مخصوص فاعلانہ قوت سے ایک معین صورت اختیار کرتا ہے، اور پھر دنیا کے سامنے اسے ایک صداقت کی شکل میں پیش کرتا ہے[1] یوں تو کائنات عالم کا ہر ذرہ حقیقت کی پردہ کشائی کر رہا ہے، اور خدا کے قانون سعادت و شقاوت کا ظہور اسی دنیا کے ہر واقعہ سے ہوتا ہے، لیکن صرف ایک پیغمبر کا ذہن اپنی مخصوص ذہنی لطافت اور فاعلانہ قوت کے باعث اُن اشارات و کنایات کو سمجھ سکتا ہے، جن میں فطرت اپنے حقائق کا اظہار و انکشاف کرتی ہے، حالانکہ ہم اور آپ ان اشارات و کنایات سے بے خبری کی حالت میں گذر جاتے ہیں، اور اپنی کثافت ذہنی کی وجہ سے اُن کا مفہوم اخذ نہیں کرتے ہیں ۔

---

[1] اس کا منشا یہ نہیں ہے، کہ مذاہب نعوذ باللہ پیغمبروں کے دماغ کی پیداوار ہیں، وہ سب منجانب اللہ ہیں، یہ طریقہ تعبیر منکرین مذہب کے آئین کے لئے اختیار کیا گیا ہے اس کی تفصیل آئندہ آتی ہے،

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَہُوْنَ تَسْبِیْحَہُمْ	اور دنیا کی کوئی ایسی شے نہیں ہے جو اس کی حمد و ثنا کی تسبیح خوانی نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیحوں کو سمجھ نہیں سکتے ہو،

درحقیقت وحی والہام کی صداقت کو تسلیم کرنے سے مادیین اس لئے تأمل کرتے ہین، کہ اُن کے سامنے اہل مذہب نے خدا کا صرف ماورائی تصور پیش کیا ہے یعنی ہستی باری تعالیٰ اس کائنات سے مادری اور مافوق ہی، حالانکہ اسلام نے خدا کے ماورائی تصور (Transcendental) کے ساتھ ساتھ اس کے سریانی تصور (Immanent) پر بھی زور دیا یعنی اس کی ذات عالم کائنات سے ماوری ہونے کے ساتھ کائنات انفس و آفاق مین جاری وساری بھی ہے،

وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ	وہ تمھارے ساتھ ہے تم جہان کہین بھی ہو،

اور یہ روح یعنی ذات باری تعالیٰ محض مخصوص افراد انسانی سے اپنی پیغام رسانی کا کام لیتی ہے اور پیغمبر کے لطیف ذہن و دماغ کا خالق اور صورتگر بھی وہی ہے، جو خارجی واقعات کا پیدا کرنے والا ہے اس طرح خارج اور باطن دونون کی تشکیل وہی کرتا ہی، ھُوَ الاَوَّلُ وَالآخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالبَاطِنُ خارجی تجربہ اور انسان کا مواد علم بھی خدا کے احکام اور اس کے مصالح کا تابع ہے، اورانسانی شخصیت کی تعمیر و تخلیق مین بھی اسی کا پوشیدہ ہاتھ کام کرتا ہے،

ھُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَاءُ،	وہی ہے جو رحم مادر مین تمھین جیسی صورت صورت چاہتا ہے، عطا کرتا ہے،

رہا یہ دعوی کہ دنیا مین کسی ابدی صداقت کا وجود نہین ہے، بلکہ ہر صداقت اپنے وقت اور زمانہ کے لحاظ سے اضافی ہے، اس کے متعلق ہم مارکس اور اس کے پیرودن سے صرف اتنا کہنا چاہتے ہین، کہ

عالم خارجی کے احوال و واقعات کی تبدیلیاں اس امر کی دلیل ہیں، کہ ان قوانین میں بھی تغیر ہوتا ہے، جن کے مطابق یہ تبدیلیاں عمل میں آتی ہیں، تو پھر کائنات ایک بالکل ناقابلِ فہم وجود ہے اور اس کے متعلق سائنس نے جس قدر نظریات پیش کئے ہیں، وہ سب غلط اور ناقابلِ اعتماد ہیں، ہم کائنات کو صرف عمومی قوانین (General laws.) کے ذریعہ سمجھ سکتے ہیں لیکن اگر یہ قوانین خود ناپائدار اور تغیر پذیر ہیں تو پھر واقعات عالم کی توجیہ کیسے ہوسکتی ہے، مثلاً آئین سٹین کے نظریہ اضافیت کو لیجئے، اگر ہم قوانین فطرت کو تغیر پذیر مان لیں، تو اضافیت پر کس طرح بھروسہ کیا جا سکتا ہے، کیا معلوم کہ آئین سٹین کی تحقیقات کے بعد یہ قانون بدل گیا ہو، اور اب فطرت کسی اور قانون کے مطابق کام کرتی ہو، پھر اگر اضافیت کے قانون کی جگہ اس دوسرے قانون کی تحقیق شروع کیجائے جس نے اس کی جگہ لی ہے، تو بہت ممکن ہے، کہ ہماری تحقیق و جستجو کے دوران میں ہی یہ قانون بھی باطل ہو جائے اور اشیاے فطرت کسی تیسرے قانون کی پابندی کرنے لگیں، اس میں شک نہیں کہ آئن سٹین کے نظریۂ اضافیت میں آیندہ بہت سی ترمیمات ہوسکتی ہیں لیکن یہ اس کا ثبوت نہیں ہے، کہ اضافیت کا قانون بدل گیا ہے، بلکہ اس سے صرف یہ ظاہر ہوگا، کہ انسان اپنی کوتاہی نظر کے باعث قوانین فطرت کو سمجھنے میں غلطی کرتا ہے، ورنہ یہ تو بالکل بدیہی ہے، کہ حرکتِ اشیا کا جو قانون آج ہے، وہی ہزار برس پہلے بھی تھا، اور ہزار برس بعد بھی ہوگا، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ تغیرات صرف حالات و واقعات میں ہوتے ہیں، نہ کہ ان قوانین میں جو حالات کی تہ میں کارفرما ہیں، بلکہ اس معنی میں فطرت کا دوام و استمرار اٹل ہے، اشیاء کے خواص میں ابتداے آفرینش سے اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، جو شے انسان کی جسمانی صحت کے لئے آج مضر ہے، وہی ہزار برس قبل بھی نقصان رساں تھی، اور وہی ہزار برس بعد بھی رہے گی،

طبیعی دنیا کی طرح یہ بات اخلاقیات میں بھی صحیح ہے، جس طرح عالم طبیعی میں قوانین فطرت تبدیلی پذیر نہیں ہیں، اسی طرح اخلاقی دنیا میں بھی قوانین اخلاق کی یکسانی میں کوئی فرق نہیں آتا،

یہ اور بات ہے کہ ہم ان قوانین کو سمجھنے مین غلطی کرین، اور جب غلطی کا احساس ہو جائے، تو اپنے نظریات و تصورات مین تبدیلی کرنے پر مجبور ہو جائین لیکن یہ تبدیلی اصل قانون مین نہ ہوگی بلکہ قانون کی بابت ہم نے جو تصور قائم کیا تھا، اس کی ترمیم و اصلاح ہوگی، جو اخلاق و عادات اور جو طرز فکر و طریق عمل انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے لئے پہلے مہلک تھے، وہی اس زمانہ مین بھی مہلک ہین، شراب خواری، زنا، نسوانی بے پردگی، اور عیش پرستانہ طرز زندگی سے اس ترقی یافتہ دور مین بھی وہی نتائج پیدا ہو رہے ہین، جو گذشتہ زمانون مین پیدا ہوئے تھے، قومون کے عروج و زوال جماعتون کے ضعف و انحطاط اور اجتماعی سود و بہبود کا قانون آج بھی وہی ہے، جو صدہا برس پیشتر تھا، تاریخ بدلتی ہے، اس کے حالات بدلتے ہین، لیکن اس کے قوانین نہین بدلتے، البتہ حالات و اشکال کی تبدیلی سے اس قانون کے اطلاق مین بھی تبدیلی ضروری ہو جاتی ہے،

جو لوگ تغیر اور محض تغیر کے قائل ہین، کیا وہ اس بات کا تصور کر سکتے ہین، کہ قانون ارتقاء جو ابتداے آفرینش سے کائنات اور اس کے جملہ تغیرات مین کارفرما ہے، دفعتہً باطل ہو جائے اور اس کے بجاے دنیا قانون ارتداد (Law of Retrogression) کے مطابق حرکت کرنے لگے، اگر اس

ل چونکہ قومون کے عروج و زوال مین متعدد عوامل (Factors) کارفرما ہوتے ہین اور آخری نتیجہ انھین عوامل کے مجموعی اثر سے مترتب ہوتا ہے، اس لئے ممکن ہے کہ چند عوامل قوم کو بربادی کی طرف لیجائین لیکن دوسرے عوامل کے درمیان مین آجانے سے ان کا اثر پورے طور پر ظاہر نہ ہوسکے مثلاً امریکہ اور انگلستان مین شراب خواری اور فحش کاری بہت بڑھی ہوئی ہے، اور اس کے ہلاکت خیز اثرات جو ہونا چاہئے تھے، ہو رہے ہین مگر ان اقوام کی بعض اعلیٰ تر صفات نے اُن کے مضر اثرات کو دبا رکھا ہے جونہی ان اعلیٰ تر صفات کے اثر و قوت مین کمی ہوگی، ان عادات بد کا سیلاب پوری قوم کو قعر بربادی مین ڈھکیل دیگا،

طرح قوانین عالم ایک دوسرے کا ابطال کرنے لگین تو کائنات یا تو بالکل برباد ہوجائے گی، یا اس کے اندر ایک دائمی جمود وسکون پیدا ہوجائے گا، پھر کیا یہی اصول انسان کے اخلاقی وجود پر صادق نہین آتا؟ اگر ہم یہ مان لین کہ قوانین اخلاق اسی طرح بدل کر ایک دوسرے کے اثرات کو بالکل مٹا دیتے ہین، تو ہمین یہ بھی ماننا پڑے گا، کہ انسان کا اخلاقی ارتقار غیر ممکن، اور اس کی روحانی زندگی یکسر بے معنی ہے، پھر کیا بات ہو کہ مارکس اور اس کے پیرو عالم طبعی مین قوانین کے دوام واستمرار سے تو انکار نہین کرتے ہین لیکن اخلاق ومعاشرت اور انسان کی اجتماعی فلاح کے قوانین کا دائمی ہونا ان پر اتنا شاق گذرتا ہے اگر فطرت اپنے کسی ایک شعبہ مین دوام واستمرار رکھتی ہے، تو کوئی وجہ نہین ہے کہ اس کے دوسرے شعبون مین دوام واستمرار اور عدم تغیر نہ ہو، یا کائنات کے مختلف شعبے متضاد قوانین کے تابع ہین، اگر ایسا ہے تو پھر اس مین کوئی اندرونی وحدت نہین ہوسکتی، حالانکہ مارکسیت ایک طرف تو اصول تضاد کی علمبردار ہے، اور اس کو تسلیم کرتی ہے، کہ دنیا مین متضاد حقیقتیں پہلو بہ پہلو کام کرتی ہین، اور دوسری طرف اس واقعہ کا اعلان کرتی ہے، کہ عالم مین بیک وقت تغیر بھی کارفرما ہے، اور ثبات ودوام بھی، یعنی تغیر اور عدم تغیر کی دو متضاد صفات ایک ساتھ کام کررہی ہین، خارجی حالات وواقعات مین ہر دم تغیر وتبدل ہوتا ہے لیکن قوانین تغیر اپنی جگہ دائم وقائم ہین، اگر اس پر بھی پیروان مارکس یہ دعویٰ کرین، کہ قوانین حیات خود تغیر پذیر ہین، تو ہم کہہ سکتے ہین، کہ جدلیات اور تاریخ کے جو قوانین تم نے سو سال پہلے مرتب کئے تھے، وہ اب تبدیل ہوگئے ہین، اس لئے تمھین اپنے تمام اصول ونظریات پر نظر ثانی کرکے مارکسیت کا ایک جدید فلسفہ مرتب کرنا چاہئے۔

تاریخی حوادث اور انسانی ارادون کی ناکامی

گذشتہ صفحات مین ہم نے انجلیس کی تحریرون سے ایک اقتباس پیش کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مارکسیت اس امر کو تسلیم کرتی ہے، کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی کوششون کے نتائج وہ نہین ہوتے ہین، جس توقع سے ان کوششون کا آغاز کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ فرد اور جماعت کی خواہشات، ارادے اور کوششین دوسرے افراد اور جماعتون کے ارادون اور

مقاصد سے متصادم ہوتی ہین، اس تصادم کا نتیجہ اکثر و بیشتر متوقع نتائج سے بہت مختلف ہوتا ہے، اس طرح انسان اگرچہ شعوری مقاصد کے ساتھ کام شروع کرتا ہے، لیکن اس کی کوششون کے نتائج شعوری نہین ہوتے، اسی طرح انسانی تاریخ مین بھی انسان کے ظاہری اختیار و ارادہ کی کارفرمائی کے باوجود درحقیقت اس کے ارادون کو بہت کم دخل ہے، غرض تاریخ اور فطرت دونون مین شعور کے بجائے بے شعوری پائی جاتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ پھر تاریخ کے واقعات مین ربط و تسلسل کیون پایا جاتا ہے، اور یہ واقعات نہ تو بے معنی ہوتے ہین، اور نہ بے قاعدگی کے ساتھ پیش آتے ہین، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ان مین کوئی شعوری مقصد کام کر رہا ہے، اگر دیانت سے اس پر غور کیا جائے، تو اس کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ تاریخی واقعات کی شکل و رفتار ایک بالاتر ہستی کے ارادہ سے متعین ہوتی ہے، جو ذی شعور ہو اور نہ صرف خود صاحب ارادہ ہے، بلکہ انسانی ارادہ کی خالق بھی ہے، لیکن مادیت کی اور شکلون کی طرح مارکسیت بھی خدا کے قریب پہنچکر اور اس کے آثار وجود کو محسوس کر کے اس سے قصداً گریز اختیار کرنا چاہتی ہے، اسی لئے انجلس کو کسی ایسے نظریہ کی جستجو ہوئی جس سے خدا کا اقرار کئے بغیر وہ تاریخی واقعات کے ربط و تسلسل اور تاریخ کی منظم رفتار کی توجیہ و تشریح کر سکے، اور اس نے تاریخ کے "مستورہ قوانین" کو اس نظم و مقصدیت کا سبب قرار دیا جو واقعات مین پائی جاتی ہے، یعنی جس طرح عالم فطرت کے واقعات مادہ کے قوانین حرکت کا نتیجہ ہین، اسی طرح واقعاتِ تاریخ کے "قوانین مستورہ" کا نتیجہ ہین، سوال یہ ہے کہ انجلس اور مارکس کے پیروون کو ان قوانین مستورہ کا علم کیسے ہوا، جب کہ وہ ہمارے مشاہدات و تجربات مین نہین آئے اور ہماری نگاہ سے مستور ہین، کیا یہ محض ادعائیت نہین ہے، کہ ہم ایک ایسے اصول و قانون کا اثبات کرین، جو ہم سے مخفی اور پوشیدہ ہے، اور جسے دیکھنے اور محسوس کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہین ہے، اگر اس کے جواب مین انجلس اور اس کے متبعین یہ کہتے ہین، (اور اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہین ہے) کہ اس قانون کے نتائج و اثرات اور اس کے آثار و شواہد اس کے وجود کی دلیل ہین، تو ہم ان سے عرض کرین گے کہ بالآخر تم نے بھی خالص تجربات و مشاہدات

کے علاوہ حصولِ علم کا ایک اور ذریعہ تسلیم کر لیا یعنی کسی شے کے آثار و آیات سے اس کے وجود کا ثبوت خواہ وہ شے بالراست ہمارے حواس و مدرکات کی رسائی سے باہر ہو، بعینہٖ اسی طریقہ سے ہم خدا کے وجود کا اثبات و اقرار کرتے ہیں یعنی تاریخ اور فطرت خارجی میں بے شوری سے شعور کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے، کہ کوئی شعوری قوت اُن کے پسِ پشت کار فرما ہے، پھر خدا کے تسلیم و اقرار میں آخر کیوں تامل ہے جب کہ اس کا وجود تھا قوانینِ مستورہ سے زیادہ قرینِ عقل اور قابلِ فہم ہے، اس کے علاوہ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے، کہ اگر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انسانی ارادوں اور کوششوں کے نتائج لازمی وہ نہیں ہوتے ہیں جن کے حصول کے لئے وہ کوشش کرتا ہے، تو پھر مارکس اور اس کے پیرو کیسے یقین رکھتے ہیں، کہ اشتمالیت کے قیام کی جدوجہد وہ کر رہے ہیں، اس کا نتیجہ وہی ہوگا، جو اُن کے پیش نظر ہے، انجلس کے . . . .

. . . .

نظریہ کی رو سے یہ امر بالکل یقینی ہے کہ اشتمالیوں کی جدوجہد کے واقعی نتائج ان متوقع نتائج سے بہت مختلف ہوں گے جنھیں پیش نظر رکھکر یہ تحریک شروع کی گئی تھی، یعنی اشتمالی تحریک بالآخر اشتمالیت کے قیام پر نہیں، بلکہ کسی ایسے نظام کے قیام پر منتہی ہوگی، جو مارکس اور انجلس کے تصور کردہ نظام سے بہت مختلف ہوگا، اگر ایسا ہے، اور انجلس کے نظریہ کی بنا پر اسی کا امکان ہے، تو پھر اشتراکی نظام قائم کرنے کی یہ ساری جدوجہد لاحاصل ہے، جب کہ ہمیں پہلے ہی سے یہ معلوم ہے، کہ اس کا نتیجہ پیش نظر مقصد سے بہت مختلف ہوگا، عجیب بات یہ ہے کہ انجلس کے اس صاف بیان کے باوجود انسانی تاریخ میں متوقع نتائج کبھی برآمد نہیں ہوتے ہیں، مارکسیت اس امر کا دعویٰ کرتی ہے، کہ اشتمالیت کی کامیابی ایک ناگزیر تاریخی وجوب ہے یعنی اشتمالی نظام بہرحال دنیا میں قائم ہو کر رہے گا، کیونکہ تاریخی حالات و واقعات کا ناگزیر تقاضا یہی ہے، اس کے علاوہ چونکہ نظام سرمایہ داری اپنے عروج و منتہیٰ کو پہنچ چکا ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس نظام کے اندر سے اس کی ضد پیدا ہو کر اُن کو برباد کر ڈالے، غرض ایک طرف یہ کہا جاتا ہے، کہ مختلف افراد

اور جماعتوں کی خواہشات اور ارادوں کے تصادم کی وجہ سے وہ نتائج کبھی برآمد نہیں ہوتے ہیں جن کا حصول افراد اور جماعتوں کے پیشِ نظر ہوتا ہے، اور دوسری طرف یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہم جن ارادوں اور مقاصد کو لیکر اٹھے ہیں، وہ بہرحال کامیاب ہوکر رہیں گے، تضاد بیان اور خیالات کے الجھاؤ کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی اور کونسی مثال ہوسکتی ہے،

مارکسیت کے بالمقابل تاریخ کے تغیرات و انقلابات کا اسلامی نظریہ اس قسم کے تضادات سے پاک ہے: اسلام نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا، کہ اس کا نظام ہی ایسا ہے، کہ وہ تاریخی واقعات کی ناگزیر رفتار سے خودبخود دنیا کے دیگر ادیان پر غالب آجائے گا، گویا کہ اس کی کامیابی تاریخِ انسانی کے ارتقائی عمل کا ناگزیر نتیجہ یا ایک تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کے افعال انفرادی اور اعمال اجتماعی میں جبر کا کوئی عنصر نہیں ہے، یعنی انسان کسی خاص دور یا کسی عہد میں کسی خاص طریقِ فکر اور طریقِ عمل کو اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے جس عقیدہ اور جس عمل کو چاہے اپنے لئے پسند کرے، لیکن اس کے اثرات لازمی طور پر اس پر مرتب ہوں گے، اور اس کی کامیابی یا ناکامی کا تعین کریں گے، وہ کائنات کو سعی و عمل کا ایک وسیع میدان قرار دیتا ہے، اور کامیابی کے لئے سعی و تدبیر کو شرط قرار دیتا ہے:-

لیس للانسان الا ما سعیٰ ۔ انسان کے لئے بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے، جس کی وہ کوشش کرے،

دنیا میں ہر عقیدہ کے لئے خواہ وہ حق ہو یا باطل اس میں اس کے پیشِ نظر کامیابی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں حتی کہ جو شخص گمراہی اور فساد کی راہ اختیار کرتا ہے، وہ بھی اپنی سعی و عمل کے مطابق ان میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے، اور کائنات کی کوئی قوت اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتی، خواہ وہ مقصد اور عمل غیر صالح اور غلط ہی کیوں نہ ہو، کائنات میں کسی حرکت اور کسی عمل کے لئے مزاحمت نہیں پائی جاتی ہے، عدم مزاحمت اس کا بنیادی قانون ہے، ہاں کسی ایسے فرد یا گروہ کو جو خود قدم نہ اٹھائے، کائنات آپ ہی آپ کامیابی نہیں عطا کرتی ہے،

محض خلوص نیت، دعائیں اور آرزوئیں خواہ وہ مومن کی ہوں یا کافر کی اُسے کامیاب نہیں کر سکتی ہیں، جب تک عمل کی طاقت اس کے پس پشت نہ ہو، لیکن اہل ایمان اور صالحین کے ساتھ خالق کائنات کی مدد شامل ہوتی ہے جب وہ سعی و عمل کے قانون کے مطابق کام کریں اور اپنے مقصد کے لئے ابتدائی قدم (Initiative) اٹھائیں تو کائنات کی تمام قوتیں ان کی مساعدت کرتی ہیں مگر یہ مساعدت سعی و عمل کے ساتھ مشروط ہے یعنی ایسا ممکن نہیں ہے کہ کوئی صالح گروہ زمین پر حق کے لئے جد و جہد نہ کرے، اور پھر بھی کائنات کی قوتیں محض اس لئے اس کا ساتھ دیں کہ وہ صالح ہے، بلکہ جد و جہد کی ابتدا اہل ایمان کی طرف سے ہونا ضروری ہے، اس وقت قدرت اُن کی امداد پر آمادہ ہوتی ہے،

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ ۔   اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا،

اس آیت سے صاف ظاہر ہے، کہ کائنات اس امر کی مقتضی ہے کہ کوئی گروہ قیام حق کے لئے کھڑا ہو، اور جب ایسا کوئی گروہ پیدا ہوتا ہے، تو فطرت اس کے لئے کامیابی کا سامان بہم پہنچاتی ہے، آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے، کہ اللہ تعالیٰ مافوق الفطرت ذرائع سے اُن لوگوں کی مدد کرتا ہے، جو اُس کے قوانین کے مطابق دنیا کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کے لئے اپنے جان و مال کی بازی لگا دیتے ہیں، اور مافوق الفطرت ذرائع کی امداد بھی عمل اور جد و جہد پر منحصر ہے، اس کے بغیر کوئی امداد حاصل نہیں ہو سکتی، خالق کائنات نے اس کی فطرت کچھ ایسی بنائی ہے، کہ وہ انسان کے اخلاقی مقاصد اور اس کی روحانی تمناؤں کے ساتھ محض غیر جانبداری، بے تعلقی اور عدم مزاحمت کا رویہ نہیں اختیار کرتی، بلکہ ان مقاصد اور تمناؤں میں اسکی شریک ہوتی، اور ہر قدم پر اس کی امداد و اعانت کرتی ہے، گویا کائنات کی تمام قوتیں اخلاقی مقاصد کی تکمیل میں دن رات لگی ہوئی ہیں، اور جب اس کام میں ان کو انسان کی طرف سے کوئی امداد ملتی ہے تو وہ اپنے کام میں اور زیادہ تیزی اور سرگرمی سے منہمک ہو جاتی ہیں، اور اپنے مددگار انسانوں کو قوت بہم

پہنچاتی ہیں، کائنات اور انسان دونوں کا مقصدِ حیات ایک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ کائنات مجبور ہے، اور وہ اُس مقررہ مقصد کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہیں اختیار کر سکتی ہے، اس کے برخلاف انسان آزاد ہے، اس لئے بسا اوقات اپنی آزادی سے غلط مقاصد کا انتخاب کرتا ہے، مگر جب وہ اپنی غلطی محسوس کرکے صحیح مقصد کو پالیتا ہے، تو انسان اور کائنات روحانی حیثیت سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، اور باہمی تعاون کے ساتھ اُن قوتوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں، جو غلط مقاصد کے لئے سرگرمِ عمل ہیں، مگر جب اہلِ ایمان کا گروہ مقصدِ حق کے لئے جان نثاری نہیں کرتا، اور مقصدِ باطل کے لئے سرگرمِ عمل گروہ کے لئے میدان چھوڑ دیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے قانونِ سعی و عمل کے مطابق اس غیر صالح گروہ کو کامیابی حاصل ہو جاتی ہے، جو اپنے مقصد کے لئے سعی و جہد کرتا ہے، ایسی صورت میں کائنات کی قوتیں اس گروہ کی مزاحمت تو نہیں کرتیں، کہ ان کا بنیادی قانون عدمِ مزاحمت ہے لیکن ایجاباً اس کی کوئی مساعدت بھی نہیں کرتی ہیں، خدا کا قانون یہی ہے کہ جو گروہ جس مقصد کے لئے جد و جہد کرے گا، اس کے لئے کامیابی کی راہ کھلی ہوئی ہے، خواہ اس کا مقصد خالص دنیوی اور غیر اخلاقی ہو،

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا	جو شخص دنیا کے منافع کے لئے جلد بازی
لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ	کرتا ہے تو ہم بھی اس کے لئے جلدی کر دیتے ہیں
جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا	جہاں تک ہم چاہتے ہیں اور جس کے لئے ہم چاہتے ہیں پھر ہم
مَدْحُورًا وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَى	اس کے لئے جہنم کی آگ تیار کرتے ہیں
لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ	جس میں وہ ذلیل و خوار ہو کر جلتا ہے،
كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۝	اور جو شخص آخرت چاہتا ہے اور اس
	کے لئے کوشش کرتا ہے، وہ کامیاب
	ہوتا ہے بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو،

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت مین کامیابی کیسے حاصل ہوگی، جب کہ دنیا مین دو گروہ مساوی قوت اور مساوی عقل و شعور کے ساتھ اپنے اپنے مقصد کے لئے جد و جہد کر رہے ہون جن مین سے ایک گروہ کا مقصد ایمان و اخلاق کے بالکل منافی اور دوسرے کا مقصد عین مقتضاے ایمان و اخلاق ہو. مارکسیت کے اصولون کے مطابق ان دونون کے تصادم کے نتیجہ کی کوئی پیشین گوئی نہین کی جا سکتی، وقتی حالات و اسباب کی مساعدت اور مادی قوت آخری نتیجہ پر موثر ہون گے، کیونکہ جب دو گروہ متضاد اغراض کو لے کر اٹھین گے، تو اُن کے تصادم کا نتیجہ تاریخی اتفاقات و حوادث پر موقوف ہوگا، لیکن اسلام قطعی طور پر دعوی کرتا ہے کہ جب مومنین صالحین کی جماعت لوجہ اللہ نظام حق کے قیام کی جد و جہد کرے گی، تو اس کی کامیابی بالکل یقینی ہے، اور محض طبعی اسباب عوامل یا مادی سر و سامان اس کی کامیابی یا ناکامی پر موثر نہ ہون گے،

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ	ان لوگون سے جو ایمان لائے اور جنھون نے
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ	نیک عمل کئے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے
فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ	کہ وہ انھین زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا
مِنْ قَبْلِھِمْ ؕ	جس طرح اُن سے قبل کے لوگون کو اُس
	نے اپنا خلیفہ بنایا تھا،

اس آیت مین اہلِ ایمان سے اللہ کا وعدہ قطعی اور غیر مشتبہ ہے، یعنی اگر کوئی جماعت ایمان اور عمل صالح کے ساتھ اپنی طرف سے سعی و تدبیر مین کوتاہی نہ کرے تو اس کی کامیابی محض اس بنا پر مشتبہ نہ ہوگی، کہ اسباب مادی یا کثرت تعداد کے لحاظ سے اس کی مقابل جماعتین اس پر فوقیت رکھتی ہین یہ مخالف قوتین کتنے ہی مادی اسباب و آلات سے مسلح ہون، کامیابی بہرحال اسی گروہ کو ہوگی، جو اپنے ذاتی، قومی، طبقاتی اور دنیوی مفاد کے لئے نہین بلکہ عالمِ انسانی کی اخلاقی فلاح کے لئے مصروف جد و جہد

ہوگا، اس کی وجہ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، یہ ہوگی کہ کائنات اپنے ظاہری طبعی وجود کے باوجود قوانین اخلاق کی محکوم اور فطرت انسانی کے اخلاقی مقتضیات اور روحانی مطالبات سے ہم آہنگ ہے، اور اس میں جو ظاہری اور مخفی قوتیں کار فرما ہیں وہ سب اسکی منتظر رہتی ہیں کہ جب کوئی گروہ اخلاقی اور روحانی مقاصد کو لے کر اٹھے، تو وہ اس کی طرف دستِ تعاون دراز کریں لیکن جب وہ اس سے مایوس ہو جاتی ہیں، تو پھر وہ اپنی طبیعت و فطرت کے مطابق مجبور ہو کر ان جماعتوں کے سامنے جو مادی اغراض اور دنیا کی سرداری و پیشوائی کے لئے جد وجہد کرتی ہیں، کامل غیر جانبداری کے ساتھ کامیابی کی راہ کھول دیتی ہیں، اور آخر میں وہ جماعت کامیاب ہوتی ہے، جو طبعی اسباب، مادی وسائل اور اہلیت کار کے لحاظ سے برتر ہوتی ہے،

نزہتہ القلوب حمد اللہ مستوفی

کے

بعض مسامحات

از

لیفٹیننٹ کرنل جناب خواجہ عبدالرشید صاحب بی ایم آیچ ہیمیو برما،

"اس مضمون مین حمد اللہ مستوفی کی جو غلطیان دکھائی گئی ہین، ان مین سے بعض صحیح ہین، اور اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اس نے ان مقامات کو خود نہین دیکھا تھا، بلکہ دوسرے جغرافیہ نویسون کے بیانات نقل کر دیئے ہین، اور یہ کوئی بعید بات نہین، اس لئے کہ ایک جغرافیہ نویس کے لئے ہر مقام کا خود دیکھنا ضروری نہین ہے، لیکن بعض بیانات کے متعلق جن کا تعلق جغرافی تغیرات سے ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس زمانہ مین مستوفی نے ان کو لکھا ہے، اس زمانہ مین ان کا بیان صحیح تھا، بعد مین جغرافی تغیرات نے ان حالات کو بدل دیا، مستوفی کی وفات سنہ ۷۳۰ھ مین ہوئی ہے، اور مضمون نگار نے ان مقامات کو سنہ ۱۹۴۲ء یعنی سنہ ۱۳۶۱ھ مین دیکھا ہے، اور ان دونون کے درمیان سات صدیون سے زیادہ کی مدت ہے، جو جغرافی تغیرات کے لئے بہت کافی ہے، "م"

حمد اللہ مستوفی کی نزہتہ القلوب کے جغرافیائی حصہ کا ترجمہ گب میموریل سیریز کی جانب سے سنہ ۱۹۱۹ء مین شائع ہوا ہے، گذشتہ سال یہ ترجمہ میری نظر سے گذرا، یہ کتاب آٹھوین صدی ہجری کی تصنیف ہے، دوران مطالعہ مین اندازہ ہوا کہ کتاب کا کچھ حصہ اغلاط پر مبنی ہے، اور بعض بعض مقامات کی تفصیل صحیح نہین ہے، اس لئے مین اُن کے نوٹس

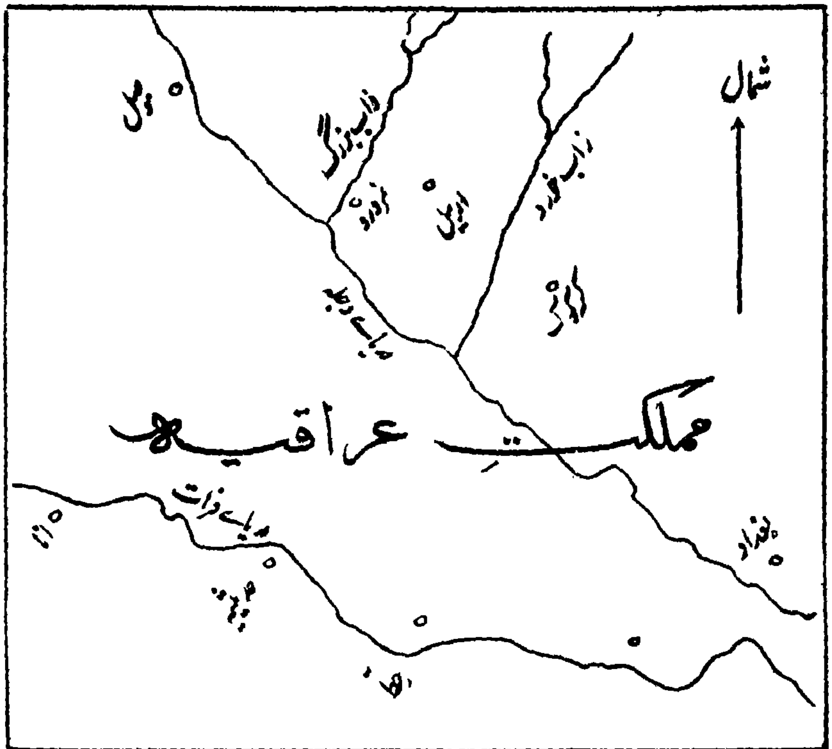
لیتا گیا، کہ جب کبھی موقع ملے گا، تو انھیں یکجا کروں گا، الحمد للہ آج شمالی برما کے قیام میں اس کا موقع مل گیا اور انھیں نوٹس کو ذرا پھیلا کر قارئین کرام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے،

جن مقامات اور علاقوں کا ذکر میں ذیل میں کروں گا، ان میں خود مجھے سیاحت کا اتفاق ہوا ہے، اور تمام جگہیں میری دیکھی بھالی ہیں، اسی لئے مجھے اور زیادہ تعجب ہوا کہ مصنف نے غلط کیوں لکھدیا ہے، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے جن مقاموں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے اکثر کو خود دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ورنہ بعض فاحش غلطیاں نہ ہوتیں، اس مضمون میں ان اغلاط کے علاوہ بعض ایسے معلومات بھی ہیں جن کا تعلق تاریخ قرآن کی جدید تحقیق سے ہے،

(۱) صفحہ، حدیثہ :- مصنف نے اس مقام کو دجلہ کے کنارے بتایا ہے، اور اسی مقام کے محل وقوع کے متعلق ص ۲۰۰ پر دوبارہ دریائے زاب کے ذکر میں بھی کچھ بیان ملتا ہے، مصنف کا بیان ہے کہ ان میں سے ایک دریا کو زاب بزرگ کہتے ہیں، اور یہ آرمینیا کے پہاڑوں سے نکل کر دیار بکر کے علاقہ سے بہتا ہوا مقام حدیثہ پر دجلہ میں گرتا ہے، ان دونوں اقتباسوں سے ظاہر ہوتا ہے، کہ حدیثہ لب دجلہ واقع ہے، جو صحیح نہیں ہے، مجھے حدیثہ کے گرد و نواح میں تقریباً پانچ مہینے رہنے کا اتفاق ہوا ہے، حدیثہ ایک مختصر سا قصبہ ہے جو حلب اور آنا کے وسط میں دریائے فرات پر واقع ہے، یہاں سے عراق پٹرولیم کمپنی (I. P.C.) کا ایک اسٹیشن جسے (K 3) کہا جاتا ہے، پانچ میل پر واقع ہے، اس قصبہ کا کچھ دریا کے اندر ایک جزیرے پر واقع ہے، یہ مقام نہایت خوبصورت ہے، ۱۹۴۲ء میں جب میں وہاں تھا تو اس وقت اس کی آبادی ڈھائی ہزار کے قریب تھی، اور یہ ناحیہ کا علاقہ تھا، ۱۹۴۲ء میں و اسم عبد الحمید جو بغداد یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے، مدیر ناحیہ تھے، جو اکثر مریضوں کو دیکھنے سے جایا کرتے تھے،

(۲) اسی طرح مترجم نے زابین کا ذکر بھی غلط کیا ہے، یہ دو دریا ہیں جو شمال کی طرف سے دریائے دجلہ میں آکر گرتے ہیں، ایک کو دریائے زاب بزرگ یا اپر (Upper) زاب کہتے ہیں، اور دوسرے کو زاب

خدیا (...) ناب کہتے ہیں، ذیل کے نقشے سے ان کا محل وقوع بخوبی سمجھ میں آجائے گا،



زابین مختصر سی ندیاں ہیں، اگرچہ کہیں کہیں ان کا پاٹ بڑھ گیا ہے تاہم جیسا کہ مستوفی نے بیان کیا ہے، ان کا تعلق دیار بکر کے علاقہ سے مطلق نہیں ہے زاب بزرگ نمرود کے قریب آکر دجلہ میں ملتا ہے، اس مقام پر قدیم شہر لارز تھا جس کے کھنڈرات ابھی تک موجود ہیں، نمرود اور مدینہ میں کم از کم ڈھائی سو میل کا فاصلہ ہے، اسی طرح زاب خورد بھی دیار بکر سے ہو کر نہیں گذرتا، جیسا کہ مستوفی نے لکھا ہے، اور وہ اسے مد زاب کہتا ہے، یہ دریا توار بیل اور کرکوک کے درمیان سے ہو کر دجلہ میں گرتا ہے مجھے زابین میں تیرنے کا اتفاق ہوا ہے، اور اکثر یہاں مچھلی کا شکار بھی کھیلا ہے، زاب بزرگ کے ساتھ ساتھ مجھے ستر میل شمال کی جانب جانے کا اتفاق ہوا ہے،

(س) ص ۱۱۹ پر مصنف رقمطراز ہیں کہ اعظم کے دو ستونوں پر براق کی تصویر تراشی ہوئی ہے اس کا چہرہ انسان کے مانند ہے، سر پر تاج ہے، اور پچھلا دھڑ بیل کی مانند ہے" میرے نزدیک یہ غلط تشریح

اس قسم کے مجسمے کثیر تعداد میں ہلال خصیب میں مل چکے ہیں، اور یہ ثابت ہو چکا ہے، کہ یہ آشوری جلیوں کے مجسمے ہیں جو بطور دیوتا پوجے جاتے تھے، ان پر اکثر خط میخی میں لکھے ہوئے کتبے بھی ملے ہیں، یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ مجسمے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت پیشتر کے زمانہ کے ہیں، جب لوگوں کو عراق کی اہمیت سے واقفیت بھی نہ تھی، بغداد کے آثارِ قدیمہ کے محکمہ نے اس قسم کے مجسمے حال ہی میں محطۃ القطار کے بالکل متصل ایک بڑے دروازے کے اندر جوڑ دیئے ہیں، اور اس دروازے کا نام آشوری دروازہ رکھدیا ہے، یہ مجسمے خورس آباد سے لائے گئے تھے،

(۴) ص ۱۴۹ پر ایک جگہ مصنف نے بیان کیا ہے، کہ "طوس کے مشرق میں امام غزالی کا مزار ہے"، امام موصوف کا مزار بہت سے مقامات کے ساتھ منسوب ہے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ پیغمبروں اور اماموں کے مزاروں کو ایک نہیں بلکہ متعدد مقامات سے منسوب کیا جاتا ہے، غالباً یہ مجاوروں کے ڈھکوسلے ہیں تاکہ نذر کا روپیہ فراوانی سے آتا رہے، بغداد میں مجھے امام غزالی کا مزار دیکھنے کا اتفاق ہوا[1]، یہ مزار ایک مختصر سے قبرستان میں واقع ہے، جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے متصل ہے، اس قبرستان کے احاطہ کے اندر ایک بوسیدہ سی چھوٹی اینٹ کی کوٹھری ہے، جس میں آپ کی قبر ہے، دروازے کی چوکھٹ کے اوپر ایک مختصر سا سنگ مرمر کا کتبہ آپ کے پورے نام کے ساتھ لگا ہے،

(۵) اسی صفحہ پر مستوفی نے لکھا ہے، کہ "طوس کے جنوب مغربی حصے میں ایک دروازہ ہے جس کے قریب تین ہزار اولیائے کرام مدفون ہیں، جن میں سے ہر ایک کا نام ابوبکر تھا"،

(۶) ص ۱۵۹ پر مقام رشت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:۔

"یہ بہت گرم مقام ہے، اور یہاں رطوبت زیادہ ہے"،

---

[1] معارف: امام غزالی کا مزار بروایت صحیح طوس کے قریب ایک قصبہ طابران میں ہے، یہیں امام موصوف کا انتقال ہوا تھا، اور یہیں دفن ہوئے اس لئے اس بارہ میں مستوفی کا بیان صحیح ہے، بغداد کا مزار جعلی ہے،

تعجب ہو کہ اگر رشت گرم ہے تو پھر ایران میں ٹھنڈا مقام کونسا ہو سکتا ہے، رشت دریاے خضر سے کچھ ہی دور ہوگا، بلکہ ساحل ہی پر کہنا زیادہ درست ہے، گرمیوں میں برسات کی وجہ سے ہوا میں رطوبت ضرور رہتی ہے مگر اتنی نہیں کہ اسے زیادہ کہا جائے، رشت سے قزوین تقریبًا ۱۳۰ میل کے فاصلہ پر ہے، قزوین مستوفی کا مولد ہے، مگر رشت سے بدرجہا گرم اور خشک ہے، موسم گرما میں رشت اور پہلوی ایران کے صحت افزا مقام ہیں، اور اکثر لوگ گرمیاں یہاں آکر گذارتے ہیں، مجھے ۱۹۴۲ء میں گرمی کے موسم میں بندر پہلوی میں رہنے کا اتفاق ہوا، یہاں سے رشت صرف بیس میل ہے، اس لئے اکثر آنا جانا ہوتا رہتا تھا، آج کل رشت ایک جدید شہر ہے، اور پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے، مناظر نہایت دلکش اور صفائی کا بہت زیادہ اہتمام ہے، البتہ ملیریا ضرور زیادہ ہے، باغات جگہ جگہ موجود ہیں، لوگوں کو سیر و تفریح کا بہت شوق ہے، باشندے خوش ... اور صاف رنگ کے ہیں، فیکٹریاں، کالج اور ہسپتال بھی موجود ہیں، کچھ عرصہ مجھے قزوین میں بھی رہنا پڑا، یہاں میں نے مصنف کے مزار کی بھی زیارت کی، ۱۹۴۲ء کے وسط میں اس کی نئی نئی مرمت ہوئی تھی، مخروطی ساخت کی مختصر سی قبر ہے، جو مسجد سنجیدہ کے قریب واقع ہے، اس مسجد کے متعلق مشہور ہے کہ سب اماموں نے یہاں نماز ادا کی ہے، واللہ اعلم،

(۷) ص ۲۳۱ پر دریاے خضر کا ذکر شروع ہوتا ہے، مصنف کہتے ہیں، کہ "دریاے خضر کی تہ میں کیچڑ کے سوا اور کچھ نہیں، جس کی وجہ سے اس کا پانی ہمیشہ گدلا اور سیاہ رہتا ہے، اور دوسرے دریاؤں کی طرح جن کی تہ میں ریت ہوتی ہے، اس کا پانی صاف نہیں لیکن انکا پانی ایسا شفاف ہوتا ہے، کہ اُن کی تہ نظر آتی ہے"،

یہ بیان بھی غلط فہمی پر مبنی ہے، کسی دریا کی تہ خواہ اس میں ریت، ٹیلے یا کیچڑ ہی کیوں نہ ہو، کبھی نظر نہیں آتی، دریاے خضر کا پانی اسی طرح صاف ہے، جس طرح دوسرے سمندروں کا ہوتا ہے، پانی کے گندلا نظر آنے کا سبب جس کی طرف مستوفی نے اشارہ کیا ہے، غالبًا وہ تیل کی جھلی ہے، جو سطح پر اکثر برسات کے موسم میں نظر آتی ہے،

مجھے خود اُسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، مجھے بھی پہلے دیکھ کر تعجب ہوا، کہ یہ کیا ہے؟ مگر ایک بار نہانے کے بعد جب بدن پر چکناہٹ سی محسوس ہوئی تو معلوم ہوا کہ تیل چپک گیا ہے، میرا قیاس ہے کہ باد کوبا (باکو) سے تیل پانی کی لہرون کے ساتھ پھیل جاتا ہے، یہ بھی ممکن ہو کہ دریاے خزر کے گرد و نواح مین تیل کے کنوئین کثرت ہین، اس لئے زمین سے تیل خود بخود نکل آتا ہو، اور پانی مین مل جاتا ہو، چونکہ تیل پانی سے ہلکا ہوتا ہے، اس لئے سطح پر تیر آتا ہے، اور اسے گدلا کر دیتا ہے، دریاے خزر کا کنارہ شناوری کے لئے بہت موزون ہے، اور گرمیون مین اچھی خاصی رونق رہتی ہے، کیچڑ کا کہین نام نہین، کنارے سے پانی مین بڑھتے جائیے، جب تک پاؤن زمین کے ساتھ لگتے رہین گے، ریت ہی ریت محسوس ہو گی،

ان اغلاط کے علاوہ مستوفی نے سدّ یاجوج و ماجوج سے متعلق نہایت سیر حاصل بحث کی ہے، اور بہت سی مفید باتین لکھی ہین، اس بحث سے چند اہم پہلو نکلتے ہین جنھین ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، اس سلسلہ مین اسکا اظہار ضروری ہے کہ اس موضوع پر مولانا ابو الکلام آزاد نے جو تحقیق کی ہے، وہ اپنی نوعیت مین واحد تحقیق ہے، مولانا نے تاریخ قدیم کے تمام پہلوؤن کا جائزہ لے کر ایک خاص نتیجہ نکالا ہے، جو ترجمان القرآن مین سورۂ کہف کے تحت نوٹون مین مفصل درج ہے، جس سے یہ مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے، اور مزید تحقیق کی ضرورت نہین رہتی، مولانا ابو الکلام کی تحقیق سے پیشتر جو الجھاؤ اس مسئلہ مین تھا میرے نزدیک اس کے تین وجوہ تھے،

اول، یہ بڑی غلط فہمی تھی، کہ سدّ یاجوج و ماجوج چین کی بڑی دیوار تھی، (Great wall of china)

دوئم، یہ کہ ذو القرنین سکندر مقدونی تھا،

سوئم، یہ بڑی غلط فہمی تھی کہ ایران کے قدیم بادشاہون کے نامون مین جو نقل (Mataches) واقع ہو گیا تھا، اوس نے معاملہ کو اور بھی الجھا دیا تھا، پہلی غلطی کی وجہ میری سمجھ مین نہین آئی تھی، کہ یہ کس

پر واقع ہوئی، دیوار چین کی موجودگی مورخین کو معلوم تھی، اور ساتھ ہی سدّ باب الابواب کا بھی علم لوگوں کو تھا، پھر کیا وجہ ہوئی کہ بیشتر مورخین کی نگاہ دیوار چین کی جانب اٹھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستشرقین نے اس تحقیق میں دلچسپی سے کام نہیں لیا، اور اگر لیا ہے تو احتیاط نہیں برتی، اور ایک دو مقامات پر لاپرواہی کے نمونے نظر آتے ہیں، تصنیفِ زیرِبحث کے ص ۲۳۲ پر مترجم نے ایک فٹ نوٹ میں اسی قسم کی غلط فہمی پیدا کردی ہے، مترجم کہتا ہے،

"سدّ یاجوج ماجوج دیوار چین ہے" (The wall of gog and-magog is the great wall of china)"

حالانکہ مستوفی نے جس دیوار کا ذکر کیا ہے، جس پر فٹ نوٹ ہے، وہ دیوار چین نہیں، بلکہ مستوفی نے صاف طور پر لکھدیا ہے، کہ یہ دیوار باب الابواب میں ہے، جسے دربند بھی کہتے ہیں، اس لئے یقیناً یہ دیوار چین نہیں ہو سکتی، مترجم نے اپنے بیان کو تقویت دینے کے لئے (M. j. De gorges-De muur Van gog and magog) کا حوالہ دیا ہے، معلوم نہیں مترجم کو یہ الجھاؤ پیدا کرنے سے کیا حاصل ہوا، اس سے پیشتر بھی مجھے ایسی دیدہ و دانستہ غلطیاں پھیلانے والوں کا تجربہ ہوا ہے، اس کی ایک نہایت اہم مثال جو کئی برس سے میری نگاہ میں ہے، عجیب نوعیت کی ہے، اس ضمن میں اگر اس کا ذکر نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے، کہ کہیں حافظہ سے اوجھل نہ ہو جائے، اس لئے اس موقع پر اسے بیان کر دیا جاتا ہے،

ڈاکٹر سخاؤ (Sachau) جنھوں نے البیرونی کی کتاب الہند کا ترجمہ کیا ہے، انھوں نے کتاب کے آخر میں ایک تنقیدی ضمیمے کا بھی اضافہ کیا ہے، اس ضمیمے میں انھوں نے ایک مقام پر بڑی غلط بیانی سے کام لیا ہے، جو کسی طرح بھی اُن کے علم کے شایانِ شان نہیں ہے، البیرونی کے ہمہ گیر علم کا اس وقت دنیا میں کون قائل نہیں، علم تو ایک طرف رہا، اس کی زبان دانی کا ثانی آج تک دنیا نے

پیدا نہین کیا، سخاؤ خود اپنے دیباچہ مین لکھتے ہین، کہ البیرونی کو چھ زبانون مین مہارت تھی، اور وہ ہر زبان مین خامہ فرسائی کیا کرتا تھا، ترکی، فارسی اور عربی تو خیر اس کے لئے آسان سمجھی جاسکتی ہین، مگر وہ یونانی، لاطینی اور سنسکرت کا بھی ماہر تھا، اور کتاب الہند لکھ کر اُس نے ہم لوگون پر جو احسان کیا ہے، وہ بیان سے باہر ہے، اور یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے، کہ اگر آج کتاب الہند ناپید ہوتی، تو ہندوستان کے قدیم علوم اس کا تمدن اور کلچر یک قلم ہماری نگاہون سے اوجھل ہوجاتے، ڈاکٹر سخاؤ تنقید مین فرماتے ہین کہ

"یہ جو اقتباسات البیرونی نے دیئے ہین یہ ہرگز بھگوت گیتا کے نہین ہوسکتے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ البیرونی نے بھگوت گیتا کا کوئی ایسا نسخہ استعمال کیا ہے جو ہمارے پاس آج کل موجود نہین، یا جو ہمارے نسخون سے بالکل مختلف تھا، اور یا پھر غالباً وہ ہندوستان مین واحد نسخہ تھا، جو اُن کی نظر سے گذرا،"

یہ البیرونی پر کتنا بڑا الزام ہے، گویا اس نے من گھڑت باتین لکھدی ہین، ہم کو بعض تاریخ کے طلبہ سے سُننے کا اتفاق ہوا ہے، کہ البیرونی گپیں بہت ہانکتا ہے، اور حقیقت کم لکھتا ہے لیکن جنھون نے البیرونی کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہین کہ یہ سراسر غلط ہے، لوگ بغیر غور کئے ہوئے محض دوسرون کی رائے پر اپنے خیالات کو پختہ کرلیتے ہین، جو ریسرچ کے منافی ہے، سخت تعجب ہے کہ ڈاکٹر سخاؤ کے پایہ کا آدمی جس نے کتاب الہند کے ترجمہ جیسا مشکل کام انجام دیا، اس حقیقت سے آگاہ نہین تھا، کہ بھگوت گیتا کے علاوہ ایک درجن گیتائین ہندوستان مین رائج تھین، ان تمام گیتاؤن کے نامون مین اختلاف تھا، جہاں تک مین نے کتاب الہند کا مطالعہ کیا ہے، وثوق سے کہہ سکتا ہون کہ البیرونی نے کسی ایک جگہ بھی بھگوت گیتا کا نام نہیں لیا ہے، وہ محض گیتا ہی لکھتا ہے، نہین معلوم مطلق گیتا سے ڈاکٹر سخاؤ نے یہ کس طرح سمجھ لیا، کہ اس سے مراد بھگوت گیتا ہی ہوگی، بال گنگا دھر تلک اپنی گیتا راسیا مین رقمطراز ہین، کہ

"یہ تمام گیتائین بھگوت گیتا کے بعد کی لکھی ہوئی ہین، اور انھون نے بعد مین شہرت حاصل کی

ل ہوئیں، البتہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے، کہ باقی گیتائیں جو وجود میں آئیں، اس کا سبب ہوا
یہی سمجھتا تھا کہ جب تک ہمارے پاس بھگوت گیتا کی مانند ایک گیتا نہ ہو گی، اس وقت تک
ب ناقص اور نامکمل رہے گا"

بعد ناظرین خود غور فرمالیں کہ ڈاکٹر سخاؤ کا اعتراض البیرونی پر کہاں تک درست ہے، آپ نے
ایک فہرست بھی دی ہے جن کی تعداد بارہ ہے، ان میں سے دو گیتاؤں کے نام یہ ہیں ، وائی
ا جن اصحاب کو مزید مطالعہ کا شوق ہو، وہ گیتا راسیا مطالعہ فرمائیں،

رح مستوفی کے مترجم نے بھی سدیاجوج و ماجوج سے متعلق غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی ہے
ان ملاحظہ ہو، پھر اس کا مقابلہ مترجم کے حاشیہ سے کیجئے، اور دیکھئے کہ مترجم نے کہاں تک اپنی اندازی
مستوفی لکھتا ہے :-

ض بیانات کے مطابق اس دیوار کو تعمیر کرنے والا ذوالقرنین اعظم تھا"

س سے کلام مجید کی طرف اشارہ ہے یعنی ذوالقرنین بن رومی بن لانتی بن جافت (gan-
ن نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام اور بعض بیانات کے مطابق یہ ذوالقرنین سکندر بن دارا، بن آرخش
(Artaxer) بن بہامن (Bahuman) بن اسفندیار تھا،

زرداد بہ اس دیوار کے متعلق لکھتا ہے :-

خلیفہ واثق باللہ نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ دیوار میں شگاف ہو گیا ہے تو ۲۲۳ھ
اوس نے سلام کو جو اس کا ترجمان تھا، اس کی تحقیق کے لئے بھیجا، اور پچاس مسلح سوار
ل رسد اس کے ساتھ کی، یہ شخص سُرّمن را (سمرہ) سے ہوتا ہوا، آرمینیا اور ابزاؤ کے
زرون کے پاس گیا، اور یہاں سے زلان شاہ اور شروان کے بادشاہوں سے ملتا ہوا
اوصریر پہنچا، صریر کا بادشاہ اس وقت باب الابواب (دربند) پر بھی حکمران تھا،

یہاں سے وہ ترخان ملک کے پاس پہنچا، جو خضر پر حکومت کرتا تھا، ترخان ملک نے سلام کو دیوار تک پہنچا دیا، سلام نے دیکھا کہ ایک خشک پہاڑ، ایک درّے کے اوپر چھایا ہوا ہے،.... اس درّے کے نیچے اُسے دو مینار نظر آئے، جو لوہے کی اینٹوں سے بنے ہوئے تھے، اور ان کے جوڑوں مین سکہ پلایا ہوا تھا، اس دیوار کے وسط مین ایک دروازہ تھا، جو دوہرے لوہے کی چادروں سے بنایا گیا تھا،...... دیوار بھی میناروں اور دروازہ کی طرح لوہے کی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی، اور اس کے بھی جوڑوں مین سکہ پلایا تھا"

اس تفصیل سے ناظرین خود اندازہ کرسکتے ہین، کہ مستوفی نے سدِ یاجوج وماجوج کا جو دربند مین واقع ہے، ذکر کیا ہے یا دیوارِ چین کا!

اس دیوار کی تفصیل ایک اور نامور مصنف کے قلم سے بھی سُن لیجئے، مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اس کتاب کا حوالہ ترجمان القرآن مین دیا ہے،

ولیم جکسن (William Jackson) نے یہ کتاب (From consta-ntinople to the home of omar Khayyam) عرصہ ہوا بطور سفرنامے کے لکھی تھی، وہ لکھتا ہے:۔

دربند.... اس کی بلند دیوارین فولاد کے مسودے ہین (؟)...... جو کہ متصل سمتوں مین بڑھتے چلے جاتے ہین، اور مغرب کی طرف چالیس میل تک قفقاز کے اندر تک چلے گئے ہین،........ اب اس دیوار کے بعض بعض حصے کہین کہین ملتے ہین، جو بحیرۂ اسود تک چلے گئے ہین، یہ عظیم دیوار سدِ یاجوج وماجوج ہی ہے...... اس مین چندان تعجب کی بات نہین کہ مرورِ زمانہ سے اس کی بوسیدہ حالت ہوگئی ہے، قدیم زمانہ مین اسے سدِ آہنی (دومرکپو) یا (Gate of gates) (باب الابواب) کہا جاتا تھا، دربند کی بنیاد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ

یہ دو بادشاہوں نے تعمیر کی، ایک سکندر مقدونی (۳۲۳ قبل مسیح) اور دوسرا ساسانی شاہنشاہ خسرو (انوشیروان عادل) جسے اکثر کیخسرو اوّل (۵۳۱-۵۷۹ قبل مسیح) بھی کہتے ہیں، آخرالذکر سے اس دیوار کی مناسبت زیادہ ہے، کیونکہ بیان کیا گیا ہے کہ کیخسرو نے اس دیوار کا بیشتر حصہ تعمیر کروایا"

ان دونوں بیانوں سے یہ صاف ظاہر ہے، کہ مستوفی اور ولیم جکسن جس دیوار کے متعلق ذکر کرتے ہیں وہ سدِ یاجوج و ماجوج ہی ہے، جو دربند میں واقع ہے، اور ان کا اشارہ ہرگز ہرگز دیوار چین کی طرف نہیں ہے، واللہ! علامہ مترجم نزہتہ القلوب نے دیوار چین کا مسئلہ کہاں سے پیدا کر لیا؟

اس بات کا کہ سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کیوں تصوّر کیا گیا ہے، میری دانست میں صرف ایک جواب ہے، وہ یہ کہ قرون وسطیٰ کے مورخین نے سکندر مقدونی کی شخصیت سے متاثر ہو کر اس پر اس قدر زور دیا، کہ اصل حقیقت نگاہ تحقیق سے اوجھل ہو گئی، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک جدید آخری انکشافات پایۂ تکمیل کو نہ پہنچے تھے، مگر کیخسرو کا نام تو موجود تھا، بلاذری نے بھی اس پر زور دیا ہے کہ سکندر مقدونی ہی نے سدِ یاجوج و ماجوج تعمیر کرائی تھی،

اوپر جو اقتباس نزہتہ القلوب سے دیا گیا ہے، اس سے بھی کچھ مغالطہ کا امکان ہے، گو اس کی نوعیت دوسری ہے، اس بیان کے مختلف اجزاء میں مطابقت پیدا کرنا مشکل نظر آتا ہے، خصوصاً جہاں مستوفی نے سکندر کا ذکر کیا ہے، اس نے سکندر کو دارا کا لڑکا بیان کیا ہے، مگر مولانا ابوالکلام آزاد کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے، کہ سائرس (کیخسرو) گورش تھا، اور یہ ایکمینز (Achae menes) خاندان سے تعلق رکھتا تھا، نہ کہ ساسانی خاندان سے، ولیم جکسن نے خسرو (انوشیروان عادل) کو ساسانی بتایا ہے، میرا خیال ہے کہ اُس نے دونوں خسروؤں کے بیان میں غلطی سے کام لیا ہے، بہر حال مستوفی خسرو کا نسب ایکمینزی بتلاتا ہے، مگر مولانا آزاد نے اس

تمام ابحاثِ ذکر صاف کردیا ہے، اور اس کی تصریح کردی ہے، کہ کیخسرو سائرس تھا، اور یہی ذوالقرنین ہے، جس کا ذکر قرآن کریم مین آیا ہے، اور اُسی نے سدِّ یاجوج و ماجوج تعمیر کرائی تھی، اب بات صرف اس قدر رہ گئی، کہ جس سکندر کا ذکر مستوفی کرتا ہے، اور جسے وہ دارا کا لڑکا بیان کرتا ہے، یہ کون شخصیت تھی؟ اس کی وضاحت خود مستوفی کے ایک بیان سے ہو جاتی ہے، ص ۲۳۹ پر وہ لکھتا ہے، کہ

"یہ سکندر بن داراب (Darab) بن بہامن (Bahaman) بن اسفندیار نے تعمیر کرائی"

اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مستوفی کا سکندر، سکندر مقدونی نہیں، بلکہ کوئی اور ایرانی سکندر ہے،

عرب کی موجودہ حکومتین

جزیرۃ العرب کے ساتھ مذہبی تعلق و عقیدت کے باوجود ہندوستان کے مسلمانون کو نجد و حجاز کے علاوہ عرب کے دوسرے حصون اور حکومتون کے حالات سے بہت کم واقفیت ہے، اس لئے اس کتاب مین عرب کا تفصیلی جغرافیہ اور تمام قابلِ ذکر حکومتون نجد و حجاز، عسیر، یمن، حج، نواحی تسعہ، بحرین، کویت، اور فلسطین و شام کے مختصر حالات، جمع کر دیئے گئے ہین، ضخامت ۰۰ اصفحے، قیمت :- عہر

چینی مسلمان

ایک دردمند صاحبِ قلم چینی مسلمان نے چین کے مسلمانون کے مذہبی اخلاقی، تمدنی، سیاسی، اقتصادی، اور تعلیمی حالات ہندوستانی زبان مین لکھے ہین،

ضخامت :- ۲۴۴ صفحے، قیمت :- عہر

منیجر

استفسار و جواب

ہندوستان کے عہد اسلامی مین زکوٰۃ کا نظام

جناب شیخ عطاء اللہ ایم اے
استاذ شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

مین نے العشر و الزکوٰۃ پر معارف مین آپ کا مبسوط مقالہ پڑھا، دو ماہ سے اُس کتاب کی تلاش مین ہون جس پر یہ مقالہ ایک تبصرہ ہے، کل پھلواری شریف لکھا ہے، اگر کتاب دستیاب نہ ہوئی تو آپکے ہان سے عاریۃً حاصل کرون گا،

فی الحال یہ درخواست ہو کہ ازراہِ کرم مجھے تاریخ ہند کی کسی کتاب کا حوالہ دیجئے جس سے آپ کے اس دعویٰ کی تصدیق ہو سکے، کہ ہندوستان کے عہد اسلامی مین بھی نظام زکوٰۃ قائم تھا اور نیز بیت المال کی آمدنی سے متعلق کچھ معلومات حاصل ہو سکین،

ازراہِ کرم اگر معلوم ہو تو یہ بھی ارشاد فرمادین کہ اس وقت کن کن اسلامی ممالک مین نظام زکوٰۃ زیر عمل ہے، اور اُس سے کس قدر سالانہ آمدنی حاصل ہوتی ہے، امید ہے کہ آپ اس مسئلہ کے سمجھنے مین میری اعانت فرمادین گے،

معارف:۔ گرامی نامہ ملا، کتاب العشر کے لئے مکتوب گرامی ملتے ہی پھلواری خط لکھدیا تھا، امید ہے کہ کتاب آپ کو مل گئی ہوگی،

ہندوستان کے عہد اسلامی مین زکوٰۃ کے نظام کے قائم رہنے کا تذکرہ آپ کو اس عہد کی تاریخون

ین عمومی طور پر مل سکتا ہے جس سے اندازہ ہو سکیگا کہ عہد اسلامی کے مختلف ادوار میں زکوٰۃ کی تحصیل وصول اور اس آمدنی کے مصارف کا طریقہ شرعی احکام کے بموجب قائم رکھا،

اس سلسلہ مین پہلے یہ بات ذہن نشین رکھی جائے، تو حقیقت کے سمجھنے مین آسانی ہوگی، کہ ان اسلامی حکومتون مین جو عہد وسطی مین مشرق و مغرب مین قائم رہی ہین، ان کے مالی نظام مین دو عملی طریق کار جاری ہوگیا تھا، ایک طرف وہ شرع کی پابندی کے لئے زکوٰۃ کے نظام کو قائم رکھتی تھین، اور دوسری طرف مختلف سلاطین اپنی حکومت کے استحکام اور شاہی مصارف، ملکی مہمات اور فوجی ضروریات کے لئے اور دوسرے ٹیکس بھی وصول کرتے تھے، اس طرح زکوٰۃ کی آمدنی و مصارف کی حیثیت ایک قسم سے دینی سترا کی ہوگئی تھی، حالانکہ اگر یہ سلاطین دین کے ماہرین اور ارباب حل و عقد کے مشورون سے اپنی حکومت کے اقتصادی نظام کو قائم کرتے، تو انھین اس دو عملی طریق کار کے اختیار کرنے کی ضرورت نہ ہوتی چنانچہ بعض دیندار سلاطین ڈو لاۃ نے اسپین اور بعض دوسرے ملکون مین کسی ایک زمانہ مین خالص دینی نظام مالیات کو برقرار رکھکر کامیابی سے حکومت کی، اور انھین دوسرے ٹیکسون کے لگانے کی ضرورت نہیں پڑی

ہندوستان کے عہد اسلامی مین بھی حکومت کے مالی نظام مین یہی صورت حال نظر آتی ہے، مختلف زمانون مین یہان کی حکومتون کے مالی نظام مین زکوٰۃ کا نظام قائم رہا، اگر اس عہد کی تاریخون کو استقصا سے دیکھا جائے، تو مختلف دورون کی تفصیلات سامنے آسکتی ہین، ذیل مین ارشاد گرامی کی تعمیل مین چند سرسری حوالے پیش ہین،

فیروز شاہی دور مین رعایا کے درمیان مسلم ذمی، امانی، اور دوسری طرف حربی کی تقسیم واضح قائم تھی، شمس سراج عفیف لکھتا ہے :-

"واہل کفر از طائفہ ذمیان و امانیان زیر سایہ چتر فیروز شاہی از رعیت بادشاہی برفاہیت می گذرانیدند، و اہل دار حرب را ہر سال نہب و تاراج میکردند (تاریخ فیروز شاہی ص ۱۰۰)

اس دور کے متعلق یہ تصریح معلوم ہے کہ اس مین زکوٰۃ کا نظام قائم تھا لیکن سلطان کے فوجی مہمون مین مصروف رہنے کی وجہ سے حکومت کے نظام مین ابتری پیدا ہوگئی تھی، جب اُس نے سلطنت کی اصلاحات کی طرف توجہ کی، اور خصوصاً مسلمانون کے خلاف لشکر کشی سے جو نقصانات متصور ہوئے، اور سامنے آئے ان مین ذیل کی دو باتین بھی تھین،

"دوم آنست کہ اموال بیت المال برائے آن جمع میکنند تا قوت در اسلام زیادت گردد نہ آنکہ بیت المال خرچ کنند و برائے قتلِ مسلمانان روند"

"ششم آنست اموال باطل ونا مشروع در بیت المال جمع می شود، (ص ۲۶۵)

اسی طرح اسلامی ملکون کے مالی نظام مین دو عملی طریق کار کے جاری ہونے کا جو تذکرہ اوپر گذرا وہی طریقہ اس دور مین ہندوستان مین بھی جاری تھا، فیروز شاہ نے اس کو ختم کرنا چاہا، اور ان تمام ٹیکسون اور محصولون کو جو غیر شرعی طریق سے وصول کئے جاتے تھے، معاف کر دیا، اور حکومت کے مالی نظام کو خالص شرعی حدود مین لانا چاہا، شمس سراج عفیف لکھتا ہے،

"سلطان فیروز شاہ بعنایت اللہ و حمایت اللہ در بلاد ممالک نامشروعات بود بر خلاف شرع ردی می نمود تمام از محصول بلاد مملکت دور کنانید، و آن مقدار روشہا کہ در قسم ملکی وضع بود و آن روشہا مخالف شرع می نمود ہمہ را منع گردانید

اس کے بعد علمار نے نامشروع محصولون کی فہرست تیار کی، اور فیروز شاہ نے ان سب کو موقوف کر دیا، لکھتا ہے:۔

"علمائے درگاہ شہنشاہی از آثار خوف حضرت الٰہی جل جلالہ و عم نوالہ چند چیز از قسم نامشروعات پیش حضرت شہنشاہ ششش جہات باز نمودند کہ در عہد سلاطین ماضیہ وضع کردہ بودند"

یہ خرابیان دو قسم کی تھین، ایک تو جائز محصول زکوٰۃ کی وصول مین غیر شرعی طریق اختیار کیا

جاتا تھا، دوسرے سرے سے ناروا ٹیکس عائد کئے جاتے تھے، علما نے ان دونوں کے تدارک کرنے کا مطالبہ پیش کیا تھا، چنانچہ فیروز شاہ نے اُن کے متعلق تحقیقات کرنے کا حکم دیا، پھر شرع کے مطابق اپنے فیصلے صادر کئے، شمس سراج عفیف ان تفصیلات کو لکھ کر آخر میں کہتا ہے،

"الغرض جملہ علماے امصار وتمام مشائخ مستثنیٰ وصاحبان دیوان قضا بحضرت شاہ طلب شدہ وازایشان استفسار طلبیدہ، جمیع علماء ومشائخ متفق اللفظ والمعنی فتویٰ دادند وازکتب معتبر روایات راجح بیرون آوردند، کہ ستون این وجوہات در علم شریعت یکے از مشروعات است چون علماے شریعت ومشائخ طریقت فتویٰ بحقیقت تحقیق مرادہ درین محل حضرت شہنشاہ اکمل فرمان فرمود تا این جمع چیزہا دور گردانند"

اس کے بعد ایک شاہی فرمان تیار کیا گیا، جس میں مشروع محصولات کی تفصیل درج تھی اور آخر میں مذکور تھا،

"اگرچہ سلاطین پیشین از سبب مصلحتے این چنین خراجہا گرفتند، وپابیش ایشان دستور مشہور بستور بازنہ نمودند چون از روے شرع گرفتن این چنین چیزہا جائز نبود من در عہد دولت خویش از آثار خوف پیش این جمیع چیزہا دور گردانیدم"

اس شاہی فرمان کو سنانے کے لئے شاہی لشکر کے مفتی قاضی نصراللہ ہاتھی پر سوار ہوئے اس کے سننے کے لئے عوام وخواص بڑی تعداد میں یکجا ہوئے، اور غیر معمولی خوشی سے اس فرمان کا خیر مقدم کیا گیا، اس فرمان کے جاری ہونے کے بعد حکومت کی آمدنی میں تیس لاکھ تنکہ کی کمی ہوگئی، یہ محاصل ...ہ میں بند کئے گئے تھے، (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۷۵-۳۷۹)

دوسری طرف جو شرعی محصول وصول نہیں کئے جاتے تھے، ان کی وصولی کا حکم جاری کیا، اور غیر معمولی احتجاج کے باوجود منسوخ نہیں کیا، اس سلسلہ میں جزیہ کی وصولی کا خاص اہتمام کیا گیا،

عفیف لکھتا ہے :-

"ہمچنین بر روش دین آئین (شرع محمدی) از طائفہ زنار داران جزیہ ستدہ" (ر ص ۳۸۲)

اسی طرح اس نے اپنی ذاتی املاک مین بھی شرعی حدود و قیود کا لحاظ رکھا، اور اپنی بنوائی ہوئی نہرون سے سیرابی کے معاوضہ مین دسوان حصہ وصول کرتا، اور ادسر زمینون کو آباد کراتا، ان املاک سے دو لاکھ تنکے وصول ہوتے تھے، اور یہ آمدنی بیت المال سے علحدہ رہتی تھی (ر ص ۱۳۰)

بیت المال کی مجموعی آمدنی اس زمانہ مین کیا تھی، اس کے دریافت کرنے مین کسی قدر وقت صرف ہوگا، افسوس کہ اتنی فرصت نہین کہ اعداد و شمار یکجا کئے جاسکین، اگر آپ اس دور کی تاریخون سے یکجا کرنا چاہین تو وہ فراہم ہوسکتے ہین، مثلاً ایک جگہ باغون کے محصول کی مجموعی آمدنی کا ذکر آیا ہے وہ ایک لاکھ اسی ہزار تنکہ تھی، اسی طرح دوآب کا محصول اسی لاکھ تنکہ وصول ہوتا تھا، اور دہلی کے جوار سے ۶ کرور پچاس لاکھ کی آمدنی تھی، عفیف لکھتا ہے :-

"در عہد دوست آن خسرو جہات یک لاکھ و ہشتاد ہزار تنکۂ حقہ دیوانی خارج حصۂ املاک باغبانان محصول میان دوآب دران ایام ہشتاد لک تنکے بود ہمچنین از بسیارے استقامت آن طالب دین شش کرور و ہشتاد و پنج لک تنکہ محصول بلاد و ممالک دار الملک دہلی بود (ر ص ۲۹۶)

فیروز شاہ نے زکوٰۃ کے مصارف کو ان کے جائز حدود مین صرف کرنے کا اہتمام بھی رکھا تھا، ۲ لاکھ تنکہ امدادی وظائف مین دئے جاتے تھے، اور چار ہزار دو سو اشخاص مستقل طور پر وظیفہ یاب تھے، خیرات خانے قائم تھے، اور ناداروں کو اُن کی لڑکیون کی شادی کے مصارف دئے جاتے تھے، نیز عام صدقات و خیرات کا وسیع سلسلہ قائم تھا، (ر ص ۳۵۰، ۳۰۹، ۳۶۰)

آئین اکبری کی تصریح کے مطابق اکبر کے زمانہ تک ہندوستان مین زمینون کی تقسیم شرعی اصطلاحون کے مطابق تھی، اور اسی لحاظ سے اُن پر محصول واجب الادا تھا، چنانچہ ابوالفضل نے زمین کی عشری خراجی اور

صلحی قسم اوران کی نوعیت بیان کی ہے، پھر محصولون کے لئے جو اصطلاحین ہین، اُن کو درج کیا ہے، اوران محصولون کا بھی ذکر آیا ہے جن کو سلاطین نے واجب الاداقرار دیا تھا، اور آخر مین بیان کیا ہے، کہ اکبر نے اس نظام کو بدل دیا تھا، (آئین اکبری ج ۱ ص ۲۰۴)

بااین ہمہ بعض تصریحات سے معلوم ہوتا ہے، کہ زمین کی خراجی وعشری تقسیم اس دور مین بھی کچھ نہ کچھ قائم تھی چنانچہ ایک جگہ ذکر آیا ہے،

"ہرکہ اراضی خراجی رانگارد وبجہت علت فرق گرد انداز گاومیش شش وانہ گاو سہ دام سالیانہ بازیافت کند، (آئین اکبری ج ۱ ص ۱۹۹) آئین عملگذار)

اس کے بعد جب عالمگیر کا دور آیا، تو فیروز شاہ کے زمانہ کی طرح نئے سرے سے اسلامی احکام کے بموجب حکومت کا نظام مال تیار کیا گیا، مستعد خان لکھتا ہے،

"جہان پناہ نے فرمان مبارک صادر فرمایا، کہ تمام ممالک محروسہ مین محاصل موافق احکام شریعت وصول کئے جائین، (مآثر عالمگیری ترجمہ اردو ص ۷۰ سہا

اسی طرح غیر شرعی محاصل کی منسوخی کا اعلان کیا گیا، مآثر عالمگیری مین ہے،

" بادشاہ رعیت نواز نے غلے اور اناج اور وجوہ راہداری ومحصول اسباب ودیگر اموال بہائم خاص کر محصول تمباکو کو جو بے حد کثیر رقم تھی، اور عملہ کرد گیری جس کے وصول کرنے مین تجار کو بے حد تنگ اور پریشان کرتا تھا، خاص کر مسلمانون کے لئے اور دیگر محاصل مذکورہ کو تمام رعایا کے لئے معاف فرما دیا، اور موروثی مطالبات مین جو رقم مناصب مبلغ [illegible] مجری ہو کر خزانہ سرکار خالصہ مین ہر سال داخل کی جاتی تھی" اور جس کی وجہ سے خزانہ مین سالانہ معقول رقم داخل ہوتی تھی، یکسر قلم معاف فرما دی گئی (رر ص ۳۰۸)

اسی طرح کارِ خیر کا انتظام بھی وسیع پیمانہ پر کیا گیا تھا جس کی تفصیل اس عہد کی تاریخون میں عام طور پر ملتی ہے،

امید ہے، کہ یہ اشارات، ہندوستان میں مسلمانون کے عہد مین نظامِ زکوٰۃ کو سمجھنے اور اسی سلسلہ مین مزید معلومات فراہم کرنے کے لئے کافی ہون گے،

موجودہ اسلامی ملکون مین سے زکوٰۃ کا نظام کہان اور کس طور پر قائم ہے، اگر اس سلسلہ میں سفرائے ممالکِ اسلامیہ مقیم ہند خصوصاً سفیر حجاز و افغانستان وغیرہ کی طرف رجوع کیا جائے تو شاید مناسب معلومات مہیا ہوسکین،

والسلام

"س"

نواے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کے کلام سے صاحبِ ذوق طبقہ پوری طرح واقف ہے، اُن کی پرجوش مذہبی و ملی، قومی و سیاسی، اور مختلف النوع دلکش و دلپذیر نظمون اور پرکیف غزلون کا مجموعہ نواے حیات کے نام سے چھپ گیا ہے، دیوان کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی مد ظلہ کے قلم سے مبصرانہ مقدمہ ہے، ضخامت ۵، ا صفحے، قیمت :- للعہ مجلد، ملنے کا پتہ :- دار المصنفین اعظم گڈھ

رقعاتِ عالمگیر

اورنگزیب عالمگیر کے خطوط ورقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے اس جلد مین جمع کئے گئے ہین، اور ان سے علم ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیون حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، قیمت :- ے ر

ضخامت :- ۴۸۷ صفحے،

"منیجر"

ادبیات

سرودِ روحانی

از جناب مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی

طائرِ فکر کی پر افشانی
بن گئی یوں سرودِ روحانی

نفسِ مدح خواں کی موجوں میں
اہتزازِ نسیمِ رضوانی

کلکِ مدحت سرا کی جنبش میں
پرِ بلبل کی بال جنبانی

کیوں نہ ہو آج دل کو ہر منظور
وصفِ حُسن حبیبِ یزدانی

نعت ہے ایسے مہرِ انور کی
مستفضی جس سے ماہ کنعانی

جس کی ہر آن جانفزاے خلق
جس کی ہر شان لطفِ رحمانی

جس کا ہر فعل آیۂ رحمت
جس کا ہر قول نطقِ حقانی

یاد جس کی ہے دل کو وجہ سکون
ہجر نا باعثِ پریشانی

نور جس کا فروغ صبحِ ازل
ذاتِ عکس صفاتِ سبحانی

مردمِ چشمِ آدم و حوا
مایۂ نازِ نوعِ انسانی

آرزوے خلیل و جانِ ذبیح
مقتداے کلیمِ عمرانی

مژدہ گو جس کی آمد آمد کے
ابنِ مریم مسیحِ ربانی

دُرجِ قدرت کا گوہرِ یکتا
بزمِ فطرت کی شمعِ لاثانی

نوبہارِ حدیقۂ اخلاق   نکہتِ بوستانِ رحمانی
مولدِ پاک کی سعادت سے   ارضِ مکہ سپہرِ نیسانی
اور نقشِ قدم کی برکت سے   خاکِ یثرب شفاے روحانی
گوہرِ شب چراغِ کانِ قریش   تاجِ ہاشم کا لعلِ رُمانی
آمنہ کے صدف کا دُرِّ یتیم   نازشِ قلزمی و عُمّانی
جس کا بچپن بہارِ حُسن کی صبح   وجہِ تزئینِ باغِ رضوانی
جس گلِ تر کی تازگی پہ فدا   سد بہارِ ریاضِ ریحانی
شرفِ بے مثال "خلقِ عظیم"   ہوا خالق سے جس کو ارزانی
صادق القول اور امین ایسا   جس کے قائل تھے دشمنِ جانی
حلم اُس کا تھا جوہرِ ذاتی   عفو اس کی تھی فطرتِ ثانی
نہ لیا انتقام دشمن سے   تھی مظالم کی گرچہ طغیانی
احد قومی زبان پہ روزِ احد   حبذا لُطف کی فراوانی
فتحِ مکہ کے طرفہ منظر سے   چشمِ افلاک وقفِ حیرانی
بدر کا وہ شجاعِ بے ہمتا   وہ احد کا دلیرِ لاثانی
پیکرِ دل پذیرِ شرم و عفاف   جس پہ قربان حیاے نسوانی
وہ شہِ ملکِ فقر جس کا گدا   نہ کرے آرزوے سلطانی
جس کے سائل کے روبرو بے قدر   شوکتِ قیصری و خاقانی
جس کے بیت الشرف کا کُہنہ حصیر   رشکِ نمالیچاے کاشانی
قیصری جس کے در کی جاروبی   خسروی جس کے گھر کی دربانی

اپنے کاموں میں اپنا خادم آپ — باوجود شکوہ و سلطانی

قائم اللیل وہ کہ جس کی جبیں — ظلمتِ شب میں شمعِ نورانی

صائم ایسا کہ جس کی خشک لبی — صوم کے حق میں آبِ حیوانی

رحم و راحت پہ اس کے ہیں شاہد — بصراحت نصوصِ قرآنی

رزم میں وہ مثالِ تیغِ دودم — جس کی بُرّش قضائے یزدانی

بزم میں ایسا ابرِ گوہر بار — جس کی بخشش سے یم کو حیرانی

شہِ لولاک صاحبِ معراج — جس کا طغرا ہے لوحِ قرآنی

وہ حبیبِ خدا کہ جس کا وجود — ہے پناہِ عذابِ یزدانی

گفتگو جس کی ذکرِ ربِ جلیل — خامشی جس کی فکرِ پنہانی

قامعِ کفر و ماحیِ الحاد — دورِ ظلمت میں نورِ ایمانی

وہ سراجِ منیرِ محفلِ قدس — جس سے روشن جہانِ ظلمانی

نیک و بد کے لئے بشیر و نذیر — رہنما بہرِ انسی و جانی

حشر میں ہم سے عاصیوں کے لئے — بخششِ خالقِ تشفیعِ اذعانی

اس کے اعجاز کے صحیفے سے — نقشِ حیرت مرقعِ مانی

اس کے استحقاق کی سند کے لئے — حرفِ آخر کلامِ ربانی

محفلِ حق کا شاہدِ زیبا — بزمِ گیتی کی شمعِ نورانی

وہ کہ جس کا جمال دل افروز — کاشفِ پردہ ہائے ظلمانی

وہ کہ جس کی نسیمِ الفت سے — نقشِ باطل ہوائے نفسانی

اے پیمبر عطا کے مہرِ منیر — ذرہ ذرہ پہ جس کی سلطانی

اے کہ تیرے سحابِ بخشش سے — پانی پانی ہے ابرِ نیسانی
مجھ پہ بھی رشحۂ کرم جس سے — دور ہو بحرِ غم کی طغیانی
اے نگاہِ کرم ادھر شاہا — میں بھی ہوں قیدِ غم کا زندانی
اس سے آگے سخن کی تاب نہیں — حرفِ مطلب کی شرح طولانی
تجھ پہ روشن ہے میرا بختِ سیاہ — تجھ پہ ظاہر ہے حالِ پنہانی
کیا عجب ہے طفیل میں تیرے — نور کو ہو عطا سلیمانی

غزل

از جناب شفیق جونپوری

حجاز مرکز ہے اپنی ملت کا منزلِ رہگذر نہیں ہے — تصور اپنا ہو کہاں تک وطن بھی حدِ سفر نہیں ہے
بدل دیا اے عندلیب نغمہ جو زمزمے میں اثر نہیں ہے — گراں ہو کانوں پہ کیوں نہ نغمہ تو کیوں نوا تلخ تر نہیں ہے
تصورِ غیر یہ گلا تھا کہ راستہ بے خطر نہیں ہے — اور آج منزل پہ ہو رہی ہے تو قافلوں کا گذر نہیں ہے
ستم ہے اے بد نصیب مالی کہ تونے اب تک صلہ نہ پایا — کہاں زمینِ چمن کی مٹی ترے پسینے سے تر نہیں ہے
کلی کلی کو ستا رہا ہے تمازتِ آفتاب کا ڈر — ہٹی گلستان سے شب کی ظلمت ابھی تو آثارِ سحر نہیں ہے
خود اپنی شاخوں کو قطع کرنا خود اپنے پھولوں کا خون کرنا — چمن پہ حاصل ہوا ہے قابو تو فائدہ کچھ نظر نہیں ہے
جہانِ قلندر نے روح پھونکی زمین تا دورِ آسمانی — ضمیرِ درویش کا اجالا ابھی دیوار و در نہیں ہے
نگاہِ جود و جلوہ آفریں ہو تو ذرہ ذرہ ہے طورِ جانی — بہار بھی موسمِ خزاں ہے اگر بہارِ نظر نہیں ہے

شفیق کوئی جدید ساقی مطلع کوئی تو سخن نہ ہے
کہ آج تہذیبِ ہاشمی پہ چاند ہوں کی نظر نہیں ہے

مطبوعات جدیدہ

متفرقات غالب مرتبہ جناب مسعود حسن صاحب رضوی صدر شعبہ اردو و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی،

تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۵ صفحے کاغذ سپید ٹائپ روشن، قیمت مجلد عہ ، پتہ :- کتب خانہ ریاست رامپور سے ملے گی،

مرزا غالب کی نظم و نثر کا تمام معلوم حصّہ اور اُن کے قلم سے نکلی ہوئی ہر سطر شائع ہو چکی ہے، مگر اب بھی اُن کے بعض غیر مطبوعہ نوادر مل جاتے ہیں، متفرقات غالب بھی انہی میں ہیں، جو مرتب کو ایک قلمی بیاض سے دستیاب ہوئے ہیں، اس میں فارسی کے اڑتالیس خطوط، دو قطعے، دو مثنویاں، اردو کی ایک غزل اور ایک سلام ہے، ضمیمہ میں رقعہ ناطق بنام غالب اور غالب کی مذکورہُ بالا مثنویوں میں سے جس کی تفصیل آگے آتی ہے، ایک مثنوی کے بعض حصوں کا جواب ہے، مقدمہ میں لائق مرتب نے ان متفرقات کے متعلق جملہ ضروری معلومات تحریر کر دیے ہیں، مکاتیب میں بعض وہ خطوط بھی ہیں، جو غالب کے مجموعۂ مکاتیب پنج آہنگ میں شائع ہو چکے ہیں، انھیں اس لئے اس مجموعہ میں شامل کیا گیا، کہ مرتب کے بیان کے مطابق پنج آہنگ میں یہ مکاتیب بہت غلط چھپے ہیں، اسی طریقہ سے دو مثنویوں میں سے ایک مثنوی باد مخالف بھی کلیات غالب میں موجود ہے، یہ مثنوی غالب نے قیام کلکتہ کے زمانہ میں وہاں کے مشہور ادبی ہنگامہ میں لکھی تھی، اس کی اشاعت کا سبب مرتب نے یہ بیان کیا ہے، "کہ کلیات کی مثنوی میں کہیں لفظی ترمیم کی گئی ہے، کہیں کوئی شعر گھٹایا بڑھا دیا گیا ہے، کہیں شعروں کی ترتیب بدل دی گئی ہے، .... اور اس کتاب میں اس کی وہی شکل ہے جس میں وہ کلکتہ والوں کے سامنے پیش کی گئی تھی" مرتب کا یہ بیان صحیح ہے

،کی تصریح کر دینا چاہیے تھا، کہ یہ ترمیمین اور تبدیلیان خود غالب کے قلم کی ہین، اس اجمال
کا ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کی ترمیمین ہین، مرتب کی شائع کردہ مثنوی کے متعلق اُن کا خود
،کہ "اس کی وہی شکل ہے جس مین وہ کلکتہ والون کے سامنے پیش کی گئی تھی،" اس نے اس کی ترمیمات
.کی ہین، اور کلیات ہی کی مثنوی آخری اصلاح شدہ ہے تاہم مرتب کی شائع کردہ مثنوی سے یہ فائدہ
ا، کہ اس کی دونون شکلین سامنے آگئین، دوسری کا بے نام مثنوی بہادر شاہ کے حکم اور حکیم احسن اللہ خان
یت کے مطابق بہادر شاہ پر تشیعت کے الزام کی صفائی مین غالب نے لکھی تھی، خواجہ حالی نے یادگا
.مرتب نے مقدمہ مین اس واقعہ کی پوری تفصیل لکھی ہے، یہ مثنوی غالباً غیر مطبوعہ ہے، اس سلسلہ مین
نے خواجہ حالی کی اس نمایان غلطی کی تردید کی ہے کہ انھون نے اس مثنوی کا نام "دمغ الباطل" تحریر کیا ہے
لہ انھون نے وثوق کے ساتھ نہین بلکہ غالباً کر کے لکھا ہے، اور موضوع بحث کی مناسبت سے اس
،کے مذاق کے مطابق نام کے متعلق اس قسم کا اشتباہ ہو جانا کوئی بعید از قیاس نہین تھا، کتاب کے
ین اس مثنوی کے جواب مین لکھنؤ مین جو مثنوی لکھی گئی تھی، اس کے کچھ اشعار نقل کئے ہین، بہرحال
ب کے قدردانون کے لئے یہ متفرقات نادر تحفہ کی حیثیت رکھتے ہین، اور اُن سے بعض نئے معلومات
س ہوتے ہین، اس لئے مرتب کی یہ ادبی خدمت قابلِ قدر ہے،

کیبنٹ مشن اور اس کے بعد (انگریزی) مرتبہ جناب شیخ محمد اشرف صاحب تقطیع اوسط،

ضخامت ۴۳۱ صفحے، کاغذ بہتر قیمت چھ روپیہ، پتہ شیخ محمد اشرف کشمیری دروازہ لاہور،

ہندوستان اور پاکستان کی آزادی اور دونون ریاستون کے قیام کے سلسلہ مین ۱۹۴۲ء سے لے کر
۱۹۴۷ء تک جو آئینی مراحل پیش آئے، اُن کی پوری روداد اس کتاب مین درج کر دی گئی ہے، اور وزیراعظم
برطانیہ کے ۱۵ اگست ۱۹۴۶ء کے اعلان کے بعد سے اکتوبر ۱۹۴۶ء تک اس سلسلہ مین برطانیہ نے ہندوستانیون
کے سامنے جو تجویزین پیش کین، اور لیگ اور کانگریس نے اس سے جو اختلافات کئے، اور جو ترمیمین چاہین اور

ان دونوں میں جو کشمکش ہوئی، اور ہندوستان کے مدبرین نے جو بیان دیئے ان سب کو بغیر کسی تنقید اور اظہار رائے کے جمع کر دیا ہے، اور اُن کے حق و ناحق ہونے اور فائدہ و نقصان کا فیصلہ ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب گویا ہندوستان و پاکستان کی آئینی آزادی کی تاریخ ہے۔

محی الملۃ والدین مؤلفہ جناب عون احمد صاحب قادری تقطیع بڑی ضخامت ۲۶۳ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ مولوی محبوب عالم صاحب خانقاہ مجیبی پھلواری ضلع پٹنہ و مولوی مقبول احمد صاحب صدیقی مدرسہ مجیدیہ قلعہ گھاٹ دربھنگہ،

مولانا محمد محی الدین مرحوم سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ پھلواری و سابق امیر شریعت صوبہ بہار جامع شریعت و طریقت اور صاحب ارشاد و ہدایت بزرگ تھے، مذہبی اور ملی کاموں میں بھی ان کا حصہ رہتا تھا، اس حیثیت سے اُن کی ذات نہ صرف بہار بلکہ دوسرے صوبوں کے مشائخ و سجادہ نشینوں میں ممتاز تھی محی الملۃ اُن کی سوانح عمری ہے، اس میں اُن کے خاندانی حالات، سوانح زندگی، مذہبی و ملی خدمات، علمی کمالات، ارشاد و ہدایت، اخلاق و سیرت وغیرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو تحریر کیا گیا ہے، کتاب کے شروع میں مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کے قلم سے صوبہ بہار میں علم و ارشاد اور صوفیہ و مشائخ اور خانقاہ مجیبی کی مختصر تاریخ ہے، یہ کتاب سلسلہ مجیبیہ کے متوسلین کے علاوہ خانقاہی سجادہ نشینوں اور پیرزادوں کے بھی مطالعہ کے لائق ہے،

اردو و ہندی رسم الخط مؤلفہ جناب مولوی محمد الیاس برنی صاحب سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، محصول ڈاک کے لئے ۱ر کے ٹکٹ بھیج کر مصنف سے مفت ملے گی، پتہ:- بیت الاسلام سیف آباد حیدرآباد دکن،

اردو کی مخالفت میں عرصہ سے ایک پروپیگنڈا یہ بھی جاری ہے، کہ اس کا رسم الخط ناقص اور اسکے مقابلہ میں ہندی کا زیادہ جامع اور مکمل ہے، جس سے اردو کے بعض ناواقف حامی بھی متاثر ہوگئے ہیں،

یہ کتاب اس پروپیگنڈے کا جواب ہے، فاضل مصنف نے اس مین دونون رسم الخط کے حروف کی قلت وکثرت، حروف صحیح وحروف علت، مفرد ومرکب اور متشابہ حروف، اعراب آوازون کے تلفظ، تحریر وکتابت کے محاسن ونقائص اور اس کی طوالت واختصار اور دوسری لسانی اور صوتی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کرکے دکھایا ہے، کہ ان تمام حیثیتون سے ہندی رسم الخط کے مقابلہ مین اردو کا رسم الخط زیادہ جامع اور مکمل ہے، اور اس مین جو خفیف سی خامیان ہین، اس کی اصلاح کی تجویزین پیش کی ہین، یہ کتاب اردو رسم الخط کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کا نہایت مدلل اور تشفی جواب ہے، جس کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، اس کی عام اشاعت کے خیال سے مصنف نے اس کی کوئی قیمت نہین رکھی ہے، اور جیسا کہ انھون نے مقدمہ مین لکھا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کرنا ضروری ہے،

زجر العوام و انذار العشائر ونجات المسلمین } مؤلفہ جناب مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دار العلوم دیوبند تقطیع چھوٹی، ضخامت بالترتیب ۶۲، ۶۰ و ۴۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۳، ۲، ۲ پتہ دار الاشاعت دیوبند ضلع سہارنپور،

آج کل عام طور سے مسلمانون کو دینی احکام سے اتنی واقفیت اور ان کی جانب سے اتنی بے توجہی ہوگئی ہے، کہ وہ بہت سے چھوٹے چھوٹے معاملات مین محض لاپروائی کی وجہ سے دانستہ یا نادانستہ بے لذت گناہون مین مبتلا ہوتے رہتے ہین، جن سے کسی قسم کا فائدہ نہین حاصل ہوتا، اور اس کا ان کو احساس بھی نہین ہوتا جن سے وہ آسانی کے ساتھ بچ سکتے ہین، مصنف نے اس کی اصلاح کے لئے یہ رسالے تصنیف فرمائے ہین، پہلے رسالہ زجر العوام مین اس قسم کے صغیرہ وکبیرہ گناہون کی ممانعت اور ان پر وعید کی حدیثون کا ترجمہ کر دیا ہے، اور جا بجا ان کی تشریح اور فوائد بھی تحریر کر دئے ہین، اس کے آخر مین انذار العشائر کے نام سے علامہ زین العابدین ابن نجیم مصری کے ایک رسالہ کا ترجمہ جس مین صغیرہ وکبیرہ گناہون کی فہرست ہے، بطور ضمیمہ شامل کر دیا ہے، تیسرے رسالہ نجات المسلمین مین ان اعمال کو

جمع کر دیا ہے جنھین صحیح احادیث مین گناہون کا کفارہ اور اُن سے بچنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے، اور اس کی ضروری تشریح اور اُن سے متعلق فوائد و نکات بھی بیان کر دیئے ہین، لیکن ان اعمال کا آج کل کے "اصلاحی عمل" سے کوئی تعلق نہین ہے، بلکہ یہ سب اعمال عبادات و دینی احکام و تعلیمات پر مشتمل ہین، اس زمانہ مین جب کہ عموماً گناہون کا احساس بھی بہت کم باقی رہ گیا ہے، ان رسالون کا مطالعہ مفید ہے،

ابلیس کا روزنامچہ از جناب نعیم صدیقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۸ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۵ر پتہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ مچھلی گوڑہ حیدرآباد دکن،

موجودہ تہذیب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے عیب کو بھی ہنر کی شکل دیدی ہے، اور خود غرضی اور ہوا پرستی کے چہرہ پر ایسی دلفریب نقاب ڈالدی ہے، کہ اس کی اصلی شکل پہچاننا مشکل ہے، چنانچہ اس کی تعلیم، تہذیب، معاشرت، سیاست کوئی چیز بھی اس گندم نمائی اور جو فروشی سے خالی نہین، دوسری طرف اس دور کے مسلمانون کا یہ حال ہے، کہ اُن کی زبانون پر تو اسلام کا نعرہ ہے، لیکن اُن کے دل اور ان کے اعمال دونون اُس سے خالی ہین، لائق مصنف نے اس کتاب مین ان دونون امور کو شیطان کی ڈائری کی شکل مین دلکش انداز مین دکھایا ہے، کہ شیطان کیسے کیسے خوبصورت نامون اور کن کن پُر فریب طریقون سے انسانون کو دھوکا دیتا ہے، یہ طرز تبلیغ نوجوانون کی اصلاح کے لئے زیادہ موثر ہے،

چمنستان فصاحت جناب سید ہمایون مرزا مرحوم بیرسٹر حیدرآباد تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۶ صفحے قیمت تحریر نہین، پتہ:- صغرا منزل ہمایون نگر حیدرآباد دکن،

مصنف مرحوم کا نام علمی حلقہ مین بیگانہ نہین، وہ متعدد کتابون کے مصنف تھے، شعر و ادب کا ذوق اُن کو اپنے نامور اور صاحب کمال باپ شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی سے ورثہ مین ملا تھا، چمنستان فصاحت ان کا دیوان ہے، ان کی شاعری اس دور کی یادگار ہے جب حیدرآباد مین داغ و امیر کا رنگ چھایا ہوا تھا، اس لئے یہی رنگ ان کے کلام کا بھی ہے، زبان صاف سلیس اور شستہ ہے،

تابعینؒ

مرتبہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

علم وعمل اور مذہب واخلاق مین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور اُن کے
بیت یافتہ تابعینِ کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانون
ے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس
روہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس مین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ،
ضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ
ضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد حنفیہ، حضرت سعید بن مسیب، حضرت سعید بنؒ
جبیر، حضرت محمد بن سیرین، حضرت ابن شہاب زہری، امام ربیعۃ الرائی، امام مکحولؒ
شامی، قاضی شریحؒ، وغیرہ چھیانوے ۹۶ اکابر تابعینؒ کے سوانح، اُن کے علمی، مذہبی،
اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے،

ضخامت:- ۵۶۰ صفحے،

قیمت:- چار روپیے،

"منیجر"

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فنِ سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیلِ دین، تاسیسِ حکومتِ الٰہی، وفات، اخلاق وعادات، اعمال وعبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات وخصائصِ نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید وتفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے، جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے، اور دوسرے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق، فضائل اور آداب کے عنوانوں اور اس کی ذیلی سرخیوں کے تحت اخلاقی تعلیم کی تفصیل ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول زیر طبع، حصہ دوم تقطیع خورد ؎ روپیہ، حصہ سوم تقطیع کلاں ؎ تقطیع خورد ؎، حصہ چہارم تقطیع کلاں باختلاف کاغذ ؎ روپے، تقطیع خورد ؎، حصہ پنجم تقطیع کلاں ؎ و ؎ تقطیع خورد ؎ روپیہ، حصہ ششم تقطیع کلاں ؎ و ؎، تقطیع خورد ؎ و ؎،

(ترتیب و تہذیب صدیق احمد)